سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
ستمبر 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
شہنشاہِ جرم: انتہائی سفاک قاتل کی داستان
روحِ مناظر: ایک فقیر منش اہلِ قلم کی روداد
ان کے علاوہ بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات، معلوماتی قصے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

17 مئی 1880ء بروز جمعہ کو دوست محمد خان کا گھر پیلی مٹی سے پوتا جارہا تھا۔ لیپائی کے بعد دیواروں پر سفیدی کرائی گئی۔ شام تک یہ تمام کام انجام پاگئے اور روشنی کا معقول انتظام کیا گیا۔ اریب قریب کے ذی حیثیت شرفا اور رشتے دار آنا شروع ہوگئے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے یہاں سے وہاں تک چاندنی بچھادی گئی۔ اس گھر میں ایک بچے کی پہلی آواز بلند ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی خوشخبری تھی۔ اسی لیے اس خوشی میں شریک ہونے والے امنڈ آئے تھے۔ والد کوتوال تھے تو نانا احمد خان کاکڑ تحصیل دار۔ خورجہ (یوپی، بھارت) میں اس خاندان کا بڑا نام تھا اس لیے ہر کوئی مبارک باد دینے چلا آرہا تھا۔ پھر ایک بات اور تھی۔ خاندان بھر میں ایک عرصے سے کسی کے ہاں زندہ بچہ پیدا نہیں ہورہا تھا اس لیے جس نے بھی بچے کے بارے میں سنا، دوڑا چلا آیا۔ یوں بھی یہ بچہ ایک بزرگ کی دعاؤں کے حصار میں تھا۔ پشاور کے نزدیک کے کسی علاقے میں ایک بزرگ رہتے تھے، وہ اکثر اپنے مریدوں سے ملنے ہند کے دیگر علاقوں میں بھی چلے جاتے تھے۔ خورجہ میں بہت بڑی تعداد میں پختون آباد تھے۔ انہی میں دوست محمد خان اور احمد خان کاکڑ کا گھرانا بھی تھا۔ اخوندجی دیگر مریدوں کے ہمراہ خورجہ تشریف لائے تو کاکڑ نے دعا کے لیے کہا۔ اخوندجی نے پیش گوئی کردی تھی کہ بیٹا ہوگا اور اس کا نام بھی تقی محمد رکھنا۔ یہ بچہ اسی دعا کا ثمر تھا۔ اسی لیے نام وہی رکھا گیا۔

اس رات خوب مہمانداری ہوئی۔ غربا فقرا کی جھولیاں بھری گئیں۔ بچے نے ہوش سنبھالا تو ماں نے ابجد سے روشناس کرایا پھر کچھ بڑا ہوا تو اسے مُلّا نور احمد کے مکتب میں داخل کرادیا گیا۔ خورجہ میں یہ سب سے اعلیٰ مکتب تسلیم کیا جاتا تھا اور فیس بھی آٹھ آنے تھی۔ اس مکتب میں نہ تو کرسی ٹیبل کا رواج تھا، نہ گھڑی تھی۔ وقت دیکھنے کے لیے دھوپ والی جگہ پر نشان لگا ہوا تھا۔ جب نشان تک دھوپ پہنچتی تو چھٹی دے دی جاتی۔ کمروں میں چٹائیاں بچھی تھیں جن پر طلبا بیٹھتے۔ جمعہ کے دن تمام بچوں کو حکم تھا کہ نہا کر آئیں اور مُلّاجی کے ساتھ جا کر جامع مسجد میں نماز ادا کریں۔ وہ وقت ہی اور تھا۔ مُلّاجی کا رعب و تعلیم کا اثر کہ بچے کی سرشت میں نماز کی ادائیگی بیٹھ گئی۔ مکتب کی تعلیم مکمل ہوئی تو دنیوی تعلیم کا خیال آیا اور بچے کو وکٹوریہ جوبلی اسکول کے درجۂ مڈل میں داخلہ دلوادیا گیا۔ یہاں کی تعلیم مکمل کی تو نوکری کا خیال آیا اور سیدھے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے پاس پہنچ گیا جو اسپیشل دورے پر خورجہ آیا ہوا تھا۔ یہ دسمبر 1898ء کی بات ہے۔ ان دنوں ایک انگریز افسر کے سامنے تن کر کھڑے ہوجانا معمولی بات نہ تھی مگر وہ سیدھا ان کے پاس گیا اور بولا "عالی جناب! میرا خاندانی پیشہ سپاہ گری ہے اس لیے مجھے محکمۂ پولیس میں بھرتی کیا جائے۔"

انگریز افسر نے بھانپ لیا کہ وہ نوجوان حوصلہ مند ہے مگر عمر کم ہے۔ بیس سال سے قبل افسری مل نہیں سکتی تھی اس لیے بطور ہیڈ کانسٹیبل علی گڑھ بھیج دیا تاکہ قانون و قواعدِ پریڈ سے آگاہی حاصل ہوجائے۔ اس زمانے میں ہیڈ کانسٹیبل کی تنخواہ دس روپے تھی۔ دو سال کی ٹریننگ کے بعد 1901ء میں ٹریننگ کالج مراد آباد بھیج دیا گیا۔ ایک سال وہاں ٹریننگ حاصل کی اور علی گڑھ آگیا۔ اس شہر میں چند ماہ گزارے تھے کہ کوتوالی مظفر نگر تبادلہ ہوگیا۔ مظفر نگر کا کوتوال ہر پرشاد تھا۔ انتہا درجے کا متعصب، بدعنوان اور رشوت خور۔ اس کی وجہ سے تقی محمد خان کو پولیس کی ملازمت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ جب ہر پرشاد صرف چند روپوں کی خاطر مسلمانوں کو کوتوالی میں بلا کر تشدد کا نشانہ بناتا تو تقی محمد خان پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ بالآخر وہ انگریز سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے پاس شکایت لے کر پہنچا مگر سپرنٹنڈنٹ بھی مسلمانوں سے خار کھاتا تھا۔ اس نے بھی شکایت پر کان نہ دھرے۔ جب ڈپٹی انسپکٹر جنرل معائنہ کے لیے آیا تو یہ ان کے پاس پہنچا اور تمام حالات بیان کیے۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل نے ہر پرشاد کی نگرانی اور تقی محمد خان کے تبادلے کا حکم صادر کردیا۔ تقی محمد کو دفتر انسپکٹر جنرل الٰہ آباد بلالیا گیا۔ یہ 1904ء کی بات ہے۔ یہیں رہ کر مزید ٹریننگ حاصل کی اور سی آئی ڈی کے محکمہ میں ترقی دے دی گئی۔ فنگر پرنٹ پر خود ہی ریسرچ کرتا رہا۔ آج جو نظام فنگر پرنٹ رائج ہے، اس کے موجد یہی تقی محمد خان ہیں۔ کلکتہ میں رہتے ہوئے بہ حیثیت سی آئی ڈی افسر اس نے بہت سارے الجھے ہوئے کیس حل کیے۔ انہی میں سے ایک نوٹوں کی چوری کا کیس ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب کیس تھا۔ اس کیس کو حل کرنے میں کلکتہ پولیس اور یوپی پولیس ناکام ہوگئی تھی۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ کلکتہ سے مرکنٹائل بینک نے ایک ہزار روپے کے نوٹ پوسٹل انشورڈ لفافے میں بنارس کے ایک سیٹھ کے نام روانہ کیے۔ سیٹھ نے لفافہ کھولا تو اس میں ردی کاغذات تھے۔ اس الجھے ہوئے کیس کو اس نے سلجھا کر انگریز افسروں کو گرفتار کرادیا۔ اسے حکومت نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ اپنے دور میں اس نے ایسے ایسے کیس حل کیے کہ ہند کے محکمۂ پولیس کے نصاب میں شامل کردیا گیا۔ 1952ء میں کراچی آگئے اور یہیں کی خاک میں مل گئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

بالآخر ماہِ رحمت بھی گزر گیا، وہ مہینا جس میں قدرت کی سخاوت جوش میں رہتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ گناہگاروں کے لیے ایک نادر موقع ہوتا ہے مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر افراد اس ماہِ مبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے پوری طرح فیضیاب نہیں ہوپاتے۔ روزہ نماز میں وقت نہ دے کر دنیا بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ گراں فروشی اس مبارک ماہ میں جتنی کی جاتی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ غربا کی عید حسرت و یاس میں گزر جاتی ہے مگر اس بار تو غربا پر ہی نہیں درمیانے طبقے پر بھی بجلی گری ہے کہ وہ بھی غربا کی سطح سے خود کو نیچے محسوس کررہے ہیں۔ یہ بجلی گرائی ہے محکمۂ بجلی نے۔ ایک طرف تو بلوں میں ہوش ربا اضافہ تو دوسری جانب لوڈ شیڈنگ نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ کاروبار ٹھپ رہا، آمدنی کے وسائل ختم، لوگ صفر پر آگئے۔ جبکہ ہمارے وزیر خزانہ آئی ایم ایف کا قرضہ ادا کرنے کے لیے مزید قرضہ لیتے نظر آئے۔ یعنی ملک کو ہر جانب سے اندھیروں کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔ اس پر قہر یہ کہ پورے رمضان کہیں نہ کہیں سے بڑی خوں ریزی کی اطلاع بھی آتی رہی جسے مغربی میڈیا خوب خوب اچھالتا رہا۔ پاکستان کا چہرہ داغدار کرتا رہا۔ ایسے میں ایک دو خبریں حوصلہ افزا بھی آئیں، مثلاً تنور پر روٹی سینکنے والے نے امتحان میں ٹاپ کر دکھایا، یا پھر پاکستانی طلبہ نے تقریری مقابلے میں دنیا بھر میں اول پوزیشن حاصل کرکے حیران کردیا مگر حوصلہ شکن خبروں کا پلّہ بھاری رہا۔ گویا کہ ہم نے رمضان کے تقدس کو بھی مجروح کیا اور اس سے وہ فائدہ بھی نہیں اٹھایا جس کا اللہ نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ ایسے وقت میں احمد ظفر کا یہ شعر مجھے شدت سے یاد آرہا ہے۔

جس بستی کا ہر دیوانہ اندر سے فرزانہ ہے
اس بستی پر وقت کا جادو چلتے چلتے چل ہی گیا

معراج رسول

جلد 22 ❖ شمارہ 11 ❖ ستمبر 2012ء

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا محمد حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: 63-C، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

شہرِ خیال

☒ **اختر صبا** نے کوٹ براڑہ ہنوں سے پہلی بار مخاطب ہوکر ثابت کیا ہے کہ وہ ایک اچھے مبصر ہیں: ”تعارف کرانے سے پہلے سرگزشت کے تمام قارئین، مصنفین اور ادارہ ہذا کو ماہِ رمضان، 14 اگست اور عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ میں پہلی بار لکھنے کی پُرامید سی کوشش کررہا ہوں (خوش آمدید) حالانکہ میں پانچویں جماعت سے سرگزشت کا اک خاموش قاری ہوں اور اب میں بی ایس سی فائنل کا ایگزام دے چکا ہوں، اس سال ایم ایس سی اکنامکس میں داخلہ لوں گا (ماشاء اللہ) میں اپنے ملک کے تمام ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ بیرون ممالک کے ڈائجسٹ کا مطالعہ بھی کرچکا ہوں لیکن جو سو فیصد میرے معیار پر پورا اترا ہے وہ ماہنامہ سرگزشت ہی ہے (ذرہ نوازی ہے آپ کی) مختار مسعود آواز دوست میں لکھتے ہیں۔ ”اچھا انسان اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر آئے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرو، ان سے تنہا فائدہ اٹھانا کم ظرفی کی دلیل ہے“ تو حقیقت میں معراج رسول صاحب نے اپنے اعلیٰ ظرف اور عظیم انسان ہونے کا ثبوت دیا جس نے ہم جیسے تشنہ علم و عقل ناداں مسافروں کو اپنے کاروانِ سرگزشت میں شامل کیا۔ کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن وقت کی کمی کے باعث عشق ناکام نمبر کی طرف آتا ہوں اداریہ میں...... مجھے عشق ہے اپنے وطن سے پڑھا، حقیقت میں اس مٹی سے عشق کرنا بھی چاہیے، اس وطن کی آزادی کے لیے کتنے بچے یتیم ہوئے، کتنے عروسوں کا سہاگ اجڑا، کتنی عصمتیں پامال ہوئیں، اس کی مثال تاریخ میں شاید ہی ملے اور اب اِک عرصہ تسلسل سے ہمارے عشق میں رقیب شناسا و رقیب غیر سانس لے رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے عشق میں اک نہ اک دن رقیب شناسا و رقیب غیر اپنا وجود کھودے گا، انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، مختصر بیتی میں ناکام عشق وارث شاہ کی خود اپنی داستانِ عشق ہیر رانجھا سے کم نہیں، یہ عشق ہی تو ہے جو فلسفۂ مغرب کا پابند ہے اور نہ ہی فلسفۂ مشرق کا۔ مغرب میں لاثانی شاعر جان کیٹس اپنی محبوبہ فینی بران کو خط میں لکھتے ہیں ”محبت ہی تو میرا مذہب ہے“ تو مشرق میں علامہ اقبال اک خط میں لکھتے ہیں ”میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں میں معمور رہتا ہے، اک شرارہ سے اِک شعلہ اٹھتا ہے اور اِک شعلہ سے اک بڑا الاؤ روشن ہوتا ہے۔ مجذوبِ عشق میں فلسفی نطشے کے بارے میں اپنے پسندیدہ رائٹر ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر قابلِ دید تھی۔ عشقِ رنگیں میں مریم کے خان نے ایم ایف حسین کے بارے میں خاصی معلومات دی تو تنویر ریاض نے سوزِ عشق میں اِک مشہور فنکار کی زندگی کا پہلو ئے عشق بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ منظر امام کی عشق بے چین، نسرین منصور کی سرابِ عشق، علی سفیان آفاقی کی بیتے لمحات فلمی الف لیلہ، صائمہ اقبال کی عشق کم نصیب، ابن کبیر کی شکستِ عشق، آصف ملک کی عشقِ مسلسل اور زین مہدی کی عشقِ حقیقی کا اندازِ بیاں بھی کسی سحر بیاں سے کم نہ تھا۔ عشق شش جہت میں عظیم مصور واں گوگ کے بارے میں پڑھا۔ کہتے ہیں کہ واں گوگ نے جب محسوس کیا کہ وہ کامل تصویر بنا چکا ہے تو اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ معنفہ اس سلسلے میں واضح کریں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ جب گوگ کے متعلق لکھا ہے تو گوگ کے متعلق پڑھا بھی زیادہ ہوگا۔ ایسا ممکن ہے اگر مصور محسوس کرے کہ وہ کامل تصویر تخلیق کرچکا ہے تو پھر جینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تخلیق کار تو تخلیق کرنے کے لیے زندہ ہوتا ہے، پُرخطر عشق میں معنف نے جس رابیل اور ہٹلر کی محبوبہ ایوابراؤن کا ذکر کیا ہے تو رابیل جس کا پورا نام گیلی رابیل تھا، ہٹلر کی سوتیلی بہن Angela Raubal کی بیٹی تھی۔ ہٹلر اور ایوابراؤن کی پہلی ملاقات 14 ستمبر 1929ء میں ہوف مین نے اپنے اسٹوڈیو میں کرائی تھی۔ کہتے ہیں کہ رابیل کی موت میں ہٹلر کا ہاتھ تھا۔ سچ بیانوں میں تمام آپ بیتیاں قابلِ ذکر ہیں لیکن ارشد علی کی معراجِ عشق نے دل کو کچھ زیادہ ہی متاثر کیا کیونکہ ایسے ہی اک کردار کے چشم دید گواہ ہم بھی ہیں۔ میری دعا ہے کہ سرگزشت کبھی بھی ہجرِ یار سے شناسا نہ ہو۔“

☒ **خالد یوسفی**، لیہ کے طویل خط کا اختصاریہ: ”بے ترتیب دھڑکنوں کو ترتیب اور بے قرار جذبوں کو قرار دیتے سرگزشت کا عشق ناکام نمبر آ پہنچا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سرورق دیکھا جو زبانِ حال سے کہتا نظر آرہا تھا کہ یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے، فہرست کا مطالعہ کیا تو یہاں سے وہاں تک اور جہاں سے تہاں تک، عشق، عشق، عشق نظر آیا۔ ایک تو عشق ویسے ہی بلائے جاں اور مستزاد یہ کہ ناکام بھی، یعنی

ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا، فہرست پڑھتے ہی ہم دل کو پکڑ کے بیٹھ گئے، ہاتھوں سے کلیجا تھام لیا، بے اختیار مرزا غالب یاد آگئے، آخر اتنا عظیم شاعر ایسے ہی تو نہیں کہہ گیا۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں

اداریہ میں معراج رسول صاحب وطن سے عشق کے پھول کھلاتے نظر آئے، صد شکر کہ اس بار اداریے میں نہ تو کرپشن کا ذکر تھا اور نہ ہی اربابِ اختیار کی روایتی بے حسی کا نوحہ، لوڈشیڈنگ، غربت، جہالت، بے روزگاری، دہشت گردی، بدنظمی، بے عدلی سمیت نہ جانے کتنے موضوعات اداریے کا حصہ بنے لیکن مجال ہے جو بے حسی کے کمبلوں میں دبکے ہوئے حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک بھی رینگی ہو، لگتا ہے اہلِ علم و دانش کی سبھی باتیں فقط صدا بہ صحرا ثابت ہورہی ہیں کہ اصلاحِ احوال کی کوششیں کسی بھی سطح پر شروع ہوتی نظر نہیں آرہیں۔ شہرِ خیال کی رونقیں عروج پر نظر آئیں۔ دعا ہے کہ اس شہرِ محبت کے سبھی باسی شاد رہیں آباد رہیں، چچھ سے ملک جاوید صاحب نے علم اور کتاب کے حوالے سے جو کہا وہ ہمیں اپنے ہی دل کی آواز معلوم ہوئی، یقین مانیے، ہمیں کتابیں چھاپنے اور کتابیں پڑھنے والے تو پسند ہیں ہی لیکن ان لوگوں سے بھی محبت ہے جو کتابوں سے محبت کرتے ہیں اور جس رقت اور تاسف سے ملک صاحب نے عبیداللہ بیگ کی رحلت کا ذکر کیا، وہ بذاتِ خود ان کی علم دوستی کا ثبوت ہے، مختار آزاد نے آخری مغل کے عنوان کے تحت اس عظیم شخصیت کو جو خراجِ تحسین پیش کیا، وہ یوں لگا جیسے سمندر کو کوزے میں بند کردیا گیا ہو، وائے افسوس کہ پچھلے ماہ مہدی حسن کا مرثیہ لکھا اور اس بار بیگ صاحب کا نوحہ کہنا پڑا کہ جنہیں مرحوم لکھتے قلم کانپتا ہے۔ بھلا خاک کے پردے سے روز روز ایسے انسان کہاں نکلتے ہیں؟ اور اب...... اب علم و دانش اور فکر و فہم کے موتی بکھیرتے لب خاموش ہوئے اور جیسے چاروں جانب ایک بنجر سناٹا چھا گیا، اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ حکومت پاکستان نے 14 اگست 2008ء کو عبیداللہ بیگ کی خدمات کے اعتراف میں صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی پیش کیا۔ تاریخ، لسانیات اور ماحول ان کی دلچسپی کے خصوصی شعبے تھے اور اس حوالے سے انہوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کی اصل وجۂ شہرت 1970ء کی دہائی میں نشر ہونے والا پروگرام ”کسوٹی“ بنا۔ اس پروگرام نے انہیں صحیح معنوں میں اسٹار بنادیا۔ کسوٹی پروگرام بیگ صاحب کا طاقتور حوالہ بن گیا اور ان کے دیگر کام نظروں سے اوجھل ہوگئے اور اب بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک ماہر ماحولیات اور بہترین دستاویزی فلموں کے خالق بھی تھے۔ پی ٹی وی پر اپنی ملازمت کے دوران میں انہوں نے درجنوں شاہکار دستاویزی فلمیں تخلیق کیں۔ یہ ایک ہفتہ وار پروگرام ہوتا تھا جس کا نام تھا ”سیلانی کے ساتھ“ اور یہ سیلانی بیگ صاحب خود تھے۔ یہ فلمیں ماحول، آب گاہوں، جنگلات، جنگلی حیات، جغرافیائی تنوع، مزاروں، مختلف ثقافتوں، رسوم و رواج اور بہت سے دور افتادہ علاقوں میں موجود نایاب پودوں، پرندوں اور جانوروں سے متعلق تھیں۔ ان میں سے 40 سے زائد صرف صوبۂ سندھ سے متعلق ہیں۔ ”سندھ کی جھیلیں“ نامی دستاویزی فلم ایوارڈ بھی حاصل کرچکی ہے۔ اس کے علاوہ جنگلی حیات کی فلموں کے معروف بین الاقوامی ادارے ”وائلڈ اسکرین“ نے ان کی فلم ”وائلڈ لائف ان سندھ“ کو 1982ء میں 14 بہترین فلموں میں سے ایک قرار دیا۔ پی ٹی وی ہی کی جانب سے ان کی ایک دستاویزی فلم ”گیم وارڈن“ کو کیش پرائز ملا۔ خواتین کے مسائل پر بننے والی ان کی دستاویزی فلم کو بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور یہ بھی ایک اعزاز ہے، اس فلم کا ترجمہ 18 زبانوں میں کیا جاچکا ہے۔ عبیداللہ بیگ جنہیں دوست احباب پیار سے ”ادبی“ کہا کرتے تھے، ایک مکمل ماہر ماحولیات اور فطری طور پر ماحول دوست انسان تھے۔ عالمی انجمن، آئی سی یو این میں وہ سینئر ترین عہدے دار تھے لیکن کمال یہ کہ مقابل پر اپنی علمیت ظاہر نہ کرتے اور اس خوبصورت طریقے سے پیش آتے کہ سامنے والا گرویدہ ہوجاتا۔ وہ بجا طور پر خود کو آخری مغل کہا کرتے تھے کہ بلاشبہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ انکسار، اخلاص اور محبت و شفقت کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ عشقِ حقیقی اپنے موضوع کے حوالے سے پرچے کی منفرد ترین تحریر ثابت ہوئی، پڑھ کر یہی خیال دماغ سے گزرا کہ الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے، اہلِ دل کے سینوں میں۔ دشمنِ عشق میں بیان کی گئی مرزا صاحباں کی داستان پنجاب کی عشقیہ لوک داستانوں میں ہیر رانجھے کے بعد دوسری داستان ہے کہ جو خاص و عام میں مقبول ہے۔ ذہانت سے بھرے کیپسول یعنی اقتباسات جو آپ نے صفحہ بہ صفحہ سجائے ہیں، ان کی تعریف نہ کرنا بے حد زیادتی ہوگی کہ ہمیں ہر بار یہ انتخاب کی داد دینے پر مجبور کردیتے ہیں۔ سچ بیانیوں پر اس بار عشق کی چھپر چھایا تھی، عنوانات نے خوب کنفیوز کیا کہ پہلے کے پڑھیں اور بعد میں کسے سو گھبرا کر الٹا شروع کیا اور تقدیسِ عشق سے معراجِ عشق، عشقِ نامکمل، پیاسا عشق، اصولِ عشق سے ہوتے ہوئے عشقِ ناتمام تک پہنچے، سبھی تحریریں موضوعاتی اور موقع کی مناسبت سے خوب تھیں، کچھ روایتی اور کچھ غیر روایتی بہرحال ہر سچ بیانی نے خیال کی کسی نہ کسی کھڑکی کا پٹ ضرور کھٹکھٹایا اور یہی انتخاب کی خوبی اور حسن ہے۔ پرچے کا آخری دیدار کرکے اسے جلد ساز کو دے آئے ہیں کہ مجلد کرواکے رکھیں گے، اس سے قبل بھی پُراسراریت نمبر کے دونوں شمارے جلد شدہ محفوظ ہیں۔“ (ایسے ہوتے ہیں عاشق اور محبت کرنے والے، اللہ آپ کو خوش رکھے)

☒ **محمد اسماعیل اجاگر** نے پنڈی گھیب سے لکھا ہے ”تقریباً ایک سال کے بعد سرگزشت کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ کی طرح خوش آمدید کہیں گے (دوبارہ تشریف آوری پر خوش آمدید) اور اب باتیں کچھ سرگزشت کی۔ اگست 2012ء کو بالآخر طویل انتظار کے بعد عشق ناکام نمبر آ ہی گیا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح پُرفکر۔ عشق اک لافانی جذبہ ہے، یہ عشق ہی تو تھا جو لاکھوں افراد نے اپنا خون بہایا، اس وطن کے لیے۔ اس وطن کی بنیاد عشق پر رکھی گئی۔ تبھی تو یہ مملکت ہزاروں مسائل کے باوجود قائم ہے اور وہ عشاق یعنی قائداعظم، علامہ اقبال، لیاقت علی خان، چودھری رحمت علی جب تک حیات رہے، اپنے عشق کی یعنی پاکستان کی حفاظت بڑی لگن سے کرتے رہے۔ اور جب سے اس عشق سے ماورا لوگوں کے ہاتھ یہ وطن آیا تو ارضِ وطن کے

لیے جان و مال کی قربانی دینے والوں کی روحیں تک کانپ اٹھیں۔ خدا کرے کہ ہمارے اندر وہ جذبۂ عشق پیدا ہو جائے جس کو دیکھ کر تاج برطانیہ نے محمد علی جناح کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ آج ہمارے اندر اسی عشق کی کمی ہے .... وارث شاہ کی یک صفحی سرگزشت بھی اچھی تھی۔ اک صفحے کے اندر پوری سرگزشت سمو دینا کوئی کوئی جانتا ہے۔ اس کے بعد وارد ہوئے، شہرِ خیال میں۔ اعجاز حسین سٹھار مسندِ صدارت پر افروز تھے۔ کافی جاندار تبصرہ رہا ان کا۔ خالد یوسفی صاحب مہدی حسن صاحب کے بارے میں آپ کے خیالات پڑھ کر بے اختیار دل سے آہ نکلی۔ مہوش رفیق صاحبہ، آج کے بچے نوجوانوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ جس دن سے والدین نے اپنے بچوں پر توجہ دینی چھوڑی ہے، اس وقت سے ہماری نئی نسل اپنی تہذیب سے دور جا رہی ہے۔ آپ نے بہت اہم پوائنٹ اٹھایا ہے پر سوال یہ ہے کہ آپ نے اس کے بعد سے اپنے بھانجے کی تربیت کے لیے کون سا قدم اٹھایا؟ کیا آپ نے ایسے منفی رجحان والے چینلز کو اپنے گھر کے ٹیلی وژن پر بلیک لسٹ کیا؟ نہیں، بالکل نہیں۔ پُرخطر عشق ہٹلر کی داستانِ عشق، پہلی دفعہ پتا چلا کہ ہٹلر نے بھی عشق کیا تھا۔ باقی تحریریں ابھی پڑھی نہیں جو کہ خاص الخاص ہی ہوں گی۔ کوئی ایسی بات جو آپ یا کسی کو بری لگی ہو تو دل سے معذرت خواہ ہوں۔"

☒ **رانا فیصل جاوید** کا علی پور مظفر گڑھ سے نامۂ خلوص "گزشتہ کئی سالوں سے میں سرگزشت کا قاری ہوں۔ خط لکھ کر شہرِ خیال میں شامل ہونے کی آرزو تو بہت پرانی تھی بس خط لکھنے کے لیے ہمت ہی نہ پیدا کر سکا۔ اس بار کاغذ اور قلم تھام ہی لیا۔ اس امید کے ساتھ کہ میرا خط لازماً محفل کا حصہ بنے گا (خوش آمدید) سب سے پہلے تو سرگزشت کے پورے اسٹاف کو عشق ناکام نمبر شائع کرنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ عشق ناکام نمبر پر تبصرہ کرنا کافی مشکل ہے۔ لیکن اپنی پسند اور ناپسند بیان کرنے میں کیا حرج ہے۔ انکل معراج رسول کا لکھا ہوا اداریہ پڑھ کر محسوس ہوا کہ میں بھی عشق کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ میں اپنے دوستوں کو اکثر یہ بات کہتا ہوں کہ مجھے عشق ہے تو اپنے وطن سے ہے، میں ہوا ہوں تو اپنے وطن کے لیے ہوا ہوں (اگر یہ جذبہ قوم میں بیدار ہو جائے تو پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے) ناکام عاشق پر پوری کہانی لکھی جانی چاہیے تھی۔ خیر ایک صفحے پر گزارہ کیا۔ مجذوب عشق اچھی تحریر تھی۔ اس کہانی میں عشق کم، ذہنی خرابی زیادہ نظر آئی۔ عشقِ رنگین آرٹ کے حوالے سے تو جاندار تحریر تھی البتہ عشق نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ ہو سکتا ہے کہ فدا حسین صاحب مادھوری پر فدا ہو گئے ہوں لیکن عشق اِک علیحدہ میدانِ خارزار ہے (آپ کے خیال میں کیا ایم ایف حسین نے مادھوری ڈکشٹ سے جو عشق کیا وہ کامیاب ہو گیا؟) عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی سوزِ عشق پڑھ کر دل پُرسوز ہو گیا جو درد خان صاحب کی آواز میں ہے، سن کر حقیقتاً دل میں ٹیسیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ عشق بے چین میں بھٹو صاحب کا تذکرہ بے چین کر گیا۔ سراب عشق پڑھ کر ثابت ہوا کہ شوبزنس میں شامل افراد کی محبتیں مفادات پر مبنی ہوتی ہیں جو سچی محبت شوبز میں ڈھونڈتا ہے، ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا ہے۔ فلمی الف لیلہ میں ننھا کی محبت کا مختصر سا تذکرہ کیا گیا جو اس اداکار کے ساتھ زیادتی ہے۔ عشق کم نصیب بھرپور اسٹوری تھی۔ عشقِ مسلسل میں لیڈی ڈیانا کی پاکستانی ڈاکٹر کے لیے محبت قابلِ ستائش تھی۔ افسوس مغرب کی گندی ذہنیت نے ان دونوں کو ملنے نہ دیا۔ دو عہد دو عشق نے بھی معلومات میں اضافہ کیا۔ عشق حقیقی اِک لاجواب داستانِ عشق ثابت ہوئی۔ حافظ کی پیاری کے لیے جنون کی حد تک چاہت نے متاثر کیا۔ عشقِ حقیقی کا لبادہ اوڑھنے کے لیے عشق مجازی میں غوطہ لگانا پڑتا ہے جیسے حافظ پیاری نے لگایا۔ دشمنِ عشق پنجابی لوک داستان، اس مرتبہ سب پر بازی لے گئی۔ صاحباں کی بے وفائی نے بڑا دکھ پہنچایا۔ عشق شش جہت نے یہ ثابت کیا کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جنونی ہونا پڑتا ہے تب جا کر منزلِ مقصود ملتی ہے۔ پُرخطر عشق میں ہٹلر کی داستانِ عشق پڑھنے کو ملی۔ سوچا بھی نہ تھا کہ ہٹلر جیسے ظالم و جابر شخص کا دل بھی کسی کی چاہت کے لیے دھڑکتا ہوگا۔ سراب میں اس مرتبہ کچھ تیزی آئی۔ اگر شہباز بھارت ... چلا جاتا تو اچھا ہوتا۔ جلاد صفت ہندوؤں کی پٹائی تو کرتا۔ سچ بیتیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ مجموعی طور پر عشق ناکام نمبر جاندار و شاندار ثابت ہوا۔ درخواست ہے کہ اس کا پارٹ ٹو بھی شائع کیا جائے کیونکہ ناکام عشق پر مبنی اور بہت سی داستانیں باقی ہیں جیسے شیریں فرہاد، سسی پنوں، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔"

☒ **خالد حسین چٹھہ** کا خلوص نامہ شاہ حبیب دھاری چھٹیاں سے "سرگزشت عرصۂ دراز سے زیرِ مطالعہ ہے، کبھی خط لکھنے کی کوشش یا جسارت نہیں کی کیونکہ عظیم الشان تحقیق اور پاکستان کے نمبر ایک ادبی تاریخی اور معلوماتی شمارے کا معیار و وقار اور تاب و تمکنت ہمیشہ مرعوب کیے رکھتی ہے، یہ آپ کی انتھک محنت اور جہدِ مسلسل کا نتیجہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس تیز ترین اور ترقی یافتہ دور میں بھی سرگزشت ہر گھر میں پڑھا جاتا ہے۔ اس بار عشق ناکام نمبر ملا تو دل کے نہاں خانوں میں پنہاں عشقِ سرگزشت نے اکسایا کہ شہرِ خیال میں شرکت کی جائے سو ہم چلے آئے۔ سرورق نہایت جاذبِ نظر اور دلکش ہے، آپ کا ابتدائیہ ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ وطنِ عزیز کے زوال و زبوں اور آلام و مصائب کا فکر انگیز احوال، ہر غیور مسلم اور غریب پاکستانی کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ گلشن کی خوبصورت شاخوں پر الو بٹھا دیے جائیں تو یہی ہوتا ہے، راہبر و منزل بینائی اور بصارت سے محروم ہوں تو بھی یہی ہوتا ہے۔ لوڈشیڈنگ مہنگائی، غربت، بے روزگاری، دہشت گردی اور لاقانونیت وطنِ عزیز کی پہچان بن کر رہ گئی ہے۔ جائیں تو کہاں جائیں؟ شہرِ خیال میں اعجاز حسین سٹھار، صدارت کے سنگھاسن پر براجمان نظر آئے۔ عبدالروف عدم عرصۂ طویل کے بعد دستیاب ہوئے، بہت خوشی ہوئی، رانا حبیب الرحمٰن کا بہترین تبصرہ اور مہوش رفیق وسدرہ بانو ناگوری کی باتیں، بصد شوق و اہتمام ملاحظہ کیں۔ ناکام عاشق میں وارث شاہ کو پڑھا جو کہ ناکامیِ عشق کے بعد امر ہوئے۔ نطشے کی رودادِ عشقِ ناکام نے بے حد متاثر و مغموم کیا۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، جن کا ناکام عشق عرصۂ طویل سے معما ہے، پڑھ کر تسلی ہوئی۔ مدھوبالا کے ناکام معاشقوں کا پُردرد قصہ، دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ پروین بوبی کی درد بھری داستانِ عشق ناکام، اسے تو زندگی بھر محبت اور پیار نہ مل سکا یہ بھی قسمت والوں کو ملتا ہے پیار کے بدلے پیار۔ مہیش بھٹ اور کبیر بیدی نے خود غرضی کی انتہا کر دی۔ مرزا صاحباں کی داستانِ لازوال نے بہت متاثر کیا۔ سراب میں فتح خان کا طوطی بول رہا ہے، شہلا کی کمینگی اور منافقت اور شہباز ملک کا خلوص، بالخصوص ایمن کے لیے بے لوث، اتنا کچھ کر گزرنے کا عزم، یہی مقصدِ انسانیت ہے۔ عشقِ ناتمام نے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ سلویا کا خوبصورت اور

مہذب کردار اور صبیح خان کی شرافت اور آبِ زم زم کی سی پاک، صاف اور شفاف محبت نے دل کو چھو لیا اور بالآخر انجام پہ رونا آیا۔ رونا تو لیڈی ڈیانا کے پُرحیرت انجام پر بھی آیا۔ ڈاکٹر حسنات روایات کی دیوار توڑ دیتا تو شاید...... ایک محبت پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی۔ ہٹلر جیسے سفاک شخص کا جذبۂ عشق انتہائی متاثر کن تجربہ رہا۔ نپولین بوناپارٹ کی داستانِ عشق بھی دلچسپ رہی۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

☒ **تفسیر عباس** کا مکتوب خاص اوکاڑہ سے "عشق ناکام نمبر نہایت کامیاب، دلکش اور منفرد شمارہ ثابت ہوا۔ ہاتھوں میں آیا تو قلبِ سوختہ کے سلگتے ہوئے بستر پر سوئی ہوئی ہمارے ناکام و نامراد عشق کی یادِ ناروا نے بے ساختہ یوں کروٹ بدلی کہ ضبط کا دامن تار تار ہو گیا، کاش ہم بھی اپنی رودادِ عشقِ نامراد رقم کر پاتے" "وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا۔ وہ عشق جس نے ہمارے قلبِ شکستہ کو پارہ پارہ کیا۔ روح کو تار تار اور پندارِ ہستی کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ محبت جس کے جسدِ خاکی کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کیا اور تہی دست و تہی داماں ہو کر بیٹھ گئے۔ استقبالیہ تحریر میں وطنِ عزیز کے عاشق صادق جناب معراج رسول کے فکر انگیز پر چار نے دعوتِ فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ ناکام عاشق میں ایک تاریخ ساز اور عظیم شاعر وارث شاہ سے متعلق پڑھ کر قلب و ذہن کو منور کیا۔ شہرِ خیال میں اسیرِ عشق اعجاز حسین سٹھار کا عشق نامہ، خامے کی چیز تھا۔ راولپنڈی سے عبدالروف عدم کی ڈائری اور شاعری سونے پہ سہاگا ثابت ہوئی۔ لیہ سے خالد محمود یوسفی نے لکھا اور یوں لکھا کہ حق ادا کر دیا۔ گوجرہ سے رانا حبیب الرحمٰن عشق کا کامیاب نمبر نکالنا ہو تو ناممکن کہاں ہے۔ ہمارا تو مشورہ ہے کہ عشقِ حقیقی نمبر نکالیں۔ ہم اپنی گزارش سرکار کے گوش گزار کرتے چلیں کہ اب عشقِ حقیقی نمبر نکالنا بھی لازم ہو گیا ہے، عشق کی بات چلے اور ان عشاقِ حق کا تذکرۂ خاص نہ ہو جنہوں نے دینِ اسلام کی ترویج و بقا اور فروغ و سربلندی کے لیے سر کٹا دیے اور اپنے لہو سے چراغِ عشق روشن کیے۔ ایک اور ہر دلعزیز اور بااخلاق شخصیت فوک سنگر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا احوالِ عشقِ ناکام، ان کے دل کا درد گلے کا سوز بن گیا اور ایسا سوز کہ جس نے برصغیر میں تین دہائی تک دلوں پر حکومت کی۔ عیسیٰ خیلوی کے مخصوص شعرا کا ذکر ہوا اور ان کے خاص اور بہترین شاعر افضل عاجز کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جن کے لکھے ہوئے ان گنت بہترین اور کامیاب گیت آج بھی زبان زدِ عام ہیں اور اتفاق سے افضل عاجز ہمارے بہت پیارے دوست بھی ہیں۔ مریم کے خان نے مادھوری ڈکشٹ اور معروف مصور ایم ایف حسین کی داستانِ عشق رقم کی۔ عشق یقیناً خلل ہے دماغ کا۔ منظر امام کی دلگداز رودادِ عشق۔ حضرتِ عشق کی کج ادائیاں، کرم فرمائیاں، مدھوبالا کے ناکام و مسلسل عشق گویا درست ہے کہ عشق میں ہر شے الٹی نظر آتی ہے اس پری پیکر کے غمناک انجام نے پلکوں کو نمناک کر دیا۔ فلمی الف لیلہ میں علی سفیان آفاقی کی دلچسپ یادوں کا سلسلہ، منور ظریف، بابرہ شریف، شمیم آرا اور ننھا کے ناکام عشق۔ پروین بوبی کی رودادِ پُرنم نے بہت متاثر کیا۔ مہیش بھٹ اور کبیر بیدی نے عشق تو خیر کیا، کیا ہاں البتہ وہ توہینِ عشق جیسے گناہِ کبیرہ کے مرتکب ضرور ہوئے۔ صائمہ اقبال کی عشق کم نصیب "میری" کے عشقِ ناکام کا دلخراش قصہ۔ ابراہام لنکن، اوراقِ تاریخ میں ایک پُراسرار اور بھید بھری شخصیت جو کہ ہنوز ایک معما ہے۔ زین مہدی کی اثر انگیز تحریر عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا دلچسپ ایمان افروز مگر پُرخطر سفر۔ گیلانی صاحب کی تاریخی تحقیق، دشمنِ عشق مرزا صاحباں کے عشقِ لازوال کا دل فگار قصہ۔ عشق شش جہت میں عشقِ ناکام کے رہینِ منت چند لوگوں کی کامیابیوں اور بالخصوص ہیری پوٹر جیسی تخلیق۔ کول گیٹ اور نوکیا جیسی ایجادات نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ عشق جذبۂ جنون ہے اور جذبہ جنون ہو تو کامیابی جزو لازم ہے۔ پُرخطر عشق میں ہٹلر جیسا بدنامِ زمانہ اور سفاک جرنیل، کس قدر نرم و نازک مزاج نظر آیا۔ شکستِ عشق نپولین بوناپارٹ کے عاشق ناکام کا پُراثر قصہ۔ حسنات خان اور لیڈی ڈیانا کے پُرفسوں عشق کا ماجرا، عقل ہوتی ہے پابندِ روایاتِ زمانہ جبکہ حضرت عشق ان روایات سے اور حدود و قیود سے قطعی بے نیاز ہوتا ہے۔ اس عشق کے انجام پر بھی رونا آیا لیکن عشق عاشق کو راہِ وفا سے گمراہ نہیں کرتا۔ عشق تو آدابِ زیست اور تہذیب کے انداز سکھاتا ہے۔ پہلی سچ بیانی عشقِ ناتمام، محبت کے لطیف و حساس اور مقدس جذبوں میں گندھی ناقابلِ فراموش رودادِ عشقِ ناکام، دل درد سے بھر گیا۔ والدین کے فیصلے یقیناً اولاد کی بھلائی کے لیے اور قابلِ صد احترام ہوتے ہیں لیکن اپنی ناجائز مرضیاں اولاد پر مسلط کر دینا، دانش مندی نہیں ہے۔ سلویا اور فصیح خان کا عشق فرسودہ روایات اور ناقص نظریات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ خواہشِ قرب میں سلگتے ہوئے دو دل کس طرح کرب کون و مکاں سے گزرے یہ اندازہ تو اہلِ دل ہی کر سکتا ہے۔ خاص نمبر کی وجہ سے تبصرہ طویل ہو گیا جس کے لیے معذرت، امید واثق ہے کہ ہماری محنت اور محبت رائگاں نہ ہوگی۔"

☒ نامعلوم مقام سے **عزیز اللہ** کا خط، وہ کہنا کیا چاہتے ہیں، سمجھ میں نہیں آیا۔ "زندگی اتنی سستی اور آسان تو نہیں، رمضان کے اس بابرکت مہینے میں عشق ناکام نمبر۔ لمبے انتظار کے بعد آیا۔ سرگزشت بدنامِ زمانہ فلمی اداکاراؤں کی جن کی ہر رات سہاگ رات، شراب ان کی مجبوری، مردان کی کمزوری۔ مدھوبالا، مجبوریوں کی داستان۔ پروین بوبی، بیکسی بلی وسکی کی بوتل۔ عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی، شادی کی بیماری میں مبتلا۔ فلمی الف لیلہ، علی سفیان آفاقی جو ڈوبی کشتی کے ملاح ہیں۔ ایم ایف حسین، بڈھا گھوڑا لال لگام۔ ہٹلر کی شادی بربادی۔ شہزادی ڈیانا، گھر کی نہ گھاٹ کی۔ تکلف معاف، شوبزنس کے فنکاروں، گلوکاروں کو ہم نے لاکھوں مرتبہ پڑھا ہے، اب تو ان کی شکل دیکھ کر الرجی ہوتی ہے۔ سچ بیانیوں میں صرف اور صرف معراجِ عشق، لاکھوں میں ایک ہے۔ تھامس ایڈیسن کی تصویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ۔ ٹائٹل، بیک ٹائٹل زبردست (آپ نے بیک ٹائٹل کہاں دیکھ لیا) شہرِ خیال میں خالد یوسفی عالیشان تبصرے، مسحور کن پوش والی بھگوان شکاری دل سے اترتی نہیں۔ اسی طرح کہانی گوہر جان بھی۔ ملتان سے ایڈوکیٹ قرۃ العین بھی اب نظر نہیں آ رہیں۔"

☒ **ظہیر احمد تبسم**، ناظم آباد، کراچی سے "خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ عشقِ ناکام نمبر آخرکار آ ہی گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ شمارہ کچھ آگے یا پیچھے کر دیا جاتا۔ شمارہ 27 تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ ٹائٹل پر جب سوزِ عشق عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کا نام پڑھا تو دل خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ کیونکہ

خان صاحب کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا کیونکہ یہ میڈیا سے واقعی دور بھاگتے ہیں۔ یہ جان کر اور بھی دکھ ہوا کہ ان کو خاندان سے الگ کر دیا گیا اور محبت بھی نہ ملی۔ عطا اللہ خان میرے شروع سے فیورٹ سنگر ہیں۔ اب آگے چلتا ہوں۔ سراب بہت زبردست جارہی ہے۔ کاشف زبیر صاحب کیا بات ہے آپ کی۔ اس بار سراب کی قسط کچھ نئے انداز کے ساتھ تھی۔ باقی شمارہ تو ابھی میں نے پڑھا نہیں کیونکہ رمضان کریم میں مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ وقت نہیں ہوتا۔ ویسے امید ہے کہ باقی تمام کہانیاں زبردست ہوں گی۔ جناب عالی، برائے مہربانی یہ خط تو ضرور شائع کیجیے گا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے کہ شائع کریں یا نہ کریں کیونکہ شہرِ خیال میں سب پرانے لکھاری اور قاری ہوتے ہیں اور نئے لوگوں کا نام ونشان نہیں ہوتا، اب اجازت چاہوں گا۔" (ہماری کوشش ہوتی ہے کہ نئے لوگوں کو بھی سینئر لوگوں جیسی توقیر ملے، یہاں نئے پرانے کی کوئی قید نہیں۔ قابلیت کی اہمیت ہے)

☒ **معراج الدین بن یحییٰ** کا محبت وخلوص بھرا خط، پارہوتی مردان سے "شمارہ چونکہ حسبِ معمول لیٹ ملا اس لیے صرف کچھ ہی حصہ پڑھا ہے۔ سراب بہت اچھی جارہی ہے لیکن بہت ست رفتاری سے۔ مصنف سے ہماری درخواست ہے کہ اس کے ٹیمپو کو تھوڑا تیز کیجیے۔ دوسری کہانی تقدیسِ عشق ہمیں بے انتہا پسند آئی۔ واقعی ایسی کہانیاں سرگزشت ہی کا خاصہ ہے۔ تقدیسِ عشق ہمارے پٹھانوں کے متعلق تھی اور بہت اچھی تھی اور مصنفہ کے اندازِ بیاں نے اسے چار چاند لگا دیے تھے۔ سب کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ مہوش باجی کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ان کو ہمارا سلام۔ طاہرہ باجی کو بھی سلام۔ آخر میں سب کو ہماری طرف سے رمضان کی خوشیاں مبارک اور ایڈوانس عید مبارک، خصوصی طور پر انکل شمر عباس کو۔"

☒ **سدرہ بانو** کا خط، شیر شاہ کراچی سے "ناکام عاشقوں کے ناکام فسانوں سے سجا شمارہ عشق ناکام نمبر ہاتھوں میں ہے۔ ایک منفرد اور خاص شمارہ جو تمام خاص نمبرز پر بازی لے گیا۔ موضوع کے حوالے سے انکل اداریے میں وطن سے عشق کا اظہار کرتے نظر آئے مگر آخر میں وہ تھوڑا دکھی ہو گئے۔ عشقِ رنگین میں ایف ایم حسین کا مادھوری سے عشق حیران کر گیا۔ عشقِ بے چین میں مدھو بالا کی بے چینی سمجھ میں نہ آسکی۔ لاکھوں دلوں پر راج کرنے والی حسینہ اپنی زندگی میں کس کرب سے دوچار تھی، یہ تحریر پڑھنے سے پہلے ہمیں اندازہ نہ تھا۔ عشقِ مسلسل پڑھ کر حیرت ہوئی کہ لیڈی ڈیانا کہ جس کے پاس شہرت اور دولت کی کمی نہ تھی، وہ بھی اپنے عشق کو پانے میں ناکام رہی۔ عشق شش جہت میں عافیہ فاروقی مختلف ناکام عاشقوں کے احوال بیان کرتی نظر آئیں۔ ایسے عاشقوں کے جو اپنے عاشق کو پانے میں ناکام رہے مگر آج وہ اپنے ناکام عشق کی وجہ سے ہی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ فلمی الف لیلہ میں حسبِ توقع انکل آفاقی عشق ناکام نمبر کے حوالے سے فلمی دنیا کے روشن ستاروں کے ناکام عشق لے کر آئے۔ یہ حافظے کی حد ہے کہ وقتاً فوقتاً موقع کے لحاظ سے قصے واقعات ماضی کے ذخیرے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر لے آتے ہیں۔ سلام ہے آفاقی انکل کی ہمت کو۔ عشق ناکام نمبر کے تمام ناکام عاشق اس شعر کی تصویر بنے نظر آئے۔ "وہ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی۔ دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں۔" 19 جولائی کے ایکسپریس اخبار میں جناب عامر خاکوانی نے مصنف کاشف زبیر کے حالات زندگی لکھے ہیں، پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ 11 سال میں کاشف معذوری کا شکار ہوا لیکن آفرین ہے اس پر کہ اس نے ہمت نہیں ہاری اور جسم کے مفلوج ہو جانے کے بعد اپنی ذہنی قوتوں کو کام میں لا کر دنیائے رنگ و بو میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ مگر یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ ان کے کرداروں میں اخلاقی اقدار بہت زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کے ہیرو بے راہ رو نہیں ہوتے۔ پہلی سچ بیانی عشقِ ناتمام ایک زبردست کہانی تھی۔ یہ کہانی سپر ہٹ تھی۔ اماں بی سے اتفاق کرتی ہوں کہ سلویا سے ہونے والی اولاد معاشرے میں مذاق بن جاتی۔ اماں بی نے بہت دور کی سوچی تھی، اصولِ عشق شاہینہ صاحبہ کی تحریر شروع سے آخر تک ذہنی الجھنوں کا شکار رہی، پڑھ کر کوئی مقصد نہ جان سکے۔ معراجِ عشق میں ارشد علی نے عشقِ مجازی سے عشقِ الٰہی کا سفر بیان کیا، نہ جانے فرہاد نے کیا نیکی کی تھی کہ عشقِ مجازی سے ہوتا ہوا وہ عشقِ الٰہی کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ پُرخطر عشق میں پتھر کے عشق کا تذکرہ ہوا۔ ایوا کے اس جملے نے دل کو چھو لیا کہ ایک عورت کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے نام سے پہچانی جائے، اس خصوصی شمارے کو پڑھنے کے بعد ہم بھی کسی انجانے شاعر کے جانے پہچانے شعر سے متفق ہو ہی گئے کہ یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجیے، اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔"

☒ **سعید احمد چاند** کا مکتوب محتر کراچی سے "پرچہ حسبِ معمول لیٹ ملا اس لیے شہرِ خیال میں حصہ بھی تاخیر سے لے رہا ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میرے خط کو شاملِ اشاعت کرتے ہیں یا نہیں؟ (حیرت ہے کہ کراچی میں پرچہ دن پہلے آجاتا ہے پھر بھی آپ کو لیٹ ملا؟ شاید آپ پرانی تاریخوں کو ذہن میں رکھے ہوئے ہیں۔ اب سرگزشت کی تاریخ ایک ہفتہ آگے بڑھا دی گئی ہے) معراج رسول صاحب کا اداریہ موجودہ حالات کے مطابق تھا جنہوں نے اس ملک کی تشکیل میں حصہ لیا، وہ اس جہاں سے سدھار چکے رہی ان کی اولاد تو اس نے اس ملک کو سنوارنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اپنی روزی روٹی کے چکر میں ایسے پڑے کہ انہیں اس ملک کی بھلائی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ یک صفحی سرگزشت میں ناکام عاشق پڑھی۔ ان کی شہرۂ آفاق "ہیر رانجھا" پڑھی تھی کافی عرصہ پہلے اور اس کے بعد اس موضوع پر فلمیں بھی دیکھیں۔ خورشید انور کی فلم میں اعجاز اور فردوس نے ہیر رانجھا کا کردار کیا تھا۔ فلم دیکھ کر لگتا ہے ہیر رانجھا پھر سے زمین پر اتر آئے ہیں۔ عبدالرؤف عدم کی واپسی کا ہم کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں۔ غلام حسین نوناری صاحب، مایوسی کفر ہے، اس ظلم اور کرپشن کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی خمینی کو بھیج دے گا۔ بھائی رانا محمد سجاد، شکریہ آپ نے اللہ سے میری خیر وعافیت کی دعا مانگی، شکریہ۔ میں تو دن رات پاکستان کے ہر فرد کے لیے دعائے خیر ہی مانگتا رہتا ہوں اللہ تعالیٰ سے۔ طویل مگر دلچسپ تبصروں میں اعجاز حسین سٹھار، عامر ساحل، خالد یوسفی، ایم

اے خالق بھٹی، غلام یٰسین نوناری، سدرہ بانو ناگوری، رانا حبیب الرحمٰن، منظر علی خان، رانا محمد شاہد، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، مہوش رفیق۔ مختصر تبصروں میں مدیحہ خان، ماریہ خان، عافیت خان خٹک۔ اس دفعہ ڈاکٹر روبی پھر غیر حاضر تھیں۔ اللہ کرے وہ خیریت سے ہوں۔ ڈاکٹر ساجد کی کاوش اچھی تھی مگر یہ کتنے قارئین کے پلے پڑی ہوگی۔ ساجد امجد صاحب، مجذوبِ عشق کی جگہ رومیو جولیٹ یا سیمسن ڈیلائلہ پر لکھتے تو کوئی بات تھی۔ عشقِ رنگین پسند آئی۔ مریم کے خان صاحبہ کسی پر دل آجانے سے عمر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تنویر ریاض صاحب، آپ نے سوزِ عشق میں کچھ مبالغے سے زیادہ ہی لکھ گئے۔ منظر امام صاحب عشقِ بے چین میں مدھو بالا کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالی ہے جو تشنہ ہے۔ نسرین منصور صاحبہ سرابِ عشق اچھی عبرت انگیز ہے۔ صائمہ اقبال کی عشق کم نصیب میں ابراہم لنکن کو پڑھا۔ ابن کبیر کی شکستِ عشق، آصف ملک کی عشقِ مسلسل۔ زین مہدی کی عشقِ حقیقی، بے جان کہانیاں تھیں۔ اس دفعہ سرِفہرست رہی مرزا صاحباں، دشمنِ عشق۔ اس داستان پر ملکۂ ترنم نور جہاں اور ترلوک کپور کی مرزا صاحباں بنی 1947ء میں۔ میری طرف سے ذوالفقار ارشد گیلانی کو مبارک باد، باقی زیرِ مطالعہ ہے۔"

☒ **حکیم سید محمد رضا شاہ**، نورنگہ، میانوالی سے لکھتے ہیں "عشق ناکام نمبر کافی انتظار کے بعد ملا۔ وارث علی شاہ کے مختصر نامے میں اس کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ شہرِ خیال میں اعجاز حسین سٹھار صدر محفل کا محبت نامہ پڑھا۔ مفصل اور پُر مغز مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ ایم اے خالق بھٹی، سدرہ بانو ناگوری، رانا حبیب الرحمٰن، منظر علی خان، رانا محمد شاہد، ملک جاوید خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، مہوش رفیق کے محبت نامے پڑھے۔ محفل کے ذریعے خطوط میں ان دوستوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی مجذوبِ عشق میں فریڈرک نطشے کے حالاتِ زندگی پڑھے اور سلومی سے اس کی جذباتی وابستگی سے آگاہی ہوئی۔ سچ ہے عشق اچھے بھلوں کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔ عشق میں دل لگی کرنی چاہیے مگر دل کی لگی نہ بنالیں۔ انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ مریم کے خان کے عشقِ رنگین میں فدا حسین کے حالاتِ زندگی اور اداکارہ مادھوری میں دلچسپی سے آگاہی ہوئی۔ ثابت ہوا ہے کہ عشق کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ بڑھاپے میں یہ روگ فدا حسین کو لگا۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق افسر ماتحت، استاد شاگرد، ڈاکٹر مریض یا مریضہ میں اکٹھے رہنے سے ایک خاص تعلق پیدا ہو جاتا ہے جس کو دیکھنے والے ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ تعلق یا محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہوتا ہے جس کو کوئی معانی پہنائے نہیں جاسکتے۔ ہمارے عبیداللہ بیگ، آخری مغل کے مختصر حالاتِ زندگی پڑھے۔ سوزِ عشق میں تنویر ریاض نے عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے حالاتِ زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ سچ ہے، خان صاحب کے گلے میں درد کا ایک پُرسوز جہاں آباد ہے۔ ہمارے علاقے کے ہیں۔ اور خان صاحب میانوالی کی پہچان ہیں۔ ان کے متعلق بے سروپا باتیں پھیلانے والے قابلِ مذمت ہیں۔ عشقِ بے چین میں نامور اداکارہ مدھو بالا جن کی ذاتی زندگی مصائب سے عبارت ہے، قارئین کے لیے سبق آموز ہے۔ سرابِ عشق میں ماضی کی اداکارہ پروین بوبی کے حالاتِ زندگی رقم ہیں۔ ...... ان کے حالات اور خاص کر آخری عمر میں نروس بریک ڈاؤن ہونے کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ عشق کم نصیب میں صائمہ اقبال نے خاتونِ اول میری ٹوڈ کی زندگی کو اجاگر کیا ہے۔ ابراہم لنکن کے ساتھ شادی کے بعد بھی اس کی زندگی میں تشنگی برقرار رہی۔ شکستِ عشق میں ابن کبیر نے جوزفین اور عظیم نپولین بونا پارٹ کی عشق کی داستان کو رقم کیا ہے اور عمدہ پیرائے میں ان کے حالاتِ زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے۔ عشقِ مسلسل میں آصف ملک نے پاکستانی ڈاکٹر حسنات احمد اور برطانوی شہزادی ڈیانا کے عشق کو تحریر میں لاتے ہوئے ایک دردناک انجامِ عشق سے باخبر کیا ہے۔ عشقِ حقیقی میں زین مہدی نے حافظ عبدالکریم کے عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف گامزن حالات کو ضابطۂ تحریر میں لاتے ہوئے زندگی کا نیا رخ دکھلایا ہے۔ حاجی وارث علی کی کوششوں سے حافظ عبدالکریم ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے۔ دشمنِ عشق میں مرزا صاحباں کے واقعات پڑھے۔ اس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ عشق ناکام نمبر ایک مکمل معلوماتی جریدہ ہے۔ اس کو پڑھ کر ماہِ رمضان اچھا گزر رہا ہے۔ آپ سب کو ایسا ماہنامہ شائع کرنے پر مبارک باد۔"

☒ **احمد خان توحیدی**، کراچی سے رقم طراز ہیں "کاش تھری پیس سوٹ والے عیاش حکمران، معراج رسول جیسے سرپھرے عاشق کی طرح پاک سرزمین کے عشق میں مخلص ہوتے تو ہم دنیا کی سب سے بڑی دولت مند قوم ہوتے۔ بابرکت مبارک شب میں ملنے والی عظیم مملکت کا یہ حال، اُف ہائے۔ ناکام عاشق ہیر رانجھا کی داستان بچپن سے زبان پر...... محفلِ شہرِ خیال میں غوطہ لگایا۔ اعجاز حسین سٹھار کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ سب کے طویل تبصرے گڈ، میرا نام ونشان ردی کی ٹوکری۔ عبدالرؤف عدم، علاقہ سواں پنڈی والے نہ پہچانیں، ناممکن۔ خالد یوسفی، لیہ حسرت کہ سرگزشت کا توڑ مدِ مقابل آئے، یوسفی کی جگہ یوسف مونث تو نہیں ہے۔ مہدی حسن اور معین اختر جیسے عظیم فنکار، اُف ہائے کہاں سے لائیں۔ ایم اے خالق بھٹی، واقعی کون زبردست سرگزشت، سرگزشت ہے۔ یاسین نوناری، تبصرہ گڈ۔ کرپشن ولوٹ مار کہاں؟ حلال تبرک سوئس بینک میں محفوظ ہے۔ توہینِ عدالت کا بل، باوجود رمضان شریف۔ یکم کو جولائی پے نہ ملنے پر جلاؤ گھیراؤ، ہمیں تا حال جون کی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ آفاقی انکل سے شکوہ بجا کہ بادام مہنگے کتنا حفظ کریں۔ مدیحہ خان وماریہ خان، خالہ بننے پر مبارک باد۔ رانا حبیب الرحمٰن، رانا شاہد۔ قدرتی وسائل سے مالا مال۔ خاندانی لٹیروں نے، زراعت، صنعت وتوانائی اپنے ازلی دشمن سے بھی کچھ نہ سیکھا۔ مہوش رفیق، منظر علی، تبصرے اچھے۔ ناکام عشق وجہ جاننے کے لیے مجذوبِ عشق کو للکارا۔ اختصار سے مسلمان عشق کے ماروں سے التجا ہے کہ اسلام میں مایوسی گناہ ہے۔ شادی سنت نبویؐ ہے۔ شادی ضرور کریں۔ عشقِ رنگین، مریم کے خان۔ مقبول فدا حسین جیسے لوگوں کی کب اور کہاں قدر کی گئی۔ سوزِ عشق، تنویر ریاض عطا اللہ عیسیٰ خیلوی خوب پڑھا سنا اب بھی سنتے ہیں۔ پانچ شادیوں کا علم نہ تھا۔ عشقِ بے چین، واہ منظر واہ بھٹو جیسی اسیر کرنے والی طلسماتی شخصیت کا مدھو بالا سے عشق تو پھر دنیا میں مدھو بالا سے بڑھ کر کون خوبصورت ہوگا۔ بالکل لاعلم تھے۔ سرابِ عشق، پروین بوبی کا تذکرہ آفاقی صاحب

بھی کر چکے ہیں۔ فلمی الف لیلہ، میڈم نور جہاں کی خوبصورت شخصیت، خوب دیکھا، پڑھا سنا اب بھی سنتے ہیں۔ حالاتِ زندگی سے باخبر کرنے پر شکریہ۔ رفیع خاور ننھا ایسا کامیڈی فنکار آج تک نہ دیکھا۔ الف نون کی ویڈیو میرے پاس ہے۔ خوب مزاحیہ پروگرام تھا بلاوجہ ختم کردیا گیا۔ ان کہی، عام پروگرام شروع کیا گیا تھا جو الف نون کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔ عشقِ ناتمام، اختتام سے قبل سلویا کو گورا چٹا ہی سمجھتے رہے۔ صبیح کی ماں کا مختلف رنگ روپ نسل پر اثر شاید سلویا کا رنگ کالا ہو۔ اصولِ عشق، سجاد کا شاہینہ پر شک غلط تھا۔ عشق کی انتہا، دردانہ اور فرزانہ، تیزاب سے ہاتھ چہرہ جلانا غلط حماقت ہے۔ یقیناً دونوں نے خودکشی کی۔ پیاسا عشق، فرحانہ اچھی لڑکی تھی، نیک و اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ احمد رضا کو شادی کرنی چاہیے۔ عشقِ نامکمل، نیلی مشرقی شریفانہ طرز، ویری گڈ۔ معراجِ عشق، فرہاد مرد ہے یا خواجہ سرا؟ نیک کام اللہ جس کو چاہے ہدایت فرمائیں۔ تقدیسِ عشق، بنیادی طور پر اکبر نیک خصلت انسان۔ شاہینہ نے بہتر طریقے سے اکبر کو راہِ راست دکھا کر اظہر سے شادی اچھی بات کی۔ مجموعی طور پر ناکام عشق نمبر واقعی لاجواب ہے۔ سنبھال کر رکھنے والا شمارہ ہے۔ شکریہ اچھی کہانیاں فراہم کرنے کا۔"

☒ **ابن مقبول جاوید احمد صدیقی** کا راولپنڈی سے خلوص نامہ "اس دفعہ عشق ناکام نمبر پڑھ کر رہا نہ گیا اور حاضر ہوگیا۔ انتہائی محبت اور انتھک محنت کا نتیجہ انتہائی اچھا نکلا کہ ہر عشق پڑھ کر عش عش کر اٹھے اور لکھنے والوں نے بھی تو کمال کردیا ہے۔ اس مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے دور میں یہ یقیناً ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ ہر عشق کا واقعہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے اور ہاں، چند ایک سے تو معلومات بھی بھرپور ہوئیں اور جو صرف سن رکھا تھا، وہ کنفرم پوری تفصیلات کے ساتھ ہوا۔ جیسا کہ ڈاکٹر حسنات اور ڈیانا کا عشق۔ مگر عشقِ حقیقی تو دل کے اندر گھستا چلا گیا اور رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سبحان اللہ۔ اگر ہر عشق کی کہانی پر تبصرہ کرنا شروع کیا تو دفتر کے دفتر بھردوں گا۔ ہر ایک نگینہ اور پھر شمارہ یقیناً دستاویز کے طور پر یادگار کے طور پر اور منفرد شمارے کے طور پر محفوظ رکھنا ہوگا اور یہ سات سچ بیانیاں بھی ہیرے ہی آپ چن کر لائے ہیں۔ تقدیسِ عشق ہو، عشقِ ناتمام ہو، عشقِ نامکمل ہو یا معراجِ عشق ہو، اصول و پیاسا عشق، سب عشق کی انتہا ہی ہیں۔ میری طرف سے ان کے بیان کرنے والوں کو سلام۔ شہرِ خیال میں چند پرانے ہمسفر بھی نظر آئے۔ اعجاز حسین سٹھار نے صدارت سنبھالی۔ خوب تبصرہ تھا۔ ایم اے خالق، سعید احمد چاند، سدرہ بانو ناگوری، رانا محمد شاہد اور رانا محمد سجاد کو سلام اور دعائیں۔ باقی سب نے بھرپور معلومات اور تبصرہ دیا۔ مہوش رفیق نے نہایت گمبھیر اور معاشرے کی جڑیں کاٹنے کے سبب بننے والی خرابی کو اجاگر کرکے بہترین مشورہ دیا ہے اور تمام ایسے کم سن بچوں کے والدین کے لیے لمحۂ فکریہ بھی۔"

☒ **رانا محمد شاہد** کی خیال آفرینی، بورے والا سے "عشق ناکام نمبر موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر عشق ناکام نمبر 2 بھی آنا چاہیے۔ اصل میں عشق میں زیادہ تر کو ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا اور جن لوگوں کا عشق کامیاب ہوا، وہ گوشۂ گمنامی میں چلے گئے یا ان کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی یا وہ عشق میاں بیوی میں ڈھل گیا گویا کہ عشق تو نام ہے مر مر کے جیے جانے کا یعنی اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں پنجاب کے معروف صوفی شاعر وارث شاہ کو موضوع بنایا گیا۔ وارث شاہ کے کلام میں پنجابی زبان اپنی پوری تابنا کی، وسعت، لچک اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد معروف مغربی فلسفی فریڈرک نطشے کے عشق کی سیر حاصل داستان بیان کررہے تھے۔ واہ...... ایف ایم حسین مادھوری سے عشق فرمارہے تھے۔ واقعی، ایک مصور کا عشق بھی اس کے کام کی طرح الگ ہی تھا۔ عشق کی بھی کتنی اور کیسی اقسام ہیں۔ مادھوری کی شاہکار تصاویر صرف اپنے لیے تخلیق کیں کہ لاکھوں روپے ملنے کے باوجود کہہ دیا کہ یہ میں نے اپنے لیے بنائی ہیں۔ عبیداللہ بیگ پر ایک صفحے کے بجائے مکمل مضمون ہونا چاہیے تھا کیونکہ علم وادب کے لیے ان کی خدمات بے مثال ہیں۔ کہیں عشق ایک مصور سے شاہکار تصویریں بنواتا ہے تو کہیں عشق کا درد اس کی آواز میں سوز پیدا کردیتا ہے۔ جی ہاں، عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی کے ناکام عشق نے آج انہیں دنیا بھر میں اپنی درد بھری آواز کی بدولت ایک پہچان عطا کی ہے۔ 18 جولائی کو بالی ووڈ فلم انڈسٹری کے پہلے سپر اسٹار راجیش کھنہ چل بسے۔ انہوں نے 163 سے زائد فلموں میں کام کیا جن میں سے 16 مسلسل ہٹ فلمیں دیں۔ ہمارے لیے دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بالی ووڈ کا یہ سپر اسٹار ہمارے شہر بورے والا میں پیدا ہوا۔ جس اسکول سے ہم نے میٹرک کیا، اسی اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر راجیش کھنہ کے والد لالہ ہیرانند کھنہ تھے جو مارچ 1947ء کو ریٹائر ہوگئے اور پھر قیامِ پاکستان کے بعد اپنی فیملی کو لے کر امرتسر چلے گئے۔ ایک تجویز ہے کہ اگر ممکن ہو تو راجیش کھنہ کی زندگی پر کوئی مضمون دیں۔ ستر کی دہائی کی ٹاپ ہیروئن پروین بوبی کی داستانِ عشق بھی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ ابراہم لنکن کی بیوی میری ٹوڈ کا اپنے شوہر سے عشق بھی بہت سی دلچسپیاں لیے ہوئے تھا۔ عظیم فاتح نپولین بوناپارٹ نے بھی عشق کے محاذ پر شکست کھائی۔ یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت کے محاذ پر بڑے بڑے فاتح ہمت ہار دیتے ہیں۔ واہ تاریخی عشق کے بھی کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ ایک طرف ابراہام لنکن کی بیوی نے عشق کی انتہا کردی تو دوسری طرف نپولین بوناپارٹ نے اپنی محبوبہ کے لیے اپنی جان دے دی۔ اتنے اچھے اندازِ بیاں پر صائمہ اقبال اور ابن کبیر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آصف ملک نے اپنے وقت کے ایک عشق کو فوکس کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جن دنوں لیڈی ڈیانا پاکستان آرہی تھیں، ڈاکٹر حسنات کے گھر جانا اور ملاقاتیں...... اس ناکام عشق کو بھی میڈیا کی خصوصی توجہ ملی تھی۔ ویسے اس کے ساتھ ساتھ لیڈی ڈیانا کے ایک اور ناکام عشق مصر کے دودی الفائد جو کار حادثے میں شہزادی کے ساتھ ہی دنیا چھوڑ گئے تھے۔ پر بھی مضمون ہونا چاہیے تھا۔ سبحان اللہ، عشق کی سب سے سچی اور کھری قسم عشقِ حقیقی ہی ہے، لافانی عشق۔ ایک بزرگ کے عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کے سفر کو زین مہدی نے بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا۔ میں بھی حیران تھا کہ عشق کی روایتی کہانیوں پر کچھ نظر نہیں آرہا۔ اس کی کمی جناب ذوالفقار ارشد گیلانی نے پوری کردی۔ مرزا صاحباں کے عشق کی کہانی پر خوب تحقیق و عرق ریزی سے کام لیا گیا۔ عشق کی یہ روایتی داستانیں ہی ہمارے ہاں

مقبول ہیں۔ سچ بیانیاں ابھی پڑھنی ہیں۔"

☒ آخری لمحے میں موصول **اعجاز حسین سٹھار** کا خط، نور پور تھل سے "ادارہ کی طرف سے کتنے اہتمام سے خریداری کا اشتہار شائع کیا جاتا ہے لیکن خریداری لینے والوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اس ماہ لیٹ ہونے کی حد ہوگئی، پرچا 6 تاریخ کو موصول ہوا۔ ثمر عباس سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ریل گاڑیاں لیٹ ہونے کی وجہ سے ایسا ہورہا ہے۔ اب کس افراتفری میں پڑھا ہے اور تبصرہ لکھا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی کی سوزِ عشق سب سے پہلے پڑھی ہے کیونکہ میانوالی ہمارا پڑوسی ضلع ہے اس لیے انس ہونا فطری بات ہے۔ اس میں بھلا کیا شک ہے کہ انہوں نے کیسٹ کے ذریعے خود کو منوایا ہے۔ دیہاتوں میں لوگ آج بھی پورے شوق سے سنتے ہیں۔ میں نے انہیں دوبار محفل میں گاتے سنا ہے۔ سونا خان بے وس جنہیں عطاءاللہ نے ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا، کے بیٹے شہباز راں کی شادی پر دے والا ضلع بھکر میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے علاقے میں پہاڑ کے دامن میں ایک گاؤں "چوہا" ہے، وہاں کی ایک فیملی فرانس میں رہتی ہے، ان کی محبت کا اندازہ لگایئے کہ وہ ایک شادی پر عطاءاللہ کو ہیلی کاپٹر پر لائے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوئے، یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ وہ دولہا کے لیے اسپیشل راولپنڈی سے بگھی لائے تھے، کئی باتیں ہیں لیکن بات طویل ہوجائے گی۔ شاعروں میں افضل عاجز کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ مظہر نیازی کے کلام کی پختگی سے انکار نہیں لیکن وہ جوان شاعر ہیں اس کے علاوہ آڈھا خان کے دوہڑے بھی گائے ہیں اور سننے والوں سے دادِ وصول کی اور آڈھا خان بھی ہر محفل کی پہچان بنے۔ عشقِ بے چین اور سرابِ عشق میں ناکامیِ عشق والی کوئی بات نہیں، یہ بے حیائی کے قصے ہیں۔ فلمی الف لیلہ کی قسط زبردست ہے، ہم دیہاتی لوگوں کے لیے تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ گھر میں بیٹھے فلموں، اداکاروں اور ان کی خفیہ محبت کا چسکا مل جاتا ہے تو خود کو ماضی میں پاکر جوان محسوس کرتے ہیں، اس بار تصویریں تاریخی نوعیت کی اور مزے دار تھیں۔ عشقِ مسلسل میں لیڈی ڈیانا کے بارے میں پڑھا لیکن معلومات میں خاصا اضافہ نہ ہوا، یہ سب اخباری میگزین کی زینت بن چکا ہے، نئی بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر حسنات احمد، عمران خان کے رشتے میں کزن ہیں، باقی سارا کچھ باسی ہے۔ عشقِ ناتمام پڑھتے ہوئے میں پچاس سال پیچھے چلا گیا۔ کتنا صاف ستھرا زمانہ تھا۔ دوستی اور تعلقات کی بنیاد خلوص ہوا کرتا تھا۔ رشتہ جوڑتے ہوئے کوئی دنیاوی لالچ ذہن میں نہ آتا تھا۔ صنفِ مخالف سے تنہائی کی ملاقات میں سوچ میں بھی گند نہ ہوتا تھا۔ آج انہی گاؤں سے روزانہ ایک لڑکی اپنے من پسند لڑکے کے ساتھ بھاگ رہی ہے۔ والدین کے لیے بے فکری کے دن ختم ہوگئے ہیں، اولاد کی بے راہ روی نے نیندیں حرام کردی ہیں۔ صبیح اور سلویا کے تعلق کو لے لیجیے، وہ کیسے دھڑلے سے ملتے رہے، جب مستقبل کا ساتھ نہ بن سکا تو ہنستے مسکراتے الوداع کہہ دیا، یہی وجہ ہے کہ آج اولاد کے سامنے سر اٹھا کر ملتے ہیں، کوئی خلش دل میں نہیں ہے۔ آج کی نسل کے لیے یہ تحریر آئینہ ہے۔"

☒ **ڈاکٹر محمد اے ملک** کی میری لینڈ، یو ایس اے سے ای میل "میں 1960ء سے امریکی شہر نیویارک میں ہوں۔ آپ کے تینوں ڈائجسٹ (جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت) پابندی سے منگواتا ہوں۔ ابتدا میں بہن خرید کر اکٹھے بھجوادیا کرتی تھی مگر اب میں منصور بک ڈپو نیویارک سے لیتا ہوں۔ پرچہ آتے ہی وہ بھجوادیا کرتے ہیں لیکن چاہ کر بھی تبصرہ بھجوا نہیں سکتا اس لیے کہ اگر تبصرہ بھیجوں تو اگلے شمارے میں ہی لگ پائے گا۔ (ہم تبصرے کا صرف اہم حصہ ہی شاملِ اشاعت کرتے ہیں) ای میل سے بھیجنا اس لیے پسند نہیں کہ کسی اردو میگزین کے لیے تبصرہ انگلش میں کروں، پھر اس خط کا نہ جانے کیا حشر ہو کیونکہ ترجمہ کرنے والے کس لفظ کا کیا ترجمہ کردیں (ای میل کے لیے اردو فونٹ نیٹ پر مفت دستیاب ہے یا پھر آپ رومن اردو میں بھی ای میل کرسکتے ہیں جس طرح ہمارے کئی قارئین پابندی سے کرتے رہتے ہیں) اب آتا ہوں اس ماہ کے سرگزشت کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا مجذوبِ عشق مجھے متاثر نہ کرسکا جبکہ میں ان کی تحریر بڑے ذوق شوق سے پڑھتا ہوں۔ مریم کے خان کی تحریر عشقِ رنگین بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ تنویر ریاض کی سوزِ عشق بہت متاثر کن تھی۔ عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی نے چار پانچ شادیاں کیں، بہت اچھے جناب! عشق بے چین بھی دلچسپ تھی۔ فلمی الف لیلہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھی۔ آفاقی صاحب لیجنڈ ہیں۔ ان کی تحریر متاثر کن اور معلوماتی ہوتی ہے۔ 206 اقساط پڑھنے کے بعد بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی گرفت اب بھی مضبوط ہے۔ میں انہیں تب سے جانتا ہوں جب وہ پیر جنگلی کے ساتھ ایک پرچے کی ادارت کررہے تھے۔ ان سے کہیں کہ وہ ان دنوں کی یادیں بھی شامل کریں۔ میں ان سے ان کے نسبت روڈ والے دفتر میں ملنے بھی گیا تھا، کیا انہیں یاد ہے؟ میں سراب پر بھی چند الفاظ لکھنا چاہوں گا۔ یہ داستان بڑی روانی سے چل رہی ہے لیکن اس قسط پر اعتراض ہے۔ یہ 41 صفحات پر محیط ہے جو صرف دو دنوں کی کہانی ہے۔ زیادہ تر واقعات صرف بھرتی کے ہیں۔ کچھ واقعات تو انتہائی غیر ضروری ہیں۔ میں نے یہ کہانی دوبار پڑھی۔ ایک بار غیر ضروری پیراگراف کے ساتھ اور دوسری بار ان کے بغیر، یقین کریں غیر ضروری پیراگراف کے بغیر زیادہ اچھی لگی۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، برہ زئی جھنگ۔ مظہر علی خان، لاہور۔ اختر حسین صدیقی، حیدرآباد۔ واصف خان، لاہور۔ نعمان مصطفیٰ، دردانہ کریم، فیصل آباد۔ ظہیر الدین شاہ، ناصر آفاق، کاشف کریم الحسن، فیصل آباد۔ کہکشاں فیضیاب، مظفرگڑھ۔ انعم مصطفیٰ، ملتان۔ صدر الدین احمد، کوٹ ادو۔ رعنا فیصل، جہانیاں۔ نصیر افضل، کاشف اقبال، گجرات۔ افضل توقیر، فہد خان، سیالکوٹ۔ آفاق بٹ، میرپور، آزاد کشمیر۔ نور علی نور، راولپنڈی۔ خاقان خان، سوات۔ قدیر رضا عطاری، اسلام آباد۔ نزہت پروین، بھکر۔ حیدر علی، فاضل پور۔ نشاط افزا (اونٹاریو، کینیڈا)

روحِ مناظر

ڈاکٹر ساجد امجد

مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ...... بغداد، مصر و غرناطہ سے کم نہیں۔ اس سرزمین پہ کیسے کیسے لعل و گہر پیدا ہوئے۔ اس سرزمین کو یہ فخر حاصل رہا کہ اہلِ علم سے اس کا دامن بھرا رہا ہے جن پر آنے والی نسلیں بھی فخر کرتی ہیں۔ انہی میں سے ایک صاحبِ علم و عرفان، مجاہدِ قلم کا تذکرہ جس نے تمام عمر مجاہدہ میں گزاری، ہر جا بحرِ علم جاری کیا مگر بھیس فقیرانہ رچائے رکھا۔ برق صفت، شعلہ نما ہوکر بھی دل کو موم بنائے رکھا۔ اس اہل علم کا زندگی نامہ جسے ہم نے طاق نسیاں پر رکھ دیا ہے۔

ایک صاحبِ عرفان کی زندگی کے شب و روز کا عکس

ہندوستان میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں میں اس کی مقبولیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر شہر میں زور و شور سے جاری تھی۔ ٹونک کا علاقہ دور دراز ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ رہا تھا لیکن ایک دن ایک مولوی صاحب چندے کے نام پر وہاں بھی پہنچ گئے۔ جمعہ کا دن تھا وہ ایک مسجد میں پہنچے اور چندے کی اپیل کے لیے تقریر کی اُن کی تقریر میں زورِ بیان نہیں تھا۔ ہفتوں گزر گئے تھے۔ مشکل سے ہر جمعہ کو چار پانچ روپے چندہ ہو پاتا تھا۔ تنگ آ کر مولوی صاحب نے اہل ٹونک کو کھری کھری سناڈالیں۔

''اس شہر میں عربی مدرسہ بھی ہے، علما بھی ہیں اور طلبہ بھی ہیں لیکن جمود و بے حسی کی یہ انتہا ہے کہ ہفتوں سے چلا رہا ہوں کوئی میری پشت پناہی کے لیے تو کیا اُٹھتا بات بھی نہیں پوچھتا۔''

ان نمازیوں میں ایک طالب علم مناظر احسن گیلانی موجود تھا۔ اس پر مولانا کا طعنہ نہایت شاق گزرا۔ وہ یہ سوچ کر مسجد سے نکلا کہ اگلے جمعہ کو وہ تقریر کرے گا اور مولوی صاحب کو بتائے گا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔

اس طالب علم نے پہلے کبھی تقریر نہیں کی تھی لیکن اسے اپنی قابلیت پر پورا یقین تھا۔ جمعہ آیا تو وہ کسی خاص تیاری کے بغیر مسجد پہنچ گیا۔ جیسے ہی سنتیں ختم ہوئیں وہ تقریر کے لیے دفعتاً کھڑا ہو گیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کیا تقریر کرنے لگا ہے۔ اس نے ایک آیت تلاوت کی اور پھر تقریر شروع کر دی۔ ابھی پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مسجد میں کہرام مچ گیا، لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ذرا ہوش آیا تو جس کے پاس جو کچھ تھا پھینکنا شروع کر دیا۔ کسی کے پاس روپے تھے، کوئی گھڑیاں پھینک رہا تھا، انگوٹھیاں اُچھال رہا تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو پانچ سو روپے کا سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ کئی ہفتوں میں سو روپے بھی جمع نہیں ہو سکے تھے، ایک دن میں پانچ سو جمع ہو گئے۔

''کون ہیں یہ صاحبزادے جو مسلمانوں کو لوٹ کر چلتے بنے؟''

''ارے صاحب، آپ نہیں جانتے، جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ یہ ٹونک کے تو ہیں نہیں۔ مولانا برکات احمد کے پاس پڑھنے کے لیے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سنا ہے ان کے دادا بھی بہت بڑے عالم تھے۔''

''دہلی یا لکھنو کے تو معلوم نہیں ہوتے۔''

''ہیں بھی نہیں۔ بہار کا ایک گاؤں ہے گیلانی' وہاں

کے ساکن ہیں۔"

"کبھی نام سنا نہیں۔"

"کوئی بڑی جگہ تو ہے نہیں جو آپ نے نام سنا ہوتا۔ پانچ چھ سو آدمیوں پر مشتمل چھوٹا سا گاؤں ہے۔ بربیگھہ سے ایک سڑک بہار شریف کو جاتی ہے۔ اسی سڑک پر بیگھہ سے میل دو میل کی دوری پر گیلانی واقع ہے۔ اس کا پورا نام محی الدین پور گیلانی تھا مگر اب تو صرف گیلانی کہلاتا ہے۔ اتنا بھی اس لیے مشہور ہو گیا کہ اس لڑکے کے دادا مولانا محمد احسن بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے گیلانی میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ شہرہ ہوا تو کابل تک کے طلبہ پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ خاندانی زمیندار تھے اس لیے پیسے کی ہوس تھی نہ ضرورت۔ فی سبیل اللہ پڑھایا کرتے تھے۔"

"کیا نام بتایا آپ نے ان صاحب کا؟"

"مولانا محمد احسن۔"

"یہ نام کچھ سنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

"ضرور سنا ہوگا۔ آپ تو رام پور کے رہنے والے ہیں۔ مولانا احسن نے رام پور میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔"

"جی ہاں، جی ہاں، یاد آ گیا۔ پچھلے دنوں میرا رام پور جانا ہوا تھا۔ وہاں میں چند علما کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ذوقِ علم کا تذکرہ چھڑ گیا۔ مثال میں مولانا احسن کا نام لیا گیا تھا مگر وہ تو کہہ رہے تھے' یہ صاحب بہار کے تھے۔"

"بہار ہی سمجھو، گیلانی وہاں کا گاؤں ہی تو ہے۔"

"رامپوری علما نے مجھے عجیب لطیفہ سنایا۔ مولانا احسن بالکل پڑھے لکھے نہیں تھے جیسا کہ زمیندار گھرانوں میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی بھی ہو چکی تھی بلکہ ایک لڑکا بھی تھا۔ ایک دن کسی نے کوئی ایسا طعنہ دے دیا کہ تحصیل علم کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور چودہ سال تک گھر لوٹ کر نہیں آئے۔ بنارس، لکھنو اور رام پور میں رہ کر علم حاصل کیا۔ گھر اس وقت لوٹے جب مستند عالم بن چکے تھے۔"

"میں نے آپ کو ٹوکا نہیں ورنہ میں یہ قصہ بھی سن چکا ہوں۔ واقعی عجیب مثال ہے۔ تو یہ لڑکا اس عظیم دادا کا پوتا ہے۔"

"سچ کہا ہے کسی نے چراغ سے چراغ ضرور جلتا ہے۔ یہ صاحبزادے بھی اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتے نظر آ رہے ہیں۔"

"ان سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آتے ہیں۔ دیکھا نہیں کیسی پرتاثیر تقریر تھی۔ نمازیوں کو رلا کر ہی دم لیا۔"

"ہاں صاحب، یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔"

اس دن سے اگلے دن تک پورے شہر کی زبان پر اسی طالب علم کے چرچے تھے۔ اس طالب علم کا نام مناظر احسن گیلانی تھا جو گیلانی میں پیدا ہوا۔ والد حافظ ابوالخیر کم پڑھے لکھے آدمی تھے۔ مولانا احسن کی بے وقت موت نے انہیں علم سے دور کر دیا تھا البتہ تایا ابونصر نے پٹنہ اور لکھنو جا کر مروجہ نصاب کی تکمیل کی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے مناظر احسن گیلانی کی تعلیم کی ذمّے داری انہوں نے قبول کی۔ ابتدائی تعلیم خود دی اور پھر اسے مزید تعلیم کے لیے ٹونک بھیج دیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب مناظر احسن گیلانی نے ریل کی شکل دیکھی۔ بہار و یوپی جیسے علمی صوبوں کے شہروں اور بڑے بڑے علمی مراکز سے گزرتے ہوئے اسے اس ریل نے راجپوتانہ کے ایک اسٹیشن پر اُتار دیا۔ وہ خوش تھا کہ منزل آ گئی مگر اسے بتایا گیا کہ وہ جس منزل کا طالب ہے وہ تو یہاں سے چالیس میل دور ہے۔ تو کیا مجھے دوسری ٹرین میں بیٹھنا ہوگا؟ کوئی ٹرین وہاں نہیں جاتی۔ کوئی لاری تو جاتی ہوگی؟

پکی سڑک کوئی بنی نہیں ہے پھر لاری کیسے چلے گی یہ بیاباں پیدل پار کرنا ہوگا ہمت ہے اور پیسے نہیں ہیں تو پیدل' ورنہ شتر گاڑی پر جانا پڑے گا۔

وہ راجپوتانہ کے نوائی اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ اب تک اس نے غور نہیں کیا تھا' ورنہ شتر گاڑی اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اونٹوں کی دو منزلہ عجیب و غریب شکل کی گاڑی۔ اس کے علاوہ دو مسافر اور بھی تھے۔ ان کے ساتھ وہ بھی سوار ہو گیا۔ شتر گاڑی نے اپنی آہستہ خرامی دکھانی شروع کی۔ کمر کی چولیں ہلنے لگیں تو اسے عربوں کی بے چارگی پر رحم آنے لگا۔ ان کی تو سواری خاص یہی تھی۔ کیسے سفر کرتے ہوں گے؟ شاید وہ اونٹ کسی دوسری نسل کے ہوں گے۔

"میاں صاحبزادے، ٹونک کس سلسلے میں جانا ہو رہا ہے؟"

"سید برکات احمد صاحب کے پاس کسی کام سے جا رہا ہوں۔"

"طالب علم ہو؟"

"وہ بھی ہوں۔ فی الحال تو ان سے ملنے جا رہا ہوں۔" وہ یہاں کے ماحول کو دیکھ کر ابھی یہ فیصلہ نہیں

کر پا رہا تھا کہ یہاں رہ کر تعلیم حاصل کر بھی سکے گا۔ اسی لیے خود کو طالب علم کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور زیادہ بات بھی کرتے ہوئے کترا رہا تھا۔ اسی لیے منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گیا تھا۔

"میں جب اُتروں تو آپ مجھے ان کا پتا بتا دیں گے؟"

"وہ ٹونک کے امرا میں ہیں۔ خیر آباد کا معقولی مدرسہ ان کی پہچان ہے جس سے بھی کہو گے ہاتھ پکڑ کے پہنچا دے گا۔ گھبراتے کیوں ہو؟" وہ پھر اسی طرح منہ دوسری جانب پھیر کے بیٹھ گیا۔ اب کوئی بات کرنے کی تھی بھی نہیں۔ صبح سے شام ہو گئی تھی، اونٹوں کی آہستہ بلکہ سست خرامی کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اسے یہ تو یقین تھا کہ جب بھی پہنچے وہ برکات احمد تک پہنچ جائے گا لیکن وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ برکات احمد صاحب اس سے کس طرح پیش آئیں گے اور بعد میں استاد کیسے ثابت ہوں گے؟

مناظر احسن کے دادا مولانا احسن کے تلامذہ میں مونگیر کے مولانا دائم علی بھی تھے جنہوں نے درسیات عربی کے بعد طب پڑھ لی تھی اور ریاست ٹونک میں شاہی طبیب مقرر ہو گئے تھے۔

مولانا دائم کے فرزند سید برکات احمد کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا خصوصاً علم معقولات میں ان کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ برکات احمد مشہور معقولی عالم مولانا عبدالحق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے جن کی خدمت میں وہ سولہ سال رہے تھے اور نصاب معقولات کی تکمیل کی تھی۔

انہوں نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ طلبہ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے بلکہ خود اپنے گھر سے بیس پچیس طلبہ کو روزانہ دونوں وقت کھانا دیتے تھے۔

والد کی جگہ والی ٹونک کے طبیب خاص ہو گئے تھے۔ معقول تنخواہ تھی، ایک گاؤں بھی جاگیر میں تھا۔ کئی ذاتی مکان تھے لہٰذا وہ یہ سب برداشت کر سکتے تھے کہ ذاتی خرچ سے مدرسہ چلائیں۔ ان کے مدرسے میں معقولات (عقلی علوم، منطق و فلسفہ وغیرہ) کی تمام کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ جن کے پڑھنے کا اب ٹونک کے سوا کہیں رواج باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان علوم کی طلب جس کو ہوتی تھی وہ ٹونک کا رُخ کرتا تھا۔ مناظر احسن کے تایا نے اسی تعلق کی وجہ سے جو برکات احمد کے والد سے تھا انہیں ٹونک بھیجا اور اس لیے بھی کہ ابونصر معقولاتی علوم کو اہمیت دیتے تھے اور یہ سہولت ٹونک میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

چودہ سالہ مناظر احسن جب سید برکات احمد کے سامنے پہنچا اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ مولانا احسن مرحوم کا پوتا ہے تو بے اختیار شفقت کا ہاتھ سر پر رکھ دیا۔

وہ ٹونک کے اسی مدرسہ میں جم کر بیٹھ گیا اور تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وہ اپنے وطن گیلانی میں منطق کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا لیکن برکات احمد صاحب نے غیر معمولی شفقت اور توجہ کی وجہ سے اس فن کے ابتدائی رسالہ ایساغوجی سے پڑھانا شروع کیا۔

جب پہلی کتاب شروع کی تو محنت و شوق کا یہ عالم تھا کہ اس رسالے کے مطبوعہ نسخے بکثرت ملتے تھے لیکن اس نے اس کا نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا۔ روز کا سبق قلم سے لکھ لیا کرتا تھا اور استاد سے جو تقریر اس سبق کے متعلق سنتا اسے حاشے پر بہ زبان اردو چڑھا لیا کرتا تھا پھر دوسری کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استاد کی درسی تقریروں کے نوٹ لکھنے کا سلسلہ زمانے تک جاری رہا۔ اسی کے ساتھ معقولات ہی کے سلسلے کے بعض نادر مخطوطات کو اپنے قلم سے نقل کیا۔

اس مدرسے کے ایک دوسرے استاد مولانا اشرف سے عربی ادب، ریاضی اور ہیت و ہندسہ کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ یہی وہ دن تھے جب اس نے خلافت تحریک کا چندہ جمع کرنے کے لیے پہلی مرتبہ تقریر کی۔ اتفاق یہ بھی تھا کہ مولانا برکات نواب صاحب کے ساتھ ٹونک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میدان خالی تھا' ورنہ شاید وہ تقریر کرنے کی ہمت نہ کرتا کیونکہ استاد محترم طلبہ کے لیے وعظ گوئی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

استاد کو واپس آنے میں ایک ماہ کا عرصہ لگ گیا اور شاگرد کی تقریروں کو موقع ملتا رہا۔ ایک تقریر کے بعد ہی وہ واعظ شہر مشہور ہو گیا۔ لوگوں نے دعوتیں شروع کر دیں۔ محلّے محلّے جلسے ہونے لگے۔ چندہ جمع کرنے والے مولوی صاحب کی تو چاندی ہو گئی۔ ہر وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رہتے۔

دس بیس تقریروں کے بعد اسے محسوس ہوا کہ جو کچھ اسے یاد تھا وہ سب سنا دیا۔ کہنے کو کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ ادھر جو پذیرائی ہوئی تھی اس کے بعد حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ تقریریں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تقریروں کے لیے نئے مضامین کی تلاش ہوئی تو امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کی طرف متوجہ ہوا۔ نیا سرمایہ ہاتھ آیا۔ تقریروں میں مزید

جان آگئی۔ لوگ اس کی تقریریں سننے کے لیے اُمڈے پڑتے تھے۔ اس کے لیے تو یہ بہت آسان تھا کہ عربی میں پڑھ کر اردو میں بول دیا کرتا تھا لیکن عام لوگوں کے لیے یہ نئی دنیا تھی۔

تشنہ لب ابھی مزید کی آرزو کر رہے تھے کہ استاد سفر سے واپس آگئے۔ آتے ہی یہ خبر مل گئی کہ وہ شاگرد جسے وہ مدرس بنانا چاہتے تھے واعظ شہر بن گیا ہے۔ اس دن اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ استاد کو غصہ بھی آتا ہے اور یہ غصہ اس پر اُتر سکتا ہے۔ جب خوب گرج برس چکے اور یہ وعدہ لے چکے کہ وہ آئندہ تقریر کرنے.... کہیں نہیں جائے گا تو پھر ان مجرموں کے بارے میں پوچھا جنہوں نے اسے واعظ شہر بنانے کا جرم کیا تھا۔ ان بے چاروں کی جو درگت بنی وہ تو بیان سے باہر ہے۔

مناظر احسن نے احیاء العلوم کا مطالعہ دوسرں کے لیے شروع کیا تھا لیکن اس کے سحر میں وہ خود گرفتار ہوگیا۔ یہ تو دنیا ہی نئی تھی۔ معقولات کے وہ سارے تانے بانے بکھر گئے جو سات سال میں بڑی کاریگری سے تیار ہوئے تھے۔ علم تو وہ ہے جو اس کتاب میں ہے۔ اس نے چپکے چپکے امام غزالی کی بعض دوسری کتابیں بھی ختم کرلیں۔ وہ اب تک اپنے تایا کی زبانی بھی یہی سنتا آیا تھا کہ منطق و فلسفہ ہی سب کچھ ہے۔ استاد نے بھی یہی بتایا تھا لیکن احیاء العلوم پڑھ کر تو معلوم ہوا ''چیزے دیگر است'' علوم منقولات کی شان ہی اور ہے۔ نشہ عشق کی تڑپ ہی دوسری ہوتی ہے۔

اب تو حال یہ ہوا کہ نہ منطق کی کتابوں میں جی لگتا تھا نہ فلسفے میں۔ ایک اضطراب تھا جو دل کو مسل رہا تھا، کیا پڑھے کہاں جائے۔ اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اس عالم اضطراب میں خواجہ اجمیر کی یاد آئی۔ یہ ٹونک سے قریب بھی تھا اور قیام کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ اسے یاد آیا کہ ایک صاحب مولانا معین الدین ہیں جو سید برکات احمد کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ میرے استاد بھائی ہوئے۔ استاد کا خیال کرتے ہوئے وہ مجھے اپنے پاس ٹھہرالیں گے۔

درگاہ اجمیر پر پہنچ کر شاید دل کو قرار آجائے۔ آب و ہوا کی تبدیلی بھی ہوجائے گی۔ یہی سب سوچ کر اس کے سمندرِ شوق نے اجمیر کی جانب پرواز کرڈالی۔

دربارِ اجمیر کا خیال آتے ہی بے اختیار جذبات اُمڈ کر آئے۔ اپنی بے بضاعتی پر نظر ڈالی۔ اتنے بڑے دربار میں جا رہا ہوں، لے کر کیا جاؤں؟ جب کوئی بادشاہ کے دربار میں جاتا ہے تو نذر پیش کرتا ہے۔ میرے پاس کیا ہے، کیا پیش کروں گا۔ ذہن میں ہلچل ہوئی اور یہ نظم کاغذ پر منتقل ہوگئی۔

بے طرح درد سے دل آج بھرا آتا ہے
خون بن کر جگر آنکھوں میں چلا آتا ہے
حسرت و یاس کا سینے سے پرا آتا ہے
شکوے آتے ہیں چلے اور گلہ آتا ہے
جسم میں آج مری جان گھٹی جاتی ہے
میرے ارمانوں کی اقلیم لٹی جاتی ہے

☆☆☆

ہائے اسلام پہ کفار مظالم توڑیں
ہم ضعیفوں پہ جلے دل کے پھپولے پھوڑیں
عورتوں تک کو نہ مردود شیاطیں چھوڑیں
تہمتیں سیکڑوں الٹی ہی وہ ہم پر جوڑیں
آہ دنیا سے مسلمان اُٹھے جاتے ہیں
تیغ تثلیث سے مظلوم کٹے جاتے ہیں

☆☆☆

نہ یہی بلکہ وہاں گنبد افلاس ڈھایا
لوٹا غارت کیا جس چیز کو اس نے پایا
اس ستم نے فلک پیر کو بھی چکرایا
گویا ایران پہ پھر چڑھ کے ہلاکو آیا
روضہ پاک میں اور خون مسلمانوں کا
پھر بھی ٹھنڈا نہ کلیجہ ہوا شیطانوں کا

جوانی میں سب شاعر ہوتے ہیں وہ بھی تھا۔ کبھی کبھی اشعار نظم کرلیا کرتا تھا لیکن یہ نظم جس روانی سے اور جتنی جلدی ہوئی اس پر وہ خود حیران تھا۔

اس نے یہ نظم جیب میں ڈالی اور کسی کو کچھ بتائے بغیر ٹونک سے غائب ہوگیا۔ شوق کی سواری اسے کشاں کشاں اجمیر لے جارہی تھی۔ اس سواری نے اسے بہ خیر و عافیت اپنے استاد بھائی مولانا معین الدین کے مکان پر اُتار دیا۔ وہ بھی حیران کہ اُدھر کا چاند اِدھر کیسے نکل آیا۔ کیفیت سنی تو ٹھنڈی سانس بھری۔

''بالکل صحیح جگہ پر آگئے۔ جب تک چاہو قیام کرو۔ تم خود نہیں آئے ہو خواجہ نے بلایا ہے۔'' ذوقِ خطابت کا احوال سن کر بڑے خوش ہوئے۔

دو ایک دن بعد ہی اجمیر کی شاہ جہانی مسجد لے کر پہنچ گئے۔ وعظ گوئی کا جنون ابھی اُترا نہیں تھا اور پھر سامنے تھیں ہزار کا مجمع۔ نوجوانی کا جوش تھا، مستی و بے خودی شروع سے تھی اور اب تو وہ خواجہ کے شہر میں تھا۔ بولنا شروع کیا تو مجمع محوِ حیرت ہوکر دیکھ رہا تھا۔ انداز واعظانہ نہیں خطیبانہ تھا۔ موقع بہ موقع منتخب اشعار کی گل افشانی ہو رہی تھی۔ نکتہ آفرینی بھی تھی اور علمی معلومات کا سیلاب بھی جو اُمڈ چلا آتا تھا۔ اکیس سال کی عمر اور یہ انداز۔ کبھی پھول برسا رہا تھا، کبھی آگ لگا رہا تھا۔ جو حال ٹونک کی مسجد میں لوگوں کا ہوا تھا وہی حال یہاں بھی ہوا۔ اس نے تقریر ختم کی تو آہوں اور سسکیوں کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔

وہ نظم جیب میں تھی جو وہ خواجہ اجمیر کی نذر کرنے کے لیے لایا تھا اور مچل رہی تھی کہ اسے سنایا جائے۔ اس نے یہ نظم خواجہ کے قبہ ضیا کے سامنے کھڑے ہوکر سنائی تو سماں باندھ دیا۔

اجمیر کے کچھ دن قیام نے دل کو کچھ سکون بخشا۔ دل قابو میں آیا تو استاد محترم کا خیال۔ کیا سوچتے ہوں گے کہ میں نے ان کے احسانات کا کیا بدلا دیا۔ اجازت لیے بغیر ہی بھاگ آیا۔ واپس جا کر عذر معذرت تو کروں۔ اس کے بعد دیکھوں گا مجھے کیا کرنا ہے؟ یہ شرم بھی دامن گیر تھی کہ میزبان پر کب تک بوجھ بنا رہوں گا۔ اس نے اجازت طلب کی اور ٹونک واپس آگیا۔

یہاں پہنچتے ہی قدرت کی طرف سے ایک نیا حادثہ پیش آیا کہ ہیضہ جیسی وبائی بیماری پھیل گئی۔ ایک ایک دن میں کئی کئی افراد اپنی جان سے ہاتھ دھونے لگے۔ ایک دن تو مرنے والوں کی تعداد اسی تک پہنچ گئی۔ غضب تو یہ ہوا کہ وہ خود بھی اس وبائی مرض کا شکار ہوگیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ مدرسے کے دس بارہ طالب علم شب و روز اس کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔ مولانا برکات خود حاذق حکیم تھے نہایت تندہی سے اس کا علاج کر رہے تھے لیکن ہر روز مایوسی کا ایک لفظ کہہ کر اُٹھ جاتے تھے۔

ایک دن سرہانے آکر بیٹھے۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ مولانا برکات نے نبض ٹٹولی اور آبدیدہ ہوکر سرہانے سے اُٹھ گئے۔ اسی وقت ایک معمر بزرگ جنہیں سید احمد بریلوی کی رفاقت کا شرف نوعمری میں حاصل ہوا تھا عیادت کے لیے تشریف لائے۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں ان بزرگ کی زبان سے اس نے کچھ سنا، کیا سنا تھا یہ اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ بس آنکھوں نے سب نے دیکھا کہ وہ جس کی طرف سے سب مایوس ہوچکے تھے تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔ گویا مردہ زندہ ہوگیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ اسے صحت تو مل گئی لیکن بینائی تقریباً مفقود ہوگئی لیکن اب طبیب مایوس نہیں تھا۔ مولانا برکات نے خوشخبری دی تھی کہ بینائی عارضی طور پر چلی گئی ہے جیسے جیسے صحت بحال ہوگی بینائی بحال ہوتی چلی جائے گی۔ رفتہ رفتہ روشنی بھی آگئی۔

وبا زدہ شہر میں داخل ہونے کی ممانعت کی گئی ہے اس لیے گیلانی سے کوئی بھی تیمارداری کے لیے نہیں آیا تھا۔ اب جو صحت یابی کا تار وہاں پہنچا تو وطن واپسی کے تقاضے ہونے لگے۔ گھر والوں کے تقاضوں سے ٹونک سے گیلانی آگیا۔

گیلانی کی تنہائی میں رہ رہ کر اجمیر کا خیال آتا رہتا تھا۔ جن دنوں اس کا قیام اجمیر میں تھا میزبان کی زبان سے حدیث پڑھانے کی تعریف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کے متعلق سن چکے تھے۔ بار بار خیال آتا تھا کہ معقولات کی ساری کتابیں پڑھ چکا، نصاب کی تکمیل ہوچکی، صرف حدیث پڑھنے کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے لہٰذا شیخ الہند کی خدمت میں دیوبند چلنا چاہیے۔ اس نے اپنے تایا ابوالنصر سے عرض کیا کہ اب وہ ٹونک نہیں جائے گا۔ اسے حدیث پڑھنے کے لیے دیوبند جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔

تایا کو کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ وہ دیوبند جائے۔ وہ ٹونک بھیجنے کے حق میں تھے۔ ٹونک کی طرف سے دل پھر چکا تھا بلکہ معقولات کی طرف سے دل پھر چکا تھا اور ٹونک میں معقولات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ رد و قدح کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر اس کے مربی تایا کو اس کا فیصلہ ماننا پڑا۔ طے ہوگیا کہ رمضان اور عید گزارنے کے بعد وہ دیوبند چلا جائے گا۔ اجازت مل گئی تھی لیکن اب سوال یہ تھا کہ داخلے کا مرحلہ کیسے طے ہو؟ کسی دیوبندی عالم سے شناسائی نہیں تھی۔ کوئی اور ذریعہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ آخر یہ سوچا کہ دارالعلوم کے مہتمم صاحب کے نام خط لکھا جائے۔ حافظ محمد احمد مسندِ اہتمام پر فائز تھے۔ اس نے ان کے نام خط لکھا۔

''میں فلاں فلاں نصاب ختم کرچکا ہوں اور اب دورۂ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلے کا خواہش مند ہوں داخلے کی کیا صورت ہوگی؟''

اس خط کا فوراً جواب آیا ''تم فوراً دیوبند پہنچ جاؤ۔ ہر چیز کا انتظام کردیا جائے گا۔''

رمضان تھے پھر وطن میں عید کے موسم سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ تن تنہا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گھر سے

اسٹیشن تک کا فاصلہ پندرہ میل سے کم نہیں ہوگا جو پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ یہاں سے ''گیا'' گیا سے سہارن ہوتا ہوا دیو بند پہنچ گیا۔ گھر سے چلا تھا تو دیو بند کے ایک طالب علم منظر حسن کے نام اس کے بڑے بھائی سے ایک خط لے لیا تھا۔ وہ خط بھی جیب میں پڑا تھا۔

تانگے والے سے دارالعلوم چلنے کو کہا اور سامان کی گٹھری بغل میں دبا کر سوار ہوگیا۔ تانگے والے نے تانگا آگے بڑھادیا۔ قصبے کی سڑکوں اور گلی کوچوں سے گزرتا ہوا یہ تانگا ایک اونچے دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازے کی پیشانی پر ''مدرسہ اسلامی عربی دیو بند'' لکھا تھا۔

اس نے منظر حسن کے نام لکھے گئے خط کو مٹھی میں دبالیا اور کسی طرح پوچھتے پاچھتے منظر حسن کے کمرے تک پہنچ گیا۔ خط دکھایا تو تعارف بھی ہوگیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے منظر حسن کو ساتھ لیا اور مہتمم کے دفتر میں پہنچ گیا تاکہ اپنی آمد درج کرادے۔ اس نے وہ خط مہتمم کو دکھایا جو اِن کی طرف سے ملا تھا۔

''تم آگئے ہو۔ تمہارا نام درج کرلیا گیا ہے۔ داخلے کا امتحان ہوگا۔ اس وقت تک انتظار کرو۔'' مہتمم نے کہا اور ساتھ ہی منظر حسن کو حکم دیا کہ یہ صاحبزادے تمہارے واقف کار ہیں اسی لیے انہیں اپنے پاس رکھو۔

مناظر احسن اس مدرسے میں زندگی کی ہلچل دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔ بارہ سو طلبہ کا مجمع ان میں بھی بھانت بھانت کے لوگ۔ ملکی بھی غیر ملکی بھی۔ وہ اب تک بیس تیس طالب علموں کے حلقوں میں رہتا بستا اور تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ یہ مجمع دیکھ کر وہ سوچنے لگا تھا کہ یہاں تو بڑی بدانتظامی ہوتی ہوگی۔ تعلیم حاصل کرنے کی صورت کیا ہوگی لیکن سب سے پہلے وہ یہاں جس چیز سے متاثر ہوا وہ یہاں کا حسنِ انتظام ہی تھا۔ نماز باجماعت سے لے کر کھانے کی تقسیم تک۔

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کسی کو کس کام کی جلدی ہے۔ ہر کام خود بہ خود ہوتا چلا جارہا تھا۔ کھانے بھی مفت، مکان بھی مفت، روشنی بھی مفت، کتابیں بھی مفت، بیمار پڑ جاؤ تو طبیب اور دوائیں بھی مفت۔

ایک ہفتہ گزرا تھا کہ داخلے کے امتحان کا وقت آگیا۔ مولانا انور شاہ کشمیری جو محدث العصر کہلاتے تھے اس امتحان کے لیے مقرر کیے گئے۔ مولانا انور شاہ کشمیری کتب خانے میں تشریف فرما تھے۔ داخلے کے خواہش مند طلبہ باہر کھڑے تھے۔ دروازے پر کھڑا ایک آدمی ایک ایک طالب علم کا نام پکارتا جاتا تھا۔

آواز پڑی۔ ''مناظر احسن گیلانی۔'' امتحان کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ اچھے اچھے گھبرا جاتے ہیں۔ وہ بھی گھبرایا ہوا تھا۔ کانپتے قدموں سے وہ کتب خانے میں داخل ہوا۔ سیکڑوں تقریریں کرچکا تھا۔ سات سال ٹونک کے مدرسے میں پڑھ چکا تھا لیکن اس وقت یہ معلوم ہورہا تھا کہ جیسے پہلی مرتبہ گھر سے نکلا ہو۔

مولانا انور شاہ کشمیری فرش پر بیٹھے تھے۔ چھوٹی سی دستی میز رکھی تھی جس پر ایک کتاب تھی۔ یہ کتاب مناظر کے لیے نئی نہیں تھی۔ مولانا نے کتاب کھولی اور ایک عبارت پڑھ کر حکم دیا کہ اس کا مطلب بیان کرو۔ نہ یہ کتاب اجنبی تھی نہ عبارت۔ یہ کتاب ٹونک کے مدرسے میں رہ کر وہ پڑھ چکا تھا۔ ایک ایک لفظ گھونٹ کر پی لیا تھا مگر وہ اس وقت اتنا مرعوب تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہیں ہورہا تھا۔ اُدھر سے پھر حکم ہوا کہ مطلب بیان کرو۔ اس نے اس طرح بولنا شروع کیا جیسے بے ہوشی میں بول رہا ہو۔ مولانا نے دو ایک سوال اور پوچھے ان کے جوابات بھی اسی طرح دیے پھر اس نے یہ سنا کہ مولانا اس سے اُٹھ جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ یہ حکم ایسا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ وہ وہاں سے اُٹھ آیا اور یہ سوچ کر اُٹھا کہ کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ گھر چلنے کی تیاری کر لینی چاہیے۔ وہاں سے آنے کے بعد اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ فیل ہونے کی خبر سنے بغیر گھر چل دینا چاہیے۔ اس نے اپنا فیصلہ منظر حسین کو بھی سنادیا لیکن اس نے تسلی دی کہ نتیجے کا انتظار کیے بغیر اسے نہیں جانا چاہیے۔

ایک دو روز میں فہرست آویزاں ہوگئی۔ وہ داخلے کے امتحان میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس سخت بدحواسی کے باوجود بہت اچھے جوابات دیے تھے۔

امتحان میں کامیابی کے بعد دورۂ حدیث میں اس کا نام درج ہوگیا۔ اسباق کا آغاز ہوگیا۔ علامہ کشمیری مسلم شریف پڑھانے لگے۔ بخاری کا درس شیخ الہند خود دیتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ابوداؤد پڑھاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے اساتذہ۔ اساتذہ کی کرم فرمانیاں اس کے شامل حال تھیں۔ شیخ الہند خود اس پر خصوصی توجہ رکھ رہے تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے تو خود اسے اپنے پاس بلا کر کہا تھا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی آدمی کو کسی سے محبت ہو تو اس کو مطلع کردے۔ اس لیے میں نے آپ کو طلب کیا ہے کہ اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کردوں کہ میں اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔'' ان سب محبتوں کے باوجود اس کے دل کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ اب تک یونانی فلسفہ اور منطق پڑھتا رہا تھا۔ درسِ حدیث شروع ہوا تو دونوں میں ٹکراؤ بھی شروع ہوگیا۔ وہ جو حدیث پڑھتا دل ہی دل میں اعتراضات بھی اُٹھاتا رہتا یعنی حدیث کے الفاظ اپنی جگہ عقل اپنا کام دکھارہی تھی۔ شکوک وشبہات بڑھتے جارہے تھے۔ یہ شبہات اتنے بڑھے کہ خود حضور اکرم کی ذات مبارکہ بھی ان کی زد میں آنے لگی۔ بدگمانیوں کا ایک طوفان تھا جو اُمڈتا رہتا تھا۔

یہ ایسی باتیں تھیں جو کسی استاد سے تو کیا کسی ساتھی سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ اگر کوئی ان حدیثوں پر اس سے بحث کرتا تو وہ ان سب کو غلط ثابت کرنے پر تل جاتا۔ وہ ذہن کو جتنا جھٹکتا یہ خیالات اتنے ہی اس پر حاوی ہوتے چلے جارہے تھے۔ دل میں ایسا چور بیٹھ گیا تھا کہ کسی کا سامنا کرتے ہوئے کترانے لگتا تھا کہ کہیں وہ دل کا حال جان نہ لے۔ کسی سے کہتا بھی تو کیا۔ یہ کہ ان حدیثوں پر میرا ایمان نہیں؟

یہ آگ ایسی طرح بھڑک رہی تھی کہ بقرعید کی چھٹیاں آگئیں۔ چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت علی احمد صابر کا مزار مبارک دیو بند کے قریب ہے۔ سوچا مزار پر حاضری دوں اور دعا مانگوں کہ ان فاسد خیالات سے مجھے نجات ملے۔

رڑکی اسٹیشن پر اُتر کر گٹھری بغل میں دبائے نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ کلیر شریف پہنچ گیا۔ روضے میں داخل ہوا۔ فاتحہ خوانی کی۔ کتنی ہی دیر اپنی حالت پر آنسو بہاتا رہا۔ گناہ گار سے گناہ گار مسلمان کو بھی احادیث کی حقانیت پر یقین ہوگا مگر میرا یہ حال کہ ان پر سے ایمان ہی اُٹھتا جارہا ہے۔ یہاں سے اُٹھ کر مسجد میں پہنچ گیا اور تلاوت کرنے بیٹھ گیا۔ کوئی صاحب چند چپاتیاں اور مسور کی دال لے کر آگئے۔ پانی بھی میسر آگیا، خدا کا شکر ادا کیا۔

کسی سے منگلور کا پتا پوچھا۔ جوتے اُتار کر گٹھری میں باندھے اور پیدل بلکہ ننگے پاؤں دن بھر چلنے کے بعد جب آفتاب غروب ہونے لگا تو وہ منگلور پہنچا۔ یہاں کسی بزرگ سے ملاقات مقصود تھی۔ ان بزرگ سے توقع تھی کہ وہ اس کی اس حالت کو دور کرنے میں اس کی مدد کریں گے لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ لامحالہ رات ایک مسجد میں گزارنے کے بعد صبح ہوتے ہی واپس آنا پڑا۔ اس سفر سے لوٹنے کے بعد بھی حالت جوں کی توں رہی۔ پریشانی بڑھتی جارہی تھی بالآخر یہ طے کیا کہ شیخ الہند محمود الحسن کی خدمت میں پہنچ کر اپنا مرض ان کے سامنے رکھ دوں پھر بھی کوئی علاج نہ ہوسکا تو دارالعلوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔

اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اس کا نام بھی جانتے ہیں اور اس کا شعبہ بھی۔ وہ صدر مدرس ہیں اور طلبہ کو نام بہ نام جانتے ہیں یہ توجہ ہے اسی لیے تو مدرسہ چل رہا ہے۔ اس نے اپنا دردِ دل عرض کرنے اور سنانے کی درخواست کی۔ حضرت اُٹھ کر اندر کمرے میں تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر مناظر نے اپنے ان خیالات فاسدہ کی تفصیل سنائی، دیر تک سناتے رہے۔ جب سب سنالیا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ''حضرت میرا تو ایمان ہی گیا۔''

شیخ الہند نے ڈھارس بندھائی۔ ''مولوی صاحب اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے تو یہ بے ایمانی کی نہیں، آپ کے ایمان کی دلیل ہے۔ ایمان نہ ہوتا تو ان خیالات سے اتنے پریشان ہی کیوں ہوتے؟'' ان جملوں نے مرہم کا کام کیا۔ اُٹھتی ہوئی ٹیس بیٹھ گئی۔ درد میں کمی آگئی۔ اس لیے بھی کہ دل کی بھڑاس نکلی تھی اور اس لیے بھی کہ استاد محترم نے گواہی دی تھی ''یہ بے ایمانی نہیں ایمان کی دلیل ہے۔''

یہ گھنی چھاؤں ابھی سر سے رخصت نہیں ہوئی تھی کہ شیخ الہند نے مزید فرمایا کہ ''آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟'' اس نے تفصیل بیان کردی۔

حضرت نے سن کر فرمایا۔ ''جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے

تاثرات

ایک ان کی شیریں گفتاری وشگفتہ بیانی۔ دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی۔ ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجیب دل آویزی اور دلکشی پیدا کردی تھی اور کسی طرح ان کی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا اور اس وجہ سے وہ اپنے حلقہ احباب میں بڑے محبوب اور حلقہ تلامذہ میں بڑے مقبول تھے جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اُٹھتا کہ ''بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی۔''

(مولانا سید ابوالحسن ندوی)

گئے ہیں وہی سب کچھ باہر نکل رہا ہے۔ پریشان ہونے کی بات نہیں۔ مولوی صاحب جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔'' ان لفظوں میں نہ جانے ایسا کیا جادو تھا کہ دنیا ہی بدل گئی۔ اب نہ وہ وسوسے تھے نہ شکوک وشبہات۔ حدیث کے اسباق میں جی لگنے لگا۔

اس واقعے کے بعد شیخ الہند اس پر بہت مہربان ہو گئے تھے۔ ایک دن کہنے لگے ''میں نے سنا ہے کہ تم ایک اچھے ادیب بھی ہو مدرسے کی طرف سے القاسم رسالہ نکلتا ہے اس میں مضمون کیوں نہیں لکھتے؟'' اسے بڑا تعجب تھا کہ اس نے نہ تو کوئی مضمون لکھا تھا نہ کہیں شائع ہوا تھا۔ نہ کسی ساتھی سے کوئی ذکر کیا تھا پھر استاد محترم کو کیسے معلوم کہ میں ادیب ہوں؟ شاید انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ لڑکا ایک اچھا ادیب بن سکتا ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارنے کے لیے وہ کہہ رہے تھے کہ اسے لکھنا چاہیے۔

اس نے استاد کا کہا پورا کیا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو تھا ہی نہایت محنت سے ایک مضمون ''خیر الامم کا طغرائے امتیاز'' لکھا۔ یہ مضمون القاسم دیوبند میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی شہرت اساتذہ وطلبہ دونوں میں ہوئی۔ باہر سے بھی خطوط آئے جن میں اس مضمون کی تعریف کی گئی تھی۔

سب سے دقیع تعریف مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی۔ آپ نے فرمایا ''یہ لڑکا یا تو محقق ہے یا آگے چل کر بن جائے گا۔'' ان تعریفوں نے اس کا بھی دل بڑھایا۔ آگے چل کر اسے ایک عظیم ادیب بن کر سامنے آنا تھا۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہونہار اور ذہین طالب علم ہوتا ہے تو اساتذہ کو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اساتذہ اس سے محبت کرنے لگے تھے اور اس پر خصوصی توجہ رکھتے تھے۔

ساتھی طلبہ میں یہ شہرت ہو ہی چکی تھی کہ مناظر احسن گیلانی علم معقولات میں درک رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو شوق پیدا ہوا کہ اس علم کی کوئی کتاب ان سے پڑھی جائے۔ وہ تیار بھی ہو گئے کہ پڑھا دیں گے مگر جونہی اس کتاب کو پڑھانے کا ارادہ کیا لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ یہ میر زاہد رسالہ تھا۔ اس پر انہیں پورا عبور تھا۔ جی کڑا کر کے رسالہ ہاتھ میں لیا۔ چند منٹ نہیں ہوئے تھے کہ نیند غالب آگئی۔

خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ جنگلی سوروں نے گھیر رکھا ہے۔ خوف جب بڑھ گیا تو ایک درخت پر چڑھ گئے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک آدمی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے بندوق چلا دی۔ کچھ سور مرے، گرے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے اور آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلی تو بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اسی وقت لڑکوں کو کہلوا دیا کہ پڑھانا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ خواب پر غور کرنے بیٹھ گئے۔ پہلے اس جملے کا خیال آیا جو شیخ الہند نے فرمایا تھا۔ ''مولوی صاحب جاؤ، اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔''

اس کے بعد ہر وسوسہ دل سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب یہ خواب؟ اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا تھا۔ اس خواب میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ معقولات کے قریب نہ جاؤ۔ بندوق والا آدمی کہیں حضرت تو نہیں تھے۔

☆☆☆

دارالعلوم کے در و دیوار اس وقت خاموش تھے۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ یہ طالب علم اس وقت کروٹیں بدل رہا تھا۔ کچھ باطنی روگ لگے ہوئے ہیں۔ ان کا ازالہ ضروری ہے۔ میں کب تک شکوک شبہات کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ دارالعلوم میں ہمیشہ تو رہنا نہیں ہے۔ شیخ الہند بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ کسی ایسے عارف اللہ کے دامن سے وابستہ ہونا ضروری ہے جن کی نگاہیں مجھ خام کو پختہ بنا دیں۔ وہ نہ بھی رہے تو اس سے تعلق مجھے بھٹکنے نہ دے۔ اس کی نگاہ انتخاب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن پر جا کر رکی جن کے تصرف باطنی کا تجربہ اسے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

طالب علم تہجد کے لیے اُٹھنے لگے تو وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر شیخ الہند قبول فرمالیں تو وہ ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لے گا۔ یہ بہت بڑی جسارت تھی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

تہجد اور اس کے بعد نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد وہ ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ حضرت شیخ یہ اعزاز اسے بخش دیں گے۔ ان کے روحانی تربیت یافتوں میں کیسی کیسی ہستیاں شامل ہیں۔ ان کے سامنے ایک طالب علم کی حیثیت کیا۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ پرائمری کا طالب علم یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہے۔ وہ اگر طالب علموں کو بیعت سے سرفراز فرمانے لگیں تو پورا دارالعلوم ان کا مرید ہو جائے۔ اس کے اعترافات بجا تھے۔ حقیقت پر مبنی تھے لیکن ابھی وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ دل کے سودے قیمت سے طے نہیں ہوتے۔ شیخ جانتا ہے کہ اس کے سامنے کنکر ہے یا موتی۔ حضرت نے پہلی درخواست ہی میں اسے بیعت کر لیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر حیران کھڑا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟

مرشد اول سے استفادے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا کیونکہ شیخ الہند جو انگریزوں کے خلاف جہادِ آزادی شروع کیے ہوئے تھے اور پورے ملک میں انہوں نے مجاہدوں کا جال پھیلایا ہوا تھا۔ عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیج چکے تھے۔ خود وہ بھی ان مجاہدوں سے ملاقات کے لیے حج کے بہانے ہندوستان سے نکلے لیکن انگریزوں کی خفیہ پولیس نے ان کے خلاف رپورٹ دے رکھی تھی۔ انہیں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا اور پھر تین چار سال بعد رہا ہو کر ہندوستان پہنچے تو سخت بیمار تھے اور بہ مشکل چھ ماہ بعد انتقال کر گئے۔

مولانا گیلانی نے دورۂ حدیث کا سالانہ امتحان دے دیا تھا۔ نمایاں کامیابی بھی حاصل کر لی تھی۔ اب انہیں ذریعہ معاش کی تلاش تھی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جو کچھ پڑھا ہے بس اسی دائرے میں رہ کر کام کر سکتے ہیں۔ جن کاموں میں معاوضہ اچھا مل سکتا ہے ان کاموں کی صلاحیت نہیں۔ اپنے وطن گیلانی جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہاں اتنے کا بھی آسرا نہیں تھا۔ اب ایک ٹونک ہی رہ گیا تھا جس سے شناسائی کی تھی۔ اسلامی ریاست تھی لہٰذا مولویت کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ اساتذہ بھی زندہ تھے جن سے مدد مل سکتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے اپنے گاؤں گیلانی گئے اور پھر وہاں سے سیدھے ٹونک چلے گئے۔ اساتذہ کرام سے ملے اور درخواست کی کہ ان کے لیے کوئی اسامی نکالی جائے۔ اتفاق سے مدرسہ میں تدریس کی کوئی اسامی خالی نہیں تھی۔ سرِدست انہیں کتب خانے میں رکھ لیا گیا، کہ وہ فہرست سازی کی خدمات انجام دیں۔ حق محنت پانچ روپے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ انہیں دارالعلوم دیوبند یاد آگیا وہ کیسے کیسے جید علما کے نورِ نظر تھے۔ ساتھیوں میں ممتاز تھے اور یہاں کتب خانے کی فہرست سازی۔ تدریس بھی ہوتی تو شوق کی تسکین تو ہوتی۔ انہیں شش و پنج میں دیکھ کر یہ وعدہ کیا گیا کہ مدرسے میں جونہی کوئی اسامی نکلے گی انہیں شعبہ تدریس میں رکھ لیا جائے گا۔ وہ فہرست سازی... کا کام کرنے لگے۔

ایک مہینے بعد ہی مدرس کی ضرورت پیش آئی۔ انہیں رکھ لیا گیا۔ مشاہرہ پندرہ روپے طے ہوا۔ فہرست سازی بھی کرتے رہے۔ اس طرح بیس روپے ماہانہ کی آمدن ہو گئی۔ وہ یہاں تین چار مہینے کام کرتے رہے لیکن سوچتے ضرور رہے کہ یہاں ترقی کا تو کوئی امکان نہیں۔ اس چھوٹی سی

ایک مکتوب

''آپ سے دل کی بات عرض کرتا ہوں۔ دینی خدمت کا شعور دماغ میں جب سے پیدا ہوا ہے ذہنی طور پر میرا دماغ ہمیشہ اس پہلو کو سوچتا رہا ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم اقوام تک اسلام کو آگے بڑھانے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو زندہ کرنے کی کوشش لاحاصل سی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی تازہ خون اسلام کی رگوں میں کسی راہ سے اگر آجائے تو ممکن ہے کہ یہ اس کی حرارت سے ان پُرانے تھکے ہوئے مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو مگر براہِ راست ان کے جگانے اور جھنجوڑنے کے کام کو قریب قریب مردوں کو جگانے کے ہم معنی سمجھ رہا ہوں۔ جب حکیم الامت (حضرت تھانوی) کی اسّی سال کی حکومت میں یہ سوئے رہے اور کچھ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں کون آیا ہے اور کون چھوڑ کر چلا گیا ہے تو اب دوسروں سے متاثر ہوں گے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی بہار ہی ممکن تھا کہ معیار ہو جاتا لیکن اس کا دل قطعاً بدل گیا اور اب تو اسلام سے یہ صوبہ بہت دور ہو گیا۔

(بنام سید سلیمان ندوی)

ریاست میں اسی تنخواہ پر کام کرنا پڑے گا۔ دنیا بہت بڑی ہے گھوم پھر کر دیکھا تو جائے۔ شاید کوئی بڑی اسامی مل جائے۔ جوانی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ اپنی قابلیت کا عرفان بھی تھا۔ برطانوی قلمرو میں جانے کا فائدہ نہیں تھا۔ علما کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہائی اسکولوں میں مولوی رکھے جاتے تھے لیکن مشاہرہ وہاں بھی کم تھا۔

کانوں میں آوازیں پڑتی رہتی تھیں کہ ریاست حیدر آباد بہت بڑی اسلامی ریاست ہے۔ وہاں علما کی قدردانی بھی ہے اور ان پر خرچ کرنے کے لیے ریاست کے پاس پیسے بھی بہت ہیں۔ وہ وہاں جانے کے بارے میں سوچتے رہے اور بالآخر فیصلہ کر لیا۔

یہ ارادے دل ہی دل میں بن رہے تھے۔ کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر یہاں سے نکل بھی گئے تو تنہا جانا ہوگا۔ یہ تنہائی بھی کاٹ لی جائے لیکن

چھپ کر نکلنا ہوگا۔ کوئی ساتھ تو ہو شریک راز تو ہو۔ آخر اپنے ایک مخلص دوست کو شریکِ راز کرنا پڑا۔

"مجھے مدرسے والے بہ خوشی ٹونک سے نہیں جانے دیں گے۔ اسٹیشن یہاں سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ہے۔ رات کے وقت نکلنا ہے، کسی ایسی سواری کا بندوبست کردو جو مجھے اسٹیشن تک پہنچادے۔"

سواری کا بندوبست ہوگیا۔ اسٹیشن پہنچے اور حیدرآباد کا ٹکٹ لے کر راہی دکن ہوئے۔ راستے بھر سوچتے گئے تھے کہ نکل تو آیا ہوں، ٹھہرنے کا بندوبست کہاں ہوگا؟ ذہن پر بہت زور ڈالا۔ کوئی نام ایسا ذہن میں نہیں آیا جو واقف کار ہو اور حیدرآباد میں رہتا ہو پھر مشہور عربی مدرسہ نظامیہ کا نام ذہن میں آیا۔ شاید وہ لوگ میرے مولوی ہونے کا خیال کرلیں۔

حیدرآباد پہنچتے ہی وہ مدرسہ نظامیہ پہنچ گئے ایک طالب علم باہر نکلا۔ انہوں نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ وہ مدرسہ عربی دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہیں اور یہاں گھومنے پھرنے اور مدرسہ نظامیہ کا انتظام انصرام دیکھنے آئے ہیں۔ طالب علم ظاہر کرنا اس لیے ضروری تھا کہ طالب علم کو اجنبیت نہ ہو۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے طلبہ بھی آکر ملنے لگے۔ ہنسی مذاق شروع ہوگیا جیسا کہ طالب علموں میں ہوتا ہے۔ قیام کا بندوبست ہوگیا تھا لیکن جلد از جلد اسے کوئی دوسرا انتظام کرنا تھا ورنہ طالب علم کہتا کہ گھومنے پھرنے آئے تھے یہ تو گلے ہی پڑ گئے۔

قدرت جب مدد کرنے پر آتی ہے تو یوں کرتی ہے۔ دوسر دن وہ اس طالب علم کے کمرے سے نکلے تو ایک شناسا چہرے پر نظر پڑی۔ یہ ان کے ساتھ ٹونک میں پڑھے ہوئے ایک ساتھی مولوی شاہ سید مقبول احمد تھے۔ مہار شتر کے رہنے والے تھے اور پیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مولانا گیلانی کی نظر ان پر پڑی۔ "اگر میرا خیال غلط نہیں تو تم مقبول احمد ہی ہونا؟"

"اور تم مناظر احسن گیلانی؟" انہوں نے بھی فوراً پہچان لیا۔ "مگر تم یہاں کہاں؟"

"اور تم؟"

"میں تو یہاں کسی کام سے آیا تھا مگر تم کیا یہاں پڑھنے آگئے ہو؟"

"پڑھنے تو نہیں آیا۔ دیوبند سے دورۂ حدیث مکمل کرکے نوکری کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

"مل گئی نوکری؟"

"ابھی کہاں، رات ہی کو تو پہنچا ہوں۔ قیام کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی یہاں آگیا۔"

"مناظر، یہ ریاست ہے۔ یہاں کسی کو اس کی قابلیت پر نوکری نہیں ملتی جب تک کوئی ایسی شخصیت تم پر مہربان نہ ہوجائے جن کا براہِ راست تعلق میر عثمان علی خاں نواب حیدرآباد سے نہ ہو، کیا سمجھے؟"

"اب ایسی شخصیت کہاں سے لاؤں؟ خیر اللہ مالک ہے۔"

"اب میں مل گیا ہوں۔ یہ مشکل بھی حل ہوجائے گی۔ میں تو دو ایک روز میں حیدرآباد سے چلا جاؤں گا۔ آؤ میں تمہیں ایسی شخصیت سے ملوادوں جس سے تعلق رکھو گے تو کام بن جائے گا۔"

"کون ہے وہ ذاتِ شریف؟"

"انوار اللہ خاں۔ امور مذہبی کے وزیر اور اس مدرسے کے جہاں تم کھڑے ہو سرپرست بھی ہیں۔ کیا پتا تمہارے لیے کوئی اسامی یہیں نکل آئے۔" وہ اس کے ساتھ مولانا انوار اللہ کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہ ابھی مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ ایک صاحب پر نظر پڑی۔ ان کا نام نثار احمد تھا اور یہ اجمیر شریف کی درگاہ کے متولی تھے۔ مولانا گیلانی کی ملاقات ان سے اجمیر میں ہوچکی تھی اور اس وقت وزیر صاحب کے مہمان تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ مولانا انوار اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کا تعارف نہایت اچھے الفاظ میں کرایا۔ اس میں آپ کی خطابت کا تذکرہ خاص طور پر شامل تھا کیونکہ اجمیر میں وہ اس کا مشاہدہ کرچکے تھے۔

تعارف کچھ اس انداز میں ہوا تھا اور ایسے معتبر آدمیوں نے کیا تھا کہ مولانا انوار اللہ کا متاثر ہوجانا لازمی تھا۔ خود مولانا گیلانی کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی اور گفتگو کا انداز ایسا دلکش تھا کہ وزیر موصوف ان کی خبر گیری کے لیے مجبور ہوگئے۔

"آپ کا قیام اس وقت کہاں ہے؟"

"مدرسہ نظامیہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"وہاں تو آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ میرے مکان میں بہت گنجائش ہے۔ آپ یہاں کیوں نہیں آجاتے؟"

"پھر آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"اہلِ علم کی دی ہوئی تکلیف میں بھی راحت ہوتی ہے۔ بس آپ یہاں آجائیں۔" مولانا نے اسی وقت کسی کو بھیجا اور مولانا کا سامان مدرسہ نظامیہ سے وزیر کی کوٹھی پہنچ گیا۔ ایک کمرا انہیں دے دیا گیا اور نوکروں کو ہدایت کردی گئی کہ مولانا کو کوئی

تکلیف نہ ہونے پائے۔

مولانا انوار اللہ صرف وزیر نہیں تھے بلکہ عالمِ دین اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ رات میں درس دیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے علما اس درس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا گیلانی بھی اس میں شریک ہونے لگے۔ ایک رات ابن عربی کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" پر بحث کی جارہی تھی۔ مولانا گیلانی نے اس کتاب پر ایسی پرزور تقریر کی کہ علما کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکا فتوحات مکیہ جیسی مشکل کتاب پر ایسی پرمغز تقریر کرسکتا ہے۔ خود وزیر صاحب کو اپنے انتخاب پر فخر ہورہا تھا۔

جب درس ختم ہوا تو ملا مراد نے مولانا گیلانی کو دوسرے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کرلیا۔ یہ دعوت دوستی میں بدل گئی۔ جلد جلد ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کتابوں کے کاروبار کی وجہ سے ملا کابلی کی شناسائی بہت سارے اہلِ علم سے تھی۔ حیدرآباد میں اہلِ علم کی کمی نہیں تھی۔ ملا کابلی کے ذریعے مولانا گیلانی کے تعلقات وسیع ہونے لگے۔

"آپ نے مہاراجا کشن پرشاد کا نام تو سنا ہوگا؟" ملا کابلی نے ایک دن کہا۔

"جی ہاں، کوئی حیدرآباد آئے اور یہ نام نہ سنے۔"

"بس تو پھر کل تیار ہوکر آجایئے مہاراجا کی طرف چلنا ہے۔" حیدرآباد میں دو شخصیات نہایت ممتاز تھیں۔ ایک مولانا انوار اللہ اور دوسرے مہاراجا کشن پرشاد۔ وزیر اعظم حیدرآباد کے پیش کار بلکہ اپنی علمی خدمات کی وجہ سے یہی سب سے اہم تھے۔ نواب کے بہت منہ چڑھے تھے۔ داد و دہش میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

ملا کابلی انہیں لے کر مہاراجا کی مجلس میں حاضر ہوئے اور مولانا کا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا کہ مہاراجا کو مبالغے کا گمان ہونے لگا۔ انہوں نے محض امتحان لینے کے لیے "وحدت الوجود" کا مسئلہ چھیڑ دیا کہ دیکھیں مولانا کیا کہتے ہیں؟ مولانا شیخ الہند کے تربیت یافتہ تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی آنکھوں دیکھے ہوئے تھے۔ اس مسئلے پر بولنا شروع کیا تو مہاراجا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک ایک نکتے کی وضاحت ہوتی چلی جارہی تھی۔ مہاراجا خود عالم تھے۔ اس مسئلے کے ایک ایک پہلو سے واقف تھے لیکن ایسی تشریح اس سے پہلے انہوں نے نہیں سنی تھی۔

"میں تو آپ کی کم عمری سے دھوکا کھا گیا تھا۔ میری طرح کئی دوسرے بھی آپ کی قدر نہیں کرسکیں گے جب تک آپ کے جوہر اُن پر نہ کھل جائیں۔ میں چند علما کو جمع کرتا ہوں۔ کیا تم ان کے سامنے تقریر کروگے؟" مہاراجا نے ان سے کہا۔

"کوئی مضائقہ نہیں جو کچھ میں سمجھا ہوں انہیں بھی سمجھادوں گا۔" تاریخ مقررہ پر مہاراجا کی کوٹھی میں انتظام ہوگیا۔ علمائے وقت جمع ہوگئے۔ مولانا گیلانی کی عمر اس وقت بائیس تئیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ علما یہ سوچ ضرور رہے ہوں گے کہ وحدت الوجود جیسا مسئلہ یہ نوخیز لڑکا کیا سمجھا سکے گا لیکن جب وہ بولنے کھڑے ہوئے تو دلائل ایک طرف کھڑے تھے، اندازِ تقریر دلوں پر چھریاں چلا رہا تھا۔

گفتگو ختم ہوئی تو سب یک زبان ہوکر کہہ اُٹھے کہ ایسا تقریر کرنے والا انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اسے نواب عثمان علی خاں سے بھی ملوایا جائے۔ ان کے بہت کام آئے گا۔ ندیم خاص بن کر رہے گا اور عیش کرے گا۔

اس واقعے کے بعد مہاراجا ان کے گرویدہ ہوگئے۔ اصرار ہونے لگا کہ وہ مولانا انوار اللہ کی مہمانی ترک کرکے مہاراجا کے گھر آجائیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئے البتہ یہ وعدہ کرلیا کہ آتے جاتے رہیں گے۔

مہاراجا سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ علمی مسائل پر گفتگو بھی ہوتی رہی لیکن جب کئی مہینے گزر گئے تو مولانا کو احساس ہوا کہ جس مقصد کے لیے وہ حیدرآباد آئے تھے وہ تو راستے ہی میں رہ گیا۔ میں تو مہاراجا کا ندیم خاص بن کر رہ گیا ہوں۔ معاش کا کوئی سلسلہ تو بنتا نظر ہی نہیں آتا۔ اس عرصے میں انہیں یہ تجربہ بھی ہوگیا تھا کہ تعلیمی اداروں کا حال

ایک آدمی

"بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کردیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف و محقق بناسکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوتا ہے اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔"

(مولانا علی میاں)

اچھا نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے تو یہ مشورہ بھی دیا کہ حیدر آباد کے کسی انتظامی محکمے میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے۔ ایک صاحب نے پولیس کے محکمے کی طرف بھی توجہ دلائی۔ کسی نے کہا وکالت کریں۔ وہ بضد تھا کہ کام درس و تدریس ہو اور مشاہرہ معقول ہو۔ انگریزی پڑھنے والوں کو ایسی نوکریاں ملتی ہیں کہ نوکر چاکر ساتھ رکھتے ہیں تو پھر مولوی کو کیوں نہیں؟ وہ علم دین کی خدمت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔

انہوں نے تنگ آکر حیدر آباد چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا۔ مہاراجا کو معلوم ہوا تو طرح طرح کی عنایات کے لیے تیار ہوگئے مگر وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں کسی مدرسے میں نوکری دلادیں اور تنخواہ اس سے زیادہ دلادیں جو اس محکمے میں ملتی ہیں پھر آخر یہ طے کیا کہ "مولانا آپ اپنی صحبت سے مجھے فیض یاب کرتے رہیں۔ تنخواہ میں اپنی جیب سے دوں گا۔"

وہ سخت کش مکش کا شکار ہوگئے۔ یہاں رہتے تو تمام دنیاوی نعمتیں مل سکتی تھیں مگر خیال آتا تھا کہ علم دین اس لیے حاصل کیا تھا کہ ایک غیر مسلم کی مصاحب میں زندگی گزار دوں؟ بس یہ خیال آنا تھا کہ اپنی دانست میں دنیا کو لات مار کے تاریک مستقبل کے جنگل میں واپسی کا عزم کرلیا۔

دنیا مل رہی تھی۔ مہاراجا خوشامد کررہا تھا۔ بس محکمہ بدلنے کی شرط تھی مگر ذہن مطمئن نہیں ہوسکا۔ اپنی مرضی سے حیدر آباد آئے تھے اپنی مرضی سے جارہے تھے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر سوال پیدا ہوا کہ کہاں کا ٹکٹ لیا جائے۔ ذہن میں شاہ مقبول احمد کا نام آیا جن سے حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تھی اور جو مولانا انوار اللہ سے ملاقات کا ذریعہ بنے تھے۔ وہ منماڑ (گجرات) کے پاس ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مولانا گیلانی نے منماڑ کا ٹکٹ لے لیا۔

دنیا بڑی تیزی سے ان کا پیچھا کررہی تھی۔ جیسے ہی منماڑ اسٹیشن پر اترے بالکل اتفاق سے شاہ مقبول سے آمنا سامنا ہوگیا۔ گفتگو کرنے سے معلوم ہوا مقبول احمد اپنے مریدوں میں جارہے ہیں۔

"مناظر احسن بڑا اچھا ہوا جو تم مل گئے۔ میرے ساتھ ہی چلو۔ تفریح بھی ہوگی اور آپ کی تقریری صلاحیتوں سے مجھے فائدہ بھی ہوگا۔ ہزار دو ہزار تو آپ کو بھی مل ہی جائیں گے۔"

مولانا گیلانی اس سے زیادہ...... ٹھکرا کر آئے تھے۔ انہیں دنیاوی لالچ تو کیا ہوتا لیکن اس ارادے سے ساتھ ہولیے کہ چلو کچھ تفریح ہوجائے گی۔ گجرات کے کئی علاقوں میں مقبول احمد کے مریدوں کے بستیاں تھیں۔ یہ سب غریب لوگ تھے لیکن پیر صاحب آئے تھے اور ان کے ساتھ ایک مولوی صاحب بھی جو اُن غریبوں کے نزدیک بڑے پہنچے ہوئے ہوں گے جبھی تو پیر صاحب انہیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ معتقدین نے راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ مولانا کی تقریروں نے الگ دھوم مچا رکھی تھی۔ دن رات دعوتیں ہورہی تھیں۔ نذرانے چڑھائے ..... جارہے تھے۔ مقبول احمد صاحب کی ایسی گرم بازاری تھی کہ لوگ سجدے کررہے تھے۔

پندرہ بیس دن گزر گئے تو مولانا گیلانی کو احساس ہوا کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ دنیا داری کی ایک مشکل یہ بھی تو ہے جس میں وہ پھنس گئے ہیں بلکہ یہ تو ایک طرح کی فریب کاری ہے جس کا وہ بھی حصہ بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ رتی بھی تڑانے کا فیصلہ کرلیا۔

"مقبول شاہ ہم تو کل جارہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"دیکھو کہاں جانا ہوتا ہے ابھی کچھ سوچا نہیں۔"

"میرا کہا مانو تو میرے ساتھ ہی رہ جاؤ۔ دو چار مہینے بعد یہاں پھیرا لگا لیتا ہوں اور پھر بیٹھ کر کھاتا ہوں۔ تمہیں بھی کچھ کرنے کی ضرورت کیا ہے۔"

مولانا مناظر نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ دنیا پوری دلربائی کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ تمام سامانِ راحت میسر آسکتے تھے لیکن یہ تو دکانداری ہے۔ اگر یہی کرنا تھا تو حیدر آباد کیا بُرا تھا۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ گجرات سے چلے اور ایک مرتبہ پھر دیو بند آگئے۔ آتے ہی نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا عثمانی نے پوچھا اتنے عرصے کہاں رہے؟ مولانا گیلانی نے تمام احوال اجمالاً سنادیا۔

"اچھا ہوا تجربہ ہوا ہوگا۔ اب یہاں سے کہیں مت جانا۔" مولانا عثمانی نے سرِدست دس روپے ماہوار ان کے نام جاری کردیے تاکہ طعام و قیام سے سبک دوش ہوجائیں۔ قیام کا بندوبست مدرسے ہی میں ہوگیا۔ ایک ماہ بعد باقاعدہ ملازمت ہوگئی۔ تنخواہ تیس روپے ماہوار طے ہوئی۔ اس تنخواہ میں درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے۔ دیو بند سے نکلنے والے القاسم والرشید رسالوں کے مضامین کی ترتیب کا فریضہ بھی انجام دیتے اور کہیں آس پاس کے دیہات میں واعظ کی طلبی آتی تو وہاں بھی بھیج دیے جاتے۔ جاکر تقریر کرآتے گویا اب وہ مدرس بھی تھے رسالے کے مدیر بھی اور مبلغ بھی۔

انہی رسائل کے ذریعے مضمون نگاری کا بھی آغاز ہوا۔ ایسے ایسے مضامین ضبط تحریر میں لائے کہ "سلطان القلم" اور "رئیس التحریر" کے القابات سے نوازے جانے لگے۔

ان کے اساتذہ تک نے دیکھا کہ وہ ایک بڑے ادیب کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ جس موضوع اور عنوان پر قلم اُٹھاتے ایسا معلوم ہوتا کہ سمندر ہے کہ جوش مار رہا ہے۔ جدید و قدیم دونوں مواد اور معلومات کا بڑا ذخیرہ ذہن و دماغ میں جمع رہتا جو لکھتے وقت صفحہ قرطاس پر پھیلتا جاتا۔ بے ساختگی، زورِ بیان، مضبوط استدلال اور سوز و گداز جیسی خصوصیات پڑھنے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علوم و معارف کا ایک اتھاہ سمندر ہے جو کھل کھا رہا ہے۔ تاریخی مواد اس سلیقے اور ترتیب سے استعمال کرتے کہ ایک قدیم دور کے فاضل اور محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصرِ حاضر کے مصنف معلوم ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بھی مقبول ہورہے تھے۔

دیو بند سے نکلنے والے دونوں پرچوں کو اس خوبی سے ایڈیٹ کیا کہ ان کا شمار ادبی پرچوں میں کیا جانے لگا۔ تاریخ، بند پر ایسی گہری نظر ڈالی کہ وہ مولوی سے زیادہ مورخ نظر آنے لگے۔

ان کے مضامین معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، الفرقان لکھنو اور صدق جدید لکھنو میں باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔ یہی مقالات بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اور اردو کی تاریخ میں معلومات کے کئی خزانے بکھیر گئے۔

ایک مصنف کے لیے وسعت مطالعہ کی ہی نہیں قوت مشاہدہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا اس مشاہدے کے لیے بھی... کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ دورِ طالب علمی میں بھی وہ دیو بند سے باہر کچھ نہ کچھ وقت سیر و تفریح کے لیے نکال لیا کرتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران بھی جب تعطیلات ہوئیں تو وہ دیو بند سے نکلے۔

پنڈت دیانند سرسوتی آریہ سماج کے بانی تھے۔ ان کے ماننے والوں نے ایک خاص طرح کی تعلیم گاہ گروکل کی نگرانی میں جاری کر رکھی تھی جہاں ہندو طلبہ کو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا کو اس درس گاہ کے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

وہ ان دنوں رڑکی میں تھے۔ وہاں سے یہ علاقہ قریب تھا لہٰذا وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں کے لوگوں سے ذکر کیا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ وہ جنگل کا علاقہ ہے۔ ان دنوں برسات ہے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا لیکن مولانا بضد تھے۔ نام کے ساتھ مولانا لکھا جاتا تھا لیکن تھے تو جوان اور جوانی کس کی مانتی ہے۔ راستے کے کھانے کے لیے کچھ سامان ساتھ لیا بعض سن رسیدہ لوگوں سے راستہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا۔ ٹرین میں بیٹھے اور ہردوار آگئے۔ سوچا تھا رات کسی سرائے میں گزار لیں گے۔ سرائے اسٹیشن کے پاس ہی تھی لیکن سرائے والا کسی قیمت پر تیار نہیں تھا کہ ایک مولوی مسلمان کو قیام کی اجازت دے۔ پورا شہر ہندوؤں کا تھا۔ مسلمان دیکھنے کو بھی نہیں تھا۔ سرائے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ واپس آکر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر رات گزاری۔ صبح ہوئی تو ایک بوڑھے سادھو پر نظر پڑی۔ اس سے کانگڑی کا راستہ پوچھا۔ پہلے تو وہ بتانے سے گریز کرتا رہا پھر اسے ترس آگیا۔ اس نے بتایا فلاں جگہ جاکر کشتی سے اس پار ہوجائیں اور وہاں سے جنگل میں داخل ہوجائیں۔ وہاں اگر کوئی مل جائے تو اس سے پوچھ لینا۔ مولانا نے یہی کیا۔ گھاٹ پر پہنچ کر کشتی سے اس پار پہنچ گئے۔ سامنے جنگل کھڑا تھا۔ نہ کوئی سواری نہ مسافر۔ گٹھری بغل میں تھی جنگل کی پگڈنڈی پر چل پڑے۔ کئی چھوٹے بڑے نالے آئے جنہیں پار کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ کیا خبر کتنا راستہ طے کیا ہوگا کہ غیب سے مدد ہوگئی۔ ایک بوڑھا آدمی مل گیا۔ اس جنگل میں وہ کیا کررہا تھا نہ انہوں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔

اس بوڑھے نے کہا "میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آؤں۔" وہ ان کے ساتھ چلتا رہا یہاں تک کہ عمارت صاف نظر آنے لگی۔ "لیجیے آپ کی منزل پر پہنچ گئے۔ میں چلا۔" اس بوڑھے نے کہا اور واپس ہوگیا۔

مولانا اللہ کا نام لے کر عمارت میں داخل ہوئے۔ کچھ لوگ انہیں دیکھ کر ان کے گرد جمع ہوگئے اور مولانا کو پرنسپل کے پاس لے گئے۔ پرنسپل بھلا آدمی تھا بڑی گرم جوشی سے ملا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں کا لبِ لباب یہ تھا کہ اس ادارے کے قیام کا مقصد قدیم و جدید کو باہم قریب لانا ہے۔

"اس سنسان جنگل میں؟"

"یہ جگہ اس لیے منتخب کی گئی ہے کہ شہری تمدن کے زہریلے اثرات سے طلبہ محفوظ رہ سکیں اور یکسو ہوکر اپنی تعلیم میں منہمک رہیں۔ یہاں وہی آئیں گے جو علم کی آشار رکھتے ہوں جیسے آپ آئے ہیں۔" پرنسپل نے ایک آدمی ساتھ کردیا جس نے تمام کالج دکھایا۔ کتب خانے کی سیر کرائی۔ اس کے بعد انہیں مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ ظہر کا وقت ہوا تو ہلکی آواز سے اذان دے کر نماز ادا کی اور لیٹ گئے۔ عصر پڑھ کر واپسی کا ارادہ کرلیا۔ پرنسپل نے سنا تو سر پیٹ لیا۔

"مولوی جی، کیا کرتے ہیں۔ تین چار گھنٹے پیدل کا راستہ ہے۔ رستے میں رات ہوجائے گی۔ رات یہیں گزار لو سویرے چلے جانا۔"

مولانا کو جانے کی جلدی تھی وہ چل دیے۔ پگڈنڈی پکڑے گردن جھکائے چلتے رہے کنارے آئے تو آفتاب غروب ہوچکا تھا۔ کالج کا مہمان خانہ اب یاد آرہا تھا۔ وہ ایک جنگلی نالے کے کنارے کھڑے تھے جس کے ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری طرف اونچے اونچے خوفناک پہاڑ تھے۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہورہا تھا۔ سوچا اب جو ہو سو ہو نماز تو پڑھ لی جائے۔ ابھی نماز ختم کرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تھے کہ ایک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ دیکھا تو کچھ لوگ بیل ہنکاتے آرہے تھے۔ وہ دوڑ کر ان لوگوں کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ اس جنگل سے نکلنا نصیب ہوا پھر وہی راستہ اختیار کیا۔ ہردوار اسٹیشن پہنچے اور رڑکی ہوتے ہوئے دیوبند واپس آگئے۔

وہ بڑے بڑے خواب لے کر حیدرآباد گئے تھے۔ وہاں سب کچھ مل بھی سکتا تھا لیکن خدمت دینی کا جذبہ انہیں دیوبند لے آیا۔ یہاں تنخواہ صرف تیس روپے تھی لیکن وہ اس میں خوش تھے۔ دنیا کو ٹھکرا کر دین کی طرف آگئے تھے۔

کچھ مہینوں بعد وطن کی یاد آئی۔ دارالعلوم سے رخصت لی۔ انہیں گیلانی سے شدید محبت تھی۔ گیلانی کو اپنے نام کا جزو بنایا تھا۔ وطن کی نشاندہی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

مسقط الراس وہ وطن پیارا
عہد طفلی کا اپنے گہوارہ
وہ درختوں کی اس کے رعنائی
اور باغوں کے حسن و زیبائی

گیلان پہنچ کر عزیز و اقارب سے ملاقاتیں اور بچپن کے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کا لطف ہی عجیب تھا۔ پختہ سڑک کے کنارے بنی بیٹھک میں ہر وقت دوستوں کا ہجوم رہنے لگا۔ ایسی ہی ایک محفل میں مولوی سید علی عظیم سے ملاقات ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک قدیم فارغ مولوی تھے۔ مولانا گیلانی ان سے نہایت تپاک سے ملے پھر وہ تقریباً روز آنے لگے۔ ایک دن آئے تو ملاقاتیوں میں سے کوئی موجود نہیں تھا اور وہ غالباً اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ میدان صاف دیکھتے ہی بات چھیڑ دی۔

"آپ کو دیوبند والے کتنے پیسے دیتے ہیں؟"

"صرف تیس روپے ماہوار۔"

"صرف...... آپ جیسی شخصیت اور تیس روپے۔"

"میری شخصیت ہی کیا۔ آپ تو وہاں پڑھ چکے ہیں۔ وہاں کیسے کیسے جید علما موجود ہیں۔"

"میں نے سنا ہے آپ حیدرآباد بھی تشریف لے گئے تھے۔"

"وہاں خدمت دینی کا موقع نہیں مل سکا جو دیوبند میں مل رہا ہے۔"

"آپ یہ خدمت تو گھر سے قریب بہار میں رہ کر بھی انجام دے سکتے ہیں اور مشاہرہ بھی شاید اس سے کچھ زیادہ ہی ملے۔"

"یہاں ایسی کون سی درس گاہ ہے جس کی آپ بات کررہے ہیں؟"

"درسگاہیں دس بن جائیں گی۔ اس وقت تو پروگرام یہ ہے کہ تمام علما کو متحد کیا جائے اور ایک پارٹی جمعیت العلما بنائی جائے۔ اس کا پہلا اجلاس قصبہ بہار شریف میں ہورہا ہے۔ سوچیے دین کی یہ کتنی بڑی خدمت ہوگی کہ تمام علما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوجائیں پھر ہم اس جمعیت کو پورے ملک میں پھیلائیں گے۔" انہوں نے اس طرح کی اور بھی باتیں کیں بڑے بڑے عزائم کا ذکر کیا۔

مولانا ان کی باتوں میں آگئے خاص طور پر اس لیے کہ وطن سے قریب رہیں گے۔ مولانا گیلانی اس سلسلے میں خانقاہ رحمانی مونگیر گئے جہاں بانی ندوۃ العلما لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری سے ملاقات ہوئی۔ ان کی باتوں سے بھی ظاہر ہوا کہ وہ بھی سید علی عظیم کی رائے کی تائید میں ہیں۔

اس خانقاہ کو مرکز بنایا گیا اور بہار شریف میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے مناظر گیلانی ہی کو بھیجا گیا۔ جہاں انہیں زورِ خطابت سے علما کو قائل کرنا تھا۔

مولانا دیوبند سے ایک ماہ کی رخصت پر آئے تھے مونگیر میں تین مہینے رہ گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے خط لکھ کر دیر کی وجہ دریافت فرمائی۔ آپ نے لکھ دیا کہ کچھ لوگوں کا مشورہ ہے کہ بہار میں رہ کر دین کی خدمت کروں۔ یہ خدمت کیا ہے یہ بھی تحریر کردیا۔

عثمانی صاحب کا پھر خط آیا۔ انہوں نے مولانا گیلانی کو نصیحت کی تھی اور لکھا تھا کہ تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ دارالعلوم آجاؤ اور یہ بھی لکھا تھا کہ دارالعلوم اب تمہیں پچاس روپے دے گا۔

اِدھر چار مہینے کے قیام کے بعد ان پر یہ بھی کھل گیا تھا کہ انہیں جس کام پر لگادیا گیا ہے وہ کامیاب ہونے والا نہیں بہار کے لوگ قدر ناشناس ثابت ہورہے تھے۔ باتیں بنانے والے بہت تھے وقت پر کوئی کام نہیں آرہا تھا۔ ایسے میں دیوبند سے خط آگیا تو انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ دیوبند واپس چلے جائیں۔

مولانا گیلانی ایک مرتبہ پھر دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔ ابھی دارالعلوم آئے ایک مہینہ گزرا تھا کہ کلکتہ میں ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک انگریزی اخبار نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نامناسب الفاظ شائع کیے۔ اس بدکلامی نے کلکتہ کے مسلمانوں اور خاص طور سے علما میں ہیجان برپا کردیا۔ حکومت برطانیہ کی تھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ویسے ہی نفرت تھی۔ سیاسی تحریکیں چلنے لگی تھیں۔ ایسے میں گستاخی عمل میں آگئی۔ جگہ جگہ ہنگامے پھوٹ پڑے۔ خدشہ تھا کہ یہ ہنگامے کسی بڑے فساد کا روپ دھارلیں گے۔ کل ہند پیمانے پر یہ فیصلہ کیا گیا باضابطہ ایک مجلس بنائی جائے تاکہ اس قسم کے بے ادبیوں کی راہ ہمیشہ کے لیے مسدود کردی جائے۔ کلکتہ میں سارے ہندوستان سے علما کو طلب کرکے ایک اجتماع عظیم کیا جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ آئندہ اس قسم کی ناہمواریوں کی وہ ضمانت لے۔

کلکتہ کے تاجروں کی جانب سے دارالعلوم کو خط لکھا گیا کہ دارالعلوم سے علما تشریف لائیں اور سارے ذمے دار حضرات ابھی زحمت سفر برداشت کریں۔ اس درخواست پر غور کیا گیا۔ مطالبہ بالکل جائز تھا۔ یہ سانحہ ایسا تھا کہ علمائے وقت کو آنا چاہیے۔ کلکتہ میں جلسے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ اس وفد کو ضرور جانا چاہیے۔ طے کیا گیا مہتمم دارالعلوم حافظ محمد احمد، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا انور شاہ کشمیری پر مشتمل وفد تیار کیا جائے۔ اس وفد میں مناظر احسن گیلانی بھی شامل ہوں۔ ان کے زورِ خطابت کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ کلکتہ اطلاع بھیج دی گئی کہ وفد فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہے۔

سب کو معلوم ہوگیا تھا کہ علمائے دیوبند کا وفد کلکتہ جارہا ہے۔ راستے میں آنے والے اسٹیشنوں پر عوام کا ہجوم تھا جو ان علما کے استقبال کے لیے جمع ہوگئے تھے اور اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں انہیں اگلے اسٹیشن کی طرف روانہ کررہے تھے۔ ان ہی روح پرور مناظر کے درمیان گزرتی ہوئی یہ

سوانحی خاکہ

نام: سید مناظر احسن گیلانی
والد: حافظ ابوالخیر
تعلیم: مدرسہ خلیلیہ (ٹونک)، دارالعلوم، دیوبند
ملازمت: مدرسہ خلیلیہ (ٹونک)، دارالعلوم (دیوبند)، جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)
پیدائش: 9 ربیع الاوّل 1310ھ بہ مقام گیلانی ضلع پٹنہ
وفات: 5 جون 1956ء
تدفین: گیلانی ضلع پٹنہ

ٹرین الہ آباد پہنچی۔ اسٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر پریشان ٹہل رہا تھا پھر وہ اس ڈبے کی طرف لپکا جس میں یہ وفد سفر کررہا تھا۔

"حافظ محمد احمد کون سے ہیں؟ ان کے نام کلکتہ سے میرے پتے پر تار آیا ہے۔ یہ تار انہیں پہنچانا ہے۔" کلکتہ کا نام سن کر سب کے کان کھڑے ہوئے کہ اب کیسا تار آگیا۔ یہ تار ظاہر ہے انگریزی میں تھا اور یہاں سب عربی داں، تار کا ترجمہ اسٹیشن ماسٹر نے پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا کہ "آپ لوگ واپس ہوجائیں کلکتہ کی حالت حد سے زیادہ نازک ہوتی چلی جارہی ہے۔ تفصیل خط سے معلوم ہوگی۔" تار کا مضمون سنتے ہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے جلدی جلدی سامان اُتارنے کا حکم دیا۔

"سب لوگ اُتر جائیں۔ صرف مولانا گیلانی اسی ٹرین سے کلکتہ جائیں۔ اگر جلسہ ہوتا ہے تو اس میں شریک ہوں اور تقریر کریں ورنہ وہاں جاکر حالات سے مطلع کریں۔" سب لوگ اُتر گئے۔ مولانا گیلانی کو اسی ٹرین سے کلکتہ جانا تھا لہٰذا وہ بیٹھے رہے اور ٹرین نے رفتار پکڑلی۔

انہوں نے دیوبند سے روانہ ہوتے وقت اپنے چھوٹے بھائی مکارم احسن کو خط لکھ دیا تھا کہ علما کا وفد کلکتہ جارہا ہے۔ میں بھی اس میں شریک ہوں۔ تم پٹنہ اسٹیشن پر آجانا۔ ملاقات ہوجائے گی چنانچہ پٹنہ پر گاڑی رکی تو بھائی کو موجود دیکھا۔ ملاقات ہوئی۔ مکارم احسن کو جب معلوم ہوا کہ وفد واپس جاچکا ہے اور مولانا اکیلے کلکتہ جارہے ہیں تو مکارم نے انہیں بھی روکنے کی کوشش کی۔

"کلکتہ کے حالات بہت نازک ہیں کوئی آپ کے ساتھ

نہیں ہے آپ بھی وہاں نہ جائیں۔''

''میرے بڑوں کا حکم ہے مجھے تو ضرور جانا ہے اور پھر معاملہ حرمتِ رسولؐ کا ہے۔'' بھائی نے آپ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن آپ نہ مانے۔ اسی کش مکش میں ٹرین نے سیٹی دے دی۔ بھائی ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا لیکن مولانا ٹرین پر چڑھ چکے تھے۔ ٹرین نے رفتار پکڑی۔ بھائی پیچھے رہ گیا گاڑی آگے بڑھ گئی۔

ہاوڑہ اسٹیشن پر گاڑی رکی تو مولانا نے دیکھا پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کھچا کچھ بھرا ہوا ہے۔ گاڑی رکتے ہی لوگ ٹوٹ پڑے۔ ایک ایک ڈبے کو جھانکتے پھرتے تھے علما کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایک ڈبے میں انہیں مناظر احسن گیلانی مل گئے جن سے ساری صورتِ حال کا علم ہوا۔

''آپ لوگوں نے تو تار دے دیا تھا کہ آپ لوگ نہ آئیں۔ وفد الہ آباد ہی سے واپس ہو گیا مجھ فقیر کو بھیج دیا ہے میں حاضر ہوں۔''

''تار تو کسی نے بھیجا ہی نہیں۔'' ہر شخص کو حیرت تھی کہ ایسا تار کس نے بھیج دیا؟ یہ ضرور کسی سازش کا حصہ ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مولانا کو ایک کار میں بٹھا کر مولوی عبدالرحیم اپنی کوٹھی پر لے گئے جہاں دیوبند کے وفد کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا لیکن وفد میں تھا کون؟ ایک مناظر احسن گیلانی۔

لوگ مایوس ہو رہے تھے کہ جلسہ سونا ہو جائے گا۔ وفد تو آیا ہی نہیں۔ یہ راز اب تک نہیں کھل سکا تھا کہ تار کس نے بھیجا تھا اور کیوں بھیجا تھا؟ یہ معمّا ابھی کھل نہیں سکا تھا کہ ایک صاحب عبدالصمد.... نام کے مولانا کو تنہا دیکھ کر ان کے پاس آئے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ نزدیک میں کوئی ہے تو نہیں پھر سرگوشی میں کہا۔

''مولانا تار میں نے دیا تھا۔ کسی سے تذکرہ نہ کیجیے گا ورنہ عوام میری دھجیاں اُڑا دیں گے۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا جو میں نے کیا۔ حکومتی حلقوں میں میرے بہت سے جاننے والے ہیں۔ ان سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ علما کو شہید کرنے کا منصوبہ بن چکا ہے۔ یہ کوٹھی جہاں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں خفیہ پولیس کی نظروں میں ہے۔ آپ کے آنے جانے پر نظر رکھی جائے گی۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ وہیں سے جلسہ گاہ میں تشریف لے جایئے گا۔ یہاں سے تو کوئی آپ کو نکلنے بھی نہیں دے گا۔'' مولانا نے صاحبِ خانہ سے اجازت لی اور عبدالصمد کے گھر منتقل ہو گئے۔

حکومت اور مسلمانوں کے درمیان تنازع بڑھتا جا رہا تھا۔ مسلمان جلسہ کرنے پر بضد تھے اور حکومت اس جلسے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ زکریا اسٹریٹ کی مشہور مسجد ناخدا میں مسلمانوں پر گولیاں چلا دی گئیں۔ بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے۔ کیسا جلسہ کہاں کا جلسہ۔ اب تو مولانا گیلانی کے دل میں جذبہ شہادت موجزن ہوا۔ کتنی عزت کی بات ہے مسلمان تو حرمتِ رسولؐ کے لیے اپنا خون بہا رہے ہیں اور میں گھر میں بیٹھا ہوں۔ وہ حاجی عبدالصمد سے بار بار کہتے تھے کہ مجھے چھوڑ دیجیے تاکہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔ حاجی صاحب انہیں روک رہے تھے کہ آپ کی جان دوسروں سے زیادہ قیمتی ہے۔ حاجی صاحب نے گھر کے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔ مولانا کا حال یہ تھا کہ ہر دروازے سے سر ٹکراتے تھے۔ حاجی صاحب کو تھوڑی دیر کے لیے یہ شک ہونے لگا کہ مولانا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مولانا کو ٹھنڈا کیا۔

''میں نے کچھ لوگوں کو بلایا ہے۔ وہ آ جائیں تو پھر چلتے ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' اسی کش مکش میں رات ہو گئی۔ چند نوجوان موٹر کار لے کر آ گئے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ حاجی صاحب نے بلایا تھا یا وہ لوگ خود آئے تھے۔

''مسلمانوں نے جلسے کا اہتمام کرایا ہے۔ آپ کار میں بیٹھیں تاکہ ہم آپ کو جلسہ گاہ تک لے جائیں۔'' مولانا کار میں سوار ہو گئے۔ یہ نوجوان انہیں شہر سے باہر کسی علاقے میں لے گیا اور مولانا کو ایک مکان میں جا کر بٹھا دیا۔

''آپ لوگ تو جلسہ گاہ میں لے جانے کے لیے لائے تھے۔''

''جلسہ گاہ میں پولیس پہنچ گئی ہے۔ جلسہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے آپ کو اسی مکان میں رہنا ہو گا۔ باہر جانے کا خیال بھی نہ کیجیے گا۔'' اب مولانا کو احساس ہوا کہ وہ قید کر لیے گئے ہیں۔ ان کی پوری نگرانی کی جا رہی ہے۔ خدا جانے یہ حکومت کے آدمی تھے یا ان کے ہمدرد؟

اخبارات پابندی سے مل رہے تھے۔ ان اخباروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ہندو مسلم فساد چھڑ گیا ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگ قتل کیے جا رہے ہیں۔ ٹرینیں تک محفوظ نہیں رہیں۔ ایک دن ایک اخبار میں پڑھا پٹنہ اور گیا جانے والی ٹرین کے راستے میں کوئی پُل توڑ دیا گیا ہے۔ ٹرین کی آمد و رفت بند ہے۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئی

تھیں۔ مولانا سے وعدہ لیا گیا کہ اگر وہ کلکتہ شہر میں داخل نہ ہوں تو ان کو دیوبند بھیجنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے وعدہ کر لیا۔

بہاری طالب علموں نے اسٹیشن پہنچا کر ٹکٹ لیا اور ناگپور میل میں بٹھا دیا اور سمجھا دیا کہ راستے میں جنکشن آئے گا وہاں ٹرین بدل جائے گی سکندر آباد، حیدر آباد والی گاڑی میں بیٹھ جانا۔ وہاں سے منمار ہو کر دیوبند پہنچ جاؤ گے۔

گاڑی سکندر آباد پہنچی تو معلوم ہوا کہ کل بقر عید ہے۔ اب اگر گاڑی میں بیٹھے رہتے تو عید گاڑی میں گزر جاتی آپ حیدر آباد میں اُتر گئے کہ کل عید کی نماز پڑھ کر دیوبند کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

اپنے ایک خاص عزیز مولوی سید محی الدین حیدر آبادی کا خیال آیا۔ وہ اسٹیشن سے سیدھے ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ جس حلیے میں وہ تھے اس میں کسی بے تکلف دوست کے گھر ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ محی الدین گھر سے نکلے اور دوست کو اس حال میں دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ سفر کی گرد چہرے پر، ایک لنگی اور لمبا کرتا بدن پر۔ یہ تھے رئیس التحریر اور سلطان القلم۔

ایک نیا جوڑا کلکتہ کے جلسے میں پہننے کے لیے ساتھ رکھ لیا تھا۔ صبح زیب تن کیا اور عید کی نماز کے لیے چلے گئے۔ ارادہ یہی تھا کہ نمازِ عید ادا کرتے ہی دیوبند کے لیے روانہ ہو جاؤں گا لیکن یہ قیام بڑھتا گیا۔ محی الدین کا اصرار بڑھتا گیا اور مولانا مجبور ہو گئے۔ دیوبند کو خط لکھ دیا کہ کلکتہ سے بخیر و خوبی واپس آ گیا ہوں۔ اب حیدر آباد میں ہوں دوستوں نے روک لیا ہے۔ بہت جلد دیوبند کا قصد کروں گا۔

مولانا حمید الدین فراہی نے درسِ قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ مغرب کے بعد یہ مجلس ہوتی تھی۔ حمید الدین فراہی تقریر فرماتے تھے۔ لوگ شکوک پیش کرتے تھے۔ مولانا حمید ان کے جوابات دیتے تھے۔

مولانا محی الدین، مولانا گیلانی کو ایک روز اس مجلس میں لے گئے۔ یہاں کا پاکیزہ ماحول اور مولانا حمید الدین فراہی کا اندازِ خطابت ایسا بھایا کہ اس مجلس میں تواتر سے حاضر ہونے لگے۔ یہ بھول ہی گئے کہ دیوبند واپس بھی جانا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی سے تعلقات استوار ہوئے تو وہ بھی مولانا گیلانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان دنوں حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آنے والا تھا۔ مولانا حمید الدین فراہی مدرسہ دارالعلوم کے پرنسپل تھے۔ یہ

یونیورسٹی جس کی بنیاد رکھی جا رہی تھی انہی کی تحریک و تخیل کا کرشمہ تھی۔ مولانا حمید الدین فراہی.... کو معلوم تھا کہ سال ڈیڑھ سال بعد جب یہ جامعہ اپنا کام شروع کرے گی تو اس کے لیے اساتذہ کی ضرورت پیش آئے گی۔ انہوں نے کام کے لوگوں کا ابھی سے انتخاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے مولانا پر زور دینا شروع کیا کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے لیے درخواست دے دیں۔ مولانا کا دل تو دیوبند میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا فراہی نے جب بہت مجبور کیا تو انہوں نے دیوبند خط لکھا اور اس کی اجازت چاہی۔ دیوبند سے حسبِ منشا جواب آیا۔ دیوبند والوں کا خیال تھا کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہو گا لہٰذا انہوں نے درخواست دے دی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی حیدر آباد کے صدر الصدور تھے۔ مولانا فراہی، مولانا گیلانی کو ان کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ ''میں ان کو بطورِ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔''

اس مردِ مجاہد نے بھی فرمایا۔ ''یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔''

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے امانت داری کا حق ادا کر دیا۔ انعام و اکرام کی ایسی بارش کی کہ قدم زمین پر نہیں رکھنے دیا۔ اسی قیام کے زمانے میں وہ بیمار پڑ گئے تو شروانی صاحب انہیں علاج کے لیے اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ علاج کرایا۔ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اپنے وطن گیلان چلے گئے۔ یہاں آنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے تقرری کا خط ملا اور انہیں سامانِ سفر باندھنا پڑا۔

مولانا کی شہرت اس تقرری سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مولانا انوار اللہ اور مہاراجا کشن پرشاد ان کے علم و فضل کے قائل تھے۔ عوام اور علما ان کی فاضلانہ تقریروں کے قائل تھے۔ القاسم اور الرشید دیوبند میں مولانا کے قلم سے تحقیقی و تاریخی مضامین لکھے جا چکے تھے اور اہلِ علم سے داد پا چکے تھے۔ تدریس کی بھی خوب اچھی طرح مشق ہو چکی تھی۔ عوام میں مقبولیت بھی کسی سے کم نہیں تھی لہٰذا جب یونیورسٹی پہنچے اور لیکچروں کا آغاز کیا طلبہ کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ہندو طلبہ بھی کھنچے چلے آ رہے تھے۔

مولانا گیلانی کی وسعتِ نظر، وسعتِ فکر، علومِ دینی کے ساتھ مسائلِ حاضرہ پر ان کی علمی دیانت نہ صرف طلبہ کو اپنا گرویدہ کر لیا بلکہ ہر شعبے کا اساتذہ بھی انہیں قدر کی نگاہ سے

دیکھنے لگے۔

جامعہ عثمانیہ میں نئے علوم وافکار سے واسطہ پڑا۔ اسلامی مدارس میں ایک ہی قسم کے علوم سے واسطہ رہا تھا۔ یہاں آکر جدید تعلیم یافتہ ماہرین سے مقابلہ کرنے میں ذہن وکفر نے کسب کمال میں تیز رفتاری دکھائی۔ ان سب نے مل کر مولانا کو جدید علوم اور قدیم علوم کا سنگم بنادیا۔

مولانا گیلانی کا ذہن رسا تھا۔ مطالعے سے قلبی شغف تھا۔ حافظہ قوی رکھتے تھے۔ وقت کے کسی حصے کو ضائع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتب بینی کے ذوق نے آپ کو عالم کل بنادیا تھا۔ تفسیر وحدیث کو گھول کر پی ہی لیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی نئے علوم کی کتابیں جو سامنے آئیں۔ انہیں بھی پڑھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے طلبہ میں بھی یہی شان پیدا ہوگئی۔ وہ بھی دینیات کے طالب علم ہوتے ہوئے عصری خیالات سے ناواقف نہ رہے۔ انہوں نے ایسے طلبہ کی ایک جماعت تیار کردی جو برطانوی ہند میں انگریزوں کی آزاد خیال اور دہریت کے سامنے اسلام کا پرچم لے کر کھڑے ہوسکیں۔

یہ تمام علوم جن سے وہ جامعہ عثمانیہ میں آنے کے بعد واقف ہوئے ان کی مضمون نگاری میں نہایت کارآمد ثابت ہوئے۔ ان کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی اور اندازِ تحریر میں بھی۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مضامین کسی قدیم خیالات کے مولوی کی تحریریں ہیں بلکہ یہ مضامین ایک درد مند دل رکھنے والے مسلمان کی پہچان بن گئے۔ ان کا جو مضمون شائع ہوتا یا جو کتاب سامنے آتی دھوم مچ جاتی۔ ہفتوں تک اس پر تبصرے شائع ہوتے رہتے۔

☆☆☆

مولانا گیلانی کو قدرت کی طرف سے صاف ستھرا نفسانیت سے پاک دل ملا تھا۔ اس میں ان کے گھر کی تربیت اور جید اساتذہ کی صحبت بھی شامل تھی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں شیخ الہند کے ہاتھ پر بیعت فرما چکے تھے لیکن مرشد اوّل سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔ ذوق تصوف وہی تھا جس کی تسکین کے لیے وہ جلال الدین رومی کی مثنوی اور ابنِ عربی کی فتوحات مکیہ کا مطالعہ کرتے رہے تھے۔ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں انہوں نے محسوس کیا کسی ایسے بزرگ سے پھر رشتہ قائم کیا جائے جو راہِ سلوک طے کرچکا ہو کہ یہ راستے رہنما کے بغیر طے نہیں ہوتے چنانچہ آپ نے غور وفکر کے بعد ایک بغدادی الاصل بزرگ کو منتخب کیا کہ جس کا قیام حیدرآباد میں تھا۔ ان کا نام حبیب العبدروس تھا جو شیخ عبدالقادر جیلانی سے نسبی اور بطنی نسبت رکھتے تھے۔

ان بزرگ سے اپنا رشتہ سلوک جوڑا اور سلسلہ قادریہ میں تربیت حاصل کی اور خلافت وبیعت سے نوازے گئے مگر اپنے خاص مزاج کی وجہ سے اطمینان کامل محسوس نہیں کیا۔ چشتیت کا رنگ طبیعت پر غالب تھا۔ کسی اور بزرگ کی تلاش ہوئی اور قدرت نے آپ کو مولانا محمد حسین کی خدمت میں پہنچادیا جو شیخ محی الدین ابنِ عربی کے قالاً حالاً ترجمان تھے۔ یہاں پہنچ کر مولانا کو طمانیت قلب کا احساس ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یہاں سے بھی خلافت ملی۔ حال تو یہ ہے کہ خلافت ملتے ہی مرید بنانے کی فکر ہوجاتی ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن مولانا گیلانی کی عاجزی انہیں اس سے دور رکھتی تھی۔ حضرت گیلانی کی تقریروں میں بلا کا مجمع ہوتا تھا۔ خاص طور پر جمعہ کے دن مجمع کی شان دیکھنے کی ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ آتے تھے۔ بیعت کے لیے درخواست کرتے۔ ٹالے نہیں ٹلتے تھے لیکن آپ تیار نہیں ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ خیال آیا بھی کہ جب لوگ اتنا اصرار کررہے ہیں تو بیعت کرنا شروع کردوں۔ اس میں حرج بھی کیا ہے لیکن جب رات کو بستر پر گئے اور سوچنے لگے تو اپنا خیال آیا۔ پتا نہیں کل قیامت میں اپنا معاملہ ہی کیسے طے پائے گا مریدوں کا بوجھ کیوں اپنی گردن پر ڈالوں یہ ہمت نہیں ہوتی اور بیعت وارشاد کے اس رسمی طریقے سے ہمیشہ دور رہے جس طرح سیاست سے دور رہے حالانکہ ان سے نزدیکی رکھنے والے ان کے صاحب معرفت ہونے کے قائل اور چشم دید گواہ تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا اور اس احوال کو مولانا گیلانی کے نام ایک خط میں تحریر بھی کردیا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب سلیم ندوی حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

''میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر پڑی کہ تم طواف کررہے ہو۔ خیال آیا کہ تم آتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔ آخر کیا ماجرا ہے۔ میں خود تمہاری طرف لپکا لیکن دیکھا تم غائب ہوگئے۔ صوفیوں میں مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ کیا یہ اسی کے ظہور کی شکل تھی؟''

انہوں نے اپنی باطنیت کو بہت سے پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ یہ باطنیت کہیں طلبہ سے اخلاص میں ظاہر ہوتی تھی کبھی تصنیف کی صورت میں کبھی وعظ وتقریر کی صورت میں یہی ان کا تصوف تھا۔

☆☆☆

مولانا گیلانی تعطیل گرما گزارنے گیلان آئے ہوئے تھے۔ اچانک ایک سخت بیماری کا حملہ ہوا۔ اندرون جسم میں پھوڑے ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارا بدن پک گیا ہے۔ ایسے مہلک مرض کا علاج گیلانی جیسی چھوٹی جگہ میں کیسے ممکن تھا انہیں پٹنہ لے جایا گیا۔ اسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ ڈاکٹروں نے ہر پھوڑے کے لیے آپریشن تجویز کیا۔ یکے بعد دیگرے سات آپریشن ہوئے۔ آٹھویں آپریشن کی تیاری ہوری تھی۔ اسی رات آپ نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت فرمائی۔ اس خواب کی تفصیل آپ نے کبھی کسی کو نہیں سنائی۔

صبح ہوئی، عجیب صبح تھی۔ ڈاکٹر متحیر ہوکر پوچھ رہے تھے ''پھوڑا کہاں تھا؟'' آخر اس فیصلے پر مجبور ہوئے کہ اب آٹھویں آپریشن کی ضرورت نہیں رہی۔

سرکار کی جو نظرِ رحمت ہوئی تھی اس کا ازالہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ حضور اقدس کی شان میں نعت مبارک کہی جائے۔ بھی زبان میں نعت کہی۔

پیارے محمد جگ کے سجن
تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن
کھبیو کراہو تو درشن
تمری دوریا کیسے چھوڑوں
تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں
تمری نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھویں پہر اب دھیان یہی ہے

☆☆☆

ایک سال اور گزر گیا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی حج کی تیاری میں مشغول ہیں اور سارے انتظام سفر مہیا کررہے ہیں۔ ان کو باتیں کرتے دیکھ کر سوچتے تھے کاش وہ بھی حج کو جائیں۔ ان دنوں ہاتھ تنگ تھا پچھلے سال اتنی بڑی بیماری کے بعد اُٹھے تھے پھر سوچتے تھے کیا خبر کب ایسے ساتھی ملیں اور حج کی سعادت نصیب ہو۔ ان حضرات کی روانگی میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ باقی رہ گیا تھا کہ ایک رات دل سے مجبور ہوکر حج کا حتمی فیصلہ کرلیا۔

عبدالباری اپنے والدین کو لینے لکھنو چلے گئے۔ مولانا گیلانی پہلے عزیز واقارب سے ملنے پہلے گیلان گئے پھر لکھنو جاکر عبدالباری ندوی سے ملے۔ عبدالماجد دریابادی بھی وہیں آگئے تھے۔ یہ قافلہ بمبئی پہنچا اور وہاں سے جہاز میں سوار ہوئے۔

زیارت حرمین کا دھیان آنکھوں میں تھا۔ دل میں محبت رسولؐ پہلے سے بھی زیادہ کروٹیں لے رہی تھی۔ اسی عالم مدہوشی میں آپ جہاز کی بالائی منزل پر چلے گئے۔ بے اختیار نعت کے اشعار نوک زبان پر آگئے۔ اس عالم تنہائی میں جو نعت آپ نے کہی جو بعد میں بہت مقبول ہوئی۔

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر
ہر کام سے پچھتا کر ہر فعل سے شرما کر

☆☆☆

مولانا گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی میں جب سے استاد ہوگئے تھے دارالعلوم دیوبند کی آمدورفت تقریباً بند سی ہوگئی تھی۔

حلیہ

درمیانہ قد۔ نہ زیادہ موٹے نہ دبلے۔ رنگ سپید وسرخ۔ چہرہ گول۔ ہلکی داڑھی نہ گنجان نہ بالکل چھدری۔ پیشانی کشادہ۔ آنکھیں روشن، نہ زیادہ بڑی نہ چھوٹی۔ بال ریشم کی طرح نرم۔ وجیہہ وشکیل۔

لباس

بدن پر کرتہ، پائجامہ اور شروانی، سر پر پنج گوشہ ٹوپی، کبھی کبھی عمامہ۔ پاؤں میں سلیم شاہی۔ کبھی کبھی پمپ شو۔ شانے پر عربی رومال۔

کچھ کتابیں

حضرت ابوذر غفاری، ایک ہندوستانی صحابی، اسلامی معاشیات، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، تدوین قرآن، تدوین فقہ، تدوین حدیث، مقالات احسانی النبی الخاتم۔ ہزار سال پہلے' مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، تذکرہ شاہ ولی اللہ، کائنات روحانی، سوانح قاسمی (تین جلدیں) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔

ویسے یہ رابطہ ٹوٹا نہیں تھا۔ خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ آپ دیوبند کے نمائندے کی حیثیت سے حیدرآباد میں قیام پذیر تھے۔ آپ کے اساتذہ سے جب کوئی حیدرآباد پہنچتا تو استقبال کرنے والوں میں آپ ہی سب سے آگے ہوتے۔ اگر دیوبند پر کوئی اعتراض اُٹھتا تو جواب دینے والوں میں وہی سب سے آگے ہوتے۔

ان کے اساتذہ سے بھی ان کی یہ خدمات پوشیدہ نہیں تھیں اور وہ سب دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح مولانا گیلانی کا تعلق دیوبند سے بحال ہوجائے چنانچہ 1930 میں دیوبند کی مجلس شوریٰ میں کچھ جگہیں خالی ہوئیں تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور دوسرے اساتذہ کی کوششوں سے انہیں اس مجلس کا باضابطہ رکن منتخب کرلیا گیا۔

دارالعلوم کی سب سے ذمّے دار مجلس مجلس شوریٰ تھی۔ اس کے اراکین ہر دور میں ملک کے مشہور ترین صاحب فضل وکمال ہوتے رہے ہیں۔ اس کا رکن منتخب ہونا مولانا کے لیے اعزاز تھا۔

شوریٰ کے اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتے تھے۔ اس بہانے اپنی مادرِ علمی میں حاضری کی ایک نئی صورت پیدا ہوگئی جو ان کی تسکینِ دل کے لے بہت تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ اس مقبولیت کا سب سے زیادہ فائدہ حیدرآباد کے لوگوں نے اُٹھایا۔ پورا حیدرآباد شہر مولانا کی تقریر کا عاشق وشیدائی تھا لٰہذا جلسہ بازوں نے اس کا خوب فائدہ اُٹھایا۔ اتنے بڑے شہر میں ہر رات کہیں نہ کہیں جلسہ ہوتا۔ آپ کو مدعو کیا جاتا۔ مروت اتنی تھی کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ جلسے والے انہیں لیے لیے پھرتے رہتے۔ تقریروں کا یہ سلسلہ یوں تو سال بھر چلتا رہتا لیکن ربیع الاوّل کے مہینے میں شاید ہی کوئی دن آرام کا ملتا ہو۔

عموماً یہ جلسے رات کو ہوتے اور رات رات بھر چلتے رہتے۔ ان جلسوں کا حال بھی مشاعروں جیسا تھا۔ جلسہ کرانے والے بس اپنا کام نکالنا چاہتے تھے۔ انہیں نہ مقرر سے محبت تھی نہ اس کی صحت کا خیال۔ جلسہ گاہ تک لے جانے کے لیے تو بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی لیکن جونہی تقریر ختم ہوتی تو بسا اوقات کارکنان غائب ہوجاتے۔ جسے لائے تھے اسے چھوڑ کر آنے کا خیال تک نہ آتا۔ مولانا کے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی۔ پیدل ہی قیام گاہ کی طرف چل پڑتے۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ڈائس سے اُترے تو جوتا غائب، ننگے پاؤں گھر کی طرف چل دیے۔ کوئی اس تجربے کی طرف توجہ بھی دلاتا تو آپ مسکرا دیتے۔

”بھائی، میرے وعظ وتقریر سے عوام وخواص کے ایک بڑے طبقے کو ایمان کی لذت ملی۔ عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔ دل ودماغ کی دنیا بدلی اور دینی علوم سے شغف پیدا ہوا۔ اگر مجھے ننگے پاؤں پیدل آنا پڑا تو بھی یہ سودا کیا بُرا ہے۔“

آپ کی تقریروں کی ایسی دھوم تھی کہ نظام حیدرآباد بھی آپ کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ کسی رئیس کے یہاں آپ کی تقریر رکھی جاتی۔ مجمع سامنے ہوتا اور نظام حیدرآباد سب کی نظروں سے اوجھل الگ بیٹھا کرتے۔ واعظ کو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہاں نظام حیدرآباد بھی تشریف فرما ہیں۔

موضوع کوئی بھی ہوتا بس یہ معلوم ہوتا کہ خیالات کا دریا ہے کہ اُبلتا اور اُمڈتا چلا آرہا ہے۔ نئے نئے نکتے سامنے آتے۔ قرآنی آیات کے نئے مفاہیم سے آشنائی ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی کثرت سے تقریریں کرنے کے بعد یکسانیت کا شکار ہوجاتے۔ ہر تقریر دوسری سے الگ ہونا کمال ہی تو تھا۔

نواز بہادر یار جنگ جن کی تقریروں کا بعد میں بہت شہرہ ہوا وہ کہا کرتے تھے کہ ”انہوں نے تقریر کرنا مولانا گیلانی سے سیکھی ہے۔ میلاد النبیؐ کے جلسوں میں جب مولانا، حیدرآباد میں تقریر فرماتے تھے تو میں موٹر لیے ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔“

یونیورسٹی کے فرائض منصبی کے علاوہ روزانہ کئی کئی لیکچروں کے ساتھ وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالنا شروع کردیا۔ رات رات بھر جلسوں میں جاگنا پڑتا پھر یونیورسٹی میں مغز کھپاتے۔ اب عمر بھی بڑھتی جارہی تھی۔ صحت کا متاثر ہونا ضروری تھا۔

مخلص احباب کو فکر ہوئی۔ مولانا سے گزارش کرکے دیکھ لی گئی کہ وہ ہر جگہ نہ جایا کریں لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ”بھائی مجھے کسی کو منع نہیں کیا جاتا۔ کوئی اتنی دور سے امیدیں لے کر آتا ہے اس نے بھی کسی سے وعدہ کررکھا ہوگا کہ وہ مولانا کو لے کر آئے گا۔ میں چلا جاتا ہوں اس کی شان بڑھ جاتی ہے۔“

ان کے چند مخلص احباب نے آپس میں مشورہ کیا اور مولانا کے ازخود کہیں جانے پر پابندی عائد کردی۔ مولانا سلیمان ندوی کو ان کی تقریروں کا انچارج مقرر کرکے یہ اعلان کرادیا گیا کہ ”مولانا گیلانی اپنی رائے سے کسی جلسے میں تقریر کرنے کے مجاز نہیں جس کو تقریر کروانی ہو وہ پہلے سلیمان ندوی صاحب سے اجازت طلب کرے۔“ اس اعلان کے بعد

تھوڑے دنوں میں معاملات قابو میں آئے اور اس طرح مولانا کی گری ہوئی صحت کو کچھ سنبھالا ملا۔ یہ فائدہ بھی ہوا کہ خطابت سے کچھ فرصت ملی تو آپ تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے۔ جو مضامین انفرادی نوعیت میں شائع ہوئے تھے انہیں کتابی شکل دی۔ کئی کتابیں شائع ہوئیں جنہیں اہلِ نظر نے دلوں میں جگہ دی۔ ان کتابوں کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ ان کتابوں کے مطالعے نے ایک دو نہیں کثرت سے ایسے لوگ پیدا کردیے جو مغربی علوم وفنون کی اسناد کے باوجود اسلامی علوم وفنون کی بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دینے لگے۔

اچھا استاد وہ ہے جو نہ صرف تعلیم دے بلکہ کردار سازی کرے۔ مولانا گیلانی یہی کام انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے طلبہ میں بیداری کی روح پھونک دی۔ طلبہ کی ایک ایسی مضبوط ٹیم تیار کی جن کے دل ودماغ اور ذہن وفکر سب مسلمان تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ اسلامیات پر خود مسلمان کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات ہورہے تھے۔ عیسائیت کا پروپیگنڈا اسلام کے خلاف ہورہا تھا۔ نوجوانوں کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جو اس پروپیگنڈے سے متاثر ہورہا تھا۔ مولانا گیلانی نے ایک طرف اپنی تصانیف کے ذریعے اس پروپیگنڈے کا جواب دیا دوسری جانب ایسے لوگ تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہے جو ان کے بعد ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔

مولانا جس طرح اسلام کی خدمت کررہے تھے وہ غیر مسلموں کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ مولانا گیلانی جب شعبہ دینیات کے صدر ہوئے تو انہوں نے یہ کوششیں کردیں کہ دینیات کو لازمی مضمون قرار دے دیا جائے۔ برطانوی عہد تک ان کی یہ کوششیں بارآور نہ ہوسکیں۔ اسی اثنا میں ملک آزاد ہوگیا۔ اب انہیں امید تھی کی دینیات کو بھی جدید علوم کی جگہ دی جائے گی لیکن آزادی کے بعد تو نہایت شدت سے ان کی مخالفت کی جانے لگی۔ انہیں افسوس تھا تو یہ کہ اس مخالفت میں درپردہ کچھ مسلمان بھی شامل ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں پہلے کی طرح دینیات ضروری طور پر پڑھائی جائے یا اس کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کو راستے ہی سے ہٹانے کی سعی کی جانے لگی۔ اربابِ اختیار نے انہیں دائرہ المعارف کی انتظامی وعلمی کمیٹی سے خارج کردیا۔ یہی نہیں بلکہ شعبہ دینیات کے رعایتی وظائف بھی ختم کردیے۔ پی ایچ ڈی کا درجہ بھی شعبہ دینیات سے نکال دیا۔

ادھر مولانا گیلانی کی مدت ملازمت بھی ختم ہونے والی تھی۔ ان کے احباب مشورہ دے رہے تھے کہ توسیع کے لیے درخواست دیں لیکن حالات ایسے ہوگئے تھے کہ حیدرآباد سے دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔

اربابِ حل وعقد کو چونکہ کوئی دوسرا آدمی نہیں مل رہا تھا اس لیے ان کی مدتِ ملازمت میں ڈیڑھ سال کی توسیع کردی گئی۔

یہ ڈیڑھ سال بھی گزر گیا۔ جیسے جیسے ریٹائرمنٹ کے دن قریب آرہے تھے مختلف دوسری یونیورسٹیوں سے بلاوے آرہے تھے۔ بہاولپور سے وزیر تعلیم کا تار آیا لیکن آپ نے معذرت لکھ کر بھیج دی۔ سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی اس پر زور دے رہے تھے کہ پنشن لے کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آجائیں۔ بہار کے حالات ملک کی تقسیم اور اس کے آزاد ہونے کے بعد نازک ہوگئے تھے۔ بہت سے گاؤں ویران ہوگئے تھے۔ گیلانی کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ وطن کے راستے ان پر بند ہوچکے تھے۔ بہار کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے پھر کہاں قیام کیا جائے؟ دکن کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ مولانا تذبذب میں تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

سلیمان ندوی کا تقاضا پھر آیا۔ تاریخ اسلام کی کوئی جگہ خالی ہوئی تھی آپ نے اس کا جواب دیا۔

”آپ نے یہ عجیب سفارش فرمائی۔ تاریخ اسلام کی تدریس کیا فقیر کے بس کی بات ہے۔ امراض کے ہجوم اور پیرانہ سالی نے کیا اس کا موقع چھوڑا ہے کہ کسی نئے تدریسی مضمون کے لیے اپنے آپ کو تیار کرسکوں۔“

سلیمان ندوی کا پھر خط آیا ”آپ علی گڑھ آئیں تو۔ لوگوں سے ملاقات ہی رہے گی۔“ آپ نے اس کا بھی جواب دیا۔

”دل اس قسم کے امور میں ملنے ملانے پر آمادہ نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ نہ عمر ہی ملازمت کی رہ گئی ہے اور نہ ایسی تنگی ہے۔“

توسیع کی مدت بتدریج ختم ہورہی تھی اور یہ خط کتابت چل رہی تھی۔ آدمی جہاں رہتا ہے اس سے انس ہوجاتا ہے۔ مولانا نے تو یہاں تیس سال گزارے تھے۔ جب خیال آتا تھا کہ حیدرآباد چھوڑنا پڑے گا تو وہ ایک انجانی تکلیف سے دوچار ہوجاتے تھے۔ ملازمت کا آخری مہینا آگیا تو غالباً وہ کسی فیصلے تک پہنچ چکے تھے۔

”میری ملازمت کا یہ آخری مہینا ہے۔ اس وقت تک تو دل مطمئن نہ تھا لیکن ایک جگہ پڑا ہوا تھا۔ اب کہاں جاؤں؟ سرِدست اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ گیلانی چلا جاؤں۔“ آخر مارچ کا مہینا بھی ختم ہوا۔ انہوں نے سلیمان ندوی کو اطلاع دی۔

”آخر وہ گھڑی بھی آہی گئی جس کا تیس سال پہلے انتظار شروع ہوا تھا۔ 13 مارچ 1949 بعد ظہر جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی صدارت کا رجائزہ دے دیا۔ دو تین دن بعد اسی گاؤں کی طرف واپسی کا رادہ ہے جس سے تقریباً نصف صدی پہلے روانہ ہوا تھا۔“

اب کہیں کوئی اور کشش رہ بھی نہیں گئی تھی۔ مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے دیوبند جانا لگا رہتا تھا لیکن یہاں بھی حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے تھے۔ وہ محسوس کررہے تھے کہ شوریٰ میں چند مخصوص لوگوں کو غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے۔ انہی کی... آراء پر فیصلے ہونے لگے ہیں۔ وہ دل برداشتہ تو تھے ہی ایک مرتبہ مجلس میں گئے تو اجلاس کے دوران ہی مولانا تھانوی کے انتقال کی خبر آگئی۔ یہ مجلس، مجلس ماتم بن گئی۔ مولانا واپس آئے تو سخت مایوس تھے۔ دارالعلوم کا آخری ستون بھی منہدم ہوگیا۔ اس کے بعد جی نہیں چاہا کہ شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہوں۔ اگلے سال جب دعوت نامہ آیا تو آپ نے جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا اور شریک بھی نہیں ہوئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی کی وفات کے بعد دیوبند جانے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ اکابرین دیوبند نے پانچ سال تک ان کا انتظار کیا اور پھر ان کی رکنیت ختم کردی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ یہ ذمّے داری بھی ختم ہوئی۔ اب گیلانی جانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ بالآخر وہ گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے گئے۔ اس عرصے میں بہار کے حالات بھی کسی حد تک ٹھیک ہوچکے تھے۔ گیلانی کے وہ مسلمان جو گھر چھوڑ چھوڑ کر جاچکے تھے امن وامان ہوا تو پھر لوٹ لوٹ کر اپنے گھروں میں آباد ہوگئے تھے۔

مولانا کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ پہلے بھی وہ گیلانی آتے رہے تھے لیکن اب تو یہ عالم تھا جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔ گاؤں میں سب کو خوشی تھی کہ اب مولانا یہیں رہیں گے۔ خاندان والے بھی خوش تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بہت خوش تھے۔ آنے جانے والوں سے یہی کہتے تھے کہ زندگی کے جھمیلوں سے فرصت ملی۔ اب انہماک کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا موقع ملے گا۔

پختہ سڑک کے کنارے بیٹھک تھی؛ وہاں لکھنے پڑھنے کا سامان فراہم کرلیا۔ کتابیں الماریوں میں رکھوالیں۔ صبح سے شام تک بیٹھک میں ہی قیام رہتا۔ ناشتا اور دن کا کھانا یہیں تناول فرماتے۔ عشا کی نماز مسجد میں ادا کرکے اندر گھر میں تشریف لے جاتے۔

ابھی نئے نئے ریٹائر ہوئے تھے۔ دنیا انہیں بھولی نہیں تھی۔ مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے دعوت نامے آرہے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی نے ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی پیش کش کی۔ کراچی یونیورسٹی نے اصرار کے ساتھ بلایا لیکن آپ نے معذرت کرلی۔ وہ جو سفر کرتے تھکتے نہیں تھے گیلانی کی مٹی میں سمٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ صحت بھی ابھی تک کچھ زیادہ ناموافق نہیں تھی لیکن دنیا کی طرف سے بے رغبتی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔

مولانا کا اکلوتا لڑکا محی الدین کراچی میں تھا۔ اس نے چاہا کہ مولانا اس کے پاس آجائیں۔ وہ خط لکھ لکھ کر بلاتا رہا پھر خود بھی گیلانی آیا لیکن آپ نے گیلانی چھوڑنا پسند نہیں کیا۔

مولانا گیلانی صاحب جائداد تھے۔ کئی باغات تھے، کاشت کی زمین بھی کافی تھی لیکن مولانا کا ان چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو فنافی العلم تھے۔ دنیا سے قطعی لاتعلق۔ جب تک حیدرآباد میں تھے اس وقت بھی یہی حال تھا اور اب تو بڑھاپا تھا۔ جائداد سے تو کیا لیتے جو اپنے پاس تھا وہ بھی بھائی بھتیجوں پر خرچ کردیتے یا ضرورت مندوں کو قرض دے کر بھول جاتے۔ فکر تھی تو یہ کہ کون سے عنوانات ایسے ہیں جن پر ابھی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ عموماً اب گیلانی سے نکلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی نکلے بھی تو ذاتی کام سے نہیں اور اسلام کی خدمت کی غرض سے۔

وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ جب ریٹائر ہوئے تو آپ کو مجلس عاملہ کا رکن بھی بنادیا گیا۔ دارالمصنفین کا ایک اہم جلسہ (1950ء) تھا۔ اس میں شرکت کے لیے وہ گیلانی سے اعظم گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر جو لوگ انہیں لینے آئے تو ان کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر، ایک تکیہ، المونیم کا ایک لوٹا اور ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے دو جوڑے تھے۔ یہ حال اس شخص کا تھا جس کے گیلانی میں باغات اور زمینیں تھیں لیکن آپ فرماتے تھے ”دنیا میں جتنا میرا حصہ ہے میں اتنا لیتا ہوں۔“

ریٹائرمنٹ کے بعد ایک سفر کراچی کا بھی کرنا پڑا تھا۔ جب مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی تو مولانا بشیر احمد عثمانی نے چاہا کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو۔ اس اسلامی دستور کو

مرتب کرنے کے لیے مولانا عثمانی نے بہت سے علما کو کراچی میں جمع کرنے کی سعی فرمائی۔ ان میں مولانا گیلانی کا بھی نام تھا۔ حکم استاد کا تھا اور پھر یہ بھی دین کی خدمت تھی۔ کوئی بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ آپ کراچی آئے۔ بحث و مباحثے کے بعد آخری شکل میں اس کو قلم بند کر کے مجلس کے حوالے کیا اور تقریباً سودن کے قیام کے بعد واپس چلے گئے۔ پاکستان کے دستور اسلامی میں مولانا گیلانی کا خاص حصہ ہے۔

آپ کی زندگی کے آخری دن تھے اور یہ سب لکھنے پڑھنے میں بسر ہو رہے تھے۔ ایک چار پائی تھی اسی پر قلم دوات رکھ لیتے اور علم و فن کا خزانہ لٹاتے رہتے۔ چار پائی کی بغل میں دو تخت تھے۔ ان پر معمولی فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا۔ قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا۔ کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے۔ کمرے میں چار بڑی الماریاں تھیں جن میں منتخب کتابیں تھیں۔ یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا۔ لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے تو چار پائی کی نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک ڈبا گھسیٹتے۔ اس میں مٹی کے تین برتنوں میں کتھا، چونا اور چھالیہ ہوتی تھی۔ کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان اس ڈبے سے پان کی گلوری بناتے اور اسے کھاتے ہی تازہ دم ہو جاتے۔ قلم پھر حرکت میں آجاتا۔

کبھی کوئی طالب علم چلا آرہا ہے۔ پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے۔ مشورے کے لیے آیا ہے۔ اپنے کاغذات اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے اور اس کی حوصلہ افزائی میں لگ جاتے۔ ضروری کتابوں کے نام بتا رہے ہیں۔ کس مضمون کو کس طرح سمیٹنا ہے یہ بتا رہے ہیں۔

دروازے پر دستک ہوئی کون ہے؟ معلوم ہوا کسی مدرسے کے مدرس ہیں۔ انہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے۔ مسودہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ اپنے کام پھر رہ گئے۔ یہ کہہ نہیں سکتے کہ مسودہ چھوڑ جایئے فرصت ہوئی تو دیکھ لوں گا۔ دو چار دن میں پھر چکر لگایئے گا۔ کسی کو بار بار بلانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے ہزار مرتبہ آؤ۔ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور مسودہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔

''آپ کہیں تو آپ کی اس کاوش پر اپنی رائے لکھ دوں۔'' اس کے کچھ کہنے سے بیشتر خود پیش کش کر دی۔ صرف اس لیے کے جو شخص مسودہ لایا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہوگا۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خوشامد کرے۔ صفحے دو صفحے کا پیش لفظ لکھ کر اس کے حوالے کیا۔

عشا کے بعد کا وقت اپنے لیے تھا لیکن اپنے لیے یہاں تھا کیا۔ کئی یونیورسٹی نے ممتحن مقرر کیا تھا۔ جن دنوں جانچنے کے لیے پرچے آئے ہوئے تھے اپنا یہ وقت بھی پرچے جانچنے میں گزرتا تھا۔

بعض قابل ممتحن اپنے معیار کو سامنے رکھ کر پرچے جانچتے ہیں لیکن مولانا کی نرم خوئی اور راست طبیعت یہاں بھی کام دکھاتی تھی۔ بھئی طالب علم ہے۔ اپنے معیار کے مطابق ہی تو لکھے گا۔ لکھتے لکھتے مشق ہو ہی جائے گی۔ بلا ضرورت نمبر کاٹنے سے گریز کرتے تھے۔ یہ نرم خوئی بعض اوقات ان کے نقصان کا سبب بھی بن جاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب آپ کسی کو قرض دیتے تھے اور طلب کرنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ اکثر یہ رقمیں ڈوب ہی جاتی تھیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ قرض مانگنے والا مصر ہے اور آپ کا ہاتھ اس وقت تنگ ہے۔ وہ اپنی ضمانت پر اسے قرض دلا دیتے اور پھر اپنی جیب خاص سے یہ پیسے ادا کرنے پڑتے۔

عام مسلمانوں سے جتنی شفقت سے ملتے تھے اور ان کی فلاح کا خیال رکھتے تھے۔ بڑے لوگوں سے ملنے میں اتنے گریزاں رہتے تھے۔ اس کا مظاہرہ لوگوں نے حیدر آباد میں مدتِ ملازمت کے دوران دیکھا تھا۔ نظام حیدر آباد ان کی تقریروں کے شیدا تھے اور آپ کی تقریروں کو چھپ چھپ کر سنا کرتے تھے۔ کوئی اور شخص ہوتا تو ان سے بڑے فائدے اُٹھاتا لیکن آپ نے خصوصی ملاقات کی کبھی سعی نہیں کی۔ تیس سالہ مدتِ ملازمت میں کبھی ملنے نہیں گئے۔ وہ الگ قصہ ہے کہ سالگرہ وغیرہ یا بعض خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ وہ بھی حاضر ہو جاتے تھے۔

ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب تھے۔ وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور نہایت مناسب کام کے لیے حاضر ہوئے۔

''مولانا آپ کے قلم میں حق تعالیٰ نے بڑی برکت دی ہے۔ آپ کی تصانیف سے اہلِ دیں ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں گے لیکن ایک کام ایسا ہے جو رہ گیا ہے اور آپ کے سوا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔''

''ایک کام کیا...... مجھ فقیر کی بساط ہی کیا۔ سیکڑوں کام ایسے ہوں گے جو رہ گئے ہوں گے۔''

''بے شک مگر اس کے لیے آپ نے بہت بڑی جماعت تیار کر دی ہے۔ میں جس کام کے لیے حاضر ہوا ہوں آپ کے اُٹھ جانے کے بعد نا کام رہ جائے گا۔''

''میرے کرنے کا ہوا تو میں انکار نہیں کروں گا۔''

''بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی سوانح اب تک مرتب نہیں ہوسکی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ کام آپ کے ہاتھوں ہو۔''

''آپ نے میری غفلت کا پردہ چاک کر دیا۔'' مولانا گیلانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''یہ میری غفلت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کے کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟ میری عملی زندگی ''القاسم'' دیوبند سے شروع ہوئی تھی۔ کیا اچھا ہو کے خاتمہ ''سوانح قاسمی'' کی خدمت پر ہو۔''

مولانا نے اسے اپنے لیے زادِ آخرت سمجھ کر اس خدمت کو قبول کر لیا اور اس کی تدوین میں مشغول ہو گئے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ شخصیت اتنی بڑی تھی کہ اس کا پھیلاؤ بھی بہت تھا اور صحت واقعات کا خیال بھی دامن گیر تھا۔ حوالے کی سیکڑوں کتب کا مطالعہ الگ۔ پیری اور بیماری نے پہلے جیسا دم خم بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے لکھتے رہے۔ مختلف رسائل کے لیے مضامین بھی برابر لکھتے رہے۔ تدوین حدیث کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن خصوصی توجہ اب ''سوانح قاسمی'' پر تھی جسے وہ اپنے لیے زادِ آخرت قرار دے رہے تھے۔

اس مسلسل محنت نے صحت پر مختلف قسم کے حملے کیے۔ کبھی سینے کا درد، کبھی معدے کی خرابی، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ تنفس کا قدیم مرض جس کے متعلق خیال تھا کہ ختم ہو چکا ہے اچانک حملہ ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ دمے کی شکل اختیار کر لی۔ حالت یہ ہوگئی کہ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا۔ دو ڈھائی مہینے تک مسجد کی حاضری سے بھی محروم ہو گئے۔ سوانح قاسمی کا کام سر پر تھا۔ اس عالم میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہے۔

اب عالم یہ تھا کہ علاج کے بعد کچھ افاقہ ہو جاتا تو لکھنے پڑھنے کا سامان نکال لیتے۔ یہ خدشہ برابر لگا رہتا کہ ابھی کسی نہ کسی بیماری کا حملہ پھر ہو جائے گا۔ ابھی صحت ہے زیادہ سے زیادہ کام کر لوں۔ اس شدت کار کی وجہ سے پھر بیمار پڑ جاتے۔ ڈاکٹروں کی طرف سے پہرا بٹھا دیا جاتا تو مجبور ہو جاتے پھر کچھ افاقہ ہوتا تو پھر لکھنے بیٹھ جاتے۔ اسی دُھوپ چھاؤں میں آپ نے ''سوانح قاسمی'' کی تین جلدیں مکمل کر لیں۔ تدوین حدیث کی تکمیل کی اور پھر اسے طباعت کے لیے دے دیا۔

مقالات احسانی کے کئی مقالات اسی بیماری میں مختلف رسالوں میں شائع کرائے جسے بعد میں آپ کے ایک شاگرد نے مرتب کر کے شائع کرایا۔ یہ تمام مقالات تصوف کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ امام غزالی کے عہد اور اس کے ماقبل و مابعد پر بحث کرتے ہوئے اچھا خاصا تاریخی ذخیرہ فراہم کر دیا۔ ابن تمیمہ کے نظریہ مخدومیت پر بھی بہت دل پذیر بحث کی ہے۔ امام احمد حنبل اور شیخ اکبر نے سلوک و تصوف پر جو احسان فرمایا ہے اس کا تذکرہ بھی بہت موثر انداز میں فرمایا۔

نومبر 53ء میں دل کا حملہ ہوا اور پھر اس نے مستقل شکل اختیار کر لی۔ آپ آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ اس مرض سے بھی لڑتے رہے لیکن ایک سال بعد ہی ایسا سخت دورہ پڑا کہ جینے کی امید جاتی رہی۔ آپ کو فوراً پٹنہ لے جا کر اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ ڈاکٹروں کو حیرت تھی کہ یہ شخص بچ کیسے گیا۔ شاید آپ کے دماغ کی طرح دل بھی مضبوط تھا کہ اتنا سخت حملہ جھیل گیا۔

جب دل نے ذرا اپنی رفتار پر قابو پایا اور اطمینان ہوا تو گیلانی چلنے کی ضد ہونے لگی۔ جلدی یہ تھی کہ کچھ ضروری مسودے اُدھورے پڑے ہیں۔ اس مرتبہ تو مہلت مل گئی شاید آیندہ نہ ملے اس لیے گھر پہنچتے ہی انہیں مکمل کروں گا لیکن اس وقت منہ اُتر گیا جب ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ اس پابندی میں یہ راز یقیناً پوشیدہ تھا کہ وہ دل سے لکھتے تھے اور اب دل ہی متاثر تھا۔

دو ڈھائی مہینے بعد گھر لوٹے تو خود بھی اجنبی لگ رہے تھے کہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ وہ بیٹھک بھی اجنبی لگ رہی تھی جو اُٹھتے بیٹھنے کا محل تھی۔ الماری میں رکھی کتابوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے تھے۔ پیروں پر سوجن کے آثار تھے۔ اکثر یہ اشعار گنگناتے رہتے تھے۔

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شاد
جی چکے بس تا کجے مرجاؤ شاد
میں نے مانا بخشوا لوگے گناہ
اور نہ جو اس کی بھی مہلت پاؤ شاد

ایک مہینے بستر پر دراز رہنے کے بعد اتنی اجازت چاہی کہ کچھ دوستوں کو خط لکھ لوں۔ گھر والے کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ یہ اجازت بھی دیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ بولتے جائیں کوئی شخص لکھ دے گا لیکن آپ کا کہنا تھا کہ دوستوں کو تو اپنے ہاتھ ہی سے خط لکھا جاتا ہے۔ تحریر بھی تو چہرہ ہوتی ہے۔ دوست میری تحریر دیکھیں گے تو دراصل وہ میرا چہرہ دیکھیں گے۔ کسی اور سے خط لکھوانا غیریت کے ذیل میں آتا ہے۔ مجبور ہو کر انہیں قلم دوات دے دی گئی۔ مختلف اوقات میں مختلف دوستوں کو خط لکھتے رہے۔

"آپ کا یہ مریض المسمیٰ بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے۔ اسی حال میں مگن ہے جس حال میں رکھا گیا ہے۔"

کئی دوست گیلان ان سے ملنے آئے۔ دوستوں کو دیکھ کر وہی بشاشت چہرے پر آگئی جو کبھی ان کی پہچان تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اتنی بڑی بیماری سے ہو کر اٹھے ہیں۔ دوست یہ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ آپ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ کمزوری ہے وہ بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ آپ پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جائیں گے۔

ایک رات سب گھر والے آپ کے نزدیک بیٹھے تھے تاکہ آپ کا دل بہلا رہے۔ کچھ ایسی باتیں کی جا رہی تھیں جن سے مسرت و شادمانی کا ماحول پیدا ہو۔ خود آپ بھی ان باتوں میں شریک ہو کر جوش و مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ آپ بیمار ہیں۔ باتوں میں کچھ دیر کا وقفہ آیا تو آپ اپنے بھائی مکارم احسن سے مخاطب ہوئے۔

"مسلمانوں میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں کیوں مشہور ہو گئی ہیں؟"

"کہا تو یہی جاتا ہے کہ مرنے والے کو شدید تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔" مکارم احسن نے کہا۔

"یہ خیال ٹھیک نہیں ہے۔" اس کے بعد آپ نے ایک قرآنی آیت پڑھی اور فرمایا۔ "اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا کہ نیند جیسے آتی ہے موت بھی اسی طرح آتی ہے۔ نیند آنے میں سونے والے کو تکلیف کب ہوتی ہے پھر موت میں تکلیف کا تصور عجب ہے۔ میرے استاد مولانا حمید اللہ فراہی فرمایا کرتے تھے مرنے والے پر نشے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔"

"جیسا آپ فرما رہے ہیں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" مکارم احسن نے کہا اور بات کا رُخ موڑنے کے لیے کوئی اور تذکرہ چھیڑ دیا۔ مولانا بھی سمجھ گئے کہ یہ لوگ اب اس بارے میں کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔

"ٹھیک ہے بھائی تم لوگ موت کے نام سے ہی وحشت زدہ ہو جاتے ہو۔ اب تم لوگ جاؤ مجھے نیند آرہی ہے۔" سب لوگ آپ کے پاس سے اُٹھ گئے۔

اگلی شب فرمانے لگے۔ "جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا، ہر شخص جوان ہو کر جائے گا۔" اگلے کئی ... دنوں میں گھر والوں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ تروتازہ رہنے لگا ہے۔ اکثر اپنے چھوٹوں سے ہنسی مذاق کرلیا کرتے تھے۔ وہ بات بھی دیکھنے میں آنے لگی کہ کھڑے ہو کر نماز بھی ادا کرنے لگے۔

4 جون 1956ء کی شب ضرورت سے زیادہ خوش تھے۔ ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ انہیں دیر تک نیند نہیں آئی پھر سو گئے۔ صبح اُٹھے وضو کیا اور کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ وظیفہ پڑھتے رہے پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئے۔ ملازم سے کہا "رات نیند کم آئی تھی۔ چادر اُڑھا دو اب میں سونا چاہتا ہوں۔" سوئے تو ابدی نیند سو گئے۔ گھر والوں نے سانس رکتے ہوئے دیکھا تو چادر اُٹھائی۔

ان کے بھائی مکارم احسن کا بیان ہے کہ چہرے پر گوشت تروتازہ تھا۔ اس منظر کو مکارم احسن ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریک جنازہ نے حیرت سے دیکھا۔

مولانا کے جنتی ہونے کی نشانی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ مولانا گیلانی کی وفات پر دنیائے عالم میں کہرام مچ گیا۔ نماز ظہر کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں آس پاس کے تمام مسلمانوں نے شرکت کی۔ نماز جنازہ اس علاقے کے ممتاز عالم دین مولانا سید فصیح احمد استھانوی نے پڑھائی اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیے گئے۔

ہندو پاک کے تقریباً تمام اخبارات و رسائل نے تعزیتی نوٹ لکھے۔ "ملت بیضا کی ایک متاع گراں مایہ لٹ گئی۔ بزم انس و قدس کا چراغ فروزاں بجھ گیا یعنی مناظر احسن گیلانی نے اس عالم آب و گل کو خیرباد کہہ کر عالم آخرت کی راہ لی۔"

(رسالہ برہان دہلی)

جو کل تک ہر غم زدہ کے لیے مجسم تسکین و تشفی تھا خود اس کے غم میں کون اور کس کو تسلی دے۔ جو کل تک ہمہ زندگی و تازگی، ہمہ جودت و ذہانت تھا کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیر زمین پہنچ چکا ہے۔

خوش عقیدگی اور روشن خیالی و رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر کہیں اور شاید ہی مل سکے۔

(صدق جدید مولانا عبدالماجد دریابادی)

گیلانی میں کئی روز سناٹا چھایا رہا۔ مولانا کی بیٹھک اُداس رہی۔

ماخوذ: حیات مولانا گیلانی، تالیف مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

نہایت جانفشانی سے مرتب کردہ ایک تحقیقی رپورٹ

مختار آزاد

دنیا کے ہر خطے میں ظلم کے نشان سمجھے جانے والے چنگیز خان کی اولادیں مختلف ممالک میں پھیلی ہیں جنہوں نے کلمہ پڑھ کر دین حق کو قبول کیا وہ انسانیت کے جامے میں آگئے مگر جو چنگیزی نسل سے چمٹے رہے وہ عرصہ دراز تک ظلم وجور کی رسّی تھامے رہے مگر اب انہیں بھی ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ دنیا کے قدم سے قدم ملاکر چلیں۔ منگولیا کے یہ خانہ بدوش اب کس حال میں ہیں، اس کی روداد دل پذیر۔

یہ بات بہت زیادہ پرانی نہیں ہے کہ جب ایک نوجوان منگول خانہ بدوش چرواہے اوچ کھوگنین نے ایک پرانا چینی ٹرک کرائے پر لے کر اس پر اپنا سارا مال و اسباب لادنا شروع کیا تھا۔ وہ سرد اور برف پوش وادیوں کی میدانی چراگاہوں کو چھوڑ کر اپنے پُرکھوں کے برعکس ایک نئی طرز کی زندگی بسر کرنے کے لیے کئی سو میل دُور واقع منگولیا کے پُرہجوم اور بے ہنگم انداز میں پھیلتے ہوئے دارالحکومت الان باتار کے لیے نقل مکانی کر رہا تھا۔

اوچ کھوگنین منگولیا کے اُن ہزاروں خانہ بدوشوں میں سے ایک ہے، جو اپنا رشتہ اُس قبیلے سے جوڑتے ہیں جس کا سپوت چنگیز خان تھا۔ وہ چنگیز خان جس نے صدیوں پہلے شوقِ جہانگیری میں خون کے دریا بہائے، سروں کے مینار کھڑے کیے اور عروس البلاد بغداد کے قیمتی کُتب خانوں میں موجود علم کے اثاثوں کو نذرِ آتش کر کے راکھ دریائے دجلہ و فرات میں بہادی تھی۔ جس کے ہاتھ میں موجود تلوار ہمیشہ دوسروں کے خون سے سرخ رہی۔ جس کے پاؤں گھوڑوں کی رکاب میں ہوتے تھے۔ ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھمی رہتی تھی تو دوسرے میں شمشیر بے نیام۔ چنگیز خان اور اُس کے ساتھی جو گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر زین کسے بنا سوار ہوتے اور اُن کے سرپٹ دوڑتے گھوڑے جن کے پاؤں زمین کو چھوتے ہی نہیں تھے۔

ہزاروں برس سے خانہ بدوش زندگی بسر کرنے والے ان خوں ریز قبائیلیوں کی اولاد اوچ کھوگنین ..... اب اپنے پُرکھوں کی روایات کو ترک کر کے سکون کی زندگی بسر کرنا

چاہتا تھا۔ وہ ٹھہرنا چاہتا تھا۔ خانہ بدوش زندگی میں ٹھہراؤ صرف بصورت موت ہے لیکن اوچ کھوگنین نے جیتے جاگتے وجود کے ساتھ ٹھہر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دوسرے خانہ بدوشوں کی طرح اب صرف زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ سکون اور اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی آس اور تلاش میں ہجرت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ساری زندگی گھاٹیوں میں مویشی چراتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر خیمے گاڑ کر روز شب بسر کرتے گزری تھی لیکن اب وہ ایسی زندگی کا مزہ لینا چاہتا تھا جہاں چار دیواری میں وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ نسبتاً شہری انداز کی زندگی گزر بسر کر سکے۔ اُس نے کبھی بھی اپنا سر چھپانے کے لیے خیمہ گاڑنے کے عیوض زمین کے مالک کو کرایہ ادا نہیں کیا تھا لیکن اب وہ جہاں جا کر بسنے والا تھا، وہاں اُسے گھر کا کرایہ بھی ادا کرنا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا لیکن پھر بھی وہ جانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب اسے دُور دُور تک پھیلی وادیوں کی آزاد فضاؤں کے بجائے چند گز کے زمین کے ٹکڑے پر مقید زندگی بسر کرنا ہوگی مگر پھر بھی وہ الان باتار جانے پر کمر بستہ تھا۔ خیمہ اور گھوڑے اُس کے پُرکھوں کی وراثت تھے لیکن اب وہ خود کو ان چیزوں سے علیحدہ کر رہا تھا۔

اوچ کھوگنین..... کئی ماہ تک مسلسل ذہنی کشمکش کا شکار رہا تھا۔ ایک طرف مستقبل اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب بلا رہا تھا تو دوسری طرف اس کا دامن ماضی سے اُلجھتا رہا۔ یوں اس کشمکش میں کافی عرصہ بیت گیا، آخر کار اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ چند ایک پالتو مویشی رکھ لیے جنہیں وہ اپنے ساتھ ماضی کی نشانی اور حال کی ضرورت سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، باقی سارے گھوڑے، بھیڑیں اور بکریاں فروخت کر کے اس نے نقدی حاصل کی اور اب کرائے پر ایک ٹرک لے کر اس میں سامان لادر ہا تھا، نئی طرزِ زندگی کی تلاش میں شروع کی جانے والی مسافت کے لیے۔

اوچ کھوگنین ، اس کی بیوی نُوروا ، دو چھوٹے بچے سامان کو ٹرک پر لدتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ بچوں کی آنکھوں میں حیرت، بیوی کی آنکھوں میں اُداسی اور خود اوچ کھوگنین کے چہرے پر بیک وقت کئی تاثرات موجود تھے۔ وہ اَفسردہ بھی تھا اور خوش بھی۔ ہزار ہا برس سے جاری روایتی طرزِ زندگی کا ساتھ چھوٹنے کا دکھ تھا تو نئے طرزِ حیات کو اختیار کرنے کی خوشی بھی چہرے پر نمایاں تھی۔

اوچ کھوگنین اسی جنگجو خانہ بدوش کے قبیلے کا ایک فرد تھا جو چنگیز خان کی موت کے سیکڑوں سال بعد پل پل بدلتی ہوئی دنیا میں پیدا ہوا تھا۔ اوچ کھوگنین کے پُرکھوں نے بدن پر بھیڑیے کی کھال اوڑھ کر اور ہاتھ میں ننگی تلوار سُونت کر صدیوں تک نہ جانے کہاں کہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور پھر سمٹے تو آبائی وطن منگولیا میں بکھر گئے۔ انہی بکھرے ہوئے خانہ بدوش قبیلوں کا باشندہ اوچ کھوگنین بدلتے زمانے میں زندہ رہنے کے لیے گلّہ بانی، گھڑ سواری اور اونی خیموں کو الوداع کہہ کر اب نئے شہر میں نئی جگہ اور نئے لوگوں کے درمیان، بالکل نئی طرز کی زندگی گزارنے کے لیے کمر کس رہا تھا۔ پالتو مویشیوں کا ریوڑ اور گھوڑے فروخت کر دینے سے اوچ کھوگنین کے ہاتھ اتنی رقم آ گئی تھی کہ دارالحکومت کے مضافات میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ وہ زندگی شروع کر سکتا تھا جس کی چاہ میں اس کا سامان پرانے چینی ٹرک پر لادا جا رہا تھا۔

دو گھنٹے کے اندر اندر اوچ کھوگنین کا سارا سامان ٹرک پر لد چکا تھا۔ اس کے چند باقی ماندہ مویشیوں کو بھی ٹرک پر سوار کر لیا گیا تھا۔ یہ وہ بھیڑ اور بکریاں تھیں جن کا دودھ شیر خوار بیٹے اور کمسن بیٹی کے علاوہ گھر کی دودھ کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے درکار تھا۔ اسی لیے یہ فروخت ہونے سے بچ گئے تھے ورنہ اُس کے دیگر مویشی اور گھوڑوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کب کے بک چکے ہوتے۔ اوچ کھوگنین کی بیوی اور دو بچے بھی سامان کے اوپر سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے۔

اوچ کھوگنین نے آخری بار ٹرک کے چاروں طرف گھوم پھر کر اس بات کو یقینی بنایا کہ سامان اچھی طرح باندھا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اُس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں اور پھر دروازہ کھول کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”چلو۔“ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھے بنا کہا۔ ٹرک ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوا اور پھر وہ وادی کے اونچے نیچے، کچے پکے اور آڑھے ترچھے راستوں ..... پر لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

اوچ کھوگنین کی منزل کئی گھنٹوں کی دوری پر تھی۔ اس نے ٹرک کی کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کا ماضی ٹرک سے اُڑنے والی دھول اور اس کے سائلنسر سے نکلنے والے دھوئیں کی دُھند میں دُھندلا رہا تھا۔ اس کے دل سے ایک ہُوک اٹھی اور پھر اس نے گہری سانس لے کر ونڈ اسکرین کے پار نظریں جما دیں۔ اس کا دل ماضی کی یادوں اور نگاہیں مستقبل کے سہانے سپنے دیکھ رہی تھیں جبکہ

اس کی روح ان دونوں کے بیچ گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ڈولے جا رہی تھی۔

روانہ ہونے سے چند ہفتوں پہلے اوچ کھوگنین الان بتار گیا تھا، جہاں اُس نے اپنے ایک واقف کار کی مدد سے شہر کے مضافات میں زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ جگہ مرکزِ شہر سے خاصے فاصلے پر تھی جہاں اوچ کھوگنین جیسے سیکڑوں اُن خانہ بدوشوں کے گھر تھے جو اپنا روایتی طرزِ زندگی ترک کر کے ہنسی خوشی مشکلات سے بھری شہری زندگی کو اپنا چکے تھے۔ یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں یہاں آباد تھے کہ وہ علاقہ اب ایک بہت بڑی کچی آبادی کی شکل اختیار کر چکا تھا جہاں بنیادی شہری سہولتوں سے محروم یہ لوگ خاصی پسماندہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب انہی لوگوں میں اوچ کھوگنین بھی شامل ہونے والا تھا۔

کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد آخر اوچ کھوگنین کی سربراہی میں اس کا مختصر سا خاندان اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ان کا نیا ٹھکانا چھوٹے سے قطعۂ اراضی پر بنا ایک کمرا تھا جس کے گرد لکڑی کی قدِ آدم باڑ بندھی ہوئی تھی۔ یہی کمرا اس کی منزل تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا سارا سامان ٹرک سے اتارا جا چکا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ تمہارا۔“ اوچ کھوگنین نے سامان اُتر جانے کے بعد ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نُوروا، شیر خوار بیٹا الاکا اور چھ سالہ بیٹی انوکا گھر کے باہر سامان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرک کے چلے جانے کے بعد اوچ کھوگنین پلٹا اور لکڑی کے دروازے کو کھولا۔ یہ دروازہ بظاہر تو نہایت سادہ سی لکڑی کا بنا تھا۔ اسے دیکھنے پر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی تھی لیکن جیسے ہی اوچ کھوگنین اور پھر اُس کے پیچھے پیچھے خاندان کے دوسرے افراد نے اس دروازے کے اندر قدم رکھا، آنِ واحد میں اُن کا ماضی کی خانہ بدوش زندگی سے بھی رابطہ منقطع ہو گیا۔ وہ زندگی جس کے یہ ہزار ہا برس قدیم ثقافتی ورثہ کے امین تھے، جو نسل در نسل سفر کرتا ہوا اُن تک پہنچا تھا۔ اوچ کھوگنین تک بھی یہ ورثہ پہنچا ضرور لیکن اب یہ یقین نہیں تھا کہ اُس کے بیٹے الاکا اور بیٹی انوکا تک اوچ کھوگنین کے خانہ بدوش قبیلے کا یہ ورثہ کبھی پہنچ بھی سکے گا یا نہیں، یا پھر وہ کنکریٹ سے بنے گرم اور پختہ کمرے میں بیٹھ کر، قہوے کی چسکیوں کے درمیان قصے کہانیوں کی طرح اپنے اَجداد کی داستان سُن سُن کر لطف لیں گے۔

اوچ کھوگنین کی نئی منزل کو دیکھتے ہوئے اب یہ کہنا بھی بہت ہی مشکل تھا کہ انوکا اور الاکا اب کبھی گھوڑوں، مویشیوں، اونی خیموں اور منگولیا کی آزاد فضاؤں کی سرسبز چراگاہوں، تنگ گھاٹیوں، پہاڑی پگڈنڈیوں، بہتے چشموں اور گرتی برف کے گالوں کو بھی آزاد فطرت حقیقی خانہ بدوش کی طرح دیکھ پائیں گے، انہیں محسوس کر سکیں گے...... یا نہیں۔ اوچ کھوگنین نے اُس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ ہی پار نہیں کیا بلکہ ایک تہذیب سے دوسری تہذیب اور ایک تمدن سے دوسرے تک کا طویل فاصلہ بھی صرف ایک قدم میں ہی طے کر لیا تھا...... صرف ایک قدم اٹھا اور اجداد کی ہزاروں سالہ خانہ بدوش زندگی تاریخ میں داخل ہو گئی۔ اوچ کھوگنین کے لیے یہ صرف ایک کمرا تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ یہ کمرا اس کے آنے والی نسلوں کی تہذیبی و تمدنی سفر کا سنگِ میل تھا۔ سنگِ میل کا نظر نہ آنے والا ہندسہ زیرو میل ...... جہاں سے سفر شروع ہوتا ہے۔ اوچ کھوگنین اور اُس کے خاندان کا بھی نیا تہذیبی سفر شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اوچ کھوگنین کی طرح اس کی بیوی بھی اس ہجرت سے خوش نہیں تھی لیکن شوہر کے دلائل اسے جذبات سے زیادہ مضبوط لگے تھے۔ اس لیے وہ بھی بنا چوں چراں کیے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی تھی۔ الان بتار آتے ہوئے وہ بھی مستقل طور پر جذباتی تغیرات سے گزرتی رہی تھی لیکن جب وہ یہاں پہنچی تو اس نے سب خیالات بالائے طاق رکھ دیے۔ اس پر ایک عورت کی سوچ غالب آ چکی تھی۔ وہ اپنے بند سامان کو کھول کر اس ایک کمرے کے مکان کو گھر بنانے میں جُت گئی۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کا نیا گھر رہنے کے لیے آراستہ ہو چکا تھا۔ ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ چکی تھی۔

چھوٹے سے ایک کمرے کا گھر سلیقے سے سنوارا گیا تھا۔ پختہ فرش پر ہاتھ سے بنا نمدہ بچھا ہوا تھا۔ کونے میں چھوٹی سی لکڑی کی میز پر ٹی وی رکھ دیا گیا تھا۔ دیوار پر مختصر سے خاندان کی یادگار تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں اور بنا پَٹ کی سادہ سی الماری میں برتن رکھ دیے گئے تھے۔ یہ گھر علیحدہ سے باورچی خانہ کے تکلف سے عاری تھا۔ اس لیے کمرے کے ایک کونے میں اسٹیل سے بنا اور مٹی کے تیل سے چلنے والا نیا چولہا رکھا ہوا تھا۔ منگولیا شدید سردی والا ملک ہے۔ یہاں بالعموم رہائشی کمرے کا استعمال بطور باورچی خانہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ’پنتھ اور دو کاج‘ والا کام ہو جاتا

ہے یعنی کھانا بھی پک جاتا ہے اور کمرا بھی گرم ہو جاتا ہے۔ اُس وقت باہر کافی ٹھنڈ تھی لیکن کھانا پکنے کے دوران چولہا جلنے سے کمرے کا درجۂ حرارت قابلِ برداشت تھا۔ اوچ کھوگنین فرش پر بچھے گدے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بچے اس کے نزدیک کھیل کود رہے تھے اور وہ خود ٹی وی پر موسیقی کا پروگرام دیکھ رہا تھا...... خانہ بدوش اوچ کھوگنین کے خاندان کی شہری زندگی کی یہ پہلی شام تھی۔

☆☆☆

صبح کا سورج اپنے معمول کے مطابق نکلا مگر ٹورو ا اور اوچ کھوگنین آسمان پر سپیدی پھیلنے سے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ انہوں نے کل ہی کمرے کے سامنے نمدے سے بنا خیمہ گاڑ کر اپنی گنتی کی چند بھیڑوں اور بکریوں کا باڑا قائم کر دیا تھا۔ اُس وقت ٹورو ا مویشیوں کا دودھ نکال رہی تھی۔ خیمے کے اندر موم بتی جل رہی تھی۔ نئی شہری زندگی کی اس نئی صبح کا احساس انہیں اب تک نہیں ہوا تھا لیکن جب وہ خیمے سے باہر نکلے تو دودھ کی بالٹی ہاتھ میں تھامے ہوئے اوچ کھوگنین کی نظر سامنے پڑی۔ دن کا اُجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ وہ چند گز زمین کے احاطے کے اطراف لکڑی کی بنی پتلی پتلی شہتیروں سے باندھی گئی سات فٹ اونچی باڑ کے حصار میں تھے۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر حدِ نظر تک گھر بنے ہوئے تھے اور ہر گھر اسی طرح کی باڑ کے حصار میں قید تھا۔

منگولیا کی دور دراز گھاٹیوں اور وادیوں میں سرکش گھوڑوں کی طرح سرپٹ دوڑنے والے اس خانہ بدوش جوڑے نے خود کو باڑ کے حصار میں قید پایا تو انہیں عجیب سے دکھ کا احساس ہوا۔ دونوں کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ اوچ کھوگنین اور ٹورو ا سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے نظر اٹھائی اور بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھ میں بھی ہلکی سی نمی اُتر آئی تھی۔ رات کو ہونے والی ہلکی برف باری سے زمین پر برف کی پتلی سی چادر جم گئی تھی۔ جگہ جگہ سیلن اور پانی کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ اُسی طرح جیسے ٹورو ا کی آنکھوں میں چپکے سے نمی اُتر آئی تھی۔

خانہ بدوش جوڑا اپنی وادی سے صرف ساڑھے تین سو میل کی دُوری پر تھا مگر اُس وادی اور یہاں کے احساس و منظر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہاں اس جوڑے کے خیمے کے برابر میں اُس کے عزیز و اقارب اور سسرال والوں کے خیمے تھے لیکن یہاں برابر میں کس کا گھر تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ وہاں وادی میں جب صبح وہ سو کر اٹھتے تھے تو ان کے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں ان کے کانوں کو بھلی لگتی تھیں لیکن یہاں باڑ کے باہر ایک تنومند سیاہ آوارہ کتا کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز میں بھونکے چلا جا رہا تھا۔ وہاں صبح کی ہوا تازگی لاتی تھی لیکن یہاں...... اچانک ایک ٹرک برابر سے گزرا اور اس کے سائلنسر سے اٹھنے والا دھواں اُن کے حلق تک میں سرایت کر گیا۔ وہ دونوں کھانستے ہوئے جلدی جلدی کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ جلد بازی میں تھوڑا سا دودھ بالٹی سے چھلک کر زمین پر گر پڑا مگر شہری زندگی کی ہلچل کو قبول کر لینے والے، کھانس کھانس کر بے حال جوڑے کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اُن کی روایتی خانہ بدوش زندگی میں دودھ کا برتن سے چھلک جانا عورت کی گرہست کی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ شہری زندگی سے ان کا تعارف ہو چکا تھا اور وہ اس کو قبول کر چکے تھے۔ اب منگولیا کی کھلی گھاٹیوں میں پھرنے والے خانہ بدوش جوڑے کو مستقبل میں اسی طرح کے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا تھی۔

☆☆☆

دارالحکومت الان بتار کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ نفوس سے زائد پر مشتمل ہے جس کا لگ بھگ ساٹھ فیصد حصہ دارالحکومت کے مضافات میں واقع مُلک کی اس سب سے بڑی کچی آبادی میں رہتا ہے جس میں اوچ کھوگنین کا خاندان مقیم ہے۔ یہ آبادی خانہ بدوش چرواہوں کے حوالے سے مشہور ہے۔ یہاں آباد لوگ زیادہ تر وہ ہیں جو بہ حالتِ مجبوری خانہ بدوش زندگی ترک کر کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔

خانہ بدوشوں کی یہ شہری کچی آبادی زندگی کی ہر اُس شہری سہولت سے محروم ہے جو شہری معاشرے کا لازمی جزو تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہاں نہ پکی سڑکیں ہیں، نہ ہی فراہمی آب و نکاسی کا باقاعدہ نظام موجود ہے۔ منگولیائی دارالحکومت میں کئی اور کچی آبادیاں بھی قائم ہیں لیکن خانہ بدوشوں کی اس سب سے بڑی کچی آبادی کا حال، دوسروں کی نسبت بہت ہی بُرا ہے۔ سہولتیں تو ہیں ہی مفقود مگر یہاں سماجی مسائل بھی بہت سنگین نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔

خانہ بدوش زندگی میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن خانہ بدوشوں پر مشتمل الان بتار کی دس لاکھ نفوس پر مشتمل کچی آبادی میں جرائم معمول کی زندگی کا حصہ ہیں۔ یہاں لوٹ مار کے واقعات کا ہونا قابلِ ذکر بات نہیں، شراب نوشی ہی نہیں دیگر اقسام کے تمام گھٹیا نشے یہاں کیے جاتے ہیں۔ غربت اور پسماندگی نہایت عام ہے اور نا امیدی ہر اُس چہرے پر جھلکتی ہے جو خوبصورت فطری ماحول کو چھوڑ کر ہنسی خوشی یہاں آ کر بس گیا تھا لیکن محرومیاں، مایوسیاں اور تاریک مستقبل کے سوا، چند ایک کو چھوڑ کر کسی کو کچھ نہیں مل سکا مگر پھر بھی اس کچی آبادی کے مکینوں کی تعداد ہر روز بڑھتی جا رہی ہے۔

خانہ بدوش زندگی تالے سے آشنا نہیں مگر یہاں کا ہر مکین رات کو سونے سے پہلے یہ تسلی کر لیتا ہے کہ باڑ کے گیٹ میں تالا تو لگا دیا ہے اور سونے سے پہلے کمرے کو اندر سے بند کر لینے کا یقین ہو جانے تک وہ بستر کی طرف قدم نہیں اٹھاتا۔ یہ حفاظتی اقدام صرف رات کے لیے مخصوص نہیں، دن میں بھی باڑ کے گیٹ پر تالا لگائے رکھنا عام سی بات ہے۔ اسی لیے باڑ کی اونچائی قدِ آدم سے بھی کئی فٹ اونچی رکھی جاتی ہے کہ کہیں کوئی باڑ پھلانگ کر اندر نہ آ جائے۔ اوچ کھوگنین اور ٹورو ا بھی تالے سے نا آشنا تھے۔ کل رات تو خیر سے گزر گئی مگر شہری زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے انہیں آج دو تالے خریدنا تھے جس کے لیے اوچ کھوگنین نے بازار جانے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

اوچ کھوگنین بازار سے لوٹ کر آیا تو اس نے باڑ کا گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا اور چابی جیب میں رکھنے کے بعد چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”میری زندگی اس طرح کے انسانی جنگلوں سے نا آشنا تھی لیکن الان بتار نے مجھے اس نئی زندگی سے آشنا کر دیا۔“ اس کا لہجہ افسردہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”ہم خانہ بدوشوں کو تو چھوڑیے، ہمارے تو مویشی بھی آزاد زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔“ پھر اس نے داہنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور باڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ سب تو ایسا ہی ہے جیسے کہ پنجرے کے اندر قید ہو کر صرف سانس لیا جائے۔“

آج الان بتار میں اس کا دوسرا دن تھا لیکن وہ یہاں زندگی بسر کرنے کے اسرار و رموز کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

”یہ زندگی تم نے اپنی مرضی سے منتخب کی ہے۔ اس میں کسی اور کا کوئی دوش نہیں۔“ اس نے یہ سنا تو حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”یہ بات درست نہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب موسموں کی مہربانی ہے۔ اگر موسم ظالم نہ ہوتا تو میں زندہ رہنے کے لیے یہاں کبھی نہیں آتا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کر کے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

”تم زندہ ہو مگر زندگی سے دُور۔“ اس کی بات سن کر میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تمہارے نزدیک سانس لینا زندگی ہے تو تم زندہ ہو مگر میرے خیال میں تم اپنی زندگی وہیں گزار آئے ہو، جہاں پر کل صبح تم نے اپنی اس نئی زندگی کے لیے ہجرت کا آغاز کیا تھا۔“ یہ سن کر اس نے میری طرف اجنبی نظروں سے دیکھا۔ اسی دوران ٹورو ا باہر آ گئی۔ اس نے قہوہ تیار کر لیا تھا اور اب وہ اپنے اس غیر متوقع مہمان کو اندر لانے کے لیے شوہر کو اشارہ کر رہی تھی جو تالا خریدنے کے لیے بازار جانے والے اوچ کھوگنین کے ساتھ ساتھ یہاں تک آ پہنچا تھا۔

چند لمحوں کے بعد میں اندر کمرے میں بیٹھا ہوا، کل تک خانہ بدوش زندگی گزارنے والے جوڑے کی اُس روایتی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا تھا جو منگولیائی خانہ بدوشوں کی روایت ہے۔ میرے سامنے پنیر، یاک کے دودھ کا پنیر، میٹھی اور خستہ موٹی سی خمیرہ روٹی اور قہوے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

چنگیز اور ہلاکو خان جیسے ہیبت ناک خانہ بدوش مگر ظالم حکمرانوں کے دیس میں ہزار ہا سال سے خانہ بدوشی زندگی کا محور رہی ہے لیکن جیسے جیسے رسل و رسائل کی سہولتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اُسی رفتار سے زندگی کے انداز بھی بدلتے جا رہے ہیں۔

منگولیائی خانہ بدوش، ہزار ہا سال سے اس سرد ترین خطے کے شدید ترین موسموں کی سنگینیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں لیکن اب موسمی شدت کا مقابلہ کرنے کی اُن کی قوت کم زور پڑتی جا رہی ہے۔ اب انہیں پل پل بدلتی دنیا میں سکون اور آسانیوں کے لیے شہری زندگی اور ٹھہراؤ میں ہی بقا نظر آ رہی ہے۔ اسی لیے منگولیا میں خانہ بدوشوں کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے اور الان بتار ہی نہیں کئی اور چھوٹے بڑے شہروں میں چھوٹی بڑی کچی آبادیاں تیزی سے پھیلتی جا رہی ہیں۔ آج منگولیا میں پھیلی ہوئی کچی آبادیوں کی اکثریت خانہ بدوشوں پر ہی مشتمل ہے۔ وہ خانہ بدوش جو مستقل ٹھہراؤ اور زندگی کی ضمانت پر روایتی طرزِ حیات تیزی سے ترک کرتے جا رہے ہیں۔

میں اُن دنوں خانہ بدوشوں کی زندگی پر بدلتے ہوئے زمانے کے اثرات پر تحقیقی رپورٹ تیار کرنے کے لیے نیشنل جیوگرافک میگزین کے ایک پراجیکٹ کے توسط سے منگولیا پہنچا تھا۔ گھومتے گھومتے اُس دن الان بتار کے بازار میں اُس وقت اوچ کھوگنین سے ملاقات ہوئی جب وہ ایک

ڈکان سے تالا خرید رہا تھا۔ مستقل سکونت کے لیے اس خانہ بدوش کی شہری زندگی کو شروع ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس سے باتیں کرکے مجھے لگا کہ منگولیا کے خانہ بدوش زندگی میں نئے رجحانات کو جاننے کے لیے یہ دلچسپ کردار ہے اور یوں ہمارے درمیان تعارف ہوا اور پھر کئی ماہ طویل رفاقت کی بنیاد پڑی۔

اوچ کھوگنین پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی نے جس انداز میں میری خاطر مدارات کی، اس پر منگولیا کی شہری زندگی کا رتی بھر شائبہ تک نہیں تھا۔ جس کمرے میں میرے سامنے کھانے پینے کی روایتی چیزیں چُنی ہوئی تھیں، وہ سب کی سب یہ لوگ چلتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر ہی یہاں آئے تھے۔ اُس وقت وہ کمرا مجھے منگولیا کی کسی دور دراز گھاٹی میں، کسی خانہ بدوش چرواہے کا نمدے سے بنا ہوا خیمہ لگ رہا تھا۔ وہ خیمہ جس کے باہر لکڑی کا جنگلا نہیں بلکہ آزاد فضا تھی مگر یہ سب میرا تخیل تھا۔ حقیقت کچھ اور تھی۔

☆☆☆

اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا، دونوں آزاد خانہ بدوش زندگی کے پالے ہوئے تھے لیکن الان بتار میں انہیں اس پختہ کمرے میں زندگی گزارنا تھی جس کے باہر صرف چند گز کے فاصلے پر لکڑی کی قدِ آدم اونچی باڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ باڑ جسے اوچ کھوگنین نے پنجرے سے تعبیر کیا تھا اور وہ اب خود اس پنجرے کا قیدی تھا۔ وہ پنجرہ جس کے دروازے پر قیدی نے خود اپنے ہاتھ سے خریدا ہوا تالا لگایا تھا۔

خانہ بدوش، پابند زندگی بسر کرنے سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا بھی اس طرزِ زندگی سے نا آشنا تھے مگر پھر بھی اُن کے پاس بقا کا یہی راستہ تھا مگر یہ راستہ انہوں نے ہنسی خوشی نہیں چُنا، اس کے پیچھے موسمیاتی جبر موجود تھا۔ وہ جبر جس کا سامنا کرنے کی صلاحیت ان کے پُرکھوں میں تو بہت زیادہ تھی مگر اب ہزاروں سال سے جاری لڑائی لڑتے لڑتے یہ خانہ بدوش شاید تھک چکے تھے۔ ان کے بازو شل ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے موسمی جبر کے خلاف اس لڑائی میں چنگیز خان کی اولادوں کو پسپائی میں ہی بقا کا راستہ نظر آ رہا ہے۔

2009-10ء کا سرد ترین موسم اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام لایا تھا۔ اُس سال منگولیا کے طول و عرض میں شدید سردی پڑی تھی۔ معمول سے بہت زیادہ برف باری ہوئی۔ سردی اور برف باری کے باعث زمین پر سبزے کی تہ جل گئی۔ درخت پتّوں سے خالی ہو گئے۔ کئی مہینوں تک زمین پر چاروں طرف برف کی چادر بچھی ہوئی نظر آتی تھی۔ گلّہ بانی ان کا واحد ذریعۂ معاش تھا۔ دوسرے خانہ بدوشوں کی طرح انہوں نے بھی چارے کا ذخیرہ کر رکھا تھا لیکن وہ بھی کم پڑ گیا۔ پہلے تو موسمِ سرما میں اُن کے مویشی زمین پر باقی ماندہ سبزہ، جھاڑیوں اور سدا بہار درختوں کے پتے چَر کر پیٹ بھر لیا کرتے تھے اور اگر پھر بھی پیٹ خالی رہتا تو ذخیرہ شدہ چارا اُن کی خوراک کی ضرورت پوری کر دیتا تھا لیکن اُس موسمِ سرما میں آنے والے برفانی طوفانوں نے گھاس کی ایک ایک پتی جلا ڈالی تھی۔ مویشی کم خوراکی کا شکار تھے۔ کم خوراکی اور سرد ترین برفیلے موسم نے اُس سال لاکھوں مویشیوں کو مار ڈالا تھا۔

خدا خدا کر کے موسمِ سرما ختم ہوا۔ خانہ بدوشوں نے سکھ کا سانس لیا کہ چلو جو کچھ بچ گیا، وہی غنیمت ہے لیکن مختصر موسمِ گرما میں ایک اور قیامت اُن شامت کے ماروں پر ٹوٹ پڑی۔ مختصر موسمِ گرما میں بدترین خشک سالی کے باعث قحط حملہ آور ہو گیا۔ اب تو مویشیوں کو کھلانے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

موسمِ سرما کے آغاز پر اوچ کھوگنین کے گلّے میں مختلف اقسام کے ساڑھے تین سو مویشی تھے مگر جب موسمِ سرما اور قحط ختم ہوا تو صرف نوّے مویشی ہی زندہ بچے تھے۔ وہ بھی مکمل طرح سے صحت مند نہیں تھے۔ کم خوراکی نے انہیں نہایت دُبلا کر دیا تھا۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ تک میں معمول سے بہت زیادہ کمی آ چکی تھی۔ یہ اُن کے لیے نہایت تشویشناک صورتِ حال تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اوچ کھوگنین کے ذہن میں ہجرت کے خیال نے جنم لیا۔

اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا تنہا نہیں تھے۔ منگولیا کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اُس برس منگولیا میں موسمی تغیرات اور شدت کے باعث اسّی لاکھ مویشی مارے گئے تھے، جن میں بھیڑیں، بکریاں، یاک، اونٹ اور گھوڑے شامل تھے۔

یہ وہ بدترین معاشی نقصان تھا جس نے اوچ کھوگنین اور اس جیسے لاکھوں خانہ بدوشوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیا۔ خانہ بدوش زندگی میں معاشی ضروریات کی تکمیل کا انحصار پالتو مویشیوں پر ہوتا ہے جب مویشی ہی نہ رہیں تو پھر اُن کے لیے مشکلات کے سوا کچھ اور چیز باقی نہیں رہتی۔ شدید معاشی نقصان کے باعث، بڑی تعداد میں گلّہ بان خانہ بدوش دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے

قابل نہیں تھے۔ آخر اوچ کھوگنین کی طرح لاکھوں خانہ بدوشوں نے شہروں کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا۔

"اس تباہی کے بعد ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا کہ خانہ بدوشی کو ترک کر کے شہر میں آ بسیں۔ سو ہمارے پاس جو کچھ مویشی زندہ بچے تھے، اُنہیں بیچ باچ کر ہم نے ایسا ہی کیا۔" اوچ کھوگنین نے ایک دن باتوں باتوں کے دوران یہاں آنے کی توجیح پیش کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "کم از کم یہاں ہماری زندگی تو محفوظ ہے۔ ہم بھوکے تو نہیں مر سکتے۔ ہمیں طبّی سہولت مل سکتی ہے۔ ہمارے بچوں کا مستقبل محفوظ ہے۔ اسی لیے ہم پہاڑی گھاٹیاں چھوڑ کر شہر میں آ بسے ہیں۔ یہاں کم سے کم محنت مزدوری کر کے اپنی گزر بسر تو کر سکتے ہیں۔" اس نے جب اپنی بات مکمل کر کے میری طرف دیکھا تو میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ مجھے صرف اوچ کھوگنین کی بات پر ہی یقین نہیں تھا۔ میں اس کا پس منظر بھی جانتا تھا۔ زندگی کی بقا، رسم و رواجوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ معاش کمزور ہو، زندگی خطرات سے دوچار ہونے لگے تو پھر اپنی بقا ہر شے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا ہی نہیں، منگولیا کے لاکھوں خانہ بدوش اپنی اپنی بقا کے لیے پُرکھوں کی روایتی خانہ بدوشی ترک کر چکے ہیں۔

اس بات پر کوئی دوسری رائے نہیں تھی کہ مستقل سکونت اختیار کرنے والے خانہ بدوشوں کو شہر میں کئی بہتر اور نئے معاشی مواقع اور سہولتیں میسر آئیں گے۔ ان کی اور ان کے بچوں کی زندگیاں یہاں زیادہ بہتر انداز میں گزریں گی۔ اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا کو شہری زندگی سے بہت زیادہ لگاؤ نہیں ہے البتہ انہیں یہاں ملنے والے زیادہ بہتر معاشی مواقع اور بچوں کے بہتر مستقبل کا یقین ضرور ہے۔ وادیوں اور گھاٹیوں میں گلّہ بانی کر کے زندگی بسر کرنے والے ان خانہ بدوشوں کو وہاں نہ تو طبّی سہولت یا آسانی مل پاتی ہے اور نہ ہی ان کے بچے اسکول جا سکتے ہیں لیکن شہروں میں ایسا نہیں ہے۔ ٹُورُوا کو یقین ہے کہ شہر میں اس کے شیر خوار بیٹے انوکا کو اچھے اسکول میں پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ بیٹے کے اسکول جانے میں ابھی کئی سال باقی ہیں، البتہ بیٹی کی عمر چھ سال ہے اور وہ اسکول جا سکتی ہے لیکن خانہ بدوشی میں پروان چڑھنے والی ٹُورُوا اس سوال کے جواب میں بالکل خاموش تھی کہ اس کی بیٹی کب اسکول جانا شروع کرے گی۔ شاید وہ عورت کے اُس روایتی کردار کو اپنی بیٹی کی شکل میں زندہ رکھنا چاہتی تھی جس میں وہ صرف گھر گرہستی مویشیوں کی دیکھ بھال، بچے پالنا اور میاں کی خدمت گزاری تک ہی محدود رہتی ہے۔ ویسے وہ اس سوچ میں کسی قدر حق بجانب ہی تھی۔ اتنی جلدی صدیوں پرانی رسم و رواجوں سے دامن کیسے چھڑایا جا سکتا ہے۔ البتہ مجھے یقین تھا کہ شہری ماحول میں پلنے والی اُس کی بیٹی ضرور اسکول جائے گی۔ مجھے اس بات کا یقین اوچ کھوگنین کے چہرے کو دیکھ کر ہوا تھا۔

الان بتار کے باسی اسے مختصراً 'یو بی' کہتے ہیں۔ اس وقت یو بی میں ساٹھ کے اَریب قَریب خانہ بدوش آباد ہیں جن میں سے زیادہ تر موسمیاتی جبر کے ہاتھوں پسپا ہو کر یہاں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ویسے بھی گزشتہ چند برسوں کے دوران الان بتار کے نواح میں قیمتی معدنیات کے بھاری ذخائر دریافت ہوئے ہیں جس میں گلّہ بانی کے مقابلے میں کان کنی کر کے پیسے کمانے کے زیادہ مواقع موجود ہیں۔

منگولیا کی نئی منافع بخش صنعت کان کنی نے صرف خانہ بدوشوں کی ہی آنکھیں نہیں چندھیائی ہیں بلکہ ان سے فائدہ حاصل کرنے والی کثیر القومی کمپنیوں نے بھی حکومت سے کیے گئے معاہدوں کے ذریعے آئندہ کئی برسوں تک کے لیے کھربوں ڈالر کی سرمایہ کاری شروع کر دی ہے۔ سرمایہ بے شک باہر سے آیا ہے لیکن کان کنی کے لیے افرادی قوت منگولیا کی ہی ہے اور وہ زیادہ تر اُن خانہ بدوشوں پر مشتمل ہے جنہیں بہتر زندگی کی آس فطری ماحول سے لبریز وادیوں سے گھسیٹ کر شہروں کی آلودہ فضاؤں میں گھسیٹ لائی ہے۔ کوئلہ، سونا اور تانبے کے بھاری ذخائر کو، زمین کی تہوں کو چیر کر باہر نکالنے کے لیے کان کنی کی صنعت تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ جس تیزی سے یہ نئی صنعت پھل پھول رہی ہے، اتنی ہی تیزی سے خانہ بدوشوں کا اپنی روایتی زندگی سے قائم مضبوط رشتہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ موسمیاتی جبر اپنی جگہ، بہتر معاش بھی دوسری بڑی وجہ بن رہی ہے منگولیا کے خانہ بدوشوں کی مستقل سکونت کا۔

☆☆☆

اوچ کھوگنین اور ٹُورُوا کا شہر الان بتار دلچسپ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی ہے جس کے بیچوں بیچ لمبائی کے رُخ پر پھیلا ہوا شہر بستا ہے جس کے عقب میں دریا بہتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شہر کے بسنے سے پہلے یہ ایک تجارتی گزرگاہ تھی۔ 1639ء میں ایک بودھ راہب گھومتا گھامتا یہاں آ نکلا۔ کہتے ہیں کہ یہ جگہ چین سے وسط ایشیا کو جانے

والی ایک تجارتی رہ گزر تھی۔ راہب نے اس جگہ ایک بودھ معبد تعمیر کیا جس کے ساتھ ہی بعد کے برسوں میں یہاں ایک چھوٹا سا تجارتی مرکز بھی قائم ہوگیا۔ رہ گزر تو تھی ہی، تجارتی مرکز قائم ہوا تو کاروانوں کا پڑاؤ پڑنے لگا۔ رفتہ رفتہ کچھ تاجر پیشہ یہاں مستقل سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کے غلام بھی یہیں بس گئے۔ رفتہ رفتہ کچھ اور لوگ آتے گئے اور شہر بستا چلا گیا۔ یوں آج کے پُر ہجوم الان بتار کی بنیاد پڑی تھی۔ کہتے ہیں کہ اگلی ڈیڑھ صدی میں اس جگہ ایک پورا شہر آباد ہوچکا تھا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق 1778ء میں بھی الان بتار اسی مقام پر واقع تھا جہاں یہ آج موجود ہے۔ شہر کا مرکز وہی بودھ عبادت گاہ تھی جس کے برابر تجارتی مرکز قائم کیا گیا تھا۔

بودھ راہب نے تو اُس وقت آج کے الان بتار کو نہایت ویران پایا تھا لیکن جب میں اس شہر میں پہنچا تو ہر طرف لوگوں، تعمیراتی ساز و سامان اور گاڑیوں کا ہجوم ملا۔ شہر لمبائی کے رُخ پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے بیچوں بیچ سے 'شاہراہِ امن' گزرتی ہے۔ یہ دارالحکومت کی واحد مرکزی سڑک ہے جو آپ کو شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہے۔ شہر کے ایک سرے پر لاکھوں لوگ آباد ہیں۔ یہ اس شہر کی افرادی قوت ہے اور ان کی اکثریت سابق خانہ بدوشوں کی ہے۔ دوسرے کنارے پر صنعتی علاقہ اور کام کرنے کے دیگر مقامات واقع ہیں۔ اس لیے صبح اور شام کے اوقات میں سڑک پر ٹریفک کا اتنا زیادہ ہجوم ہوتا ہے کہ گاڑیاں چلتی نہیں ہیں بلکہ ایک ایک انچ کرکے اپنی منزل کی جانب کھسکتی چلی جاتی ہے۔ صبح ہوتے ہی لوگوں کا سیلاب دورویہ شاہراہِ امن کے ایک حصے پر بہہ نکلتا ہے اور شام کو سیلابِ انسانی سڑک کی دوسری طرف بہنے لگتا ہے اپنے اپنے گھروں تک پہنچنے کے لیے۔

الان بتار میں ہر روز بڑی تعداد میں سیکڑوں خانہ بدوش گھرانے ملک کے مختلف حصوں سے آکر سماتے جارہے ہیں۔ اپنی پہچان، روایات اور صدیوں قدیم طرزِ زندگی چھوڑ کر آنے والے یہ سادہ لوح خانہ بدوش جہاں شہر میں پہنچ کر مختلف سماجی، نفسیاتی اور بعض اوقات معاشی مسائل کا شکار ہوتے ہیں، وہیں شہری بھی اُن سے شاکی نظر آتے ہیں۔ شہریوں کو شکوہ ہے کہ وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ کی زندگی کے عادی نہیں ہوتے۔ انہیں ہجوم میں سڑک پار کرنے کی تربیت نہیں ہوتی۔ وہ سہولتوں کے استعمال سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ شہری زندگی سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں وہ برسوں بتا دیتے ہیں مگر پھر بھی خود کو اچھی طرح شہری معاشرے میں سمو نہیں پاتے۔

الان بتار میں بڑی تعداد میں خانہ بدوش قبائلیوں نے سکونت اختیار کی ہے، اس کے باعث شہر میں کئی سماجی مسائل پیدا ہوچکے ہیں۔ اکثر اوقات سادہ لوح خانہ بدوش پُر ہجوم سڑک پر گھنٹوں اس انتظار میں کھڑے رہتے ہیں کہ گاڑیاں چلی جائیں تو سڑک پار کرتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ سڑک پار کرنے کے لیے سڑک پر قدم تو رکھ دیتے ہیں لیکن آتی جاتی گاڑیوں کے بیچ، بچ بچا کر گزرنے کے بجائے سُٹ پٹا جاتے ہیں۔ کچھ گاڑیوں سے ٹکرا کر زخمی تو کئی بدنصیب موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کو بچانے کے چکر میں جب کوئی ڈرائیور اچانک اپنی گاڑی کے بریک لگاتا ہے تو اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک آدھ گھنٹے تک سڑک ٹریفک کے لیے بند ہوجاتی ہے اور گاڑیوں کی میلوں لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔

منگولیا کبھی کمیونسٹ ملک تھا۔ شہر میں لوگوں کو قطار لگا کر اشیائے ضرورت خریدنے کی عادت ہے جب کہ یہاں آکر بس جانے والے نئے نئے شہریوں کو یہ اندازہ ہی نہیں کہ قطار کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دُکان دار کو پیسے دو اور چیز لو۔ اس کے لیے قطار میں کھڑا کیوں ہوا جائے۔

شہری تیمور کا کہنا ہے ''بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی خانہ بدوش، سر پر لکڑی کا صندوق اٹھائے ہوئے فٹ پاتھ پر جارہا ہوتا ہے لیکن قطار دیکھ کر صرف یہ جاننے کے لیے لوگوں میں گھستا چلا آتا ہے کہ یہاں لوگ کیوں جمع ہیں؟ ایسا کئی بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بعض لوگ اس بات پر ان سادہ لوح سچے انسانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کچھ انہیں ڈانٹ بھی دیتے ہیں۔ جب کسی کو انہیں ڈانٹا ہوا دیکھ لوں تو سچ مانو مجھے دلی افسوس ہوتا ہے۔''

شہر والے شاید خانہ بدوشوں کی نفسیات، ان کی بودو باش اور تاریخی پس منظر سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اُن کے لیے تو یہ وہ بے وقوف لوگ ہیں جو منہ اٹھا کر شہروں کا رُخ کرلیتے ہیں۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو تیمور کی طرح ان سے ہونے والی زیادتیوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

الان بتار میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو ان خانہ بدوشوں کی تاریخ، نفسیات، سماج اور مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا...... یہ ہیں بابر۔ وہ منگولیا کے معروف پبلشر اور مورخ ہیں۔ منگولیا کی تاریخ اور تاریخی کرداروں پر اُن کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اُس دن وہ ہجرت کرکے مستقل سکونت اور بہتر معاشی مستقبل کی آس لیے یہاں آنے والے خانہ بدوشوں کے بارے میں بتا رہے تھے:

''یہ آزاد فطرت کے حامل لوگ ہیں۔ نئے آنے والوں کو تو چھوڑیے، میں متعدد ایسے گھرانوں سے مل چکا ہوں جو کئی سالوں سے یہاں رہ رہے ہیں لیکن اُن کی ذہنیت اب بھی خانہ بدوش معاشرے والی ہی ہے۔ یہ لوگ بعین وہی کرتے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ سرکشی اور آزادی اُن کے لہو میں شامل ہے۔ صرف اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کرنا اور پھر عمل کر گزرنا اُن کی فطرت ہے۔ وہ دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین کی پروا نہیں کرتے۔ اُن کے لیے تو اپنی سوچ اور اپنا فیصلہ ہی اصل قانون ہے۔ ذرا ٹریفک کو ہی لے لیں۔ یہ لوگ قانون کی رتی برابر بھی پابندی نہیں کرتے۔ اگر وہ یہ سوچ لیں کہ انہیں ابھی سڑک پار کرنی ہے تو وہ دائیں بائیں دیکھے بنا سڑک پر قدم رکھ دیتے ہیں اور کسی کی پروا کیے بنا آگے بڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ کوئی گاڑی انہیں کچل سکتی ہے۔ ان کو بچاتے ہوئے کوئی تیز رفتار گاڑی اُلٹ سکتی ہے، وہ گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا سکتی ہے مگر...... یہ خانہ بدوش اس بات کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا مقصد سڑک پار کرنا ہے اب چاہے کچھ کیوں نہ ہوجائے، انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔'' یہ کہہ کر بابر نے گہری سانس لی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''قصور اُن کا نہیں، اصل قصور تو اُس خانہ بدوش آزاد ذہنیت کا ہے جو ان کے خون میں سمائی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر بولے ''آخر کو یہ ہیں تو چنگیز خان کی اولاد نا۔'' اس کے بعد ایک زوردار قہقہہ اُن کے منہ سے نکلا۔ میں بھی کافی دیر سے خاموش بیٹھا اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُن کے قہقہے میں میری ہنسی بھی شامل ہوچکی تھی مگر یہ ہنسی طنزیہ نہیں تعریفی تھی اور بابر کا قہقہہ بھی اُن سادہ لوح مگر آزاد فطرت چنگیز خان کے وارثوں کی تعریف میں تھا۔

یہ تھے چنگیز خان کی سرزمین کے اُن قبائلیوں کے بارے میں الان بتار کے شہریوں کے تجربات اور باتیں جو خانہ بدوش زندگی سے ناتا توڑ کر شہر میں چلے آئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خانہ بدوش مہاجرین کی خود اپنے بارے میں رائے، شہریوں کی رائے سے کچھ مختلف نہیں تھی لیکن وہ حالات کو دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

''ہم نے اس طرزِ کی زندگی، اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ لوگوں کا سمندر ہے۔ یہاں کوئی کسی سے واقف نہیں۔ ہر شخص اپنی زندگی میں مگن ہے جب کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔'' اوچ کھوگنین نے الان بتار میں کئی ماہ گزارنے کے بعد اپنے تجربے سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کا سماج ہمارے ہاں سے قطعی مختلف ہے۔ ہمارے ہاں ایک کا دکھ سب کا دکھ اور کسی ایک کی خوشی سب کی خوشی ہوتی ہے مگر یہاں جس کو آپ جانتے ہیں، اُس کی خوشی اور دکھ سے ہی آپ کا تعلق ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ تعلق سچا بھی ہو۔ بہت کچھ صرف دکھاوا ہوتا ہے۔ ہمارے جذبے خالص، ہماری محبت سچی اور ہماری عقیدت ملاوٹ سے پاک ہوتی ہے۔ شہر میں سب کچھ اس کے برعکس ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور چھت کو گھورنے لگا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہم جو ہجرت کرکے یہاں آباد ہوچکے ہیں، شاید کبھی بھی ان جیسوں کی طرح کے شہری نہیں بن سکیں گے۔ ہم شاید کبھی بھی الان بتار والوں جیسے نہیں ہوسکتے، البتہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے بچے اُن جیسے ہی ہوجائیں گے لیکن افسوس......'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر اُداس لہجے میں کہنے لگا۔ ''ہم سب کے بچے اُن جیسے تو ہوجائیں گے لیکن افسوس کہ وہ کبھی بھی اپنے پُرکھوں جیسے نہیں رہ سکیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے موتی جیسے دو آنسو لڑھک کر گالوں پر آکر ٹِک گئے۔ اُس وقت مجھے یہ دو آنسو سچے موتی لگے...... انمول سچے موتی جو شہر کی آلودہ فضا میں دھندلا کر بہت جلد اپنی آب و تاب کھودینے والے تھے۔

☆☆☆

الان بتار میں کئی ماہ گزارنے کے بعد ایک ہفتے کی صبح اوچ کھوگنین اپنے مختصر سے خاندان کے ہمراہ بس کے ذریعے چند روز کے لیے اپنے آبائی علاقے کو روانہ ہوا۔ اس سفر میں، مَیں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ وہ اپنے سسر کی مدد کے لیے جارہا تھا۔ گرمیوں کا موسم ختم ہونے والا تھا اور اسے اپنے سسر کے کھیت کی صفائی، فصل کی کٹائی اور سردیوں میں مویشیوں کے لیے چارہ ذخیرہ کرنے میں اُن کا ہاتھ بٹانا تھا۔ گاؤں، شہر سے ڈھائی گھنٹے کی دُوری پر تھا۔

نُوروا کے باپ کا نام جایا تھا۔ وہ بھی گلّہ بان خانہ بدوش ہے۔ کبھی اُس کے مویشیوں کا ریوڑ ایک ہزار سے زائد بھیڑوں، بکریوں اور یاک پر مشتمل تھا لیکن گزشتہ موسمِ سرما کی شدید سردیوں، برفانی طوفان اور پھر گرمیوں میں خشک سالی اور قحط کے باعث اس کے بھی سیکڑوں مویشی

ہلاک ہوگئے تھے۔ اب اس کے ریوڑ میں صرف تین سو بھیڑ بکریاں ہی باقی رہ گئی تھیں مگر جایا بوڑھا ہونے کے باوجود نہایت باہمت تھا۔ وہ اپنی زمین کو چھوڑنے کے بجائے یہیں کی مٹی میں مل کر خاک ہو جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس نے اوچ کھوگنین کو بھی بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہاں سے نہ جائے لیکن اُس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ جب وہ نہ مانا تو جایا نے اُس کو بادلِ ناخواستہ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

جایا، اوچ کھوگنین کی طرح کم ہمت نہیں تھا۔ وہ جہاں دیدہ شخص تھا۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد ایک بار پھر اس کے حالات بدل جائیں گے۔ اس کا ریوڑ ایک بار پھر ہزار سے زیادہ مویشیوں پر مشتمل ہوگا۔ گزرے موسمِ سرما سے اس نے ایک سبق سیکھا تھا۔ اس بار وہ نہ صرف مویشیوں کے لیے زیادہ مقدار میں چارا ذخیرہ کر رہا تھا بلکہ اس بات کی بھی منصوبہ بندی کر چکا تھا کہ اگر اس موسمِ سرما میں بھی سردیاں سخت پڑیں اور برف باری شدید ہوئی تو وہ کس طرح اپنے مویشیوں کو چارا دے گا کہ وہ پورے موسم میں خوراک کی کمی کا شکار نہ ہونے پائیں۔ اس لیے اُس نے موسمِ گرما میں اپنے چھوٹے سے کھیت پر جہاں اناج کاشت کیا، وہیں کافی بڑے رقبے پر چارا بھی اُگا دیا تھا، جسے اب وہ کاٹ کر، خشک کرنے کے بعد ذخیرہ کرنے والا تھا۔ جایا کی مدد کے لیے اُس کی بیٹی ٹُوروا اور داماد اوچ کھوگنین بھی پہنچ رہے تھے۔

بس منگولیا کے خوبصورت کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں اوچ کھوگنین اور ٹُوروا کی زبانی جایا کی کہانی سُن چکا تھا۔ اب اس سے ملاقات کا انتظار تھا۔ میں صرف جایا سے ہی نہیں ملنے والا تھا بلکہ ایک قدیم تہذیب کے جدید عہد میں موجود ایک کردار سے ملنے والا تھا۔ خانہ بدوش تہذیب کا وہ کردار جس کے دو رُخ تھے، ایک جایا دوسرا اوچ کھوگنین۔ ایک وہ جو موسم کی سختی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر شاکر و صابر ہوا اور ایک بار پھر ہمت جمع کر کے حالات کی بہتری پر کمربستہ ہوگیا۔ دوسرا وہ جو اپنے جیسے لاکھوں خانہ بدوشوں کی طرح ہمت ہار بیٹھا اور اجنبی معاشرت میں آ کر اپنی شناخت کو اپنے ہی ہاتھوں مٹانے پر تُل گیا۔

یہ ایک خوبصورت وادی تھی۔ قدرت کے حسین نظاروں کی فراوانی تھی۔ ہوا خالص اور کیف آگیں تھی۔ بس سے اترتے ہی میں نے گہری سانس لی۔ میرے پھیپھڑے خالص آکسیجن سے بھر گئے۔ روح کو شادابی کا احساس ہوا۔

میں نے اوچ کھوگنین اور ٹُوروا کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر بھی ایسے تاثرات تھے کہ جیسے برسوں کے بعد وہ اپنے کسی بہت ہی پیارے مگر بچھڑے دوست سے ملاقات کر رہے ہوں۔ بچوں کے چہروں پر بھی نہایت پاکیزہ، سچی اور معصوم مسکراہٹ رقصاں تھی۔

ہم نے سامان اٹھایا اور پیدل آگے بڑھنے لگے۔ ہمیں جایا تک پہنچنے کے لیے بیس منٹ کی پیدل مسافت طے کرنی تھی۔ ہم پگڈنڈیوں پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

شام ہو چکی تھی۔ خیمے کے باہر موسم سرد تھا۔ میں جایا اور اُس کے اہلِ خانہ کے ساتھ بھیڑ کے بالوں سے بنے بڑے سے گول خیمے میں بیٹھا ہوا قہوہ پی رہا تھا۔ ہم کھانا کھانے کے بعد دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے جایا سے سوال کیا کہ ”تم نے اوچ کھوگنین کی طرح یہاں سے شہر چلے جانے کا فیصلہ کیوں نہیں کیا؟“

”یہ میری زمین ہے۔“ میری بات سُن کر اُس نے نہایت اعتماد سے کہنا شروع کیا۔ ”میرے پُرکھوں کی زمین ہے۔ اس زمین پر میں اپنے انداز کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ مجھے کسی اور کے بنائے ہوئے قانون پر نہیں چلنا پڑتا۔ میں صرف روٹی کے لیے اپنا سب کچھ کیوں چھوڑ دوں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ ”ہم خانہ بدوش ہیں۔ مویشی ہی ہماری معیشت ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ پچھلے موسمِ سرما میں ہمارے بہت سارے مویشی مر گئے تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی دھرتی چھوڑ دوں۔ اپنی زندگی کا چلن چھوڑ دوں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور گہری نظروں سے اوچ کھوگنین اور ٹُوروا کو دیکھنے کے بعد ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔

”میں بوڑھا ہوں مگر کم ہمت نہیں۔ مجھے اپنے پُرکھوں سے پیار ہے، اپنی تہذیب سے پیار ہے۔ میرے سارے جانور مر جائیں تب بھی میں یہ دھرتی چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاؤں گا اور نہ ہی بھوکا مروں گا۔ ہم کمیونسٹ ملک میں رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری افسر شاہی بدعنوان ہے۔ ہمیں وہ کوئی خاص سہولت نہیں دیتے لیکن یہ کمیونزم کی مہربانی ہے کہ ہمارا سب کچھ ختم ہو جانے کے باوجود بھی یہ ہمیں بھوکا مرنے نہیں دیں گے۔ ہمارا ملک، ہماری حکومت ہمیں یہیں پر دو وقت کی روٹی پہنچائے گی تاکہ ہم زندہ رہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”ویسے بھی انسان بھوک سے نہیں مرتا۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“ اُس کی بات سُن کر میں نے حیرت سے کہا۔

”ممکن ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”انسان بھوک سے نہیں، حوصلہ ختم ہو جانے پر مر جاتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں عزم و حوصلے کی جواں چمک رقصاں تھی۔

جایا کی بات سُن کر میں نے باری باری اوچ کھوگنین اور ٹُوروا کے چہروں کی طرف دیکھا۔ اُن کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ شہر نے ان کے گوشت پوست کے وجود کو تو زندہ رکھنے کی ضمانت فراہم کر دی ہے لیکن یہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کرتے وقت ہی ان کا حوصلہ شاید مر چکا تھا۔ اب میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جایا کی نظر میں وہ دونوں زندہ تھے یا پھر......

”ویسے آپ شہر کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟“ میں نے قہوے کی خالی پیالی جایا کی بیوی چنسل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انسانوں کا جنگل ہے۔“ چنسل نے دبی آواز میں جواب دیا۔ یہ سُن کر میں مسکرا دیا۔

”شہروں میں رکھا ہی کیا ہے۔“ جایا نے بیوی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”شور، دھواں، ہنگامے، لوٹ مار، نہ ہوا خالص نہ ہی لوگوں میں اپنائیت ...... میں تو شہر میں ہفتہ بھر بھی نہیں رہ سکتا۔ اگر کبھی میں ایک ہفتہ شہر میں رہ گیا تو یقیناً بیمار پڑ جاؤں گا، مر جاؤں گا۔“

”مگر ٹُوروا اور اوچ کھوگنین بھی تو......“ میں نے جایا سے ادھورا سوال کیا۔

”سچ کہہ رہے ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اس دھرتی کو اُس طرح محسوس نہیں کرتے جیسا کہ میں اور میری بیوی۔“ یہ کہہ کر اُس نے چنسل کی طرف دیکھا، وہ مسکرا دی۔ ”ان دونوں کا ڈیرا یہیں ہمارے برابر تھا۔“ اُس نے بیٹی اور داماد کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ اُن دونوں کا فیصلہ تھا۔ ہم خوش نہیں تھے لیکن ان کی خوشی کے لیے مجبوراً اجازت دے دی۔ اب بھی اُن کا خیمہ یہیں موجود ہے۔ کبھی کبھار اُس پر نظر پڑتی ہے تو دل سے ہُوک اٹھتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ بیٹی اور داماد کے چہروں پر بدستور پشیمانی کے آثار تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”کبھی کبھی اُس خیمے کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ وہ دونوں واپس آ جائیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ان دونوں کو تو تن کی آسانی اور بچوں کا شہری مستقبل چاہیے۔ وہ انہیں مل گیا مگر روح کی بے آرامی کی قیمت پر۔“ یہ کہہ کر اُس نے آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پونچھا اور ہاتھ بڑھا کر ٹُوروا کی گود سے اپنے شیر خوار نواسے کو لے کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ ”انہیں خوش رہنا چاہیے۔ ان کی خوشی ہماری خوشی ہے۔“ اس نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جایا کی بات سُن کر پہلی بار اوچ کھوگنین اور ٹُوروا نے فرش پر سے نظریں اوپر اٹھائی تھیں۔

☆☆☆

”اوچ کھوگنین اور جایا جیسے لوگ قابل اور تجربہ کار گلہ بان ہیں۔ ویسے بھی گلہ بانی اور خانہ بدوشی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔“ الان بتار واپسی پر میری ملاقات بابر سے ہوئی تو میں نے انہیں جایا سے ملاقات کا احوال سنایا تو انہوں نے کہا۔ ”ویسے ناکامی اور دلبرداشتہ ہونے میں قصور اوچ کھوگنین کا نہیں۔ یہ موسم کا جبر تھا۔ اس جیسے ہزاروں خانہ بدوش ہیں جو اُن جیسے ہی حالات کی ستم ظریفی کا شکار بنے۔“ یہ کہہ کر اُنہوں نے کچھ دیر تک سوچا۔ ”ویسے جایا ٹھیک کہتا ہے۔ وہ سچا خانہ بدوش ہے۔“ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے کمیونسٹ دور میں منگولیا کے تمام چھوٹے بڑے علاقوں میں مختلف قسم کے کارخانے لگائے گئے تھے۔“ بابر نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ ”1990ء کی دہائی کے اوائل میں جب سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا تو کارخانے بھی بند ہوگئے۔ ستّر سالہ سوویت کمیونسٹ دور میں خانہ بدوشوں کی کئی نسلیں صرف مزدور بن کر رہ گئی تھیں۔ جب روزگار ختم ہوا تو خانہ بدوشوں کی ان بے روزگار مزدور اولادوں نے الان بتار کا رُخ کیا۔ وہ شہر کے مضافات میں واقع پہاڑی ڈھلوانوں کی قدرتی چراگاہوں کو استعمال میں لا کر ایک بار پھر وہی پیشہ اپنانا چاہتے تھے جو کئی نسلوں پہلے اُن کے باپ داداؤں کا تھا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے گلہ بانی کر کے گزر بسر کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔ بطور خانہ بدوش اُن کی گھٹی میں موجود گلہ بانی کے علم کی سیاہی پھیکی پڑ گئی تھی۔ انہیں راستہ یاد تھا لیکن اس پر چلا کیسے جائے وہ یہ بات نہیں جانتے تھے۔ مویشی تھے، چراگاہیں تھیں مگر تین چار نسلوں پہلے خانہ بدوشی ترک کرنے والوں کی

مزدور اولادیں مویشی، اُس کی نفسیات ...... سب کچھ بھول بھال گئے تھے۔" یہ کہہ کر بابر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے۔ "یہی کچھ اوچ کھوگنین کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ ہوگا۔ جاپا جیسے لوگ اب منگولیا میں بہت ہی تھوڑے رہ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کافی دیر خاموش رہے اور سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔ "مجھے افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اپنے اجداد کی روایتی زندگی کو ترک کر رہے ہیں۔ یہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ نہ تو وہ مکمل طور پر کبھی شہری زندگی میں فِٹ ہو پائیں گے اور نہ ہی انہیں خانہ بدوشی میں جینے کا ہُنر یاد رہے گا...... قابلِ افسوس ہے یہ بات مگر یہی سچ ہے۔"

☆☆☆

اوچ کھوگنین کو اپنی آنکھوں میں سنہرے سپنے سجا کر الان بتار آئے ہوئے کئی ماہ بیت چکے ہیں مگر اب تک اس کے معاشی حالات مستحکم نہیں ہو پائے۔ اُس نے شراکت داری اور از خود کئی کاروبار کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کام میں اُسے کامیابی نہ مل سکی۔ اس کی ناکامیوں کا ایک سبب اُس کی ناتجربہ کاری بھی ہے۔ ان کوششوں میں وہ اپنی جمع پونجی میں سے خاصی رقم گنوا چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ الان بتار سے ساڑھے تین سو کلومیٹر دور اپنی وادی میں پلٹ کر جانا نہیں چاہتا۔ وہ یہیں رہنا چاہتا ہے۔ اس کی بیٹی اسکول جاتی ہے۔ ایک دو سال بعد بیٹا بھی اسکول جانے کی عمر تک پہنچ جائے گا۔ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتا ہے مگر ذریعۂ معاش اس کو اب تک پریشان کیے ہوئے ہے۔

منگولیا میں تین کھرب ڈالر کی غیر ملکی سرمایہ کاری سے کان کنی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ بڑی تعداد میں مزدور پیشہ اور ہُنر نہ رکھنے والے لوگ اس شعبے میں کھپ رہے ہیں مگر اوچ کھوگنین کین زمین کے اندر غاروں میں جانے سے ڈرتا ہے۔ اس لیے وہ اس طرف کا رُخ نہیں کر رہا۔

"اب کیا کرو گے؟" اُس دن میں نے اس سے سوال کیا۔ میں الوداعی ملاقات کے لیے اوچ کھوگنین کے گھر پہنچا تھا۔ میری تحقیق مکمل ہو چکی تھی۔ وہ تحقیق کا مرکزی کردار تھا اور اگلے دن مجھے واپس اپنے گھر لوٹ جانا تھا۔

"بہت تھوڑے پیسے باقی بچے ہیں۔" اس نے میری بات سُن کر افسردگی سے کہا۔ "اب جتنے پیسے ہیں، سوچ رہا ہوں اس سے کوئی پرانی کار خرید لوں اور ڈرائیونگ سیکھ کر اسے بطور ٹیکسی چلانا شروع کر دوں۔ کم از کم دو وقت کی روٹی تو مل جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ رُکا اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "اس طرح بیٹی کو اسکول چھوڑنے اور لانے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ویسے گلّہ بانی کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"الان بتار اس کام کے لیے موزوں نہیں البتہ یہاں بچوں کی پرورش بہتر انداز میں ہو سکتی ہے۔"

کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ اس نے باڑ کے دروازے کو کھولا۔ لکڑی کا بڑا سا پھاٹک نما دروازہ ایک چرچراہٹ سے کھلا۔ میں اُس کی طرف پلٹا اور کہنے لگا۔ "تم گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کیسا محسوس کرو گے؟"

میرے سوال کے جواب میں اس نے منہ نہیں کھولا بلکہ سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ میں اس کے اندرونی کرب کو محسوس کر چکا تھا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ چند لمحے تک ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔

"یا خدا...... میں اپنے گھوڑوں کی کمی بہت محسوس کرتا ہوں۔" اس نے یہ بات میری طرف نہیں آسمان کو غور سے تکتے ہوئے کہی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اُسے گلے سے لگایا۔

چند گھنٹوں کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی شہری زندگی میں کھو جانے والے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں الان بتار خالی ہاتھ آیا تھا مگر مجھے گھر لوٹنے کا یقین تھا۔ اب میں الان بتار سے ایک خانہ بدوش کی دکھی زندگی کی کہانی اپنے ساتھ لے کر گھر لوٹ رہا تھا۔ وہ جیب میں جمع پونجی ڈال کر یہاں آیا تھا کبھی نہ لوٹنے کے لیے مگر اب تک خالی ہاتھ تھا۔ اُس کے پاس اگر الان بتار کا دیا ہوا کچھ تھا تو وہ یادیں تھیں جو یہاں آنے کے لیے اس نے اپنی روایتی خانہ بدوش زندگی کو ترک کر کے بدلے میں پائی تھیں۔ صرف ماضی کی یادیں ہی اب اس کا حاصلِ ہجرت تھا۔

چنگیز خان کے قبیلے کے اس فرد کو اب الان بتار کے ہنگامہ خیز شب و روز میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن بتانے تھے۔ اپنے سپنوں کے پورا ہونے کی امید میں...... ہر نئے دن ٹوٹنے والے نئے معاشی عذابوں کے کرب...... اور ماضی کی خانہ بدوش زندگی کی انمول یادوں کے ساتھ......

ماضی کی وہ انمول یادیں جو دو چار پَل کے لیے ہی سہی مگر اوچ کھوگنین پر ٹوٹنے والے عذابوں کی شدت کو ضرور کچھ کم کر دیتی ہوں گی۔

شوبھوگیان

ابن کبیر

زندگی گزارنا آسان نہیں، قدم قدم پر رنج ومحن کی بیڑیاں، آزمائشیں، خطرات منہ کھولے منتظر رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کٹھن حالات میں کچھ لوگ باوقار انداز میں بامقصد زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں شوبھوگیان چندانی کا شمار ہوتا ہے جسے رابندرناتھ ٹیگور، موئن جودڑو کا آدمی، کہہ کر پکارتے تھے۔ جس نے وطنِ عزیز کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے قربانیوں کا نیا بابِ رقم کیا، آزادی کے بعد بھی ظلم واستبداد کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ ہندو ہونے کی وجہ سے اسے جب جب ہندوستان جانے کا کہا گیا اس کا جواب ہوتا، یہ وطن صرف مسلمانوں کا نہیں، ہم اقلیت کا بھی ہے، ہم کیوں جائیں کسی غیر دیس میں۔

ایک بے لوث خدمت گار پاکستان کی جیون کتھا

یہ اُس درویش کی کتھا ہے جس کی داستانِ زیست واقعات کی فراوانی اور حالات کے نشیب و فراز کے سبب افسانوی معلوم ہوتی ہے۔

یہ وہی قابلِ احترام انسان ہے جسے "گرودیو" یعنی رابندرناتھ ٹیگور نے "موئن جودڑو کا آدمی" کہا، شیخ ایاز جیسے دانا شاعر نے "قلندر" کہہ کر پکارا اور اِس یقین کا اظہار کیا کہ اُس کی موت کے بعد اُس کی سمادھی پر میلا لگے گا!

جس طرح جنرل ڈیگال نے سارتر کے بارے میں کہا

تھا کہ ”سارتر فرانس ہے، اور فرانس سارتر!“ اِسی طرح دعوے دار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ”وہ جودڑو ہے اور موئن جودڑو وہی ہے!“ اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہ اِسی قدیم زمین سے اس کی سرشت اُبھری اور اِسی دھرتی کے حسین رنگوں نے اُس کی زیست میں قوس قزح کے رنگ بھر دیے۔ یہی سبب ہے کہ آج اس کا ذکر ایک اساطیر، ایک داستان معلوم ہوتا ہے۔

اُن کی تمام عمر مزدوروں، کسانوں اور معاشرے کے کچلے ہوئے طبقات کے حقوق کی جنگ لڑتے گزری۔ اِس دوران اُنہیں جیل کی سختیاں اور آمروں کے مظالم بھی سہنے پڑے مگر وہ اپنے نظریات سے دست بردار نہیں ہوئے۔ وہ اپنی دھرتی کے سچے عاشق ہیں، اِسی باعث تقسیم کے بعد بھی سندھ کی زمین سے جُڑے رہے۔ آیئے لاڑکانہ میں مقیم قابلِ احترام اس سیاسی وسماجی راہ نماء، دانش وَر، تاریخ داں، افسانہ نگار اور کالم نویس کی زندگی میں جھانکتے ہیں۔

☆☆☆

پُراسرار شہر موئن جودڑو سے ایک میل کے فاصلے پر تارا کینال کے علاقے ”اولندھو“ میں ”بندی“ نامی ایک گاؤں ہے، جو ضلع لاڑکانہ کا حصہ ہے۔

اِس گاؤں کے فطری ماحول میں زندگی پُرسکون اور دھیمی ہے۔ پانچ ہزار سال قدیم شہر موئن جودڑو سے قربت کا بھی اثر ہے جس کے سبب یہاں ہر کیفیت قدیم اور ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

سن 1920 کا ذکر ہے۔ ماہ اپریل مئی میں داخل ہو رہا تھا۔ سود کو ناپسند کرنے والا کھراز میں دار پیربھ داس اپنے دو ہونہار سپوتوں ٹنورمل اور کھلن داس کے ساتھ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر کے صحن میں چپ کا آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اُس کے شب وروز یکساں سکون کے ساتھ گزر رہے تھے اور وہ وقت کی رفتار سے مطمئن تھا۔

یہ ایک ایسا خاندان تھا جو سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک کا پیروکار تھا اور اس تعلق سے ”نانک پنتھی“ کہلاتا تھا۔ اِس عقیدے کے لوگ داڑھی وغیرہ نہیں رکھتے۔ بس اپنے بابا کی تقلید میں تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں۔

پیربھ داس کا جوان بیٹا ٹنورمل بھی زندگی کے پگڈنڈیاں ایک اَن کہی مسرت کے ساتھ عبور کر رہا تھا۔ خدا نے اُسے ایک سُگھڑ بیوی دی تھی اور اُس کے صحن کو اولاد کی نعمت سے بھر دیا تھا۔ اور جب مئی کو شروع ہوئے تین دن گزر گئے، اُسے ایک اور خوش خبری ملی جس نے اُس کی مسرت کو دوچند کر دیا۔

اوپر والے نے اُسے ایک اور بیٹے سے نوازا تھا۔ اُس نعمت خداوندی کو وصول کرنے کے بعد زمیں دار کے گھر جشن منایا گیا اور بچے کا نام سوبھراج رکھا گیا۔

”یہ بچہ ہمارے خاندان کا نام روشن کرے گا۔“ دادا پیربھ داس نے اپنے پوتے کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ باپ ٹنورمل نے بھی زیرِلب دعا کی کہ یہ بچہ آنے والے وقتوں میں اُس کا نام روشن کرے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبولیت کی گھڑی تھی، کیونکہ آج اِسی سوبھراج کے طفیل نہ صرف زمیں دار ٹنورمل اور اُس کے باپ پیربھ داس کا ذکر آتا ہے بلکہ تفصیلات کھوجنے والے تو سوبھراج کے پردادا شری گیان چند تک پہنچ جاتے ہیں جو ہریل داس کا ہونہار سپوت تھا۔

سوبھراج کے اجداد کا تعلق کنڈیارو، سندھ سے تھا جو ایک صدی قبل موئن جودڑو کے نزدیک مسلمانوں کے گاؤں ”بندی“ میں آن بسے جہاں اُس زمانے میں نہ تو مندر تھا، نہ ہی کوئی گردوارہ! اور وہاں کی آزاد فضا میں اُس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہندو مسلم سب شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو مانتے تھے اور شہباز قلندرؒ کا نام احترام سے لیتے تھے۔ ہر تہوار میں گاؤں کے باسی، مذہب سے بالاتر ہو کر یکساں مسرت کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ مسلمان بزرگ ہندوؤں کو تعویذ دیتے اور ہندو عورتیں مسجد میں منت کا دیا جلایا کرتی تھیں۔

سوبھراج کے آباواجداد نے ”بندی“ آنے کے بعد ایک جھونپڑی نما کمرے میں پنساری کا کاروبار شروع کیا۔ قسمت نے ساتھ دیا، ترقی کرتے کرتے یہ گھرانہ اچھا خاصا بیوپاری بن گیا۔ اب ضرورت مندوں کو سود پر قرضے دینے کا سلسلہ شروع ہوا اور اِس میدان میں بھی کام یابی نے قدم چومے۔ الغرض سوبھراج کی پیدائش تک یہ بیوپاری خاندان معاشی مسائل سے آزادی حاصل کر چکا تھا۔

والدین کی خواہش تھی کہ اُن کا سپوت انڈین سول سروس میں نام کمائے لیکن شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اُس نے سرکاری ملازمت کو درخورِ اعتناء نہ جانا۔ البتہ اِس بابت کبھی اُس کے اپنوں نے شکایت نہیں کی، کیوں کہ سرکاری مشینری کا حصہ بن کر زیادہ سے زیادہ وہ تھوڑے بہت پیسے اور عزت کما لیتا اور ریٹائرمنٹ کے بعد پینشن پر گزرا کرتا، پر جس کٹھن راہ کا اُس نے چناؤ کیا، وہ اُسے بین الاقوامی شہرت تک لے گئی۔

☆☆☆

پیربھ داس کے پوتے اور ٹنورمل کے سپوت سوبھراج کا سفرِ زیست پوری ایک صدی پر محیط ہے جس میں اُس کا پیدائشی نام کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ پہلے وہ ”سوبھا خان“ ہوا، پھر ”سوبھو گیان چندانی“ کے نام سے معروف ہوا۔ بعد میں بڑے احترام کے ساتھ کامریڈ کا سابقہ اُس کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا۔ اور وہ کامریڈ سوبھو ہو گیا۔

گاؤں کے فطری اور آزاد ماحول میں پروان چڑھنے والا سوبھراج سات بہن بھائیوں میں تیسرا تھا۔ ٹنورمل کی پہلی اولاد کلیانی تھی، پھر کیول رام پیدا ہوا۔ پھر سوبھراج اِس دنیا میں آیا۔ اگلا نمبر پرمیشوری کا تھا جس کی تقلید خوب چند نے کی، جس کے بعد ودھیا نے آنکھ کھولی۔ ٹنورمل کی آخری اولاد ساوتری تھی۔

سوبھراج نے گاؤں کے فطری ماحول کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اپنے اہلِ خانہ سے ہم آہنگ ہونے کی مشق کی جس نے مستقبل میں مختلف طبقات میں گھل مل جانے کے عمل میں اُس کی معاونت کی۔

سوبھراج کی ماں محنتی، جفاکش اور خداترس خاتون تھی۔ وہ سوبھراج اور اُس کے بہن بھائیوں کی معصوم سماعتوں کی پیار بھری لوریوں سے بھر دیتی، اُنھیں مزے دار کھانے کھلاتی اور ساتھ ساتھ چکی پیستی رہتی۔ ہر ماں کی طرح وہ ممتا سے بھرپور اور قربانی کے جذبے سے سرشار تھی۔

کھلن داس سوبھو کا چچا تھا جس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ اُس نے اپنے بھتیجے، یعنی سوبھو کے بڑے بھائی کیول رام کو بیٹے کی طرح پالا، پر سوبھراج سے بھی چچا کو کچھ کم محبت نہیں تھی۔

سوبھراج اپنے دادا پیربھ داس سے بہت محبت کرتا تھا جو صبح سویرے اُٹھ کر باقاعدگی سے امن وشانتی اور اپنے بچوں کے لیے مخصوص دعائیں کرتا، جنھیں سکھ لوگ ”ارداس“ کہتے ہیں۔

اُس وقت بندی میں کوئی مندر نہیں تھا پر سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والا دفینہ کتھاؤں کی صورت دستیاب تھا۔ کم سن سوبھراج گرونانک سے لے کر گرو گووند سنگھ تک کی کہانیاں جو ”سکھ پنتھ“ کہلاتی ہیں، بہت شوق سے سنتا تھا۔ سندھ کی قدیم دھرتی کی عظیم لوک کہانیاں سنتے ہوئے سوبھراج نے ماں کی گود سے نکل کر چلنا سیکھا۔ اور آگے چل کر بندی نامی خاموش گاؤں کو اپنے وجود کی روشنی سے ایک زمانے کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔

☆☆☆

”غریب بھی تو انسان ہی ہوتا ہے اور اِس بات کا حق دار ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے!“

کھیل کود میں مصروف سوبھراج کے ذہن میں یہ خیال بابائے سندھ، کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے توسط سے پروان چڑھا۔ سچ تو یہ ہے کہ سوبھراج کی کہانی کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ذکر کے بغیر اُدھوری معلوم ہوتی ہے۔

وہ تبدیلیوں کا زمانہ تھا! دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح سندھ میں بھی جاگیردار گھرانوں میں پیدا ہونے اور تربیت پانے والے کئی پڑھے لکھے نوجوانوں نے خود کو انقلابی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا تھا، جن میں 10 اکتوبر 1901 کو پیدا ہونے والے حیدر بخش جتوئی کا نام نمایاں ترین تھا۔

حیدر بخش جتوئی ایک نظریاتی انسان تھے۔ وہ کارل مارکس کی تعلیمات سے متاثر تھے اور اُنہیں عملی جامہ پہنانے کے خواہش مند تھے۔ بڑی مشکل سے گھر والوں کے اصرار پر اُنہوں نے سرکاری ملازمت قبول کی تھی۔ محنتی آدمی تھے، ترقی کرتے کرتے وہ ضلع لاڑکانہ کے ڈپٹی کلیکٹر کے عہدے تک پہنچے لیکن ترقی پسند نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے بھی اُنہوں نے ہاریوں کے لیے خاصا کام کیا۔

اور ایک خوب صورت صبح سوبھراج نے اِس مجاہد کو اپنے دادا کی اُطاق میں دیکھا۔

دراصل جس زمانے میں حیدر بخش جتوئی ہیڈ منشی تھا، اُنہوں نے بندی کا دورہ کیا تھا۔ اُس وقت سوبھراج سات برس کا تھا۔

اُس موقعے پر پیربھ داس نے حیدر بخش جتوئی سے شکایت کی کہ اُن کا پڑوسی جان بوجھ کر اُس مقام پر گائے ذبح کرتا ہے، جہاں ہندو اور گاؤں کے دوسرے لوگ میٹھا پانی بھرنے جاتے ہیں، اِس عمل سے بھائی چارے کی فضا خراب ہوتی ہے۔

اقلیت کے دُکھ درد کو محسوس کرنے والے حیدر بخش جتوئی نے جب یہ سنا، تو فوراً اُسے بلایا اور خوب ڈانٹا۔

اُس دن سوبھراج نے پہلی بار اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ایک ایسے شخص کو دیکھا جو مذہبی وطبقاتی تقسیم سے بلند ہو کر انصاف پر مبنی فیصلے کرتا تھا۔

اُس زمانے میں سرکاری اہل کار اُن کسانوں کا مال و

اسباب ضبط کر لیتے تھے، جو حکومت کو ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار سرکاری اہل کار کسانوں کے ضبط شدہ اسباب کے ساتھ مویشی اور برتن بھی ساتھ لے گئے۔ جب جتوئی صاحب کو پتا چلا، تو اُنہوں نے سخت غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ جو غریب کسان ٹیکس ادا نہیں کر سکے، اس کے گھر کے مویشی تک اُٹھالاؤ، فوراً جاؤ اور انہیں واپس کر دو۔"

یہ سوبھو کی کہانی کا انتہائی اہم موڑ ہے، کیوں کہ مستقبل قریب میں کم سن سوبھراج اِسی ہمدرد انسان کے نقشِ قدم پر چلنے والا تھا!

اِس ملن سار اور اُجلے شخص (حیدر بخش جتوئی) نے 1945 میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر "ہاری کمیٹی" میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ واضح رہے کہ سندھی ہاری کانفرنس کی بنیاد 1930 میں رکھی گئی تھی جس کا مقصد سکھر بیراج کے مضافات میں واقع غیر آباد زمین کو ہاریوں میں تقسیم کروانے کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ اِس جماعت کا تعلق "آل انڈیا کسان سبھا" سے تھا۔ تنظیم میں کامریڈ عبدالقادر کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ ہاری کمیٹی نے سندھ کے جاگیرداروں کے خلاف ٹنڈو جام اور دوسرے علاقے میں موثر تحریکیں چلائیں۔ کامریڈ عبدالقادر کے ساتھ کام کرنے والوں میں ایک بڑی کھیپ کسان اور کمیونسٹ راہ نماؤں کی تھی۔ پھر حیدر بخش جتوئی اِس کا حصہ بنے، جن کی قیادت میں ہاری کمیٹی نے ٹریڈ یونین کی طرز پر کسانوں کے لیے جدوجہد کی۔ وہ 1947 میں کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اُنہوں نے ہاریوں میں شعور بیدار کرنے کے لیے "حق دار" نامی ایک ہفت روزہ بھی نکالا۔ قصہ مختصر، بعد میں اِسی انقلابی کے نقشِ قدم کا تعاقب کرتے ہوئے سوبھراج نے بھی ہاریوں کے لیے شان دار جدوجہد کی۔

لیکن یہ تو بعد کی کہانی ہے، اُس وقت تو کم سن سوبھراج یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ ایک باہر کا آدمی جو ہمیں ٹھیک طرح جانتا تک نہیں ہے، وہ ہماری مدد کیوں کر رہا ہے؟

اُس کے ننھے دل میں بھی دوسروں کی خدمت کرنے اور دکھ درد میں کام آنے کے جراثیم پلنے لگے۔ اُس کی شفیق ماں کی تربیت بھی شاملِ حال رہی، جو دُکھی خواتین کی دل کھول کر مدد کیا کرتی تھی اور اُسے بھی کچلے ہوئے انسانوں کی مدد کرنے کا پاٹ پڑھاتی تھی۔

دھیرے دھیرے غریبوں کی مدد کرنے کا جذبہ قوی ہوتا گیا۔ جب کبھی دادا کے ساتھ اناج کے بٹوارے کے وقت سوبھراج کھیتوں میں جاتا تھا تو ہمیشہ ہاریوں کی طرف داری کرتا۔

ایک دن باپ نے ننھے سوبھراج سے کہا۔ "آج اناج کا بٹوارا تم کرو گے۔" ننھے نے جھٹ پٹ بڑا حصہ ہاری کو اور چھوٹا حصہ دادا کو دے دیا۔

باپ نے حیرت سے اِس کا سبب دریافت کیا تو سوبھراج نے جواب دیا۔ "بابا، اِس غریب ہاری کا خاندان بڑا ہے، ہمارے پاس ویسے بھی بہت سی زمینیں ہیں۔"

اُس موقع پر پیربھ داس نے حیران و پریشان ٹنورمل کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور بڑے ہی مشفقانہ انداز میں پوتے سے کہا۔ "ہاں، سوبھراج تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

ایسا نہیں ہے کہ سوبھراج ابتدا ہی سے انقلابی تھا، وہ تو فقط غریبوں کا ہم درد تھا۔ متحرک طبیعت اُسے کچھ نیا کرنے کو اُکساتی رہتی تھی۔

☆☆☆

مستقبل میں سرمایہ دارانہ مظالم کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جانے والا سوبھراج بچپن میں شرمیلا اور کم گو بچہ تھا۔

اُس کے والدین کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ تھا لیکن اُس وقت "بندی" میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ ہاں، ساتھ والے گاؤں "نکی" میں ایک اسکول ضرور تھا، سو پیربھ داس کے پوتے نے پانچ برس کی عمر میں حصولِ علم کے لیے گاؤں سے باہر قدم رکھا اور یوں 1925 میں سیکھنے کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔

ماں نے اپنے سپوت کے لیے اپنے ہاتھ سے ایک بستہ تیار کیا جس میں ننھے سوبھراج کی کتابیں سما جاتیں، جو اُسے اُس وقت غیب سے در آنے والی عجیب و غریب اشیاء معلوم ہوتی تھیں۔ اِسی بستے میں ایک سلیٹ، قلم اور سیاہی ہوتی جس کی بوتل کا ڈھکن اگر ڈھیلا ہو تو وہ ضائع ہو جاتی اور سوبھو کے ساتھ تو اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔

اسکول گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دور تھا، اور کم سن سوبھراج کو علم کے پیچھے پاپیادہ بھاگنا پڑتا تھا۔ ہاں، کبھی کبھار بیل گاڑی یا گدھا گاڑی میں سفر کی سہولت میسر آجاتی تو سوبھراج کی عید ہو جاتی۔

یہ ایک صدی پُرانے اسکول کا ذکر ہے، جو آج کی جدید درس گاہوں سے یکسر مختلف تھا۔ اساتذہ جہاں سزا دینے

کے لیے آزاد تھے، وہیں اپنے طلبا کی تربیت کے معاملے میں بھی طاق تھے۔ اور استاد کے گھر کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنا باعث شرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہر غم سے آزاد سوبھراج نے بھی بچپن میں اپنے استاد کے گھر کے لیے دیگر ساتھیوں کی طرح لکڑیاں اکٹھی کیں۔

اُس کی ہمدردیاں ابتدا ہی سے محنت کشوں کے ساتھ تھیں۔ جب گاؤں کے ماسٹر جی لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیتے تو وہ غریب ہاریوں کے بچوں کے ساتھ لکڑیاں کاٹنے جنگل چلا جاتا۔ بڑا بھائی کیول رام ذرا وڈیرا قسم کا بچہ تھا۔ وہ محنت نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے باپ ٹنورمل سے چھوٹے کی شکایت کر دی۔ "بابا، سوبھراج ہاریوں کے بچوں کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا ہے۔"

اُس موقعے پر پیربھ داس نے اپنے ننھے پوتے سے کہا۔ "اگر تمہارے ماسٹر کو ضرورت ہے تو میں لکڑیوں سے بھری گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔"

سوبھراج نے معصومیت سے جواب دیا۔ "مجھے تو اِس کام میں مزہ آتا ہے!"

پانچویں تک تعلیم اپنی مادری زبان یعنی سندھی میں حاصل کی۔ سندھی کے ساتھ ساتھ سوبھراج کی گرمکھی پر بھی خوب گرفت تھی۔ آنے والے وقت میں انگریزی زبان پر بھی یدطولیٰ حاصل ہو گیا۔

پانچویں پاس کرنے کے بعد اِس آزاد منش بچے نے قمبر کا رُخ کیا جہاں اے وی ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اسکول گھر سے دور تھا سو بورڈنگ ہاؤس میں ڈیرا ڈال لیا۔ راہ نما کا کردار تین سال بڑے کیول رام نے نبھایا۔

وہیں سوبھو ایک بیماری میں مبتلا ہو گیا، اور یہ تھی مطالعے کی بیماری!

سندھی زبان کی کُتب سے اُسے عشق تھا۔ اُس وقت تک دنیا کی اہم ترین تصانیف کے سندھی تراجم دستیاب تھے۔ ان میں مذہبی کتابیں، جاسوسی ناول اور کلاسک ادب بھی شامل تھا۔ اسی زمانے میں سوبھراج نے رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں رٹیں۔

ان دنوں ہندوؤں میں ایک مُصلح مہاراج روچی رام تیجورام کا چرچا تھا جو فرسودہ رسم و رواج کے خلاف لکھتے تھے اور ایک رسالہ "دھرم پرچاریہ" نکالتے تھے۔ اِس رسالے نے سوبھو کے خیالات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اُس کا حافظہ کمال کا تھا اور یہ قابلیت بورڈنگ کے ساتھیوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ شام ڈھلنے کے بعد بچے اپنے قابل ساتھی کے گرد جمع ہو جاتے، مہابھارت اور رامائن کی کتھا سنانے کی فرمائش کی جاتی اور پھر رات کے خوش گوار پلوں کو سوبھو کی آواز مہمیز کرتی۔ جلد اِس داستان گو نے ساتھیوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

پڑھائی میں تیز سوبھو لڑائی جھگڑے میں بھی آگے آگے رہتا۔ یہ فعال طبیعت ہی تھی جو اِس کام پر اُکساتی تھی۔ اگر کوئی اور نہیں ملتا، تو بڑے بھائی ہی سے دو دو ہاتھ کر لیتا۔ آزاد فطرت یہ بچہ خاصا منہ پھٹ تھا۔ دوسرے کے "نک نیم" رکھنے میں تو اُسے ملکہ حاصل تھا۔

ایک روز قمبر کے ایک ٹرانسپورٹر کے بیٹے کو سوبھراج نے "گھسے باز" کہہ کر پکارا، تو ساتھیوں نے خوب قہقہے لگائے۔ بعد میں بچارے کا نام ہی "گھسے باز" پڑ گیا۔

اگلا شکار اساتذہ تھے۔ شرارتی سوبھراج نے اپنے ٹیچرز کو بھی عجیب عجیب نام دے رکھے تھے جن کی پُرمزاح ادائیگی ساتھیوں کو ہنس ہنس لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کر دیتی۔ اور ایک دن اساتذہ تک یہ اطلاع پہنچ گئی۔ توقع کے عین مطابق خوب درگت بنی لیکن آزاد منش سوبھراج تو سفر جاری رکھنے پر یقین رکھتا تھا۔

"سوبھراج بدتمیز نہیں، بس اس کی طبیعت میں طراری ہے۔" سرزنش کرنے کے بعد ایک استاد نے دوسرے سے کہا۔

دوسرے نے تائید کی۔ وہ سب قابل سوبھراج کو پسند کرتے تھے۔ اِس بچے میں لوگوں کو گرویدہ بنالینے کی بھرپور صلاحیت تھی۔

☆☆☆

سفر سوبھراج کی قسمت میں تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اُس کے شفیق ہیڈ ماسٹر روچی رام شاہانی 1934 میں ریٹائر ہو گئے۔ اُن کی جگہ علی گڑھ سے آنے والے ایک استاد نے لی۔ نہ جانے کیوں ہندو لڑکے اُس استاد سے خائف تھے سو اکثریت نے مائیگریشن کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ سوبھراج اور کیول رام دونوں کو لاڑکانہ لے گیا جہاں اُنہوں نے لاڑکانہ ہائی اسکول میں داخلے کے لیے ٹیسٹ دیا۔ سوبھراج تو پاس ہو گیا، لیکن شومئی قسمت کیول رام کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

بہ ظاہر دونوں بھائیوں کی راہیں الگ ہونے کو تھیں پر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

جب ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو اطلاع ملی کہ سوبھراج مذہبی مزاج کا حامل نوجوان ہے اور گرنتھ، مہابھارت اور رامائن کے علاوہ معلوماتِ عامہ کے مضمون میں بھی خوب گرفت رکھتا ہے تو لاہوری محلے میں مقیم اِس طالب علم کو ہدایت کی کہ اپنے بھائی کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہوجائے۔ یوں کیول رام کو سوبھراج کی ذہانت کے طفیل ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا۔

وہاں انگریزی کے استاد سوبھراج پر بہت مہربان تھے جن کی لائبریری اِس نوجوان کا مسکن بن گئی۔ مطالعے نے اُسے موئن جودڑو کے قریب کردیا جس کا شمار میسوپوٹیمیا اور کریٹ کی طرح قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے اور جسے مہرگڑھ کی نو ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب کا تسلسل تصور کیا جاتا ہے۔

مستقبل کا کمیونسٹ اور سیکولر دانش ور اُس زمانے میں بہت حساس تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ مذہبی کتابیں پڑھتے ہوئے وہ آب دیدہ ہوجاتا۔ شاید اسی حساسیت نے سنیاسی بننے کی راہ دکھائی۔

ایک دن گھر سے بھاگ کر سوبھراج رادھا سوامی پنتھ کی شاخ کے ایک آشرم پہنچ گیا جہاں توحید پرست سنیاسی مقیم تھے جو شادی نہیں کرتے تھے۔

وہ خود کو آشرم کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے میں جُٹا تھا کہ اچانک اپنے والد کو روبرو پایا وہ خاموشی سے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی زرعی اراضی پر لے گئے جو سوا ایکڑ کے رقبے پر پھیلی تھی۔ یوں وہ سنیاسی بنے بغیر واپس اپنے دادا کے پاس آگیا۔

لاڑکانہ میں جن اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا، اُن میں نمایاں ترین ہیڈ ماسٹر کرم چند ہنگورانی تھے، جو سوبھراج سے بہت شفقت برتتے تھے۔ جب اُن کا تبادلہ لاڑکانہ سے این جے وی ہائی اسکول کراچی ہوا اُنھوں نے اپنے چہیتے شاگرد کو بھی وہیں بلوالیا۔ اس شفیق استاد نے نہ صرف اسے اپنے گھر میں ٹھہرنے کی سہولت دی بلکہ این جے وی اسکول میں داخلہ بھی کروا دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی دو بھتیجیاں تھیں جو سوبھراج کی ہم عمر تھیں، دونوں بہت ہی نٹ کھٹ، شوخ اور چنچل تھیں لیکن کتابوں میں گم سوبھراج نے اُن کی جانب توجہ نہیں دی۔

تنہائی پسند اس نوجوان میں عجیب کشش تھی۔ لوگ اُس کی جانب کھنچے چلے آتے۔ ایک دن اُس نے ایک لڑکے کو اپنا پیچھا کرتے پایا۔ رک کر اُس کا مسئلہ دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ تو اُس کی علمیت کا دیوانہ ہوگیا ہے۔ بعد میں اُس نے محبت بھرا ایک خط اس کے نام لکھا۔

یوں سوبھراج اور اس کی دوستی ہوگئی۔ وہ اس کے اہلِ خانہ سے بھی گھل مل گیا۔ گھر سے دوری کا احساس جاتا رہا۔

اُس لمحے سوبھراج نے خود سے کہا۔ ''میں خوش نصیب ہوں کہ اچھے لوگ مجھے منتخب کرلیتے ہیں اور مجھ سے دوستی کرتے ہیں!''

☆☆☆

تیرہ برس کے سوبھراج کو ایک روز کسی نے بھگت سنگھ کی تصویر پکڑادی۔ اِس انقلابی کی فکر نے سوبھراج کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کی تصویر جیب میں رکھ کر گھومنے لگا۔ دراصل لاڑکانہ کے زمانے میں اُس کا تعلق پرچی نامی ایک لڑکے سے قائم ہوگیا تھا جو انقلابی تبدیلیوں کے لیے تشدد پسندی کا حامی تھا۔ وہ دورانِ کلاس سوبھراج کے کان میں بھگت سندھ، راج گرو اور سکھ دیو کے کارنامے سرگوشیوں کی صورت اُنڈیلتا رہتا۔ اُس زمانے میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو زندہ باد کے نعرے لگتے تھے، وہیں دوسری طرف بھگت سنگھ زندہ باد کے نعرے بھی لگا کرتے تھے۔ ان دنوں چٹاگانگ کے انقلابیوں کا بھی ذکر رہتا تھا، جنھوں نے 1932 میں چٹاگانگ کے اسلحہ خانے پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا تھا۔

اُس وقت تک سوبھو (سوبھراج) معروف اسکالر سوامی رام تیرتھ کی ''ان دی ورڈز آف گاڈ ریلائزیشن'' پڑھ چکا تھا جس میں یہ پیغام دیا گیا تھا کہ سوشل ازم اور ہندومت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اسی طرح ایک کتاب ''سوشل ازم ان ہندومت'' بھی اس کے زیرِ مطالعہ رہی۔ دھیرے دھیرے اِس نوجوان کا رجحان سوشل ازم کی جانب بڑھنے لگا۔ جلد ہی اُسے احساس ہوگیا کہ امارت اور غربت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ انسانوں کی پیدا کردہ ہے۔

''اب مجھے عملی طور پر اس عمل کا حصہ بننا ہوگا!'' اُس نے فیصلہ لیا اور ''بائیکاٹ برٹش'' اور ''گو بیک سائمن کمیشن'' جیسی تحریکوں میں بہ طور طالب علم بھرپور حصہ لیا۔

1937 میں سوبھو نے میٹرک کیا۔ شومئی قسمت، بڑے بھائی کیول رام امتحان میں کامیابی نہیں حاصل کرسکا۔

''کیول زمین سنبھالے گا اور سوبھراج تم کالج جاؤ گے!'' والد نے حکم صادر کیا جو اُن کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ اب اس کے قدم ڈی جے سندھ کالج کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں وہ شعبۂ آرٹس میں تعلیمی مدارج طے کرنے کا حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔

''میاں، طب کے شعبے کا انتخاب کرو، آرٹس میں کیا رکھا ہے۔'' اُس موقعے پر ایک ناصح نے کہا۔

''ارے جناب، مستقبل انجینئرنگ کا ہے، اس کا چناؤ کرو۔'' ایک اور خیر خواہ نے مشورہ دیا، لیکن دھن کا پکا سوبھو عمرانی علوم میں گرفت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

''میں تو فقط سیاست داں بننا چاہتا ہوں۔'' سوبھو نے یہ کہہ کر ناصحوں کو چپ کروادیا۔ اس زمانے میں یہ نوجوان کانگریس کی فکر سے متاثر تھا اور گاندھی جی کی تقلید میں کھدر کی قمیص پہنا کرتا تھا لیکن جو شخص اس کی روح کو اپنی جانب کھینچتا تھا، وہ تو ''گیتانجلی'' کا خالق ٹیگور ہی تھا۔

بھوک اور غربت سے پاک معاشرے کا خواب دیکھنے والے سوبھو نے ٹیگور کو توجہ سے پڑھا۔ وہ دوستوں سے کہا کرتا تھا ''یہ کتابیں میرے لیے آسمانی صحیفوں کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔''

☆☆☆

1939 میں انٹرمیڈیٹ کا مرحلہ طے کرنے والے سوبھو کے سامنے ایک روز اُس کے ساتھی لیکھو تلسانی نے ''شانتی نکیتن'' میں پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے سوبھو نے اپنے دل کی آواز خیال کیا۔

''تمہارے اِس فیصلے کا سبب کیا ہے؟'' والد نے سوال کیا۔

''شانتی نکیتن بہترین ہندوستانی اور مغربی روایات کا امتزاج ہے۔ وہاں ہوسٹل ہے، دو فیکلٹیاں ہیں۔ وہاں زندگی ہے!'' سوبھو نے احترام کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

والد نے اجازت دے دی۔ سوبھو نے داخلے کے لیے خط لکھا۔ جواب ندارد!

اب کیا کیا جائے؟ اُس نے پرنسپل کے نام ایک تار بھیج دیا۔

''جناب میرا کردار اچھا ہے، پڑھائی میں خوب ہوں، شانتی نکیتن آنا چاہتا ہوں، پریکٹیکل ٹیسٹ پاس کرنے کے لیے تیار ہوں!''

چند روز بعد جواب ملا۔

''تمھارا داخلہ ہوگیا ہے۔ کراچی میں ہمارے نمایندے سے ملو، داخلے کی منظوری خود ٹیگور نے دی ہے!''

تار پڑھ کر سوبھو کی باچھیں کھل گئیں اور وہ سفر کی تیاریوں میں جُت گیا۔ اُس موقعے پر شفیق چچا نے یہ کہہ کر اُس کی مخالفت کی کہ کلکتہ بہت دور ہے لیکن سوبھو نے بڑے بھائی کی سفارش کے طفیل بالآخر اجازت حاصل کرہی لی۔

اس برس شانتی نکیتن جانے والوں میں لاڑکانہ کی دو لڑکیاں بھی تھیں۔ سوبھو اُن سے ملا اور سفر کے انتظامات میں جُت گیا۔

ایک خوش گوار صبح ''کلکتہ ایکسپریس'' میں وہ 23 لڑکیوں اور ایک لڑکے گل چند کی ہم سفری میں شانتی نکیتن کے لیے روانہ ہوا۔ تین دن کا سفر تھا اور وہ اس گروپ میں بیوپاری خاندان سے تعلق رکھنے والا واحد طالب علم تھا۔

پٹری پر دوڑتے ریل کے ڈبے میں دھیرے دھیرے اجنبیت کا احساس گھٹتا گیا۔ اس کا لڑکیوں سے بھی مکالمہ ہوا۔ ان میں ایک لڑکی سندری، جو کسی زمانے میں سوبھو کی کلاس فیلو رہ چکی تھی، اس کے ہر سوال کا بڑی محبت سے جواب دیا کرتی تھی۔

گھر سے دور جانا آسان تو نہیں۔ موسم گرما میں تین دن کا سفر وہ اُکتاہٹ سے بھرپور تھا لیکن سرنگ کے اختتام پر روشنی تھی!

بالآخر وہ شانتی نکیتن پہنچ گیا۔ اُس سحرانگیز علمی گہوارے میں قدم رکھنے کے بعد ایک اور پریشانی نے اُسے گھیر لیا۔ دراصل کالج کو تین دن بعد کھلنا تھا۔ لڑکوں کا ہاسٹل خالی پڑا تھا۔ اُس تنہائی نے سوبھو کو خوف زدہ کردیا۔ اُس رات وہ گھر کی یاد میں آب دیدہ ہوگیا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی کو خط لکھا جس میں اداسی ہی اداسی تھی!

پریشانیوں کے اُن دنوں میں اس صبح مسرت نے من کے دروازے پر دستک دی۔

سوبھو کی جب آنکھ کھلی تو پورا ادارہ سُریلے سازوں سے ترتیب دی جانے والی موسیقی سے گونج رہا تھا، کہیں بانسری بج رہی تھی تو کہیں ستار، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے کائنات گنگنارہی ہو۔

موسیقی کے اس مسحورکن ماحول میں ایک بے چینی نے اسے آلیا۔ وہاں اُس کی دھرتی یعنی سندھ کے سُر نہیں تھے۔

سوبھو چونکا۔ ''سندھ سے بھی طالبات شانتی نکیتن آئی ہیں، پھر سندھی سُر کہاں گم ہوگئے؟'' یہ سوچتے ہوئے سوبھو لڑکیوں کے ہاسٹل کی جانب دوڑا۔

وہاں پہنچ کر لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والی ایک دوشیزہ

سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، جو چند ساعت بعد نیم لباس اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی، اور سوبھو شرما گیا۔

”بہن، تم اِس حالات میں، یہ کیا ماجرا ہے، اور پھر یہاں سندھ کے سُر کیوں نہیں گونج رہے؟“ سوبھو نے سوال کیا۔

لڑکی نے اُسے بتایا کہ اُن کا سامان غلطی سے واپس کلکتہ چلا گیا ہے، جس کی واپسی میں کچھ وقت لگے گا، اِس لیے سندھ سے آنے والی طالبات ہاسٹل تک محدود ہوگئی ہیں۔

تب سوبھو کو سمجھ میں آیا کہ شانتی نکیتن کی شانتی میں سندھی سُر کیوں نہیں۔

شانتی نکیتن مخلوط تعلیمی ادارہ تھا جہاں چین، انڈونیشیا اور امریکا سے آنے والے طلبا بھی زیرِ تعلیم تھے۔ ابتدائی دنوں میں اداسی کا شکار رہنے والے سوبھو کو جلد اُس درس گاہ نے گرویدہ بنا لیا، جہاں صبح بنگالی زبان میں قومی گیت گائے جاتے تھے اور اُس موقعے پر ادارے کے اساتذہ اور ملازمین کے بال بچے بھی طلبا کے ساتھ ہم آواز ہوتے تھے۔

وہاں سوبھو کے کئی نئے دوست بنے۔ ڈنڈ بیٹھک لگانے والے لڑکوں سے دوستی ہوگئی۔ جلد اِس متحرک اور قابل نوجوان کو انگلش اسٹڈی سرکل کا جوائنٹ سیکریٹری بنا دیا گیا۔ یوں اُس میں روسی، جرمن اور فرانسیسی ادب پڑھنے کی چاہ پیدا ہوئی۔ جب اُس نے روسی ادب پڑھا تو اُسے اپنی زمین یعنی سندھ کے مسائل کے بے حد قریب پایا۔ انگریزی ادب کے استاد کے توسط سے انگریزی، فرنچ اور جرمن ادب کی گہرائی سے روشناس ہوا۔

ٹیگور نے وہاں سوویت یونین کا کمیون سسٹم متعارف کروا رکھا تھا۔ ہاسٹل میں سب کے لیے ایک سا کھانا تیار ہوتا تھا اور سب یکساں سہولیات سے مستفید ہوتے تھے۔ اُس ماحول نے سوبھو کو بہت متاثر کیا۔

شانتی نکیتن میں دو وسیع لائبریریاں تھیں، ایک طلبا کے لیے وقف تھی اور دوسری ٹیگور کے لیے مخصوص تھی۔ ٹیگور کو سب احترام سے ”گرودیو“ کہتے تھے۔ کالج کے پرنسپل انیل چند ٹیگور کے پرسنل سیکریٹری تھے۔ ایک دن گرودیو نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”موئن جودڑو والے اُس لڑکے کو تو بلاؤ جس نے لکھا تھا کہ اُسے انٹرویو کے بغیر داخلہ دیا جائے۔“

حکم صادر ہونے کے چند ساعت بعد سر جھکائے سوبھو اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔

طلسماتی شخصیت کے مالک ٹیگور نے سوال کیا۔

”بھئی تمہیں اس قدر یقین کیوں تھا کہ میں تمہیں داخلہ دے دوں گا؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ میں نے آپ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے یقین تھا کہ آپ ٹیلنٹ کی قدر کرتے ہیں۔“

80 سالہ ٹیگور نے نوجوان سے اُس کا نام دریافت کیا پھر کہا۔ ”بھئی میرے ادارے میں تمہارا نام موئن جودڑو کا آدمی ہوگا!“

سوبھو خاموش رہا۔ گرودیو کی شفقت نے اسے مسرت سے بھر دیا تھا، تاہم وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے برسوں میں اُسے اِسی نام سے یاد کیا جائے گا۔

سوبھو نے بی اے آنرز کے لیے پولیٹیکل سائنس، اکنامکس اور ہسٹری آف اکنامک تھاٹس کے مضامین کا چناؤ کیا تھا۔ انگریزی لازمی تھی، جب کہ اختیاری مضمون کے لیے سندھی ادب کا انتخاب ہوا۔ اس وقت شانتی نکیتن میں سندھی پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا لیکن ٹیگور کے اُس ادارے میں علم کی قدر ہی سب سے اہم اور مضبوط اصول تھا۔

موئن جودڑو کے آدمی کے لیے کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر کرشنو کرپلانی سے رجوع کیا گیا۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ شفیق استاد کرشنو کرپلانی نے خود کو سندھی ادب تک محدود نہیں رکھا بلکہ قابل طالب علم کو فلسفہ بھی پڑھایا۔ وہ کمیونسٹ تھے اور مارکسی نظریات کی تفہیم میں سوبھو کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔

☆☆☆

یہ 1940ء کا ذکر ہے۔ اُس زمانے میں 26 جنوری آزادی کے دن کے طور پر منایا جاتا تھا، کیوں کہ اُسی روز 1928 میں کانگریس پارٹی نے یومِ آزادی کی قرارداد منظور کی تھی۔

طلبا نے فیصلہ کیا کہ وہ قومی آزادی کا یہ دن ضرور منائیں گے۔ واضح رہے کہ یہ دن منانے پر گرودیو نے پانچ برس قبل پابندی عاید کردی تھی۔ طلبا نے سوبھو کو آگے کردیا کہ وہ ٹیگور سے اِس بابت اجازت طلب کرے۔ ٹیگور جاسوسوں کو بہت ناپسند کرتے تھے اور اُنہیں یقین تھا کہ حکومت کو جب یہ خبر ملے گی کہ شانتی نکیتن میں یہ دن منایا جارہا ہے تو حکومتی اہل کار فوراً پہنچ جائیں گے لیکن انہوں نے اپنے چہیتے طالب علم کی بات مان لی۔

نوجوان سوبھو بہت خوش تھا۔ اجازت ملنے کے بعد وہ تیاریوں میں جُٹ گیا۔ اور وہ تقریب یادگار ثابت ہوئی کہ اسی روز اُس نے انگریزی میں زندگی کی پہلی تقریر کی۔ تقریر کے بعد جب وہ پسینے میں شرابور نیچے اُترا، تو آسٹریلیا اور امریکا سے آئے ہوئے اساتذہ نے اُس کا کاندھا تھپ تھپایا۔ اُس موقعے پر ہندوستان کے عظیم مصور نندلال بوس بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی اُسے بہت سراہا۔ یوں راتوں رات موئن جودڑو کا آدمی بین الاقوامی آدمی بن گیا۔

کیا ایک تقریر انسان کی قسمت بدل سکتی ہے؟ سوبھو کے لیے اِس سوال کا جواب اثبات میں تھا۔

تقریب کے چند روز بعد ایک بنگالی لڑکے نے اُسے پیغام پہنچایا کہ چند ”کرانتی کاری“ یعنی انقلابی اُس سے ملنا چاہتے ہیں۔ چائے خانے میں ملاقات ہوئی جہاں عملی جدوجہد سے جڑے سپاہیوں نے اس کی تقریر کو بہت سراہا اور ”بلب پور“ میں معروف کرانتی کاری، پنالال داس گپتا کے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔

کچھ کر گزرنے کی خواہش میں مبتلا بارش میں بھیگتا سوبھو ایک ساتھی کے ساتھ مقررہ وقت پر بلب پور پہنچ گیا۔ اور اُس انسان سے ملا جس نے حقیقی معنی میں اُسے سوشل ازم کی راہ دکھائی۔ ملاقات میں پنالال سے سوبھو کی طویل گفت گو ہوئی۔ اس کرانتی کاری نے نوجوان کو ٹراٹسکی کی مشہورِ زمانہ کتاب ”روسی انقلاب کی تاریخ“ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اُسی عرصے میں سوبھو نے گاندھی، نہرو اور بوس کو بھی پڑھا۔

سیاسی نظریات دھیرے دھیرے پروان چڑھتے رہے۔ اب اُس نے آزادی کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔

☆☆☆

مطالعے میں غرق رہنے والے اِس نوجوان نے سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا، اب دیگر نوجوانوں کی طرح اُسے محبت کے تجربے سے گزرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ لڑکیوں سے گفت گو کرتے ہوئے صرف کام کی باتوں تک محدود رہتا تھا اور غیر ضروری دوستیاں گانٹھنے سے اجتناب برتتا۔

پھر ایسا ہوا کہ صوبۂ پنجاب سے شانتی نکیتن آنے والی ایک لڑکی اُس کے پیچھے پڑگئی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ برسات کا موسم تھا اور بارشوں میں کلکتہ کے باسی پھسلن کے خطرے کے پیشِ نظر جوتے پہننے سے اجتناب برتتے تھے۔ بارشوں میں وہاں ہر شخص چپل پہنے نظر آتا۔

مئی 1861ء میں کلکتہ میں پیدا ہونے والے ٹیگور کا پورا نام ٹھاکر رابندر ناتھ تھا۔ مصوری اور موسیقی پر گرفت رکھنے والے اِس نوبل انعام یافتہ ادیب نے کلکتہ میں 1921ء میں ”شانتی نکیتن کالج“ کی بنیاد رکھی تھی، جو درحقیقت اُن کے والد کے مشن کا تسلسل تھا، جنھوں نے ایک آشرم کی صورت یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ ٹیگور دراصل صحت مند روایات کے پرستار اور جدید علوم کے حامی تھے۔ وہ قدامت پرستی کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ گردانتے تھے۔

پھر ایک روز شریر لڑکیوں نے دیکھا کہ بارش میں ایک لاتعلق نوجوان جوتے پہنے بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا اُن کے سامنے سے گزر رہا ہے۔

وہ شریف انسان سوبھو ہی تھا۔ لڑکیوں نے اُسے چھیڑنا شروع کردیا، چند جملے بھی کسے۔ اُس نے بھی بھونڈا سا جواب دے دیا۔

گروہ میں شامل ایک لڑکی نے بہت ہتک محسوس کی۔ جھٹ سے جاکر پرنسپل سے سوبھو کے 'جنگلی پن' کی شکایت کردی۔ پرنسپل جانتا تھا کہ سوبھو عشق و عاشقی سے دور رہنے والا شریف لڑکا ہے۔ اس موقعے پر اُس نے سوبھو کا دفاع کیا۔

بعد میں ایک دو بار اس لڑکی سے سوبھو کا سامنا ہوا، وہ خشمگیں نگاہوں سے گھورتی رہی اور سوبھو نے خاموش رہنے میں عافیت جانی۔

ایک روز لائبریری سے باہر نکلتے ہوئے سوبھو کو لاڑکانہ کی ہم جماعت سندری کشن شوداسانی مل گئی۔ وہ عمر میں سوبھو سے بڑی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اُس کی منگنی شانتی نکیتن آنے سے قبل ہی ہوچکی ہے۔

اُس نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔ ”تم صرف پڑھتے رہتے ہو، مجھے تو یک سر بھلا بیٹھے!“

سوبھو نے اِس شکایت کو بہت سنجیدگی سے لیا اور اپنی ہم زبان کو ایک درخت کے نیچے لے کر بیٹھ گیا۔ رومانوی گفت گو کیا ہونی تھی، وہ بھلا مانس اُسے سیاست پر لیکچر دینے لگا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ محنت رائگاں نہیں گئی۔ سندری بہت متاثر ہوئی۔ بعد میں وہ اس عالم فاضل نوجوان سے چمٹ ہی گئی اور ہر محاذ پر بہنوں کی طرح اُس کا

دفاع کرنے لگی۔

یہ انقلاب ہی کی کشش تھی کہ سندری سوبھو سے بھی پہلے ”کوئیٹ انڈیا موومنٹ“ میں اپنے خاندان کے ساتھ جیل چلی گئی۔ بہ الفاظ دیگر، سوبھو ایک اچھا استاد اور وہ ایک قابل طالبہ ثابت ہوئی۔

☆☆☆

لائبریری میں ڈیرا ڈالنے والے سوبھو کی لائبریرین سے اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک دن اُس نے رازدارانہ انداز میں اُسے بتایا۔ ”میاں یہ لائبریری تو کچھ بھی نہیں، اصل لائبریری تو گرودیو کی ہے۔“

یہ سُننا تھا کہ سوبھو کے من میں آگ سی لگ گئی جس کی تپش ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اِس ضمن میں پرنسپل انیل چندا سے سفارش کی۔ اُنہیں نے بڑے احترام کے ساتھ ٹیگور کے سامنے قابل طالب علم کی خواہش کا اظہار کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ گرودیو نے کہا۔ ”بس، میرے کمرے میں مت جائے، باقی کمرے موئن جودڑو کے آدمی کے لیے کھلے ہیں۔“

گرودیو کی لائبریری تو علم کا خزانہ تھی۔ ایک نیا جہان اب موئن جودڑو کے آدمی کے سامنے تھا۔

اُس عرصے میں پنا لال داس گپتا اور دیگر انقلابیوں سے بھی ملاقات رہی۔ الغرض شانتی نکیتن میں گزرے دو برسوں میں اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سوبھو کی زیست کا سب سے خوش گوار دور تھا۔

اِسی عرصے میں سوبھو کو بھائی کا ٹیلی گرام ملا کہ اُس کی شادی کی تاریخ 25 اپریل 1941 طے کی گئی ہے، سو وقت پر پہنچ جائے!

دراصل کم سنی ہی میں چودہ سالہ لڑکی لیلا سے اُس کی منگنی کردی گئی تھی۔ اُس نے یہ خبر اپنے ساتھیوں کو بھی دی۔ لڑکوں نے مبارک باد دی، چند نے شرارت سے ٹہوکے بھی دیے۔ لڑکیوں نے بھی اُسے اچھے مستقبل کے لیے دعائیں دیں، البتہ چند دل بہت اُداس تھے۔ خصوصاً کیرالا کی ایک لڑکی لیلا ایپن، جو سوبھو کے بہت قریب تھی اور انگلش سرکل کی جوائنٹ سیکریٹری تھی۔

شادی کی خبر سن کر وہ سوبھو کے پاس آئی۔ ”سوبھو ہم نے سنا ہے کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے اور شادی ہونے والی ہے، کیا کبھی تم اُس لڑکی سے ملے ہو؟“

سوبھو نے جواب دیا۔ ”نہیں، ہمارے یہاں یہ رواج نہیں۔“

اُس لڑکی کو یہ سن کو صدمہ ہوا۔

”اُس کا نام کیا ہے؟“ لیلا ایپن نے سوال ہے۔

”وہ تمہاری ہم نام ہے۔“ سوبھو مسکرایا۔ ”لیلا ہے اُس کا نام!“

یہ سن کا کیرالا کی اس سندری نے قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔ ”مجھے یقین ہے تم خوش رہو گے۔ میں تمہارے لیے خوش ہوں۔ میں تمہیں خط لکھوں گی۔“

درس گاہ سے رخصتی کے وقت طریقۂ کار کے مطابق ایک استاد نے ہر فارغ التحصیل طالب علم سے یہ سوال کیا کہ اُس نے شانتی نکیتن سے کیا حاصل کیا؟

سوبھو نے اپنی باری پر جواب دیا۔ ”میں بچے کی حیثیت سے یہاں آیا تھا اور آدمی بن کر جا رہا ہوں!“

اور حقیقت یہی تھی کہ موسیقی سیکھنے کی خواہش لیے اِس درس گاہ کا رُخ کرنے والا نوجوان انقلابی بن کر لوٹ رہا تھا۔

شانتی نکیتن ہی میں اِس نوجوان کی سومین ٹھاکر سے بھی ملاقات ہوئی تھی جو کمیونسٹ پارٹی کا بڑا نا قد تھا۔ ٹھاکر نے سوبھو کو لاڑکانہ واپسی سے قبل کلکتہ میں ملاقات کرنے کی تاکید کی تھی۔ سو واپسی میں نوجوان نے تین دن ٹھاکر کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران جاسوس اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے دراصل حکومت کو اندازہ ہوگیا تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہ لڑکا اُن کے لیے مسائل کا سبب بن سکتا ہے۔

☆☆☆☆

دھوم دھام سے سوبھو کی شادی ہوئی، اور پہلی بار اکیس سالہ اِس نوجوان نے اپنی شریکِ حیات کو دیکھا جس سے پندرہ برس کی عمر میں اُس کی منگنی طے کردی گئی تھی۔ وہ ایک خوش گوار لمحہ تھا!

شادی کے پانچ دن بعد اُسے لیلا ایپن کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا۔ ”ہمارے دوست سوبھو کی شادی لیلا نامی خوب صورت لڑکی سے ہوگئی ہے، جو یقیناً ایپن نہیں ہے!!“

سوبھو کی بیوی اُس سے سات برس چھوٹی تھی۔ وہ چار جماعتیں پڑھی ہوئی تھی، جو اس زمانے میں بہت تصور کیا جاتا تھا۔ اِس باہمت عورت نے ہر موڑ پر اپنے انقلابی شوہر کا ساتھ دیا۔ سوبھو خود کو خوش قسمت تصور کرتا تھا کہ اُسے لیلا جیسی اچھی شریکِ حیات ملی۔

☆☆☆

1941ء میں سوبھو نے کراچی کا رُخ کیا جہاں قومی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ مورخین کے مطابق یہ قصبہ اٹھارویں صدی کے اوائل میں کلاچی کے نام سے وجود میں آیا تھا اور اس معمولی ماہی گیر بستی کو انگریزوں نے تجارتی نقطۂ نگاہ سے بندرگاہ بنا دیا۔

سوبھو نے ایس سی شاہانی لا کالج (سندھ مسلم کالج) میں داخلہ لے لیا۔ اُسی زمانے میں اس کا تعلق ”کراچی اسٹوڈنٹس یونین“ سے پیدا ہوا جو آل سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے منسلک تھی اور نیم سوشلسٹ نظریات کی حامی تھی۔

سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ طلبا کی راہ نمائی حشو کیول رامانی کر رہا تھا جو اُن دنوں جیل میں تھا۔ وہ ترقی پسند اور سامراج دشمن نوجوان تھا۔ لندن سے آنے والے اِس انقلابی نے آزادی کے تعلق سے جذباتی پمفلٹ شائع کروایا تھا۔ اُس پوسٹر کی اشاعت کی پاداش میں انگریزوں نے اُسے دو سال کی سزا سنائی تھی جو اکتوبر 1941 میں مکمل ہوئی۔ یوں سوبھو کی حشو سے ملاقات ہوئی۔ جلد ہی دونوں دوست بن گئے۔ دونوں کے درمیان ترقی پسند ادب کا موضوع زیرِ بحث رہتا۔

سوبھو نے حشو کے ساتھ اندرونِ سندھ کا طوفانی دورہ کیا۔ اُس وقت ”سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن“ حشو کے زیرِ اثر تھی۔ اُس نے اپنے دوست کا ہر مقام پر بھرپور تعارف کروایا، یوں سوبھو کو نئی شناخت ملی۔ جلد ہی اسے فیڈریشن کا سیکریٹری منتخب کرلیا گیا۔

یہ عہدہ سوبھو کے لیے بہت اہم تھا۔ اُس نے تنظیم کو مضبوط و منظم کرنے کا بیڑہ اُٹھالیا اور اِس ضمن میں اسٹڈی سرکلز کا سلسلہ شروع کیا۔

متحرک سوبھو خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ حکومت کی اس پر نظر تھی۔ وہ جہاں جاتا، سادہ لباس والے اہل کار اُس کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ جاتے، جو اگر اتفاقاً اُس کے سامنے آجاتے تو بھونڈے انداز میں لاتعلق نظر آنے کی اداکاری کرنے لگتے جس پر سوبھو مسکرا دیتا۔

ابھی وہ ایل ایل بی کے فائنل امتحان کی تیاریوں میں جتا تھا کہ انگریز سرکار کے خلاف ”ہندوستان چھوڑ دو تحریک“ شروع ہوگئی۔ وہ ایک عزم کے ساتھ تحریک میں شامل ہوگیا۔ یوں ایل ایل بی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اُس زمانے میں انگریز کامریڈوں سے بھی سوبھو کا تعلق رہا جو ”برٹش کمیونسٹ پارٹی“ کے ممبر تھے اور سندھ میں سول سرونٹ کی حیثیت سے ملازمت کیا کرتے تھے۔ ان دنوں سوبھو مٹھا رام ہاسٹل میں مقیم تھا جہاں ان افراد سے ملاقات رہتی۔

☆☆☆

فروری 1942ء میں پٹنہ میں ”آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن“ کی کانفرنس ہوئی۔ سوبھو کی سربراہی میں سندھ کے طلبا نے کانفرنس میں شرکت کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اُنھوں نے بہ راستہ لاہور سفر طے کیا۔ لاہور میں پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر میں چند روز قیام کیا۔ وہیں اُس کی اندر کمار گجرال (بعد میں گجرال نے ہندوستانی سیاست میں بہت نام کمایا اور صدر کا عہدہ حاصل کیا) سے ملاقات ہوئی جس نے سوبھو کو بتایا کہ کمیونسٹ پارٹی کی لائن تبدیل ہو رہی ہے۔ جو کمیونسٹ جیلوں میں قید ہیں، انہیں انگریز رہا کردیں گے، اس لیے آپ بھی اپنا احتجاج ہلکا کریں۔

سوبھو طالب علموں کو کمیونسٹ پارٹی کی پُرانی لائن پر چلا رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جنگِ عظیم دوم فاشسٹوں اور سامراجیوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگ تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ جنگ عوامی جنگ میں کیسے تبدیل ہوسکتی ہے جس کا تقاضا کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی۔

خیر، طلبا کا وفد کلکتہ پہنچا۔ سوبھو نے اپنی درس گاہ شانتی نکیتن کی بھی زیارت کی۔ پانی کی تبدیلی کے باعث اُسے ٹائی فائڈ ہوگیا، جس کے سبب سوبھو چند دن کی تاخیر سے پٹنہ پہنچا۔

پٹنہ میں سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے نمایندے کے طور پر موجود تھے، جنہیں نئے پالیسی کے تعلق سے نوجوانوں کو مطمئن کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

جب سوبھو پہنچا اُس وقت تک اسٹوڈنٹس کانفرنس میں قرارداد پاس کی جا چکی تھیں۔ وہاں سجاد ظہیر، میاں افتخار اور مقیب الدین فاروقی تقاریر کر رہے تھے جنہوں نے طے کرلیا تھا کہ تمام کمیونسٹ جیلوں سے نکل جائیں گے اور پارٹی لائن بدل کر دوسری جنگِ عظیم میں انگریزوں کا ساتھ دے گی۔

اُس موقعے پر سوبھو نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ کراچی جا کر اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرسکتا ہے۔ ”اگر طلبا کی اکثریت نے ساتھ دیا تو ہم بھی کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دیں گے، ورنہ انگریزوں کے ساتھ لڑنے کی پُرانی لائن پر چلا جائے گا۔“ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

خیر، پٹنہ کانفرنس میں آزادی کے حق کے لیے نعرہ بلند کیا گیا، جس کے بعد ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں خود مختاری کی تحریک شروع ہوگئی۔ سوویت

پارٹی نے اُس لائن کی جزوی مخالفت کی۔ اِس تعلق سے چند برس بعد 1946ء میں "نیوز ٹائمز" نے بھی یہ سوال اُٹھایا کہ "کیونسٹ معلوم نہیں کیوں، مذہبی نعروں کے تحت ایک ملک کی حمایت کررہے ہیں۔"

خیر، پٹنہ سے واپسی پر سوبھو نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دیگر ارکان کے سامنے کمیونسٹ پارٹی کی پیش کش رکھی۔ فیڈریشن نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ لہٰذا طلبا تحریک میں تیزی لانے کا اعلان کردیا گیا۔

دوسری جانب حکومت کراچی کے طلبا سے تنگ تھی۔ بالآخر اُنھوں نے اُن کے بدمعاش لیڈر، یعنی سوبھو کی گرفتاری کا فیصلہ کرلیا۔ اُس کے خلاف وارنٹ نکل گیا۔ وہ بھی تیار تھا، فوراً انڈر گراؤنڈ چلا گیا۔ البتہ اس کریک ڈاؤن میں بڑے پیمانے پر طلبا و طالبات گرفتار ہوئے۔

جیل بہت ہی عجیب مقام ہوتا ہے، وہاں تنہائی اور اذیت انسان کو توڑ دیتی ہے اور وہ اپنے نظریاتی فیصلوں کو حماقت تصور کرنے لگتا ہے۔

یہی معاملہ جیل میں قید طلبا و طالبات کا بھی تھا جو جیل سے سوبھو کو پیغامات بھجواتے "تمہیں شرم آنی چاہیے، ہم جیل میں ہیں اور تم باہر عیش کررہے ہو!"

اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ بے چارہ سوبھو باہر کن مشکل حالات میں کام رہا ہے۔

دوسری جانب سوبھو کی گرفتاری کے لیے حکومت اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئی۔ جیل میں طلبا پر تشدد ہونے لگا جس کے پیشِ نظر بالآخر سوبھو نے گرفتاری دینے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

25 جنوری 1943ء کو اُسے مٹھارام ہوسٹل، کراچی کے ٹینس کورٹ سے تقریر کے دوران، شرپسندی کے الزام کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ خیر، بنیادی سبب تو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں اُس کی فعال شمولیت تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر 23 برس تھی۔

کورٹ سے اِس "بدمعاش" کو ڈیڑھ برس کی سزا ہوئی۔ اِس زمانے میں ترقی پسندوں کے لیے جیل تربیت گاہ کی مانند تھی، سو سوبھو کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

جیل کی پہلی یاترا دلچسپ رہی۔ گرفتاری کے بعد بولٹن مارکیٹ کے ایک تاریک اور گندے لاک اپ میں ایک ہفتہ گزرا۔ گرفتار ہونے والوں میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور کُل گرفتار شدگان کی تعداد ستر تھی۔ بیش افراد کو تو دوسرے دن رہا کردیا گیا، لیکن سوبھو کو سات دن تک قید میں رکھا گیا۔ اُسے جیل بھیج دیا گیا جہاں اُسے نہا دھو کر غلاظت سے نجات حاصل کرنے کا موقع ملا۔

جیل میں نوجوان سوبھو زیادہ وقت مطالعے میں صَرف کرتا تھا۔ جیل افسر کا نام اکبر مرزا تھا جو بہت دلچسپ انسان تھا۔ اُس نے جب سوبھو کے بیرک میں "لینن" کی تصانیف دیکھیں تو اُنہیں غیر قانونی کہتے ہوئے ضبط کرنے کا حکم جاری کردیا۔

غصیل سوبھو نے جواب میں کہا، "تم اِس کا حق نہیں رکھتے، صرف کراچی کا کمشنر کتابوں کو سیز کرنے کا حق رکھتا ہے!"

اُس وقت تو جیل افسر کچھ نہیں بولا، بعد میں سوبھو کو اپنے دفتر بلوایا اور کہا۔ "خواہ مخواہ شور کیوں مچاتے ہو۔ کتابیں میرے دفتر میں رہیں گی۔ جب ایک ختم کرلو، تو دوسری لے جاؤ۔ اِس طرح کتاب پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھو۔"

اور سوبھو نے لینن کو پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ لینن کی تصانیف کی کُل تعداد 54 ہے، اور ہر کتاب ضخیم اور دقیق ہے، پر سوبھو کوئی عام انسان تو تھا نہیں، اُس نے مختصر سے عرصے میں 'لینن' کی تمام تصانیف چاٹ ڈالیں۔

جیل ہی میں سوبھو کی ملاقات کانگریسی لیڈر رجے رام داس سے ہوئی جن کے تعاون سے متحرک سوبھو نے جیل میں اسٹڈی سرکل کا سلسلہ شروع کیا۔ سکھر جیل میں گزرے دس ماہ میں اُس کے سرکل کے ارکان کی تعداد ساڑھے چار سو سے تجاوز کرگئی جس میں شامل تمام ارکان کانگریسی تھے اور ایک سوبھو کمیونسٹ تھا۔ پھر اُسے حیدرآباد جیل منتقل کردیا گیا جہاں اُس نے اسٹڈی سرکل کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

جولائی 1944ء میں سوبھو رہا ہوا لیکن یہ تو گرفتاریوں کے سلسلے کا آغاز تھا۔ بعد کے برسوں میں جیل یاترا کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ کُل چھ بار جیل گیا۔ یوں اُس نے نوجوانی کے دس قیمتی برس جیلوں میں سڑتے گزارے۔ بعد کے برسوں میں اُسے پانچ برس اپنے گاؤں میں نظر بند رہنے کی اذیت بھی سہنی پڑی۔

سوبھو "ایجی ٹیشن" کے بجائے "ایجوکیشن" والی سیاست کو اہمیت دیتا تھا۔ اُس کے نزدیک جیل جانے کی سیاست زیادہ پسندیدہ نہیں تھی۔ سوبھو کا خیال تھا کہ جیل جانے سے کمیونسٹوں کے سیاسی شعور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے برعکس اسٹڈی سرکلز زیادہ سودمند ثابت ہوتے ہیں۔

اِسی سبب اُس نے حتیٰ الامکان جیل سے بچنے کی کوششیں کیں، جو بڑی حد تک ناکام رہیں۔

☆☆☆

1945ء میں 'شانتی نکیتن' سے فارغ التحصیل اس نوجوان نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شمولیت اختیار کرلی۔ دوسروں پر تنقید کرنے والے، احساسِ برتری میں مبتلا سوبھو کو جلد اپنی غصیل طبیعت اور اس کے نتیجے میں سرزد ہونے والی غلطیوں کا احساس ہوگیا، اور اس نے دوسروں پر تنقید کرنے کا سلسلہ کم سے کم کردیا۔ اُسی زمانے میں اُس نے "ڈیل کارنیگی" کی مشہور زمانہ کتاب How to Win Friends and Influence People پڑھی، جس نے اُسے نئے لوگوں سے دوستیاں کرنے کی مہارت عطا کی، جو آنے والے وقتوں میں اُس کے بہت کام آئی۔

اُس زمانے میں جمال الدین بخاری کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری تھے۔ جو یہاں کے نہیں تھے، اُنہیں تحریک اور پارٹی کے امور چلانے کے لیے ہندوستان سے بھیجا گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ دفتر میں رہا کرتے تھے۔ وہ بہت محنتی اور سلجھے ہوئے انسان تھے، انہوں نے سوبھو کی بڑے بھائی کی حیثیت سے بھرپور راہ نمائی کی۔

پہلی جیل یاترا کے بعد سوبھو نے خود کو کمیونسٹ پارٹی سے منسلک اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے لیے وقف کردیا تھا۔

اُسی زمانے میں سوبھو کی ملاقات سندھ کی معروف شخصیت جی ایم سید سے ہوئی۔ پہلی ملاقات کے موقعے پر جی ایم سید نے سوبھو سے کہا تھا۔ "تم کمیونسٹ لوگ عوام کے دماغ کو اپیل کرتے ہو مگر میں ہمیشہ عوام کے جذبات کو اپیل کرتا ہوں۔"

سوبھو نے احترام کے ساتھ جواب دیا۔ "جناب ہم نہ صرف عوام کے دماغ کو اپیل کرتے ہیں بلکہ اُن کے پیٹ بھی اپیل کرتے ہیں۔"

کامریڈ سوبھو نے 1946 میں ہونے والی رائل انڈین آرمی بغاوت کی بھرپور حمایت کی تھی جس کی پاداش میں اُسے دوسری بار جیل جانا پڑا۔

....

سوبھو کو اپنی دھرتی یعنی سندھ سے پیار تھا۔ وہ یہیں رہنا چاہتا تھا۔ دوسری جانب ملکی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ بالآخر 14 اگست 1947ء ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

اسی زمانے میں سوبھو کو اپنے پیارے دادا کی جدائی کا کرب سہنا پڑا جن کا انتقال عین قیامِ پاکستان والے روز بڑے ہی عجیب انداز میں ہوا۔ بستر پر دراز اُس کے دادا نے جب توپیں داغنیں کی آوازیں سنیں تو آنکھیں کھول کر دریافت کیا۔ "یہ آوازیں کیسی ہیں؟"

سوبھو کے بڑے بھائی کیول رام نے کہا۔ "بابا انگریز جارہے ہیں۔"

دادا نے کہا۔ "اچھا!" اور اپنی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرلیں۔

تقسیم کے مسئلے پر کمیونسٹ پارٹی میں واضح اختلاف پایا جاتا تھا، سوبھو جانتا تھا کہ برصغیر کی تقسیم کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

خیر، اگست 47ء میں مہاجرین کی آمد شروع ہوگئی تھی اور سندھ میں مقیم ہندو خاندانوں نے ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔

سوبھو کے اہلِ خانہ بھی تقسیم کے بعد پاکستان میں رہنے کے خلاف تھے لیکن زمین کے عشق میں مبتلا سوبھو اڑ گیا۔ اُس نے اپنے بھائی سے کہا۔ "جب تک تمہارا پڑوسی کلہاڑی اُٹھا کر تم سے یہ نہ کہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، تم نہیں جانا۔ اور جہاں تک میری بات ہے، میں پاکستان ہی میں رہوں گا۔"

بعد ازاں ایسا ہی ہوا۔ بندی میں ریاست راجپوتانہ کے چند لٹے پٹے مہاجر لاٹھیاں لے کر آگئے اور اُن کے اہلِ خانہ سے یہاں سے چلے جانے کے لیے کہا۔ سوبھو کے بڑوں نے اُنہیں سمجھایا کہ یہاں کئی گھر خالی پڑے ہیں، آپ وہاں رہ سکتے ہیں۔ وہ بھی شریف لوگ تھے، ساتھ والے گاؤں میں چلے گئے۔

خوش قسمتی سے سندھ میں ہندو مسلم فسادات بڑے پیمانے پر نہیں ہوئے۔ اور جو تھوڑے بہت واقعات ہوئے بھی تھے، سو بھو اُن کے لیے اردو اور انگریزی کے مؤقر اخبارات کو قصوروار ٹھہراتا تھا۔

ایک دن اُس نے اپنے ساتھی کامریڈ سے کہا۔ "یہ لوگ ہندوؤں کے خلاف سُرخیاں لگاتے ہیں۔ جن ہندوؤں نے پاکستان کے ساتھ رہنا منظور کیا ہے، اُنہیں بے وجہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اُن کے بارے میں کہا جاتا کہ یہ بھارت کے ایجنٹ ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا؟"

سوبھو کو اِس بات کا دکھ تھا کہ اُس جیسے پڑھے لکھے شخص کے متعلق، جو ٹیگور کا شاگرد رہ چکا ہو، قیامِ پاکستان کو سپورٹ کرتا ہو، ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتا ہو، عجیب و غریب باتیں کی جارہی ہیں اور یہ سوال اُٹھایا جارہا ہے کہ وہ پاکستان میں رہنے کی ضد کیوں کررہا ہے۔

خیر، سوبھو نے ہر الزام برداشت کیا لیکن اپنا وطن چھوڑنے سے انکار کردیا۔

....

سوبھو نے پاکستان میں رکنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا، تاہم اپنے نظریات سے دست بردار نہیں ہوا تھا۔ آزادی کے زمانے میں اُس نے ٹریڈ یونینز میں عملی طور پر کام کیا۔ کراچی سٹی ورکرز یونین سے وابستگی کے زمانے میں اُس کے نام کے ساتھ ''کامریڈ'' کا سابقہ لگا جو آج تک برقرار ہے۔ سوبھو نے بے زمین ہاریوں میں زمین کی مفت تقسیم کے لیے اَن تھک کام کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُس نے ''ہاری الائی تحریک'' کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا کہ متروکہ اراضی کا ایک مخصوص حصہ بے زمین ہاریوں کو الاٹ کیا جائے۔ اِس تحریک کو کامیابی ملی اور لاکھوں ایکٹر اراضی بے زمین کسانوں میں تقسیم کی گئی۔ مزدور دوست سرگرمیوں کا نتیجہ اگلی گرفتاری کی صورت سامنے آیا۔ نیوی بغاوت کیس میں کے ہانگل، علی احمد اور سوبھو گیان چندانی کو گرفتار کیا گیا۔ یوں تقسیم کے بعد یہ محبِ وطن مزید چار برس جیل میں رہا۔ 17 اپریل 1948ء کو گرفتار ہونے والے سوبھو کو 52ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ ''سوبھو گیان چندانی بہ نام کراؤن'' پاکستان کے تمام کورٹس میں جانا پہچانا کیس ہے۔

وہ سوبھو کے لیے بہت ہی اذیت ناک لمحات تھے۔ اُسے طعنہ دیا گیا کہ وہ ہندو ہے، اُس کا وطن لاڑکانہ نہیں ہندوستان ہے! پر اُسے تو لاڑکانہ سے عشق تھا، وہ یہ زمین کیسے چھوڑتا؟

اُس موقعے پر چند اعلیٰ عہدے داروں نے اُسے پیش کش کی کہ وہ قیدیوں کے تبادلے میں ہندوستان چلا جائے۔ جواب میں اُس مردِ مجاہد نے کہا۔ ''میں تو یہاں کا پیدائشی ہوں، یہیں کا باشندہ ہوں، میں کیوں جاؤں؟''

جب اُس نے انکار کردیا تو اُسے قانونی طریقے سے ہندوستان بھجوانے کے لیے کوششیں شروع کردی گئیں۔ یہ سوبھو کو کسی طور قبول نہیں تھا۔ اُس نے پاکستان میں تعینات ہندوستان کے سفیر سری پرکاش کو پیغام بھجوایا۔ ''جناب، ہم یہاں کے باشندے ہیں، یہی ہماری دھرتی ہے، ہمیں زبر... نہ بھیجا جائے۔''

یہ پیغام ملنے کے بعد ہندوستانی سفیر نے اعلیٰ ... کے سامنے واضح کردیا کہ وہ سوبھو کو قبول نہیں کرسکتے، کیوں ... کسی کو زبردستی گھسیٹ کر کسی ملک کا شہری نہیں بنایا جاسکتا۔

یوں موئن جودڑو کا قلندر موئن جودڑو کے قریب ہی ر...

☆☆☆

یہ 53ء کا ذکر ہے۔ سندھ اسمبلی کے انتخابات منع... ہوئے۔ ہاری تحریک عروج پر تھی جس میں سوبھو بھی پیش پ... تھا۔ ہاری کمیٹی کی جانب سے بیالیس امیدوار نچلے طبقے ... کھڑے کیے گئے۔ سوبھو کا الیکشن آفس انتخابی مہم کی سرگرمیو... کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی کے ترقی پ... طالب علم ڈاکٹر خواجہ معین اور ڈاکٹر ادیب الحسن رضو... سائیکلوں پر سوار ہو کر کئی میل کا سفر طے کرتے اور نچلے ط... کے اِن امیدواروں کی الیکشن مہم چلاتے۔

سوبھو ضلع دادو سے ہاری کمیٹی کا اُمیدوار تھا۔ گو کہ ... سوبھو مسلمان نہیں تھا لیکن دل چسپ امر یہ ہے کہ مولانا نذ... احمد جتوئی نے اُس کے پولنگ ایجنٹ کے طور پر ذمّے داری نبھائی۔ اس موقعے پر کسی نے مولانا سے سوال کیا۔ ''حضرت آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟'' اُنہوں نے جواب دیا۔ ''میں ہندو ہوں!''

اِس جواب سے اندازہ لگا جاسکتا ہے کہ سوبھو کے لیے لوگوں کے دل میں کتنی محبت، کتنا احترام تھا۔

اگرچہ اُس وقت ہاری تحریک کا شہرہ تھا، تاہم ہاری کمیٹی کے ارکان کو اپنی جیت کا یقین نہیں تھا، اِس لیے انتخابات کی زیادہ زور شور سے تیاری بھی نہیں کی گئی۔ حیدر بخش جتوئی نے سوبھو اور دیگر ارکان سے کہہ رکھا تھا کہ ہمیں پارٹی کا پروپیگنڈ... کرنا ہے، اِسی مقصد کے لیے ہم نے الیکشن میں حصہ لیا ہے۔

خیر، سوبھو نے اپنے حلقے میں 18 ہزار میں سے 6 ہزار ووٹ حاصل کیے، جو انتخابی سیاست میں ایک اچھی ابتدا ... لیکن اگلے ہی برس پارٹی اور اُس کے تمام ذیلی اداروں ... پابندی عاید کردی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی اور ملحقہ ادارے زیر زمین چلے گئے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یوں سوبھ... انتخابی سیاست سے دُور ہوگیا۔

☆☆☆

اب سوبھو پاکستان میں تھا، اپنے وطن لاڑکانہ میں ... لیکن وہ تھا تو خطرناک!

وہ کسانوں کو اُکسا سکتا تھا۔ سو جولائی 54ء میں اسے پھر گرفتار کرلیا گیا۔ مارچ 55ء تک وہ قید میں رہا۔ اس زمانے میں وہ حیدرآباد جیل میں قید تھا۔

جیل کے زمانے میں اُس نے نظریاتی ساتھیوں کی تربیت کے لیے اسٹڈی سرکل کا سلسلہ شروع کیا جس میں ابتدائی کمیونزم سے لے کے مرحلہ وار موجودہ سرمایہ دارانہ دور تک کے سماج کے ارتقاء پر بحث ہوئی۔

وہاں ''بھوپت'' نامی ایک ڈاکو بھی قید تھا جو یوسف کے نام سے معروف تھا۔ اس نے سوبھو سے اسٹڈی سرکل میں شمولیت کی اجازت مانگی۔ سوبھو برابری پر یقین رکھتا تھا، اس نے ڈاکو کو انسان سمجھتے ہوئے سرکل میں شرکت کی اجازت دے دی۔ ڈاکو عام طور پر غریبوں اور کم زوروں کے مددگار تصور کیے جاتے ہیں لیکن جاگیر دار اپنے ہتھکنڈوں سے اُنہیں انقلاب دشمن بنا دیتے ہیں۔ اسٹڈی سرکل میں سوبھو کی باتوں نے بھوپت کو اتنا متاثر کیا کہ دوسرے صبح سوبھو کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے اُس شخص نے اعتراف کیا کہ وہ اب تک ایک سو سات انسانوں کو قتل کرچکا ہے۔ اُس نے تسلیم کیا کہ ریاست جونا گڑھ کے نواب اور راج کوٹ کے مہاراجاؤں نے اُسے بڑی چالاکی سے ترقی پسند تحریکوں کے خلاف استعمال کیا۔

سوبھو کی علمی کوششوں نے جن افراد کی زندگیاں بدلیں، اُن میں یہ ڈاکو بھی شامل ہے!

رہائی کے بعد بھی اِس محبِ وطن سیاسی کارکن کو تین ماہ تک گاؤں میں نظر بند رکھا گیا۔

سوبھو نے اُس زمانے میں شہرِ قائد میں قیام کیا۔ کراچی اُن دنوں ترقی پسندوں کا مرکز تھا اور سیاست، صحافت اور مزدور تحاریک روشنیوں کے شہر کے بنیادی حوالے تھے۔ اسی سبب سوبھو نے اپنے خاندان کے ساتھ کراچی کا رُخ کیا۔ وہاں اس مجاہد نے نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کو منظم کرنے کا ذمّہ سنبھالا۔ اُسی زمانے میں اخبار ''نئیں سندھ'' سے بھی وابستگی رہی، جس کا دفتر میکلوڈ روڈ پر تھا۔ جلد ہی سندھ کے اِس کامریڈ نے کراچی کے مزدور حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا، یوں کل کا پُرجوش اسٹوڈنٹ لیڈر آج کا قابلِ احترام مزدور لیڈر ہوگیا۔

سوبھو بندر روڈ میونسپل کارپوریشن کی عمارت کے بالمقابل ایک مندر کے احاطے میں رہا کرتا تھا جہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔

سوبھو گیان چندانی کی تصانیف کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔ ''کڈھن بھار ایندو'' (کب بہار آئے گی) اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس کا اردو میں ''انقلابی کی موت''........ کے نام سے ترجمہ ہوا۔ ''تاریخ جا وساریل ورق'' (تاریخ کے فراموش کردہ اوراق) مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''تاریخ گالھائی تھی'' کالموں کا مجموعہ ہے، جس کا اردو میں ''تاریخ بولتی ہے'' کے عنوان سے ترجمہ ہوا۔ ''وڈی وٹ ھئام'' (وہ بڑے لوگ تھے) سوانحی خاکوں کا مجموعہ ہے، جس کا اردو میں ''سندھ کے انقلابی راہ نما'' کے نام سے ترجمہ ہوا۔

55ء میں سوبھو نے باقاعدہ پاکستان نیشنل پارٹی (نیپ) کے لیے کام شروع کیا۔ اس عرصے میں دیگر جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہا۔ جب ڈھاکا میں مولانا بھاشانی نے ''نیپ'' بنائی تو سوبھو نے وہاں ہونے والے اجلاس میں بھی شرکت کی۔ وہ ''ون یونٹ'' کے خلاف تحریک میں بھی آگے آگے رہا۔ الغرض جہاں سیاسی و انسانی حقوق کی بات ہوتی، سوبھو وہاں موجود ہوتا۔

59ء میں عام انتخابات کی اطلاع تھی۔ حساب کتاب سے عوامی لیگ اور مولانا بھاشانی کی فتح کے امکانات روشن اور اسٹیبلشمنٹ کو یہ قبول نہیں تھا۔ مارشل لا لگنے کے واضح امکانات تھے اور ایسا ہی ہوا!

58ء میں شرپسندی کے الزام میں سوبھو کو پھر گرفتار کرلیا گیا۔ دس ماہ حیدرآباد جیل میں گزرے، پھر شاہی قلعے کے اندھیروں میں گم کردیا گیا۔ چوبیس چوبیس گھنٹے اُسے تاریک کوٹھری میں رکھا جاتا تھا۔ 59ء میں لاہور ہائی کورٹ سے رہائی تو مل گئی لیکن اگلے پانچ برس اِس کمیونسٹ نے اپنے گاؤں میں نظر بند رہتے ہوئے گزارے۔

☆☆☆

نظر بندی کا دورانیہ 59ء سے 64ء تک محیط تھا!

سوبھو بنیادی طور پر کاشت کار تھا۔ اُس کا پورا خاندان زراعت سے جُڑا ہوا تھا۔ اُن کے پاس 300 ایکٹر زمین تھی۔ اُس زمانے میں بڑے بھائی نے سوبھو سے کہا۔ ''اب تو تم گاؤں ہی میں ہو، کیوں نہ تم رائس فیکٹری کی دیکھ بھال کی ذمّے داری سنبھال لو!''

سوبھو نے ہامی بھرلی۔ ان دنوں چاول کو بیماری لگ گئی تھی اور پیداوار تقریباً ختم ہوچکی تھی۔

جدید سوچ کے حامل سوبھو نے اس میدان میں بھی تجربات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چاول کی ایک نئی قسم ''اری 8'' کے بیج حاصل کیے اور کاشت کاری شروع کردی۔ لوگوں نے بہت شور مچایا کہ ''لڑکا نئے تجربات کرکے زمین کو تباہ کردے گا!''

بھائی نے بھی سوال کیا، لیکن سوبھو کو خود پر بھروسا تھا۔ اُس نے خوب محنت کی، دراصل محنت تو اُس کی گھٹی میں تھی۔ اور جب ایک ایکڑ سے 2400 کلوگرام چاول پیدا ہوا، تو تنقید کرنے والے ششدر رہ گئے۔ کہاں روایتی بیج سے 400 کلوگرام فی ایکڑ کی پیداوار ہوتی تھی اور کہاں اب 2400 کلوگرام چاول پیدا ہوئے۔

سوبھو یہیں نہیں رکا۔ اس کی مہم پسند طبیعت نے چاول کی کاشت کے لیے مختص زمین پر گندم کاشت کرنے کے لیے اُکسایا۔ بغاوت تو اس کی سرشت میں تھی، اس نے میکسیکو سے درآمد کردہ بالکل نیا بیج ''میکسی پاک'' کا تجربہ کیا۔ توقع کے عین مطابق پھر مخالفت ہوئی۔

ایک ساتھی نے کہا ''بابو، اس بیج میں طاقت نہیں!''

''کیوں اپنے بھائی پر ظلم کرتے ہو؟'' ایک کسان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''بھائی یہ زراعت ہے، سیاست نہیں!'' ایک ہاری نے قہقہہ لگایا۔

لیکن سوبھو خاموشی سے مصروف رہا۔ اور اس بار بھی اس کی محنت رنگ لائی۔ فصل زبردست ہوئی۔

انقلابی سوبھو کاشت کاری میں بھی بیل کی جگہ ٹریکٹر لایا، روایتی بیج کی جگہ نیا اور ترقی یافتہ بیج متعارف کروایا اور زمین پر روایتی فصلوں کے بجائے نئے نئے کام یاب تجربے کرکے روایتی کاشت کاری کا تصور بدل ڈالا۔

☆☆☆

60ء کی دہائی میں روس اور چین کے جھگڑے نے کمیونسٹوں کو تقسیم کردیا تھا۔ اختلاف سیاسی بلکہ نظریاتی میدان تک پھیل گیا اور دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیاں دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئیں۔ سوبھو اس جھگڑے میں پڑنے کے خلاف تھا۔ 62ء میں ہندوستان اور چین میں جنگ چھڑ گئی۔ دوستوں نے سوبھو کو مشورہ دیا کہ تم ہندوستان کے خلاف اخبار میں بیان دے دو، نظر بندی ختم ہوجائے گی، لیکن نظریاتی جدوجہد پر یقین رکھنے والے اس مردِ مجاہد نے سستے ہتھکنڈ[وں] سے اجتناب برتا۔

سوبھو کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی کا عہدے دار بھی [رہا] لیکن وہ خود کو بہ طور کارکن ہی مطمئن محسوس کرتا تھا، اس [لیے] ایک موقعے پر جب اسے سربراہی قبول کرنے کی پیش کش [کی] گئی، تو اس نے انکار کردیا۔ سوبھو نے قائم مقام سیکریٹری [کا] بھی عہدہ چھوڑ دیا۔ شرف علی کو سیکریٹری بنا دیا گیا جن [کی] گرفتاری کے بعد نازش امروہوی نے کمیونسٹ پارٹی [کے] سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ پھر جمال نقوی اور جام [ساقی] سامنے آئے، جن کے طریق سے سوبھو کو اختلاف رہا۔

نظریاتی سوبھو نے جب دیکھا کہ دیگر افراد [نے] پارٹی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور مز[دوروں] اور کسانوں کی تحریک کا حلیہ بگاڑ دیا ہے، تو اُس نے ا[پنے] ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس وقت کسی [نے] اُس کی بات پر توجہ نہیں دی جس کے بعد میں بہت منفی نتا[ئج] سامنے آئے۔

1970ء میں پیپلز پارٹی اور نیپ کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ سوبھو نے دونوں ترقی پسند جماعتوں [کو] اختلافات سے اوپر اُٹھتے ہوئے عوام کی فلاح و بہبود کے [لیے] مشترکہ کاوشیں کرنے کا مشورہ دیا کہ اس لڑائی سے محنت کش طبقے کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس ضمن میں سوبھو نے میر حاصل بزنجو سے بھی بات کی، اس سلسلے میں عملی کوششیں بھی کی گئیں لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد ترقی پسندوں کی حمایت کرنے والی جماعت یعنی پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی، جس کی کام یابی میں ترقی پسند سوچ کے حامل طلبا نے کلیدی کردار ادا کیا۔ دیگر ترقی پسند جماعتیں بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد بائیں بازو کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار میں آنے کے بعد سوبھو گیان چندانی کو اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی، تاہم سوبھو نے انکار کردیا۔

کھرا اور بے باک آدمی، جس کا دامن کرپشن کے الزام سے پاک ہو، بیوروکریسی کے لیے ہمیشہ ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ سو پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں بھی وہ تین ماہ جیل میں رہا۔ اُس پر لسانی فسادات کروانے کا الزام عاید کیا گیا تھا اور پہلی بار سوبھو کو کمیونسٹ کے بجائے ہندو کا لیبل لگا کر گرفتار کیا گیا تھا۔

یہ بہت ہی تکلیف دہ الزام تھا۔ رہائی ملی تو فوراً بلوچستان کا رُخ کیا کہ وہاں کمیونسٹوں کے لیے حالات نسبتاً بہتر تھے۔

کوئٹہ میں اُن کی میر غوث بخش بزنجو سے ملاقات ہوئی جو اس زمانے میں بلوچستان کے گورنر تھے اور کوئٹہ کے بلدیہ ہاؤس میں رہایش پذیر تھے۔ جب انہیں اطلاع ملی کہ سندھ میں حکومت ہر کمیونسٹوں کو گرفتار کرنے کے درپے ہے، تو انہوں نے احکامات جاری کردیے کہ سندھ سے بھاگ کر بلوچستان آنے والے کسی سیاسی ورکر کو گرفتار نہ کیا جائے۔

کوئٹہ میں قیام کے دوران سوبھو گیان چندانی کی گرفتاری کا امکان نہیں تھا کہ حکومتی مشینری گورنر کے احکامات کے سامنے بے بس تھی۔ اُس موقعے پر ملک کے منتخب وزیر اعظم نے بزنجو صاحب سے گلہ کیا۔ ''تم نے ایک ہندو کو اپنے گھر پناہ دے رکھی ہے۔''

اِس پر انہوں نے جواب دیا۔ ''میں نے ہندو کو نہیں، اپنے بھائی سوبھو کو پناہ دی ہے!''

دو ماہ تک یہ مجاہد بلوچستان میں رہا۔ اُس عرصے میں اُس نے ''سنگت'' کے لیے مضمون لکھا جس میں دلائل دیے کہ پیپلز پارٹی اور نیپ کو اتحاد کرلینا چاہیے تاکہ جمہوریت مستحکم ہو۔

دوسری جانب بزنجو صاحب نے بھٹو اور سوبھو کی ملاقات کروادی جس کے بعد اُس کی گرفتاری کا معاملہ ٹل گیا۔

77ء میں ایک بار پھر ملک آمریت کی لپیٹ میں آگیا اور ترقی پسندوں کو توڑنے کے لیے ریاستی سطح پر منظم کوششوں کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں بائیں بازو کے کارکنان کو خاصا نقصان پہنچا۔ وہ وقت کٹھن تھا لیکن ضعیف العمر سوبھو نے رجائیت پسندی کے ساتھ خود کو سنبھالے رکھا۔

1988ء میں انتخابات میں دوستوں نے سوبھو کو اقلیتی نشست پر کھڑا کردیا۔ سوبھو نے عجیب انداز سے مہم کا آغاز کیا اور نعرہ لگایا۔ ''یہاں امیر ترین ہندو بھی اچھوت ہے!''

روشن فکر لوگوں نے اُس کی مہم کے لیے بہت کام کیا۔ وہ ایک ایک ہندو ووٹر کے پاس سوبھو کے لیے ووٹ مانگنے گئے۔ سوبھو کا مقابلہ ایک لکھ پتی تاجر بھگوان داس چاولہ سے تھا۔

بے شک وہ پاکستان کی انتخابی سیاست کی ایک عجیب و غریب الیکشن مہم تھی، جسے مسلمان چلا رہے تھے، ایک ہندو

کے لیے!

نتیجہ...ایسے ایسے علاقوں سے بھی سوبھو کو ووٹ پڑے جہاں کوئی سوبھو کو جانتا بھی نہیں تھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے سوبھو کی کام یابی کا اعلان کر دیا۔ اُس موقعے پر نواز شریف نے اُسے فون کر کے مبارک باد دی۔ دوسری طرف سے.... بے نظیر بھٹو شہید نے بھی مبارک باد دیتے ہوئے اسے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کی پیش کش کر دی۔ سوبھو نے جواب دیا۔ ''میں کسی پارٹی میں شامل نہیں ہوں گا، میں پوری اسمبلی میں اقلیت کا واحد رکن ہوں۔ میں نچلے طبقے کے لیے کھڑا ہوا ہوں، سو میں ایوان میں محروموں کے نمایندے کا کردار ادا کروں گا، خواہ وہ مسیحی ہوں، ہندو ہوں یا مسلمان!''

سوبھو جیت گیا، اب وہ اسمبلی میں جانے کو تھا۔ لبرل اور ترقی پسند حلقے اُس کی اسمبلی میں موجودگی سے بہت پُرامید تھے لیکن کسی نے سچ ہی کہا ہے، پیسا بولتا ہے!

سوبھو کے مخالف امیدوار نے انتخابی نتائج کے بعد خوب پیسا خرچ کیا، جس نے ہمیشہ کی طرح کام کر دکھایا۔ الیکشن کمیشن نے دوبارہ گنتی کروائی۔

پیسے کی طاقت ووٹوں کی طاقت پر غالب آگئی، نتائج میں بڑے پیمانے پر گھپلا کیا گیا اور دوبارہ گنتی کے بعد، بڑی ہی بے حسی سے سوبھو کی ہار کا اعلان کر دیا گیا۔ اور یوں پاکستان کی تاریخ کی عجیب و غریب الیکشن مہم کا بڑے ہی بھونڈے ڈھنگ سے اختتام ہو گیا۔

☆☆☆

تقسیم سے قبل سوبھو سندھ مسلم کالج میں زیرِ تعلیم تھا، پر ملکی حالات کی تبدیلی اور پھر گرفتاری نے اُسے قانون کی تعلیم اُدھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وکیل بننے کی خواہش دل میں تھی۔ سو 70ء میں پھر کمر کس لی اور مون لا کالج، لاڑکانہ سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصے اِس کالج میں پڑھایا بھی، پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیے۔ پھر وکالت کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ اِس محنت کش نے ایک طویل عرصے تک اِس پیشے سے خود کو جوڑے رکھا۔

نظریاتی آدمی صرف جدوجہد پر یقین رکھتا ہے، سو سوبھو نے غریبوں کے مقدمات بلا معاوضہ لڑے، جب تک دم خم رہا، وکالت کا سلسلہ جاری رکھا، جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی، کامریڈ سوبھو اِس شعبے سے کنارہ کش ہوتا گیا۔

☆☆☆

ادیب سوبھو گیان چندانی کی کہانی بھی سیاست دان سوبھو کی کتھا کی طرح طویل اور پُرپیچ ہے۔

یہ کہانی درحقیقت نظریات پر کامل یقین رکھنے کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ سوبھو کو بچپن ہی سے اس بات پر پختہ یقین تھا کہ کوئی بھی ادب اُس وقت تک بڑا ادب نہیں بن سکتا، جب تک وہ زندگی سے وابستہ نہ ہو!

مطالعے میں گردن تک غرق سوبھو کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز پہلی گرفتاری سے ہوتا ہے۔ جیل کے زمانے میں اس بابت کچھ کرنے کی خواہش نے اُسے متحرک رکھا۔ برصغیر کے ترقی پسندوں نے ابتدا ہی سے خود کو ادب سے جوڑ رکھا تھا کہ ذرائع ابلاغ نظریات کی ترویج میں کلیدی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور پیغام کی رسائی میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ دیگر انقلابیوں کی طرح سوبھو نے بھی شعر کہے، مضامین لکھے اور فکشن کے شعبے میں دلچسپی لی۔

قیامِ پاکستان سے قبل کراچی میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (PWA) کام کر رہی تھی۔ سوبھو نے اِس کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کیا۔ اِسی ادارے نے 1944ء میں ''ریگستانی پھول'' کے نام سے ترقی پسند افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں سوبھو کی دو کہانیاں بھی شامل ہوئیں۔

1944ء میں رہائی کے بعد ساتھیوں کے ساتھ یہ مہم شروع کی کہ سندھی ادیبوں کو طبع زاد کہانیاں لکھنے کی ترغیب دی جائے۔ سجاد ظہیر کے مشورے پر جمال الدین بخاری، گوبند مالہی، رام پنجوانی، اے ترین اور سوبھو سندھی ادیبوں کا ایک پلیٹ فارم بنانے میں جُٹ گئے۔ اسی خیال کے تحت سوبھو نے کمیونسٹ مینی فیسٹو کا سندھی میں ترجمہ کیا۔

تقسیم سے دو ماہ قبل اپنے دوستوں کے ساتھ اُس نے ''سندھی ادبی سنگت'' قائم کی اور اُسے کام یابی سے چلاتا رہا۔ سوبھو کے مکتبِ فکر سے وابستہ افراد کی رائے یہ تھی کہ ادب انسان کو طاغوتی قوتوں کے خلاف لڑنے میں مدد دیتا ہے۔ تقسیم کے بعد اِس سنگت کے ہندو ارکان ہندوستان چلے گئے جس سے تنظیم کو دھچکا پہنچا۔

جب 1953 میں سندھ اسمبلی میں الیکشن میں عوامی محاذ میدان میں اُتری، تو سوبھو نے اِس کا منشور لکھا، جس کا انگریزی اور علاقائی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا۔

جی ایم سید نے کراچی سے ایک رسالہ ''نئیں دنیا'' شروع کیا تھا، جس میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اُنہوں نے سوبھو کو اِس نظریاتی مشق کا حصہ بننے

کے لیے راضی کر لیا۔ 58-57 میں سوبھو نے ''نئیں دنیا'' کی ایڈیٹری بھی کی۔ اُس زمانے میں اس نے کراچی میں قیام کا فیصلہ کیا۔ یہ روزنامہ روشن فکری، خرد افروزی اور انسانیت کا پرچار کرتا تھا۔ بعد میں مارشل لا کے عتاب نے اخبار کی صورت جاری اِس سلسلے کو تباہ کر دیا۔

معیاری ادب سے جُڑے سوبھو کو شوقِ مطالعہ نے ابتدا ہی سے فکشن سے نتھی کر دیا تھا۔ نوجوانی میں اس نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ سوبھو کے ایک افسانہ ''کڈھین بہار ایندو'' (بہار کب آئے گی) کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ سوبھو کے پہلے افسانوی مجموعے کا عنوان بھی یہی تھا۔ یہ مجموعہ نو افسانوں پر مشتمل تھا۔ بعد میں لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب اسلم رحیل نے اِن کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا، جو ''انقلابی کی موت'' کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ اِس مجموعے میں ایک انقلابی ابراہیم مالا باری کی زیست کی بابت لکھی ہوئی ایک کہانی بھی شامل ہے، جسے افسانوی رنگ نے ایک شاہ کارِ تحریر کا درجہ دے دیا ہے۔ سوبھو کا افسانہ ''رحیماں'' بھی بہت مقبول ہوا جس میں کم سنی میں شادی کی جاہلانہ سماجی رسم کے خلاف آواز اُٹھائی گئی۔ گوکہ سوبھو نے زیادہ افسانے نہیں لکھے لیکن ناقدین اُس کا شمار جدید سندھی افسانہ نگاروں کی اوّلین صنف میں کرنے لگے۔

اِن افسانوں کا بہت اثر ہوا۔ ہم عصر، خصوصاً نوجوان بہت متاثر ہوئے۔ سوبھو افسانوں تک محدود نہیں رہا، اس نے ''نپولین جو موت'' (نپولین کی موت) نامی ایک ڈراما بھی لکھا۔

کہتے ہیں کہ شاعر فطرت کے بے حد قریب ہوتا ہے اور موئن جو دڑو کا قلندر بھی فطرت سے جُڑا ہوا تھا، پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ شاعری کے شعبے میں طبع آزمائی نہ کرتا۔ سوبھو نے اپنے خیالات کو شاعرانہ شکل بھی دی، پر اُس کی شاعری کا بڑا حصہ گم ہو چکا ہے۔

سوبھو گیان چندانی کی ایک پہچان کالم نگاری بھی ہے۔ اس بطلِ جلیل نے 1990ء میں کالم لکھنے شروع کیے۔ سیاست اور تاریخ اُس کا موضوع تھا، یوں اِس خطے میں آنے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھنے والے اِس نظریاتی محنت کش کے کالموں نے سیاسی و تاریخی اہمیت اختیار کر لی۔ سوبھو کا مقصد دنیا کے سیاسی انقلابیوں اور سماجی تحریکوں پر روشنی ڈالنا تھا۔ ساتھ ہی ان کالموں میں سندھ پر پڑنے والے اُن کے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا۔

جب کالم مقبول ہوئے، تو دوستوں نے انہیں کتابی شکل دینے کا تقاضا کیا۔ مشورہ سوبھو کے دل کو لگا۔ یوں ''تاریخ گالھائے تھی'' نامی کتاب منظرِ عام پر آئی، جس کا اردو میں ''تاریخ بولتی ہے'' کے عنوان سے ترجمہ ہوا۔

اِس ادیب نے سوانحی خاکے اور مضامین بھی لکھے، جن میں چند ''وڈی وٹ ھیام'' (وہ بڑے لوگ تھے) نامی کتاب کی صورت یکجا ہوئے۔ اِس درویش نے اپنی والدہ کی سوانح ''امڑ'' کے نام سے لکھی۔

پھر دوستوں نے 80 سالہ سوبھو کو اپنی آپ بیتی لکھنے کے لیے تحریک دی۔ اپریل 2002ء سے اگست 2005 تک ایک سندھی رسالے ''سوجھرو'' میں سوبھو کی خودنوشت قسط وار شائع ہوئی، جس کا عنوان ''روشنی جی پندھ میں''، یعنی ''روشنی کے سفر'' میں تھا۔

گوکہ اس قدآور ادیب کے کام کو ادب دشمن معاشرے میں اس طرح نہیں سراہا گیا جس طرح اس کا حق تھا، پھر بھی چند ادب دوست اداروں نے اس کے کام کو تسلیم کیا۔ اِس ضمن میں اُسے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی جانب سے 2004ء میں کمالِ فن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سوبھو کی تخلیقات کا محور سماجی انصاف، جمہوریت اور اخلاقیات کی ترقی رہا ہے۔ اپنے نظریے سے گہری کمٹ منٹ کے پیشِ نظر سوبھو کو 2007ء میں حبیب جالب امن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

☆☆☆

زندگی کے آخری برسوں میں اس انقلابی کو سخت گھریلو مسائل نے گھیرے رکھا۔ کبیر سنی میں دماغ کی رگ پھٹنا ایک خوف ناک سانحہ تھا، پر سوبھو نے اعتماد اور قوت ارادی کے ساتھ اِس المیے کا مقابلہ کیا، اور خود کو ادویہ سے باندھ لیا۔ اِس حادثے کا ایک سبب عمر تو دوسرا گھریلو مسائل تھے۔ اس سبب اُس نے وکالت ترک کر دی، پر اِس ضمن میں مشورے دینے کا مفید سلسلہ جاری رکھا۔

اوپر والے نے سوبھو کو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ پہلی اولاد ایک صاحب زادی تھی، جو 43ء میں پیدا ہوئی اور چند برس بعد انتقال کر گئی۔ بڑا بیٹا کنھیا ڈاکٹر تھا، جو بدقسمتی سے نوجوانی ہی میں گردے کے عارضے میں مبتلا ہو کر یرقان کا شکار ہو گیا۔ اُس زمانے میں بوڑھے سوبھو نے اپنے بیٹے کے علاج معالجے کے لیے بہت زور مارا۔ دن رات ایک کر دیے۔ تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ علاج پر لاکھوں روپے خرچ

ہوئے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے، سوبھو کو اپنی لائبریری آٹھ لاکھ میں محکمۂ ثقافت حکومت سندھ کو فروخت کرنی پڑی۔ اُس لائبریری میں پاکستان، بھارت، سندھ، فلسفہ، مذہب، ادب، الغرض دنیا بھر کا بہترین مواد تھا۔ اِس مجاہد نے اسپتال کے سیکڑوں چکر لگائے، پر تھکا نہیں۔

بدقسمتی سے کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔ بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ بڑھاپے میں جوان بیٹے کی موت نے جیسے کر توڑ دی۔

دوسرا بیٹے کا نام نرمل داس رکھا، جس نے بہ طور انجینئر نام کمایا۔ اور پی ٹی وی کے ادارے میں اپنا کیریر بنایا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، لوگوں پر اس درویش کی حقیقت آشکار ہوتی گئی۔ عوام نے اِس بزرگ کا ایک ولی کی طرح احترام کرنا شروع کردیا۔ لوگ فیض حاصل کرنے کے لیے جھپٹ پڑے۔ ہمہ وقت اُس کے گرد ہجوم رہنے لگا۔ کبھی کوئی دوست دروازے پر دستک دیتا، کبھی کوئی ریسرچر آجاتا۔ میڈیا والے بھی مائک اور کیمرا لیے وقت بے وقت آن پہنچتے۔ کبھی کبھار یہ درویش سوچتا۔ ”ایک وقت تھا، جب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، پر لوگ سُننا نہیں چاہتے تھے، پر اب، جب میں زیادہ کہنے کے قابل نہیں رہ گیا، تب لوگ لپک لپک کر میرے پاس آرہے ہیں۔“

سندھی ہوں یا غیر سندھی، سب آج اِس پیارے بزرگ سے محبت اور احترام سے پیش آتے ہیں۔

لوگ در پر آتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، پیر چھوتے ہیں، پر سوبھو انہیں ایسا کرنے سے منع کرتا۔ اُس نے تو ساری زندگی شخصیت پرستی کے خلاف جدوجہد کی۔

آج سوبھو کو سندھ میں ”لیجنڈ“ کا درجہ حاصل ہے، پر یہ لیجنڈ بھی کئی لیجنڈز سے متاثر ہے۔ شاعروں میں اُسے ٹیگور اور نذرالاسلام کا کام بہت پسند ہے۔ سندھی شاعری میں شاہ لطیف اور شیخ ایاز نے اُسے متاثر کیا، اردو میں فیض، جوش اور جالب کی شاعری نے دل کو چُھوا۔ لٹریچر میں دوستوفسکی نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ میکسم گورکی بھی بہت بھایا۔ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل مارس تھوریز کی شخصیت نے بھی سوبھو کو بہت متاثر کیا۔ سوبھو کے پسندیدہ انقلابی پی سی جوشی ہیں، جنھوں نے بکھرے ہوئے کمیونسٹوں کو یکجا کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ سوبھو شاہ عنایت کی جدوجہد سے بھی متاثر ہے۔

اب سوبھو کسی پارٹی سے منسلک نہیں، نہ ہی کسی جماعت یا گروہ کی طرف داری کرتا ہے، بلکہ خود کو ایک بزرگ تصور کرتا ہے، اور لیفٹ کی تمام پارٹیوں کو اپنا کہتا ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی چند بدتہذیب، بے معنی الزامات لگاتے ہیں، احمقانہ حد تک تلخ سوالات اُٹھاتے ہیں، تاہم یہ گیانی الزامات کی پروا نہیں کرتا، ذہن بڑا کشادہ ہے۔ سوبھو کے نظریات پختہ ہیں، اُنھیں حالات بدل نہیں سکتے۔

بڑھتی عمر انسان کو محدود کردیتی ہے اور وہ زندگی سے کٹ جاتا ہے، لیکن باہمت سوبھو نے زندگی سے تعلق قائم رکھا۔ اور آج بھی قائم ہے۔

☆☆☆

کہنے والے کہتے ہیں کہ 1991 میں سوویت یونین کے زوال نے بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹوں کا کردار ختم کردیا لیکن سوبھو کی مثبت سوچ کو اس سانحے نے قطعی متاثر نہیں کیا۔ اس بابت جب ایک پریس کانفرنس میں کسی نے دریافت کیا، تو اس مجاہد نے کہا، ”دنیا کا بوجھ اُٹھانے والے چند بزدل تھک گئے ہیں، بس!“

”محترم کیا سوویت یونین کی تحلیل سوشل ازم کی ناکامی نہیں؟“ سوال کرنے والے نے اگلا سوال داغا۔

سوبھو نے جواب میں کہا ”نہ تو سوشل ازم فیل ہوا ہے، نہ ہی اجتماعیت فیل ہوتی ہے۔ اس سسٹم میں کوئی خرابی نہیں، پر جب احتساب کرنے والے ادارے نہ ہوں، تو وہی نتائج سامنے آتے ہیں جو سوویت یونین میں آئے۔ سخت مرکزیت میں جمہوریت کم ہوتی ہے۔ وہاں انقلاب کے نام پر مرکزیت نافذ کردی گئی تھی۔“

اِس بابت سوبھو نے متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کالموں میں اس نے میں اپنا تجزیہ یوں پیش کیا:

”آخری برسوں میں سوویت یونین میں پڑھے لکھے، گہرے کمٹ منٹ رکھنے والے انقلابی مرگئے، جو باقی بچے انھیں کلرک اور منیجر بنا دیا گیا۔ کتنے بڑے بڑے اور اچھے کمیونسٹوں کو اِس طرح کے فضول کام سنبھالنے پڑے، کوئی ریلوے کا وزیر بنا، کوئی ثقافت کا، اِس طرح انقلابی جذبہ مکمل طور ٹھپ ہوگیا۔“

وہ مزید کہتا ہے ”جب تک غربت موجود ہے، سوشلزم اور سوشلسٹوں کو کوئی ختم نہیں کرسکتا۔“ یہی وہ یقین ہے، جس نے اُسے زندہ رکھا ہے، اور یہی وہ فکر ہے، جو اپنی جسمانی موت کے بعد یہ قلندر اگلی نسلوں کے لیے چھوڑ جائے گا۔

خونخوار عورتیں

اے آر راجپوت

عورت پھول ہے، خوشبو ہے، سُبک چاندنی ہے، خدا کا بہترین تحفہ ہے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ مگر وہ عورتیں...... جذبۂ انتقام میں اندھی ہوچکی تھیں۔ انسانیت کی تذلیل بن چکی تھیں۔ قیدیوں کو کیسی کیسی عجیب وغریب ایذائیں دیتی تھیں مگر جب ان کے مظالم کا اختتام ہوا تو بھی وہ باز نہ آئیں، اور خود پر ظلم کرنے پر اتر آئیں۔

دوسری جنگ عظیم کا ایک دل دہلا دینے والا قصہ

فروری 1945ء میں منیلا کے تمام امریکی جنگی دستے جنرل ڈگلس کی کمان میں دیے جاچکے تھے مگر امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے ہنوز لایٹ کے علاقے میں نوتعمیر شدہ ہوائی اڈے استعمال کررہے تھے۔ ان اڈوں سے پرواز کرنے والے بی 24 بمبار طیارے چینی سمندروں پر جنوب میں بورنیو سے سلیبس تک اور شمال میں فارموسا اور روکویو کے جزائر پر بھرپور بمباری کررہے تھے۔ ان حملوں کا مقصد سمندری اور خشکی کے راستوں سے جاپانیوں کی فوجی سپلائی اور سامانِ رسد کا راستہ منقطع کرنا تھا۔

15 جنوری کو، بی 24 بمبار طیاروں کا ایک اسکواڈرن اپنے مشن پر روانہ ہوا جنھیں فارموسا پر بمباری کرنا تھی۔

گرین گوز نامی طیارہ اس فارمیشن کے آخر میں تھا

لیکن ہنان کی بندرگاہ پر بمباری کرتے ہوئے یہ طیارہ اپنی فارمیشن کھو بیٹھا اور بھٹکتا ہوا اس ساحل کے اتنے قریب پہنچ گیا جہاں دشمن کی توپیں اس کے استقبال کے لیے تیار تھیں۔ اٹھارہ سو فٹ کی بلندی پر طیارے کا زمینی توپوں کی زد سے بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ایک گولہ طیارے کے دائیں بازو پر لگا اور طیارہ ایک جھٹکا لیتے ہوئے قلابازیاں کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف آنے لگا۔ طیارے کے پائلٹ ٹی این مونرو نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے طیارے کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی اور بالآخر وہ ساحل کی ریت کی ایک پٹی پر کریش لینڈنگ کرنے میں کامیاب ہوگیا جہاں بدقسمتی سے لاتعداد جاپانی فوجی اس کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ طیارے کو چاروں طرف سے جاپانی فوجیوں نے گھیر لیا۔

دس افراد پر مشتمل اس طیارے کے عملے کو گرفتاری کے فوراً بعد ہی ہنان بھیج دیا گیا جہاں جاپانی بحریہ کے انٹیلی جنس آفیسر تین دن تک ان سے پوچھ گچھ کرتے رہے اور بالآخر انہیں بتایا گیا کہ انہیں جزیرے کے اندرونی حصے میں واقع ایک جنگی کیمپ میں بھیجا جارہا ہے جہاں وقتاً فوقتاً ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔

اسی روز ایک جاپانی محافظ نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں اکاساکی کے جنگی کیمپ نمبر تین میں بھیجا جانے والا ہے۔

اسی شام انہیں کیمپ نمبر تین کی طرف روانہ کردیا گیا تھا۔ دو تین گھنٹوں تک ٹرک نہایت تیز رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ شدید سردی کے باعث قیدی ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے تاکہ ایک دوسرے کے جسموں سے حرارت حاصل کرسکیں لیکن سردی کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا، اس کے ساتھ ہی ٹرک کی رفتار بھی کم ہوگئی۔ پختہ سڑک ختم ہوچکی تھی اور اب ٹرک برفانی میدان میں ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چاندنی میں تاحدِ نگاہ برف کی سفید چادر پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

جہاز کا مشین گن سارجنٹ رچرڈ باس ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگائے سکڑا بیٹھا تھا۔ سردی کی شدت سے اس پر کپکپی سی طاری تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے اس جاپانی کی طرف دیکھا جو مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ جارہا تھا۔

''کیا یہاں ہمیشہ ایسی ہی سردی ہوتی ہے؟''

''یہ ماؤنٹ مورس ہے۔ اس وقت ہم سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کررہے ہیں جبکہ اکاساکی صرف چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ علاقہ جہاں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، سردیوں میں برف سے ڈھکا رہتا ہے لیکن موسم بہار میں بارشوں کے ساتھ ہی یہاں کی برف پگھلنا شروع ہوجاتی ہے۔'' مترجم نے بتایا۔

تقریباً دو گھنٹے مزید ہچکولے کھانے کے بعد وہ کھٹارا ٹرک ایک زبردست ہچکی لے کر رک گیا۔ رچرڈ نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ جگہ جگہ نصف آرک لائٹس کی تیز روشنی میں اکاساکی جنگی کیمپ نمبر تین کی خاردار تاروں کے جنگلے کا گیٹ نظر آرہا تھا۔ ٹرک کے رکتے ہی ایک ہیولا کیبن سے نکل کر ان کی طرف بڑھا، وہ سر سے پیر تک گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔

جہاز کا ریڈیو آپریٹر مائر پہلا شخص تھا جس کی آنکھیں تیز روشنی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم گیا۔

''عورت!'' اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی ''دیکھو، وہ محافظ ایک عورت ہے، حیرت انگیز! یہ کیمپ عورتوں کی نگرانی میں ہے۔''

مونرو اور رچرڈ وغیرہ بھی اب ٹرک کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے، امپیریل آرمی کی یونیفارم میں ملبوس تقریباً ایک درجن عورتیں گیٹ کے قریب رائفلیں سنبھالے مستعد کھڑی تھیں۔

''اوہو!'' جہاز کے انجینئر چک کرو کر نے سیٹی بجائی ''معلوم ہوتا ہے ہمیں جنگی کیمپ کے بجائے بھول کر کسی نائٹ کلب میں بھیج دیا گیا ہے۔''

ان کے ساتھ آنے والے مسلح جاپانی مترجم نے انہیں ٹرک سے اُترنے کا حکم دیا۔ وہ جیسے ہی نیچے اُترے، دو محافظ لڑکیوں نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں رائفلوں کی زد میں لے لیا اور وہ خاردار تاروں کے گیٹ سے گزرتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ گئے۔ اس لمحے چند اور محافظ لڑکیوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ تیز روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ جب کوئی لڑکی اپنی جگہ سے حرکت کرتی تو اس کی رائفل کے آگے لگی ہوئی سنگین، روشنی میں بجلی کی طرح چمک اُٹھتی۔ مونرو انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا اُٹھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جاپانیوں نے عورتوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنا شروع کردیا تھا۔ ضروری تربیت کے بعد صرف انتظامی امور ان عورتوں کے سپرد کیے گئے تھے جہاں ان کے لیے زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن جنگی قیدیوں کے کسی کیمپ کی نگرانی عورتوں کے سپرد کردینا، مونرو کے نزدیک حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

مونرو ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عورت دائرے میں کھڑی محافظ لڑکیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے آگئی۔ اسے دیکھ کر ہر قیدی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

اس کیمپ میں کسی ایسی حسین عورت کی موجودگی کا تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

وہ قیدیوں کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اس کے جسم پر امپیریل آرمی میجر کی وردی تھی جو کمر پر خاصی چست تھی۔ پیروں میں برفانی جوتے تھے جو پنڈلیوں تک آرہے تھے۔ پتلون کے پائنچے نہایت سلیقے سے جوتوں کے اندر اُڑسے ہوئے تھے۔

قیدیوں کے ساتھ آنے والے جاپانی مترجم نے اپنی زبان میں اس عورت سے کوئی بات کی پھر قیدیوں کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔

''یہ اوکاٹسو سان ہیں۔ تم لوگ اس کیمپ میں اپنے قیام کے دوران انہیں اسی نام سے مخاطب کروگے۔ اس کیمپ میں تمہارا قیام کتنا طویل ہوگا؟ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، ہماری زبان میں ''سان'' میڈم کو کہتے ہیں۔ تم لوگ اگر چاہو تو اپنی آسانی کے لیے انہیں سان کے بجائے میڈم بھی کہہ سکتے ہو۔ اوکاٹسو سان میجر رینک کی مالک اور اس کیمپ کی انچارج ہیں۔ اوکاٹسو کے بعد اس کیمپ کی نگرانی کی ذمے داری یاکو سان اور ہارو سان پر عائد ہوتی ہیں۔ تمہیں ان کے احکامات کی بے چوں وچرا تعمیل کرنا ہوگی۔ اس کیمپ کے محافظوں میں کوئی مرد شامل نہیں، سارا انتظام ان لڑکیوں کے سپرد ہے لیکن تم انہیں مردوں سے کم نہیں پاؤگے۔''

مترجم چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کیمپ کی محافظ لڑکیوں کے بارے میں بتانے لگا۔

''اکاساکی کے اس کیمپ کی محافظ لڑکیوں کی تعداد صرف تین ہے جن کی انچارج میڈم اوکاٹسو ہیں جو کیمپ سے متعلق معاملات میں ہر لحاظ سے خودمختار ہیں، البتہ بعض معاملات میں وہ صرف اور صرف فارموسا، ہائی کمان کو جواب دہ ہیں۔'' مترجم کے مطابق بہت عرصہ پہلے یہ کیمپ مرد فوجیوں کی نگرانی میں تھا لیکن جنرل میک آرتھر کے فلپائن واپس آنے کے بعد مرد فوجیوں کو ساحل کی حفاظت کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ مترجم نے اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ جنرل میک آرتھر کو اس علاقے میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ''ایک بات اور......'' مترجم نے قیدیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان میں پانچ لڑکیاں شادی شدہ ہیں اور ان کے شوہر بحریہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ان لڑکیوں کو شہنشاہ کی خاص توجہ بھی حاصل ہے۔ ایک بات اور ذہن نشین کرلو کہ یہ لڑکیاں تمہارے مردوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ انہیں تم سے شدید نفرت ہے اور کسی سے نفرت کرنے کی اس سے بڑی وجہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے شوہر، بھائی، باپ اور رشتے دار تم لوگوں کے ہاتھوں ... مارے جاچکے ہیں یا مارے جارہے ہیں۔ میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو تنبیہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے تمہارے فرار کی کوئی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوگی۔ یہ بات بھی نوٹ کرلو کہ جب تک تم لوگ یہاں ہو، یہ سب تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی۔''

مترجم نے اپنی تقریر ختم کرکے میڈم اوکاٹسو کی طرف دیکھا اور اوکاٹسو نے پسندیدگی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ مترجم اسے سلامی دے کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میڈم اوکاٹسو اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہی جب تک وہ گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے ٹرک پر سوار نہ ہوگیا۔ پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

ارشیا اینو...... اس کے خوبصورت ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

مترجم کی وارننگ کے باوجود جہاز کا پائلٹ لیفٹیننٹ نونان اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''بے بی! میں تمہاری زبان نہیں سمجھتا لیکن اگر تمہیں کسی محبوب کی تلاش ہے تو وہ میرے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

لیکن جب میڈم اوکاٹسو نے انگلش میں جواب دیا تو نونان اور اس کے ساتھی سناٹے میں رہ گئے۔ خصوصاً نونان کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔

”میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتی ہوں۔“ میڈم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ میں نے جو الفاظ کہے تھے، اس کا مطلب ہے، بدآمدید کتو!“

جملہ ختم کرکے میڈم اوکاٹسو نے ایک ہاتھ اُٹھا کر مخصوص اشارہ کیا۔ لیفٹیننٹ نونان کے پیچھے کھڑی ہوئی دو محافظ لڑکیوں نے نونان کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اس کے ساتھیوں سے الگ کرلیا، اس سے پہلے کہ نونان کچھ سمجھ سکتا، دونوں لڑکیوں نے رائفل کے بٹ پوری قوت سے اس کی پنڈلیوں پر مارے، نونان چیختا ہوا زمین پر گرا۔ پنڈلیوں پر لگی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اُٹھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ محافظ لڑکیوں نے رائفلوں کے بٹ مار کر اسے چت لٹادیا اور اس کے بازوؤں پر کھڑی ہوگئیں۔ نونان برف پر پشت کے بَل لیٹا، بُری طرح چیخ رہا تھا، اس دوران ایک اور لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور تقریباً ڈیڑھ انچ موٹی لکڑی کا ٹکڑا اس کے دانتوں میں پھنسادیا۔

نونان اب بھی چیخ رہا تھا۔ اس کی آواز اب عجیب سی نوعیت اختیار کرچکی تھی۔ دانتوں میں لکڑی ہونے کی وجہ سے اس کا منہ ڈیڑھ انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔

اور پھر...... وہ سب کچھ اس قدر سرعت سے ہوا تھا کہ مونرو اور اس کا ساتھی کوئی اندازہ نہ لگا سکے۔ میڈم اوکاٹسو نے اپنی ہپ پاکٹ سے چاقو نکال لیا اور نپے تلے قدم اُٹھاتے ہوئے نونان کے قریب پہنچ گئی۔ چند لمحے وہ نونان کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر ایک پیر اُٹھا کر نونان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے میڈم اوکاٹسو کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ اس پر جھک رہی تھی۔ تب پھر دفعتاً ہی وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور چاقو کا .... پھل اس کے کھلے منہ میں داخل کردیا۔ نونان بُری طرح مچلنے لگا مگر میڈم اوکاٹسو نے اس کی سینے پر اپنا پورا بوجھ ڈال رکھا تھا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے حرکت کررہا تھا۔ چاقو کی تیز نوک نے نونان کی زبان کو جڑ سے کاٹ دیا تھا۔ نونان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

میڈم اوکاٹسو اُچھل کر اس کے پاس سے ہٹ گئی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے تقریباً پانچ انچ کے گوشت کے لوتھڑے کو جو نونان کی زبان تھی، ہوا میں لہراتے ہوئے چیخی ”بانزآئی......!“

یہ خوشی کا نعرہ تھا۔ اس نے نونان کی طرف دیکھا، اس کے منہ سے بہنے والا خون، چہرے، گردن اور زمین پر جمی ہوئی برف کو سرخ کیے دے رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں، دانتوں میں لکڑی پھنسی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو خون کو نگل سکتا تھا اور نہ ہی تھوک سکتا تھا۔ لیفٹیننٹ نونان کے ساتھی خاموش کھڑے تھے، یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، ان کے پیچھے کھڑی ہوئی محافظ لڑکیوں کی رائفلوں کی سنگینیں ان کی گردنوں کو چھورہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بھی نونان سے مختلف نہیں ہوگا۔

رچرڈ کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں، اس نے سختی سے دانت پر دانت جمار کھے تھے، سفاکی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور خون میں لت پت نونان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے..... اسے ایسی اذیت ناک موت ماروں گا کہ جاپانیوں کی آنے والی کئی نسلیں تک یاد رکھیں گی۔“

رچرڈ کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے ساتھیوں نے اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن لی اور اسی لمحے انہوں نے رچرڈ کو اپنا لیڈر تسلیم کرلیا، اس کے جبڑوں کے اُبھرے ہوئے مسلز اور لہجے کی کرختگی کا احساس کرکے مونرو، اسٹیوارڈ اور لائیڈ وغیرہ نے بھی تسلیم کرلیا کہ رچرڈ اس گروپ کا واحد آدمی ہوگا جو کبھی انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکے گا۔

میڈم اوکاٹسو نے جو رچرڈ کی بڑبڑاہٹ نہیں سن سکی تھی، اپنا خون آلود ہاتھ اور چاقو کا خون نونان کے کپڑوں سے صاف کیا۔ نونان کی زبان ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی، وہ قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے خوں خوار بلی کی طرح غرائی۔

”میں اس کیمپ میں آنے والے قیدیوں کو ہمیشہ اسی قسم کی وارننگ دیتی ہوں۔ اس طرح کوئی بے ہودہ خیال ان کے ذہن میں جگہ نہیں پاسکتا۔“

اس نے خاموش ہوکر ایک طرف اشارہ کیا، یہ گویا استقبالیہ تقریب ختم ہونے کا سگنل تھا، محافظ لڑکیاں قیدیوں کو دھکیلتے ہوئے روشنی کے دائرے سے نکال لے گئیں۔

ان کی بیرک گھاس پھونس کا ایک سائبان ثابت

ہوئی۔ لکڑی کے چار ستون کھڑے کرکے ان پر چھت قائم کردی گئی تھی۔ چاروں طرف سے کھلا ہونے کے باعث سردی سے بچاؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نیچے کچی زمین تھی اور انہیں اوڑھنے یا بچھانے کے لیے کمبل وغیرہ بھی فراہم نہیں کیے گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد آرک لائٹس بجھادی گئیں، چند منٹ کے بعد ہی ان کی آنکھیں تاریکی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکی تھیں۔ ان کے اردگرد اسی قسم کے پندرہ اور سائبان تھے جن میں موجود قیدی اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لیے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کررہے تھے۔

لیفٹیننٹ نونان ختم ہوچکا تھا۔ اس کی لاش برف پہ پڑی تھی۔ اب وہ صرف نورہ گئے تھے۔ ٹرک سے اُتر کر ان لڑکیوں کو دیکھ کر ان میں سے جن لوگوں نے یہ سوچا تھا کہ وہ کسی جنگی کیمپ کے بجائے نائٹ کلب میں آگئے ہیں، جہاں خوبصورت لڑکیاں ان کی دلجوئی کو موجود ہیں، انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اب وہ سب یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اس کیمپ کے بارے میں انہوں نے جو داستانیں سن رکھی تھیں، ان میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہ تھی۔ ان کے خیال میں یہ موت کا کیمپ تھا جہاں قدم رکھتے ہی موت نے ان کا استقبال کیا تھا اور ان کے ایک ساتھی کو چاٹ لیا تھا۔ موت جو خوبصورت لڑکیوں کی صورت میں ان کے گرد منڈلا رہی تھی۔

صبح سب سے پہلے رچرڈ ہی کی آنکھ کھلی تھی۔ ایک نظر چاروں طرف دیکھتے ہی یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ یہ کیمپ موت کے نام سے کیوں مشہور تھا۔

ایک لمحے کو تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سترہویں صدی کے کسی عقوبت خانے میں پہنچ گیا ہو۔ ہر سائبان میں چھ سے دس تک قیدی تھے اور ان کی حالت دیکھ کر بہ مشکل ہی یہ فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی انسان کے زمرے میں آتے ہیں۔ پھٹے پُرانے غلاظت آلود کپڑوں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ ڈھانچوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہ لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اُٹھ کر متحرک ہوگئے تھے۔ ان کے جسموں اور پھٹے پُرانے کپڑوں سے اُٹھنے والی بدبو سے رچرڈ کو ابکائی آگئی۔

ایک سائبان کی طرف دیکھتے ہی رچرڈ چونک گیا۔ اس سائبان کے ڈھانچا نما قیدی اپنے دو ساتھیوں کو برف پر گھسیٹتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں لے جارہے تھے، وہ لاشیں تھیں۔ ان قیدیوں کے وہ ساتھی تھے جو گزشتہ رات زندگی کی اذیت سے نجات پاگئے تھے۔

رچرڈ یہ خوفناک منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی طرف سے کانگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ تمام قیدی اپنی اپنی بیرکوں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ رچرڈ نے اپنے ساتھیوں کو جگادیا اور وہ بھی دوسرے قیدیوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے سائبان کے نیچے لائن لگا کر کھڑے ہوگئے۔ اس طرف محافظوں کے ہٹ کی طرف سے دو محافظ لڑکیاں ٹرالی دھکیلتی ہوئی اس طرف بڑھتی نظر آئیں۔ رچرڈ اور اس کے ساتھی دو نمبر بیرک میں تھے، لڑکیاں پہلی بیرک کے سامنے رک گئیں۔ ایک لڑکی رائفل سنبھالے کھڑی رہی جبکہ دوسری لڑکی ٹرالی پر رکھے ہوئے پتیلے میں سے کوئی چیز ڈونگے سے نکال نکال کر اس بیرک کے قیدیوں کے سامنے برف پر ڈھیر کرنے لگی پلیٹ یا کسی برتن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ آٹھ قیدی تھے سب اس کھانے پر ٹوٹ پڑرہے تھے۔

دوسرے دن سوموار تھا۔ اس روز کیمپ میں ڈاک آیا کرتی تھی اور قیدیوں کے لیے یہ دن ہفتے کا بدترین دن ہوتا تھا۔ کیمپ کی محافظ لڑکیاں اپنے نام آنے والے خطوط پڑھنے کے بعد ردِعمل کے اظہار پر زیادہ دیر نہیں لگاتی تھیں۔ یہ خطوط مختلف شہروں میں مقیم ان کے رشتے داروں کی طرف سے آتے یا شوہروں کی طرف سے جو کسی نہ کسی کی موت کی اطلاع ضرور ہوتی۔

”اور جب انہیں اپنے کسی رشتے دار کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے تو یہ واقعی خونخوار بلیاں بن جاتی ہیں۔“ انفنٹری آفیسر نے بتایا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی مونرو اور اس کے ساتھیوں نے محافظ لڑکیوں کے رویّے میں تبدیلی محسوس کرلی اور ان کے سامنے برف پر کھانا بکھیر دیا گیا۔ وہ غالباً چاول تھے جو کسی اور چیز میں ملا کر پکائے گئے تھے مگر ان چاولوں سے اس قدر بدبو اُٹھ رہی تھی کہ اگر وہ کوئی لقمہ اُٹھا کر منہ میں ڈال بھی لیتے تو اسے نگلنا ان کے لیے دوبھر ہوتا، اس کے برعکس پُرانے قیدیوں نے زمین پر سے چاول کا ایک ایک دانا صاف کردیا تھا۔

مونرو، کیمپ کے دوسرے سرے پر لکڑی کے ان ہٹس کی طرف دیکھ رہا تھا جو کیمپ کی انچارج میڈم اوکاٹسو اور دیگر محافظ لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے، باہر سے دیکھنے پر

بہ ظاہر وہ ہٹ بھی اچھی حالت میں نظر نہیں آرہے تھے مگر مونزو کو یقین تھا کہ وہاں زندگی کی ہر آسائش موجود ہوگی۔

دوپہر میں میڈم اوکاٹسو اپنے ہٹ سے باہر نکلی، یہ ہٹ اس کے دفتر کے علاوہ رہائش گاہ کا کام بھی دے رہا تھا، وہ چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑی متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی رہی پھر بڑے نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں آکر رک گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا کوڑا تھا اور دوسرے ہاتھ میں میگا فون، جسے منہ سے لگا کر وہ چیختے ہوئے بولی۔

''امریکی کتو! میری بات غور سے سنو۔ آج کی ڈاک سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے بے شمار جوان امریکی بھیڑیوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ان جاپانیوں کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور ہم ان کے ایک ایک قطرۂ خون کا بدلہ لیں گے۔''

اس کی تقریر ختم ہوتے ہی محافظ لڑکیاں ہاتھ والی دو گاڑیاں کھینچتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں۔ یہ ''ہتھ گاڑیاں'' گدھا گاڑیوں سے مختلف نہیں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہیں گدھوں کے بجائے لڑکیاں کھینچ رہی تھیں۔ کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر محافظ لڑکیوں نے گاڑیاں چھوڑ دیں، ایک گاڑی میں میڈم اوکاٹسو اور دوسری میڈم یوکا سوار ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی چمڑے کا کوڑا نظر آرہا تھا۔ محافظ لڑکیوں نے دو قیدیوں کو ایک سائبان سے گھسیٹ کر نکال لیا اور انہیں کھینچنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں ڈھانچوں سے مختلف نہ تھے۔ ان کے لیے اپنے جسموں کا بوجھ گھسیٹنا مشکل ہورہا تھا لیکن وہ گاڑیاں کھینچنے پر مجبور تھے۔ وہ چیونٹی کی رفتار سے گاڑیاں کھینچ رہے تھے۔

دفعتاً فضا میں زناٹے کی آواز اُبھری۔ میڈم اوکاٹسو کے کوڑے نے اس کی گاڑی کھینچنے والے قیدی کی پشت سے کھال اُدھیڑ دی تھی۔ یہ گویا میڈم یوکا کے لیے سگنل تھا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی میں جتے ہوئے قیدی پر کوڑے برسانے شروع کردیے۔ چابک پڑتے ہی قیدیوں کی رفتار بڑھ گئی۔ دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو برف پر دوڑنے لگیں۔

میڈم اوکاٹسو اور یوکا پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنی گاڑیوں سے جتے ہوئے قیدیوں پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ وہ اس طرح چیخ رہی تھیں جیسے اس ریس سے پوری طرح محظوظ ہورہی ہوں۔

دفعتاً میڈم اوکاٹسو کی گاڑی والے قیدی کا پیر برف پر پھسل گیا، اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکتا، وہ اوندھا پڑا تھا کہ دوسری گاڑی کا پہیا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ قیدی کے گرنے سے گاڑی اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ اس صورتِ حال نے میڈم اوکاٹسو پر جنون سا طاری کردیا۔ وہ گاڑی سے نیچے کود آئی، اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کوڑے کے دستے سے قیدی کی پسلیوں پر ضرب لگائی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ میڈم نے اس کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کردی مگر بے سود۔ قیدی کے جسم میں حرکت تک نہیں ہوئی۔

بالآخر میڈم اوکاٹسو چیختی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس طرح یہ کھیل ملتوی ہوگیا۔

اگلے سوموار کو اگرچہ کیمپ کے قیدیوں کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آج کی ڈاک سے کیمپ کی محافظ عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ منیلا میں جاپانی فوجوں نے جنرل میک آرتھر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ایک اور محاذ پر میڈم اوکاٹسو کا باپ جس رجمنٹ کی کمان کررہا تھا، امریکی فوج نے اس کا مکمل صفایا کردیا تھا۔

اس مرتبہ اپنے وحشیانہ کھیل کے لیے میڈم اوکاٹسو نے مونزو اور اس کے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ اوکاٹسو اور یوکا نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی ان کے سائبان کے سامنے رک گئیں اور انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سب اپنے سائبان کے سامنے کھڑے ہوگئے اور میڈم اوکاٹسو اس طرح ان کا جائزہ لینے لگی جیسے قسائی بکروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ کون سا اس کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہوسکتا ہے۔ بالآخر میڈم نے رچرڈ اور سیکنڈ ریڈیو آفیسر برٹرام کو لائن سے الگ کرلیا۔

''تم دونوں قدوقامت میں ایک جیسے لگتے ہو، اپنی اپنی قمیص اُتار دو۔'' میڈم نے حکم دیا۔ انہوں نے قمیص اتار دیں۔ وہ خاصے تندرست اور تنومند تھے، میڈم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

''مجھے تم جیسے تنومند اور مضبوط آدمیوں کی ضرورت تھی۔ پُرانے قیدیوں میں اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی سکت بھی نہ رہی لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ آج کے مقابلے میں مزہ آجائے گا۔''

محافظ عورتیں انہیں رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں اور ایک بار پھر درندگی اور

بربریت کا ایک نیا مظاہرہ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں اس قابل بھی نہ رہے کہ اپنے قدموں سے چل سکتے، میڈم اوکاٹسو اور یوکا کے لیے اب ان میں کوئی دلچسپی کی بات نہ تھی۔ وہ دونوں اس کھیل کے اختتام کا اعلان کرکے رخصت ہوگئیں۔

رچرڈ کے چہرے، سر اور جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا اس نے سر جھٹکتے ہوئے برٹرام کی طرف دیکھا جو اس سے بھی بدتر حالت میں تھا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ممکن ہے موسم کی یخ بستگی ان کے زخموں کو انفیکشن سے بچالے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں توانائی کی ضرورت تھی جس کا حصول بہ ظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ رچرڈ سوچ رہا تھا کہ اگر مناسب خوراک کا انتظام نہ ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ بھی پُرانے قیدیوں کی طرح ڈھانچوں میں تبدیل ہوکر رہ جائیں گے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

لیکن سوال تو یہ تھا کہ خوراک کہاں سے آتی؟ امریکیوں سے نفرت کیمپ کی محافظ عورتوں کے انتقامی جذبے میں شامل تھی۔ رچرڈ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مناسب خوراک حاصل کرنا ہے تو اسے انہی عورتوں میں سے کسی ایک کو قابو میں کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے اور پھر بالآخر محض اتفاق سے اسے وہ موقع مل گیا جس کا وہ منتظر تھا۔ اس روز حسبِ معمول ان کے سامنے کتوں کی طرح کھانا ڈالا جارہا تھا۔ رچرڈ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا محافظ لڑکی کو پتیلے میں سے چاول نکال نکال کر ان کے سامنے زمین پر ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی باری آئی تو برف پر لڑکی کا پیر پھسل گیا اور چاولوں سے بھرا ہوا مگا رچرڈ کے پیر پر پلٹ گیا۔

''گومن نا سائی!'' لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

لڑکی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ معذرت کے ان سیدھے سادے الفاظ نے رچرڈ کے دماغ میں ایک جھماکا سا پیدا کردیا۔ اور وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر کیمپ کی خونخوار محافظ لڑکیوں میں سے کسی کی ہمدردی حاصل کی جاسکتی ہے تو وہ یہی ہوسکتی ہے۔ کیمپ کے پُرانے قیدیوں سے رچرڈ کو اس محافظ لڑکی کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ وہ ناما تھی، اس کا تعلق ہنان کے ایک ایسے کلب سے تھا جہاں جاپانی فوجی افسر تفریح کے غرض سے جاتے تھے۔

رچرڈ تین دن تک گہری نظروں سے اس کی نقل وحرکت کا جائزہ لیتا رہا، وہ اس سے تنہائی میں بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا، بالآخر اسے یہ موقع مل ہی گیا۔ اس روز ناما محافظوں والے ہٹس کے قریب ایک شیڈ میں اسٹاک کا جائزہ لے رہی تھی کہ رچرڈ بھی نہایت خاموشی سے رینگتا ہوا شیڈ میں داخل ہوگیا۔

''ناما......!''

رچرڈ نے دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا، اس کے لہجے میں بے پناہ درد تھا، اس ایک لفظ سے وہ ناما کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہمدردی کا مستحق ہے۔

ناما اپنا نام سن کر چونک سی گئی۔ اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا، رچرڈ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب چمک اُبھر آئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رچرڈ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور محتاط قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

سب کچھ رچرڈ کی توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا، ناما، رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو چوری چھپے اضافی راشن فراہم کرنے لگی، کبھی وہ انہیں چاول پہنچادیتی اور کبھی ڈبل روٹی وغیرہ۔

مارچ کا مہینا ختم ہوتے ہی برسات کا موسم شروع ہوگیا۔ اس سائبان کے علاوہ قیدیوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بارش کی تیز بوچھار میں وہ رات دن بھیگتے اور سردی میں ٹھٹھرتے رہتے۔

اپریل کے وسط میں میڈم یوکا کو اطلاع ملی کہ اس کا شوہر اوکی ناوا کے محاذ پر امریکیوں کے ہاتھوں مارا جاچکا ہے۔ وہ ایک بنکر میں مشین گن سے فائر کررہا تھا کہ دشمن کی توپ کا گولا بنکر کے اندر آکر گرا اور مشین گن کے ساتھ اس کے بھی پرخچے اُڑ گئے۔

یوکا نے میڈم اوکاٹسو سے ''شکار'' کی اجازت مانگی جو بلا جھجک مل گئی۔ اس مقصد کے لیے یوکا نے لیفٹیننٹ مونزو کا انتخاب کیا تھا۔

قیدیوں کو کچھ علم نہ تھا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے، وہ تو صرف ایک رات پہلے ناما نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اشاروں کی زبان میں رچرڈ کو بتادیا تھا کہ

اپنے شوہر کی موت کا انتقام لینے کے لیے یوکا کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔

دوسرے دن صبح دو محافظ لڑکیاں مونرو کو گھسیٹتی ہوئی میدان کے وسط میں لے گئیں اور مونرو کو کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر خونخوار بلیوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ مونرو کی قمیص تار تار ہوگئی۔ لڑکیوں کے نوکیلے ناخنوں سے اس کے چہرے اور جسم پر گہری خراشیں آ گئی تھیں جن سے خون رسنے لگا۔ ایک لڑکی نے اس کے گلے میں جھولتی ہوئی قمیص کھینچ کر دور پھینک دی پھر وہ دونوں رائفلیں تان کر دور کھڑی ہوگئیں۔ اب یوکا کی باری تھی، وہ قہر برساتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی، اس کے اشارے پر دو محافظ لڑکیوں نے مونرو کے بازو پشت پر جکڑ لیے، یوکا کے پاس اس وقت کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے مونرو کی طرف جھکتے ہوئے اچانک ہی اپنی انگلیاں اس کی ایک آنکھ میں گاڑ دیں۔ مونرو بلبلا اُٹھا۔ یوکا نے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔ مونرو کی آنکھ کا ڈیلا (Eye ball) گویا ابل کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ مونرو کی دوسری آنکھ بھی نکال چکی تھی۔

مونرو اس گروپ کا طاقت ور ترین آدمی تھا۔ پہلی آنکھ نکلتے وقت اس کے منہ سے بس ایک چیخ نکلی تھی، اس کے بعد پھر اس نے اُف تک نہ کی۔ جبکہ یوکا اس سے کسی خاص ردِعمل کی توقع کیے ہوئے تھی، اسے یقین نہ آیا کہ مونرو اس طرح خاموشی سے یہ اذیت برداشت کر جائے گا۔ اس کی قوت برداشت نے یوکا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس نے ایک محافظ لڑکی سے رائفل چھینی اور چھینتے ہوئے رائفل کی سنگین سے مونرو کے بازوؤں اور ٹانگوں پر وار کرنے لگی۔ سنگین اُتار کر رائفل پھینک دی اور قسائی کی طرح مونرو کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پھینکنے لگی۔ مونرو کے جسم سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے اب تک کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ اس کا ایک بالائی دانت نچلے ہونٹ میں پیوست تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ یوکا اب بھی بربریت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مونرو نیچے گر گیا۔ یوکا کا جنون اس وقت کم ہوا جب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک لاش پر سنگین چلا رہی ہے۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد سارجنٹ میٹ ٹیلر نے کیمپ کے خاردار تاروں کو پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر اسے بھی اسی طرح اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا کہ کیمپ کے قیدی لرز اُٹھے۔ اس کے چند روز کے بعد جہاز کے گن پورٹر نے میڈم اوکاٹسو پر حملہ کر دیا، اس کا شاید دماغ چل گیا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سنگینوں کے کچوکے دے دے کر میڈم اوکاٹسو سے الگ کیا اور میڈم اوکاٹسو نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر پورٹر کے سر میں گولی اُتار دی۔

جون کے شروع میں جب کیمپ میں اوکی ناوا کے سقوط کی بازگشت سنائی دی تو رچرڈ کے دل میں بھی امید کی کرن جگمگا اٹھی، اسے یقین تھا کہ اوکی ناوا کے بعد اب فارموسا کی باری آئے گی۔ اس میں چند مہینے بھی لگ سکتے تھے اور اس دوران انہیں صبر و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔

پھر وہ ہوا جس کا رچرڈ کو خطرہ تھا۔

کیمپ کے کچن سے راشن کی چوری کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میڈم اوکاٹسو نے کچن کی نگرانی شروع کر دی اور ایک روز ناما راشن چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ پہلے تو ناما سے ویسے ہی پوچھ گچھ کی جاتی رہی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ راشن کس کے لیے چرایا کرتی تھی پھر اسے گھسیٹ کر میدان کے وسط میں لے آیا گیا اور تمام قیدیوں کے سامنے اس پر تشدد کرتے ہوئے اصل بات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ناما کا جسم خون سے تر ہو رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی مگر اس کی زبان نہیں کھل سکی۔ بہر طور اسے بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کے بعد ناما کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو اضافی راشن کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دوسری طرف امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے جاپانیوں کی بیشتر سپلائی لائنیں کاٹ چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیمپ میں بھی راشن کی قلت پیدا ہوگئی۔ مزید برآں جون کی چلچلاتی دھوپ نے بھی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ برف پگھلنے کے بعد کیمپ میں پڑی ہوئی لاشوں سے سڑاند اُٹھنے لگی۔ اگست کے شروع میں قیدیوں کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ رچرڈ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ بے بسی کی موت مرنے کے بجائے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس روز میڈم اوکاٹسو کے ہٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک گیا۔ اندر سے آنے والی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب کر ڈالیں اور وہ

رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ نہایت آہستگی سے اندر رینگ گیا، اندر پہنچنے کے بعد ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا لیکن اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو اس پر سحر طاری کر رہی تھی لیکن میڈم اوکاٹسو بھی ہٹ میں موجود تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ رچرڈ نے دروازہ مقفل کر دیا اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ معمولی سی آہٹ سن کر میڈم اوکاٹسو تیزی سے گھوم گئی، رچرڈ کو دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دیوار پر ٹنگے ہولسٹر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ہولسٹر سے ریوالور نکالتے ہوئے اس نے پیر کی ٹھوکر سے کھانے کی میز الٹ دی۔

ہولسٹر سے ریوالور کھینچتے ہی اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے مگر بدحواسی میں اس کی کوئی بھی گولی نشانے پر نہیں لگی تھی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بھاری ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپ رہا ہے۔

میڈم اوکاٹسو کی یہ بدحواسی دیکھ کر رچرڈ کے ذہن میں شاید یہ شیطانی خیال اُبھرا ہو کہ اگر وہ اوکاٹسو کی انا کو مجروح کر سکے تو......؟

شاید یہی سوچ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک بن کر اُبھر آئی تھی۔ میڈم اوکاٹسو نے ایک اور فائر کیا مگر نشانہ اس مرتبہ بھی خطا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے چھلانگ لگا دی۔ دنیا کی سفاک ترین عورت میڈم اوکاٹسو بے بس چڑیا کی طرح رچرڈ کی گرفت میں تھی۔ رچرڈ پر جنون سا طاری تھا۔ فائرنگ اور میڈم کی چیخوں کی آواز سن کر محافظ لڑکیاں ہٹ کے باہر جمع ہو چکی تھیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا مگر رچرڈ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر تو جنون طاری تھا۔ اس نے میڈم اوکاٹسو کو نیچے گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ انتقام کا جذبہ اب بھی شدید تر تھا۔

اس نے میڈم کے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ممکن ہے وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتا لیکن اس لمحے محافظ لڑکیاں دروازہ توڑ کر اندر گھس آئیں۔ وہ رچرڈ کو بڑی مشکل سے گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔

میڈم اوکاٹسو کے چہرے پر لاتعداد خراشیں تھیں۔ ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا تو وہ ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے غرائی۔

”تم امریکی کتے! تمہاری یہ جرأت۔ تمہیں اس جرم کی اتنی بھیانک سزا دوں گی کہ تمہاری چیخوں سے آسمان تک کانپ اُٹھے گا۔“

میڈم اوکاٹسو، میڈم یوکا اور میڈم بارد احکامات جاری کرتی رہی۔ رچرڈ کو ہٹ سے باہر لایا گیا۔ تین محافظ لڑکیوں نے اپنی رائفلیں اس کی پشت سے لگا رکھی تھیں۔ کیمپ کے آخری سرے پر خاردار تاروں کے قریب اسے روک لیا گیا۔ اس جگہ کے قریب ہی جنگلے کے دوسری طرف گندگی کا ایک جوہڑ تھا۔ رچرڈ کے ہاتھ میں ایک بیلچا دے کر گڑھا کھودنے کا حکم دیا گیا۔ تین رائفلوں کے سائے میں وہ گڑھا کھودتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھی پانچ گھنٹے تک گڑھا کھودتے رہے، ان میں جو بھی ذرا سستی دکھاتا، میڈم یوکا کا ہنٹر اس کی کھال ادھیڑ ڈالتا۔

نو فٹ کی گہرائی میں پہنچنے کے بعد پانی نکل آیا، اس کے باوجود وہ گڑھا کھودتے رہے۔ بدبودار پانی تیزی سے گڑھے میں بھر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب پانی پنڈلیوں تک پہنچ گیا تو انہیں رسیوں کے ذریعے باہر نکال لیا گیا۔

قیدیوں کو دو محافظوں کی نگرانی میں ان کی بیرک میں واپس پہنچا دیا گیا اور میڈم یوکا کے حکم پر چار محافظ لڑکیاں جنگلے کے دوسری طرف جوہڑ کے بدبودار پانی سے بالٹیاں بھر بھر کر اس گڑھے میں اُنڈیلنے لگیں۔ ان کا یہ کام تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ پھر اطلاع پا کر میڈم اوکاٹسو بھی اپنے ہٹ سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔ رچرڈ کی قمیص پھاڑ کر اس کے جسم سے الگ کر دی گئی اور پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو دھکیلتے ہوئے گڑھے کے قریب لے آیا گیا۔ اس وقت تک تقریباً چار فٹ پانی جمع ہو چکا تھا۔

میڈم اوکاٹسو چند لمحے خونخوار نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھتی رہی پھر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے تم بہت اچھا کھانا کھاتے ہو امریکی کتے! آج میں نے تمہارے لیے ایک بہت خاص ڈش تیار کرائی ہے۔ اسے ہماری زبان میں لنغا ہی کہا جاتا ہے۔“

میڈم اوکاٹسو بات کرتے ہوئے رچرڈ کے قریب آ گئی تھی۔ آخری الفاظ منہ سے نکالتے ہی اس نے رچرڈ کو دھکا دیا۔ رچرڈ قلابازی کھاتا ہوا گڑھے میں گر گیا۔ پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کمر اور ٹانگوں پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس کرنے

لگا۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر کمر سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ کوئی چیز اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی جسے اس نے نوچ لیا پھر اپنے ہاتھ میں تقریباً پانچ انچ لمبی جونک دیکھ کر اسے اپنے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک جونک اس کے پیٹ پر چپک گئی تھی جسے کوشش کے باوجود وہ نوچنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا اور پھر تو اسے محسوس ہوا جیسے پیٹ سے نیچے جسم کے ہر حصے پر نشتر چل رہے ہوں۔

جونکیں اب اس کی کمر اور پیٹ پر رینگتی ہوئی جسم کے ہر حصے پر پہنچ رہی تھیں اور وہ بڑی آزادی سے اس کا خون چوس رہی تھیں۔ رچرڈ چیختا ہوا گڑھے کی دیوار کی طرف لپکا، اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر چکنی مٹی پر اس کے ہاتھ پھسلتے رہے۔ اس نے بے بسی سے اوپر دیکھا، اس کے ساتھی گڑھے کے کنارے پر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف و دہشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ رچرڈ اپنے جسم سے جونکیں نوچتا پانی میں ناچتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اوپر دیکھا۔ اس مرتبہ اسے کوئی محافظ لڑکی دکھائی نہیں دی تھی۔ البتہ اس کا ایک ساتھی گڑھے کے کنارے پر لیٹا اپنا ہاتھ نیچے لا رہا تھا۔ رچرڈ نے پوری قوت کے ساتھ اُچھل کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کی انگلیاں مس ہوئیں مگر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کے ہاتھ پر گرفت نہ جما سکا۔ بالآخر تیسری کوشش میں وہ مائز کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے ایک اور ساتھی کوبر نے فوراً ہی زمین پر لیٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ تان کر گڑھے سے باہر نکال لیا۔

ہوا اور دھوپ کے باعث اس کے جسم پر جونکوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رچرڈ اور اس کے ساتھی اس کے جسم سے جونکیں نوچ نوچ کر پھینکتے رہے۔

"کک...... کیا ہوا......؟ یہ...... یہ خونخوار بلیاں یہاں سے کیوں چلی گئیں؟" رچرڈ نے حواس بحال ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

"پپ...... پتا نہیں۔" مارٹر بولا "کچھ دیر پہلے ایک کار گیٹ پر آکر رکی تھی، نیچے اُترنے والے ایک جاپانی فوجی نے چیخ کر انہیں بلایا تھا شاید اس کے ساتھ کچھ اور بھی تھے، تمام لڑکیاں دوڑتی ہوئی کار کے قریب چلی گئیں۔ وہ لوگ اب بھی گیٹ کے پاس جمع ہیں۔"

رچرڈ نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ کیمپ کی تمام محافظ لڑکیاں جاپانی بحریہ کے ایک آفیسر کے گرد جمع تھیں۔ چند منٹ بعد لڑکیاں اس آفیسر کو چھوڑ کر اپنے ہٹس کی طرف چلی گئیں۔ جاپانی آفیسر کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر نپے تلے قدم اُٹھاتا ہوا رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گیا۔

چھ اگست کے دن...... امریکی فضائیہ کے بی 29 طیارے نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا دیا تھا۔ اس کے تین دن بعد ایک اور ایٹم بم نے ناگاساکی کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ چودہ اگست کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس طرح جنگ ختم ہوگئی تھی اور جنگی کیمپوں میں تمام امریکی قیدی اب آزاد تھے۔ رچرڈ اور اس کے ساتھیوں نے کیمپ کے تمام قیدیوں کو یہ خوشخبری سنائی، ہر وہ شخص جو چلنے پھرنے کے قابل تھا، خوشی سے اُچھل پڑا اور پھر انہوں نے محافظ لڑکیوں کے ہٹس کو گھیرے میں لے لیا۔ اب وہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں شدید نفرت تھی اور وہ کیمپ کی ان درندہ صفت محافظ لڑکیوں سے انتقام لینا چاہتے تھے جنہوں نے انہیں زندہ درگور کر رکھا تھا۔

وہ سب کے سب محافظ لڑکیوں کے ہٹس کی تلاشی لیتے رہے مگر ان لڑکیوں کو تو جیسے زمین نے نگل لیا تھا۔ تمام ہٹس خالی پڑے تھے۔ ماسوائے ایک ہٹ کے جو میٹنگ ہال کہلاتا تھا اور جہاں وہ محافظ لڑکیاں اہم معاملات پر مل جل کر غور و خوص کیا کرتی تھیں۔ میٹنگ ہال کا دروازہ اندر سے بند دیکھ کر انہیں اطمینان ہوگیا کہ محافظ لڑکیاں اندر موجود ہیں اور اپنی حفاظت کے لیے وہ سہم کر میٹنگ ہال کے کونے کھدروں میں چھپی بیٹھی ہیں۔

"دروازہ توڑ ڈالو۔" زخمی رچرڈ نے نقاہت کے باوجود چلا کر کہا اور سب دروازے پر پل پڑے۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ گر پڑا۔

واقعی ان کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ تمام محافظ لڑکیاں میٹنگ ہال کے کونے کھدروں میں نہیں بلکہ کمرے کے بیچوں بیچ اس میز کے گرد موجود تھیں جہاں وہ اپنے اہم معاملات پر غور و خوص کیا کرتی تھیں...... مگر اس حال میں کہ ان کے جسموں سے خون بہہ کر جم چکا تھا۔ ان تمام جاپانی لڑکیوں نے اپنے اسلاف کی روایات پر عمل کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور "ہاراکاری" پر عمل کرتے ہوئے اپنی جانیں ختم کر لی تھیں۔

دشمن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان اور جانور میں ایک خاص فرق ہوتا ہے جسے آدمیت کہتے ہیں۔ آدمیت معراج ہے انسان کی۔ وہ بھی خود کو اس مقام پر لے آیا تھا۔ اس نے ثابت کردکھایا کہ انسان ظلم سے نہیں ترحم کے جذبے سے مالامال ہوتا ہے۔

شبنم کی خنکی جیسے فسوں ساز جذبوں کی روداد

وِسن نیند سے جاگا تو اسے کافی کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ وہ بستر سے اُٹھا اور کافی کا برتن چولہے پر چڑھا کے کھڑکی کی طرف آگیا۔ صبح دھیرے دھیرے نمودار ہو رہی تھی، یہی سبب تھا کہ دور دیر تک بچھی گھاس پر شبنمی قطرے جھلملا رہے تھے، ہلکی ہلکی کہر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کا حسن بہت نکھر آیا تھا تاہم سردی میں بھی کافی اضافہ ہوگیا

تھا، ولسن نے ایک اونی کمبل اوڑھ لیا تھا۔ مختصر سے کچن میں جلتا ہوا چولہا بھی کیبن کی سردی کم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

ولسن ذرا دیر تک کھڑا کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا پھر دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں دیوار پر ایک بندوق لٹک رہی تھی، اس نے بندوق اُتاری اور میز پر رکھ دی جہاں پہلے سے کارتوسوں کا ایک ڈبا بھی رکھا ہوا تھا، وہ باہر جانے کے لیے اب تیار تھا۔ دفعتاً شوں... شوں کی سنسناتی آواز کیبن میں ابھری ساتھ ہی ایک مخصوص خوشبو پھیلی، چولہے پہ رکھی کافی تیار تھی۔

گرما گرم کافی پینے کے بعد اس نے میز پر سے بندوق اٹھالی، شست باندھ کر اس کی چال اور نشانے کا اندازہ کیا پھر اس کے اندر کارتوس بھرنے لگا، ٹھوس چھرّوں والے کارتوس بندوق میں بھرنے کے بعد باقی کارتوس اس نے جیب میں ٹھونس لیے اور باہر آگیا۔

خون کو برف بنا دینے والی سرد لہر نے اس کا استقبال کیا، وہ سرتاپا ٹھٹھر کر رہ گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس چھپر تلے آگیا جدھر اس کی جیپ کھڑی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ہر چیز کا بہ غور معائنہ کیا، سب ٹھیک تھا۔ رسّیاں، بندوق، لکڑی کا بلاک، غرضیکہ ہر وہ شے جو شکار میں مستعمل ہوسکتی تھی، اس کے پاس شکار کا لائسنس بھی تھا جسے اس نے اپنے سیٹ کے ساتھ ہی منسلک کر رکھا تھا تاکہ دور سے ہی دکھائی دے جائے۔

وہ اپنی جیپ میں سوار ہوا اور اسے اسٹارٹ کر کے احاطے سے باہر لے آیا۔ اس وقت اس نے ایک اور جیپ کی آواز بھی سنی۔ یہ جیپ ہنری ہی کی ہوسکتی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح شکار پر روانہ ہو رہا تھا۔ ہنری اس سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ اس وقت کہر اتنی گہری تھی کہ ولسن کو اپنی جیپ کی فلیش لائٹ روشن کرنا پڑی تھی۔ اس نے پیچھے سے آتی ہوئی دو روشنیاں دیکھیں۔ یہ روشنیاں ہنری کی جیپ کی ہوسکتی ہیں۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنی جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ وہ ہنری کے ساتھ مل کر شکار نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔

کچھ دور آنے کے بعد کہر چھٹ گئی۔ اب اتنی روشنی... ہوگئی تھی کہ اس نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ وہ شکاریوں کے ایک کیمپ کے برابر سے گزرا۔ شکاریوں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلائے لیکن اس نے اپنی جیپ کی رفتار کم نہیں کی۔ وہ ان کی طرف جواباً ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد وہ سڑک بلند ہوتی تھی۔ اس کی جیپ کے برابر سے اور بھی گاڑیاں گزریں، جو یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اب یہ سڑک اچھی خاصی مصروف ہوگئی ہے۔

ولسن اپنی جیپ دوڑاتا ہوا بلندی پر لے آیا جہاں ایک کیمپ لگا ہوا تھا اور اس کیمپ کے باہر تین آدمی بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ یہاں چلنے والی ہوا اچھی خاصی سرد تھی۔ ولسن نے اپنی جیپ ان شکاریوں کے قریب لاکر روک دی اور خود جیپ سے اُتر کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

''اس سال تم جلدی نہیں آگئے ولسن! کیا بات ہے؟'' ایک شکاری نے اس کی طرف کافی بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہنری کا کیا حال ہے، کیا وہ بھی آچکا ہے؟''

''ہاں، وہ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔'' ولسن نے بتایا اور گرم کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ وہ تیس بتیس برس کی عمر کا ایک خوب رو آدمی تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور جسم کی بناوٹ مضبوط تھی۔

''اس بار صورتِ حال کیا ہے ڈک؟'' اس نے شکاری سے دریافت کیا۔

''پیٹر نے آج سویرے سویرے ایک بارہ سنگھے کو مارا ہے۔'' اس آدمی نے بتایا۔ جس کا نام ڈک تھا۔ ''اب وہ اس کی کھال اُتارنے میں مصروف ہے۔''

ولسن نے اس طرف نگاہ کی جدھر ڈک نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کی شاخ سے بارہ سنگھے کی لاش لٹکی ہوئی تھی اور دو آدمی کیمپ کی طرف آرہے تھے۔ ان دونوں کے لباس پر خون کے دھبے تھے، خون، ان کے ہاتھوں پر بھی تھا جو اَب جم چکا تھا۔ وہ دونوں بھی آگ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک پیٹر تھا اور دوسرا گریٹ۔

تبھی نیچے وادی والی سڑک سے کسی گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی۔

''میرا خیال ہے کہ ہنری بھی آپہنچا ہے۔'' پیٹر نے کہا۔ ''کیا تم دونوں اس سال ایک ساتھ شکار کھیلنے کا پروگرام بنا رہے ہو؟''

''نہیں، ابھی تک تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی ہے۔'' ولسن نے جواب دیا۔

ہنری بھی اوپر پہنچ چکا تھا اور اس نے اپنی جیپ کیمپ سے کچھ فاصلے پر لاکر کھڑی کر دی تھی۔ اب وہ جیپ سے اتر کر ان لوگوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ ایک مضبوط جسامت کا آدمی تھا جس کے سر کے بال اُڑے ہوئے تھے، اس کے جبڑے بہت بھاری تھے، وہ دیکھنے ہی سے ایک سخت گیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ الاؤ کے پاس آکر اس نے خود ہی اپنے لیے ایک پیالی میں کافی انڈیلی اور آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ ان کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر ہنری نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی بندوق ایک طرف رکھ دی۔ ولسن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے تم آدھی رات کو ہی چل پڑے تھے؟''

''سیدھی سی بات ہے۔'' ہنری نے کافی کے دو گھونٹ بھرنے کے بعد پیالی ایک طرف رکھ دی۔ ''اس شرط میں تمہارا ہی فائدہ ہے، اس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ تمہارا باغ اُجاڑ ڈالا تمہارے کتوں کو ہلاک کیا اور گیراج میں بھی توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ اگر میں اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ میں جانتا ہوں، اسے مارنا اب تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ تم سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔''

''نہیں، میں اسے مار لوں گا کیونکہ میں اس کے حملوں کی ترکیبیں سمجھ گیا ہوں۔''

''مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ولسن اسے مارنا ہی نہیں چاہتا۔'' ڈک نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں اسے مارنا چاہتا تو کب کا مار چکا ہوتا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' ولسن نے کہا۔ ''وہ میرے سامنے آئے بھی تو...... تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اتنے نقصانات کے بعد اس کے وجود کو برداشت کر سکتا ہوں؟ پچھلے سال اس نے میرے گھوڑے کے پیٹ میں اپنا سینگ اُتار دیا تھا جس کے نتیجہ میں مجھے گھوڑے کو گولی مارنا پڑی۔''

پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے، کہیں کہیں پر یہ بادل ایک دوسرے سے مل بھی گئے تھے۔ ''ہاں! اس موسم میں وہ ہمیشہ باہر نکلتا ہے اس بار بھی ضرور آئے گا۔''

''وہ تمہیں ستانے پر تلا ہوا ہے ولسن! جانوروں کی دشمنی بڑی گندی ہوتی ہے۔'' پیٹر نے کہا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں کہ تم اور وہ ایک دوسرے کے سخت جانی دشمن ہونے کے باوجود کسی کو مارنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

پیٹر کی بات سن کر ولسن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ صرف پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''شاید تم اسی لیے میرے ساتھ شکار نہیں کھیلتے، تمہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں اسے گولی نہ مار دوں، شاید اسی لیے کہ تم نہیں چاہتے ہو کہ تمہارے دشمنوں کی ہلاکت میرے ہاتھوں ہو، کیوں؟''

''نہیں، مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے، چاہے تم کچھ بھی کرتے رہو۔''

وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر ولسن نے اپنی سگریٹ سلگائی۔ دو چار گہرے گہرے کش لینے کے بعد اس نے ہنری کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں کل صبح سویرے شکار کے لیے چل دوں گا، تم جو مناسب سمجھو کرو۔''

''میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' ہنری نے کہا۔ ''تم مجھے روک نہیں سکتے۔''

''آخر تم میرے ہی ساتھ کیوں جانا چاہتے ہو؟'' ولسن نے جز بز ہو کے پوچھا۔

''میں تمہیں ایکشن میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ہنری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہیں شکار کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی کیونکہ تم ایک ماہر شکاری ہو لیکن میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم چاہے کتنی ہی کوشش کر لو لیکن اس بارہ سنگھے کو میں ہی ہلاک کروں گا تم مجھ سے اس بات پر شرط بھی لگا سکتے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں بارہ سنگھے کو مارنے سے زیادہ مجھے شکست دینے میں دلچسپی ہے، کیوں؟''

ہنری نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں نے وہ دن اس کیمپ میں گزارا، رات ہونے پر دوبارہ الاؤ روشن کر دیا گیا۔ شکاری اس الاؤ کے گرد بیٹھ کر اپنے اپنے شکار کے قصّے سنانے لگے۔ دوسری صبح ان لوگوں کو شکار کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ اس رات بھی خاصی سردی تھی۔ الاؤ کے پاس کمبل اوڑھ کر لیٹنے کے باوجود ان میں سے ہر شخص سردی سے کانپ رہا تھا۔

دوسری صبح ہنری کی آنکھ کھلی تو روشنی ابھی نمودار نہیں ہوئی تھی لیکن ولسن الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔ وہ شکار پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہنری اس کے پاس آگیا۔

''کیوں؟ تم مجھے چھوڑ کر جانے کی سوچ رہے ہو نا وِلسن؟'' اس نے وِلسن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میں نے کافی ختم کرلی ہے اور اب یہاں سے جا رہا ہوں۔'' اس نے کافی کی پیالی ایک طرف رکھ دی اور کھڑا ہوگیا۔

ہنری اس وقت تیار نہیں تھا، اس لیے وہ چیختا چلّاتا رہ گیا جبکہ وِلسن بڑے آرام سے اپنی جیپ کی طرف آیا، جیپ میں بیٹھا اور ایک جھٹکے سے اسے اسٹارٹ کردیا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ چکا تھا جہاں گھاس اور پودے بہت کم دکھائی دے رہے تھے، اردگرد چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی جیپ ایک طرف کھڑی کی، بندوق اُٹھائی اور ایک بڑے سے پتھر کے عقب میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اب سے پانچ برس پہلے اس نے اسی جگہ سے اس بارہ سنگھے پر گولی چلائی تھی لیکن وہ بارہ سنگھا اس کے حملے سے بچ نکلا تھا۔ اسکے بعد یہ ہر سال کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر سال یہاں آتا اور اس بارہ سنگھے کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلا جاتا۔

پہلی گولی چلانے کے بعد سے اب تک اس کے اور اس بارہ سنگھے کے درمیان ایک قسم کی جنگ جاری تھی اور اس کی ابتداء اس بارہ سنگھے ہی نے کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ وِلسن سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہا ہو، وہ انتہائی ذہانت سے اس کی جیپ کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے کامپ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے ان برسوں میں وِلسن کو بے شمار نقصانات پہنچائے تھے، وہ کسی بلا کی طرح وِلسن کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور وِلسن اسے ہلاک کرنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ وہ اگر دکھائی بھی دیتا تو گولی چلانے سے پہلے ہی کسی چھلاوے کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔

وہ بہت دیر تک اس پتھر کے عقب میں بیٹھا بارہ سنگھے کا انتظار کرتا رہا۔ وِلسن کا تجربہ تھا کہ وہ بارہ سنگھا ان ہی اطراف میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ اس وقت دھوپ نکل چکی تھی اور دن کی روشنی میں دور دور تک بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ ہوا چٹانوں سے ٹکرا کر ہلکا ہلکا سا شور پیدا کر رہی تھی۔ وِلسن نے ہنری کے بارے میں سوچا۔ وہ اس وقت نہ جانے کہاں ہوگا، ہوسکتا ہے وہ بھی میرے پیچھے ہی چل پڑا ہو اور اس وقت کہیں آس پاس ہی موجود ہو اور اس کی طرح بارہ سنگھے کو نشانہ بنانے کی تاک میں بیٹھا ہوا ہو، وِلسن کو معلوم تھا کہ وہ اس بارہ سنگھے کو نشانہ بنانے کے بعد یہ سوچ کر خوش ہوتا رہے گا کہ اس نے میرا شکار چھین لیا۔ وہ بنیادی طور پر اسی مزاج کا آدمی تھا، ہونہہ۔

ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے اس کے اعصاب اکڑنے لگے تھے۔ لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس غفلت میں اس کی توہین تھی، اس کی ذرا سی غفلت سے وہ بارہ سنگھا اس کی زد میں آکر پھر نکل سکتا تھا۔ یہ اس کے اور بارہ سنگھے کے درمیان جنگ تھی اور وہ انسان ہونے کے حوالے سے اس جنگ میں شکست برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے ہر حال میں اس بارہ سنگھے پر اپنی برتری ثابت کرنا تھی، تبھی اس کی نگاہوں کے سامنے ایک متحرک دھبا سا اُبھرنا شروع ہوا۔ بہت دھیرے دھیرے وہ نمایاں ہونے لگا۔ وِلسن مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے جان لیا کہ وہ دھبا دراصل وہی بارہ سنگھا ہے، جو اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر کسی طرف جا رہا ہے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار بہت کم معلوم ہو رہی تھی لیکن وِلسن کو اندازہ تھا کہ وہ تیز طرار جانور اس وقت کتنی احتیاط کا مظاہرہ کر رہا ہوگا۔ وہ کچھ ایسا ہی ذہین تھا۔

وِلسن نے اوپر دیکھا۔ نیلے آسمان پر بادل دکھائی نہیں دے رہے تھے، لیکن ہوا ابھی تک سرد تھی۔ اس نے دوبارہ اپنی نگاہیں اس بارہ سنگھے کی طرف جما دیں۔ وہ اب بہت قریب آچکا تھا۔ شکار اپنی احتیاط پسندی کے باوجود دھیرے دھیرے نشانے پر آتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھ لی پھر اس وقت کچھ سوچ کر وہ اپنی گردن ہلانے لگا۔ اس نے پچھلی بار اتنے فاصلے سے بارہ سنگھے پر گولی چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا گیا تھا۔ اس بار وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا نشانہ اتنا تیچا ثابت ہو کہ وہ چالاک جانور دوسری سانس ہی نہ لے سکے لیکن اس کے لیے اسے اتنے فاصلے تک آنے کا موقع دینا ضروری تھا جہاں سے اس پر درست نشانہ لگایا جا سکے۔ اس نے کچھ اور اوپر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس نے بندوق اپنے شانے سے لٹکائی اور دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا۔ بہت آہستگی کے ساتھ لیکن بدقسمتی سے اس کا پیر رپٹ گیا اور ایک پتھر اس کی ٹھوکر سے لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس پتھر کی آواز نے بارہ سنگھے کو چوکنا کردیا پھر اس سے پہلے کہ وِلسن سنبھل کر اپنی بندوق شانے سے اُتارتا بارہ سنگھا چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ وِلسن غصے کی شدت سے اپنے دانت پیس کر رہ گیا۔ جانور نے ایک بار پھر اسے شکست دے دی تھی، وہ دل شکستہ سا ہو کر ٹیلے سے نیچے اُترنے لگا۔

تبھی اس نے بندوق چلنے کی آواز سنی، وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ اسپرنگ فیلڈ بندوق کی آواز تھی اور اس قسم کی بندوق ہنری کے پاس تھی۔ اس نے دوبارہ اپنی بندوق اپنے شانے سے لٹکائی اور اس طرف دوڑنے لگا جدھر سے وہ آواز سنائی دی تھی۔ اس کی ٹھوکروں سے پتھر اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے لیکن وہ دوڑتا چلا گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے ہنری کو دیکھا جو اپنی بندوق ہاتھ میں اٹھائے ہوئے کھڑا تھا لیکن اس بارہ سنگھے کا کوئی پتا نہ تھا۔

''میں نے اسے زخمی کر دیا ہے وِلسن!'' ہنری نے بتایا۔ اس کی آواز میں فخر اور خوشی کا تاثر تھا۔ ''وہ گر بھی گیا تھا مگر پھر اُٹھ کر دوڑ گیا۔ ہم اس کے خون کے نشانات کے ذریعے اس تک پہنچ سکتے ہیں، تم آؤ میرے ساتھ ہم دونوں اس کا تعاقب کرتے ہیں۔''

وِلسن اسے گھور کر رہ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا اس بارہ سنگھے کو مارنے کی خوشی ہنری کے حصے میں آئی تھی۔ اس لیے اس کے لہجے میں فخر کا احساس تھا۔ اس نے سبقت حاصل کرلی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ہنری سے بھڑ جائے۔ اس شخص کا تفاخر بھرا لہجہ اسے کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بجائے وہ ہنری کے ساتھ خون کے نشانات کے سہارے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد انہیں ایک جگہ خون کا بڑا سا دھبا دکھائی دے گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بارہ سنگھا چند لمحوں کے لیے یہاں رکا تھا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ خون کے نشانات چھوٹے چھوٹے دھبوں کی صورت میں آگے چلے گئے تھے۔

وہ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ اس وقت ہوا اور بھی سرد ہوگئی، اس کے ساتھ ہی آسمان پر بادلوں کے سفید سفید گالے تیرنے لگے جو اس بات کی علامت تھے کہ برف باری شروع ہونے والی ہے۔ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ پہاڑیوں کی دوسری جانب برف باری شروع ہوگئی ہو۔ کچھ دور جانے کے بعد اچانک بارش شروع ہوگئی، اس علاقے کی بارش بھی اس انداز کی ہوا کرتی تھی۔ اچانک اور شدید۔ وہ دونوں بارش میں بھیگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، حالانکہ آسمان پر ہر طرف گہرے بادل چھا گئے تھے، اس کے باوجود اتنی روشنی تھی کہ وہ زخمی بارہ سنگھے کا تعاقب کرتے رہے لیکن دوپہر تک وہ بارہ سنگھا کہیں دکھائی نہ دیا۔ بارش نے اس کے خون کے نشانات بھی بڑی حد تک صاف کر دیے تھے وِلسن محض اندازے پر چلا جا رہا تھا۔

''اب چھوڑو بھی اس کو۔'' ہنری جھلّا کر بولا۔ ''آخر ہم کب تک اس کا تعاقب کرتے رہیں گے، لعنت بھیجو اس پر۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وِلسن نے کہا۔ ''ہم نے جب کھیل شروع کیا ہے تو اس کو انجام تک بھی پہنچانا ہے۔''

بارش کے تھپیڑوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ ان کے پورے کپڑے شرابور ہوگئے تھے۔ اسی لمحے سرد اور برفیلی ہوا نے انہیں منجمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہنری تو باقاعدہ کانپ رہا تھا اگر ان لوگوں کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے تو اس موسم میں وہ خود بھی برف کا حصہ بن کر رہ جاتے۔

''آخر تم میری جان لینے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟'' ہنری نے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتے نہیں، میرا کیا حال ہو رہا ہے؟''

''میں دیکھ رہا ہوں... لیکن میرے ساتھ چلنے کی تمہاری اپنی مرضی ہے۔ تم چاہو تو اب بھی واپس جا سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم راستے میں کہیں رکے نہیں تو شام ہوتے ہوتے کیمپ تک پہنچ جاؤ گے۔'' اس نے اپنے چہرے سے پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہمیشہ جانوروں کو زخمی کر کے چھوڑا ہے، کبھی انہیں مار نہیں سکے ہو۔''

وِلسن کے اس ریمارکس پر ہنری اسے گھور کر.... رہ گیا۔ وہ دونوں خاصا دور نکل آئے تھے۔ لیکن اس زخمی بارہ سنگھے کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وِلسن کے خیال میں وہ زخمی ہو جانے کے بعد انہیں شکست دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ لیکن کچھ دور چلنے کے بعد انہیں ایک پہاڑی سلسلہ دکھائی دے گیا، یہاں چھوٹے چھوٹے کئی غار بنے ہوئے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ بارہ سنگھا انہی میں سے کسی غار کے اندر موجود ہو۔

''میرا خیال ہے کہ وہ بارہ سنگھا انہی غاروں میں سے کسی میں موجود ہے۔'' وِلسن نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''جہنم میں جائے بارہ سنگھا۔'' ہنری نے کہا۔ ''میں تو اس بارش سے تنگ آچکا ہوں اور اب واپس جا رہا ہوں،

میں تمہاری طرح پاگل پن کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔"
"تمہاری مرضی۔" ولسن نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے کچھ سامان دیتے جاؤ، ہوسکتا ہے کہ مجھے اس علاقے میں رات گزارنا پڑ جائے۔"

ہنری نے اسے رات گزارنے کے لیے اپنے تھیلے میں سے کچھ چیزیں نکال کر دیں اور خود پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ولسن ایک اونچے گھنے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ بارش اگرچہ ابھی تک اسی زور و شور سے ہو رہی تھی، لیکن اس گھنے درخت کے پتوں اور اس کی شاخوں نے بارش کے پانی سے بڑی حد تک بچاؤ کر رکھا تھا۔ درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے ان غاروں کی طرف نگاہیں جما دیں جن کے اندر اس کے خیال میں زخمی جانور پناہ لے سکتا ہے۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ بارہ سنگھا بھی انہی میں سے کسی ایک غار میں چھپا ہوگا۔

شام ہوتے ہوتے بارش رک گئی، لیکن ہوا ابھی تک سرد تھی اور وہ بارہ سنگھا بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ولسن نے اس مقام پر پڑاؤ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے اِدھر اُدھر سے درختوں کی شاخیں جمع کیں پھر آگ روشن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ گیلی لکڑیوں نے آگ پکڑنے میں بہت دیر لگا دی تھی لیکن جب الاؤ روشن ہوگیا تو ولسن اپنے ہاتھ پاؤں تاپنے لگا۔ اس نے اپنا بھیگا ہوا کمبل بھی اُتار کر خشک ہونے کے لیے آگ کے قریب رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود بھی آگ کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اس طرح اس کے بدن کو حرارت ملنے لگی تھی وہ بہت دیر تک لیٹا بادلوں کی آوازیں سنتا رہا۔ بارش اگرچہ رک گئی تھی لیکن بادل ابھی تک گرج رہے تھے اور اس شام میں ان کی گرج ایسی لگ رہی تھی جیسے بہت دور نقارے بج رہے ہوں۔

کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہوا اور بارہ سنگھے کے نشانات کی تلاش شروع کردی۔ تھوڑی سی محنت کے بعد اسے خون کے ہلکے ہلکے سے دھبے ایک غار کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ بہت ممکن تھا کہ خون کے یہ دھبے پہلے بہت گہرے ہوں لیکن اس موسلا دھار بارش نے انہیں ہلکا کردیا تھا۔ اس کے باوجود اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچا تھا۔ ان دھبوں کو دیکھ کر وہ اپنے عارضی پڑاؤ کی طرف واپس آگیا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ معمول کے مطابق بہت جلدی کھل گئی۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے الاؤ کی طرف دیکھا الاؤ رات ہی میں کسی وقت سرد ہوگیا تھا۔ بارش اب مکمل طور پر بند ہوچکی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کچھ اور لکڑیاں جمع کیں اور آگ روشن کردی۔ اس بار لکڑیوں نے آگ پکڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی، اس کے پاس کافی کا پورا سامان موجود تھا۔ اس نے جلدی جلدی کافی بنا کر پی اور ایک بار پھر بارہ سنگھا کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ اس وقت صبح نمودار ہونے والی تھی اور اس کی ہلکی ہلکی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں اسے احساس ہوگیا کہ وہ غار اس کی توقع سے کہیں زیادہ فاصلے پر تھا حالانکہ شام کے وقت وہ زیادہ دور نظر نہیں آرہا تھا۔ بہرحال! اسے تو ہر حال میں اس بارہ سنگھے تک پہنچنا تھا، چاہے فاصلہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔

وہ پڑاؤ کی آگ بجھا کر روانہ ہوا تھا لیکن اس کے سینے کے اندر ایک دوسری آگ جل رہی تھی۔ یہ نفرت اور غصے کی آگ تھی اس بارہ سنگھے کے خلاف، جس نے اسے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ وہ اس کے اعصاب پر کسی بلا کی طرح سوار تھا۔ ولسن کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس نے اپنی جیپ گیراج والے کو دکھائی تھی تو اس نے کہا تھا۔ "کیا بات ہے ولسن؟ کیا کسی ہاتھی سے ٹکر ہوئی تھی؟ اس کی مرمت پر تو اچھا خاصا خرچا آئے گا۔"

ولسن نے ایک نظر اپنی جیپ پر ڈالی جس کی ہیڈ لائٹس ٹوٹی ہوئی تھیں اور اس کے پچھلے حصے کو بھی اچھا خاصا نقصان پہنچا تھا۔ اس کم بخت بارہ سنگھے نے اس کی جیپ کی یہ حالت کردی تھی۔ اس وقت ولسن کی بندوق کمرے میں رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بندوق اُٹھا کر لاتا۔ وہ بارہ سنگھا اپنا انتقام لے کر فرار ہوچکا تھا۔ اس نے ایک ٹائر کو پھاڑ دیا تھا، ریڈی ایٹر میں سوراخ کردیا تھا اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس چکنا چور کردی تھیں۔ اس کے علاوہ سامنے والا شیشہ بھی کرچی کرچی ہوگیا تھا۔ گیراج والے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس نے اپنی جیپ کسی پاگل ہاتھی کے سامنے ڈال دی تھی۔

ولسن کے اعصاب پر تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اپنی جیپ کی تباہی کے ساتھ اسے اپنے باغیچے کی تباہی بھی یاد آگئی تھی۔ اس باغیچے کو اس نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ اس میں مختلف قسم کے پودے لگائے تھے لیکن اس بارہ سنگھے نے اپنے انتقام کے جوش میں اس کے باغیچے کو بھی تباہ کردیا تھا اور وہ بھی اس بُری طرح کہ دوبارہ شجر کاری پر ولسن کے پورے دو سو ڈالر خرچ ہوگئے تھے۔

اس وقت اسے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا تھا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ ان علاقوں میں کسی کو تنہا نہیں رہنا چاہیے، تنہا رہنے سے بڑے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک اکیلا آدمی آخر کتنے کام کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی اور ہوتا تو اس پر جتنی تباہی آئی تھی اتنی کبھی نہیں آتی۔ اگر وہ باہر گیا ہوا ہوتا تو دوسرا آدمی چیزوں کی حفاظت کے لیے موجود رہتا۔ اس بدمعاش بارہ سنگھے نے تو اس کی زندگی تلخ کر کے رکھ دی تھی۔ کبھی کبھی ولسن کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس بدمعاش بارہ سنگھے کے اندر کسی شیطان کی روح حلول کرگئی ہے جو اسے بتاتی رہتی ہے کہ ولسن اس وقت کیا کر رہا ہے؟ اور کہاں ہے؟

اسے یاد آیا کہ ایک بار پھلوں کی بہت اچھی فصل ہوئی تھی ان پھلوں کو اس نے چھپر کے نیچے چھپا دیا تھا اور ان پھلوں پر اتنی مقدار میں گھاس پھوس ڈال دی تھی کہ باہر سے دکھائی دینا مشکل تھا لیکن بارہ سنگھے نے سونگھنے کی قوت سے پھلوں کا پتا چلا لیا تھا اور اس نے راتوں رات پھلوں کے اس ذخیرے کو تہس نہس کردیا۔ ولسن اپنا دل پکڑ کر رہ گیا تھا۔ اتنا زبردست نقصان یقیناً اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے بارہ سنگھے کو گالیاں دینا شروع کردیں۔

وہ پہاڑی ابھی بہت دور تھی۔ سفر کرتے کرتے اس کے اعضا شل ہونے لگے۔ وہ جیسے جیسے جیپ آگے بڑھاتا جارہا تھا۔ ویسے ویسے سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ اس بارہ سنگھے پر لعنت بھیج کر واپس ہوجائے، اس نے جہاں اپنی جیپ کھڑی کی تھی، وہاں پہنچے اور جیپ لے کر اپنے کاٹیج لوٹ جائے کسی کو بھی اس بات سے مطلب نہیں تھا کہ اس نے بارہ سنگھے کا شکار... کرلیا ہے یا نہیں۔ اس سے پوچھنے کے لیے کوئی بھی نہیں آتا۔ وہ خوامخواہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے ہوئے تھا پھر اسے خود ہی اپنے اس خیال پر شرم سی محسوس ہونے لگی۔ واپسی کا تو یہ مطلب ہوتا کہ اس نے ایک حقیر سے جانور سے ہار مان لی ہے اور یہ اس کی توہین تھی کیونکہ وہ ایک انسان ہی تھا اور شکاری بھی۔ لیکن جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا تو ٹھیک اسی وقت وہ بارہ سنگھا اسے دکھائی دے گیا۔

ولسن کو امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح اچانک نظر آجائے گا۔ اسے بہت دیر تک اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا وہ بارہ سنگھا گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ستّر فٹ سے بھی کم فاصلہ تھا۔ وہ دونوں اتنے فاصلے سے ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ بارہ سنگھے نے اسے دیکھ کر اپنی گردن اُٹھالی۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ ولسن نے اپنے شانے سے بندوق اُتار لی۔ اس وقت اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر اس پر ایک ہیجان کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ بارہ سنگھے نے بندوق دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن وہ اُٹھ نہ سکا۔ اس پر نقاہت طاری تھی۔ ولسن نے بندوق سے نشانہ بناتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ بارہ سنگھا بھی اب بالکل بے حس و حرکت تھا۔ اس کی نگاہیں ولسن پر لگی ہوئی تھیں اور اس کے انداز میں ایسا وقار تھا کہ ولسن کے ہاتھ کانپنے لگے۔ بالآخر دو

آنکھیں

آنکھیں کبھی کبھی گزرا ہوا زمانہ بھی دکھا دیتی ہیں۔ جو ہوچکا وہ پھر سے ہونے لگتا ہے جو گزر گیا وہ پھر سے گزرنے لگتا ہے۔ جس سانحے پر ہم رو چکے ہوں، اس پر پھر رونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آنکھوں کا کمال ہے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص منظر دکھا دیتی ہیں اور پھر پرانے نغمات یاد آجاتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے...... آنکھوں کی تمام کوششیں خاموش ہوجاتی ہیں۔ عہدِ جنوں ہی نہیں ہوتا، لوگ مطلب اور منفعت کی دنیا میں گم ہوجاتے ہیں۔ کون آتا ہے، درد کے صحرا میں۔ اور عہدِ جنوں بھی تو ایک یادگار ہی تو دے گیا...... ایک مینار، اس نے ہمیں شرمندہ تو نہیں کرنا۔ ہم شرمندہ ہی کیوں ہوں...... چلو ہم آنکھیں بند کرلیتے ہیں...... لیکن......

رہ گئی کان میں صدائے جرس
کارواں کا غبار آنکھوں میں

اقتباس: حرف حرف حقیقت از واصف علی واصف

مرسلہ: ملک ثاقب شاد تنولی، ایبٹ آباد

دشمن ایک دوسرے کے سامنے آ ہی گئے تھے۔ بارہ سنگھا گولی چلنے کا انتظار کرتا رہا لیکن نہ جانے کیوں ولسن کی ہمت جواب دینے لگی تھی؟ اس نے اپنی بندوق کی نال جھکالی اور نڈھال سا ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

ولسن بھی اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس حالت میں بارہ سنگھے پر کبھی گولی نہیں چلا سکے گا۔ دشمن پر وار کرنے کا مزہ تو اسی وقت ہے، جب دشمن بھی کچھ کر گزرنے کی طاقت رکھتا ہو جبکہ وہ بارہ سنگھا زخمی اور کمزور ہو گیا تھا۔ دوسری طرف بارہ سنگھے نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس کا دشمن شاید اس وقت تک اس پر گولی نہیں چلائے گا جب تک اس کے زخم نہیں بھر جاتے۔

ولسن کو اس بارہ سنگھے کی حرکتیں یاد آنے لگیں۔ وہ اس وقت ولسن کے کاٹیج پر حملہ کیا کرتا تھا، جب ولسن کہیں گیا ہوا ہوتا تھا۔ یہ گویا ایک قسم کا چیلنج تھا، جو وہ اپنے بے زبان حملوں سے دے رہا تھا، اس نے کبھی ولسن پر حملہ نہیں کیا تھا، اور اب ولسن کا بھی یہ فرض تھا کہ وہ کم از کم اس وقت اس پر حملہ نہ کرے۔

وہ کچھ دیر تک اس بدمعاش بارہ سنگھے کو دیکھنے کے بعد اپنے پڑاؤ پر واپس آ گیا۔ واپس آتے آتے ایک بار پھر ان وادیوں میں رات اُتر آئی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی کلہاڑی کے ذریعے درختوں سے لکڑیاں حاصل کیں اور آگ روشن کر لی۔ اس نے وہ رات بھی اس پڑاؤ میں گزاری تھی۔

دوسری صبح وہ بارہ سنگھا کی طرف جانے کے بجائے کسی اور ارادے سے آبادی کی طرف چل پڑا۔ آبادی کی طرف جاتے ہوئے جو سب سے پہلا مکان اسے دکھائی دیا وہ جیک کا تھا۔ جس سے ولسن کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ اس نے جیک سے پک اَپ مانگ مرہم پٹی کا سامان لے لیا۔ تین چار کمبل بھی مانگ لیے۔ اس کے بعد یہ تمام چیزیں اس نے پک اَپ میں ڈالیں۔ جیک کا شکریہ ادا کیا اور بارہ سنگھے کی طرف سفر شروع کر دیا۔

وہ بارہ سنگھا اس جگہ موجود تھا، ولسن کو دیکھ کر اس نے اپنی گردن اُٹھائی اور ایک طرف ڈال دی۔ ولسن نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان گاڑی سے اُتار لیا۔ سب سے پہلے اس نے آگ روشن کر دی۔ کچھ دیر تک جلتی ہوئی آگ کے پاس بیٹھا رہا پھر آہستہ آہستہ بارہ سنگھے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی رسّی کا پھندا بارہ سنگھے کی طرف اُچھال دیا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی دیر تک جدوجہد کرتا رہا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد وہ اس کی ٹانگوں اور سینگوں کو باندھنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ لیکن اس نے اسے باندھنے کے سلسلے میں بھی بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کے زخم کو کسی قسم کی تکلیف ہو پھر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے زخم کا معائنہ شروع کر دیا۔

ہنری کی چلائی ہوئی گولی بارہ سنگھے کی گردن کے نچلے حصے میں لگی تھی۔ اگر کچھ اور دیر لگتی تو بارہ سنگھے کی موت یقینی تھی۔ اس کے زخم سے خون بہہ بہہ کر اب کھرنڈ کی صورت میں جم چکا تھا اور زخم کے اردگرد سوجن آ گئی تھی۔

ولسن نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے زخم کو صاف کیا اور اس پر دوائی لگا کر مضبوطی کے ساتھ پٹی باندھ دی۔ اس عمل کے دوران بارہ سنگھے نے تکلیف اور غصے سے اُچھلنے کودنے کی کوشش کی تھی لیکن ولسن نے اسے بڑی مضبوطی سے باندھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ سوائے جنبش کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکا۔ اس عمل میں ولسن کو بڑی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے بڑی بات تھی کہ وہ اپنے دشمن کا علاج کر رہا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ بارہ سنگھے کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی جلائی ہوئی آگ بجھ چکی تھی اور ہوا میں شامل ٹھنڈک یہ بتا رہی تھی کہ کچھ دیر میں یا تو بارش ہونے والی ہے یا پھر برف باری... اس نے اردگرد سے پھر لکڑیاں جمع کیں اور آگ روشن کر دی اس بار اس نے یہ آگ بندھے ہوئے بارہ سنگھے کے قریب روشن کی تھی تاکہ اس کے بدن کو بھی حرارت ملتی رہے۔

دوسری صبح اس نے بارہ سنگھے کی پٹی تبدیل کر دی۔ وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ اس کے زخم کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس دوران برف باری بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے چار لکڑیاں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر زمین میں گاڑ کر اوپر ایک چھپر سا بنا دیا۔ چھپر کو بنانے کے لیے اس نے درختوں کی شاخوں سے کام لیا تھا۔ یہ پناہ گاہ پوری طرح برف اور سردی کو روک تو نہیں سکی تھی پھر بھی کسی نہ کسی حد تک بارہ سنگھے کے لیے بچاؤ کا سامان ہو ہی گیا تھا۔

ولسن کو احساس تھا کہ اس کا احسان لیتے ہوئے اس مغرور جانور کی انا کس طرح زخمی ہو رہی ہو گی۔ وہ کتنا بے چین ہو رہا ہو گا۔ اگر اس کے بدن میں طاقت ہوتی تو وہ شاید اپنے بھیانک زخم کے باوجود بھاگ لیتا، لیکن اس وقت وہ بالکل مجبور تھا۔ خون کے اخراج نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ بس وہ کبھی کبھی اپنی میلی آنکھیں کھول کر ولسن کی طرف دیکھتا پھر اپنی گردن جھکا لیتا۔ ولسن کی توجہ اور علاج سے اس کی حالت کچھ سنبھلنے لگی تھی۔ پہلے اس کی سانسوں میں بڑی بے قاعدگی تھی۔ وہ اُلٹی سیدھی تکلیف دہ سانسیں لے رہا تھا۔ کبھی کبھی تکلیف کی شدت سے وہ زور زور سے کھانسنے بھی لگتا تھا لیکن اب اس کی سانسوں میں رابطہ آ گیا تھا اور اس نے کھانسنا بھی کم کر دیا تھا۔ ولسن کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

ولسن نے قریبی چشمے سے ایک بالٹی پانی لیا اور بندھے ہوئے جانور کے پاس آ گیا۔ وہ کپڑا بھگو بھگو کر اس کے زخم کے آس پاس خون کو صاف کر رہا تھا۔ اس موقع پر بھی بارہ سنگھے نے کلبلانے اور نجات حاصل کرنے کی کوشش چاہی تھی لیکن مضبوطی سے بندھی ہوئی رسّیوں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کے بدن کو پونچھ کر ولسن نے پانی کی بالٹی اس کے منہ کے سامنے رکھ دی۔ بارہ سنگھا کچھ دیر تک اُلجھن آمیز نگاہوں سے ولسن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بالٹی میں اپنی گردن ڈال دی۔ وہ بڑے آرام سے پانی پی رہا تھا۔

اس رات اگرچہ برف باری نہیں ہوئی تھی لیکن ہوا سرد چل رہی تھی اور ولسن کو گرم کپڑوں اور جلتے ہوئے آتش دان کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تاکہ وہ اپنے بدن کو سکون پہنچا سکے لیکن وہ یہاں کھلے مقام پر اس بارہ سنگھے کے سامنے لیٹا ہوا تھا۔ اسے گرم کپڑوں کی ضرورت تھی لیکن اس کے پاس صرف دو ہی کمبل تھے اور یہ دونوں کمبل اس نے بارہ سنگھے کو اوڑھا دیے تھے اور خود صرف ایک کوٹ میں سکڑا ہوا کپکپا رہا تھا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے، وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی جو چیزیں لایا تھا، وہ بھی ختم ہونے لگی تھیں۔ ان کے ذائقے تبدیل ہو گئے تھے مگر ولسن کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے کاموں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ آگ کے لیے لکڑیاں چننا، آگ روشن کرنا، بارہ سنگھے کے زخم کی دیکھ بھال، اس کے لیے محفوظ پناہ گاہ کی تعمیر اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ ان مصروفیات نے موسم کی سختیوں کی طرف سے اس کا دھیان بٹائے رکھا تھا۔

اس صبح بارہ سنگھا کچھ زیادہ بے قرار تھا۔ اس کا زخم اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ ولسن نے کسی سرجن کی طرح اس کے زخم کا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ضروری دوائیں، روئی پٹیاں اور چاقو لے کر بارہ سنگھے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر بھی بارہ سنگھے نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنے زخم کی تکلیف میں اُلجھا ہوا تھا۔ ولسن نے زخم کے اردگرد کے حصے کو کاربولک کے محلول سے دھویا پھر اس کے زخم میں چاقو کے ذریعے ایک چیرا لگا دیا۔ بارہ سنگھے کا خون اس کے زخم سے نکل کر اس کے ہاتھوں اور کپڑوں کو سرخ کر گیا تھا۔ اس وقت بارہ سنگھا بھی اپنا سر زور زور سے پٹخنے لگا تھا۔ ولسن نے ایک ہاتھ سے اس کا ایک کان بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا۔ پھر اس نے زخم میں دوائیں بھرنا شروع کر دیں، زخم میں دوائی ڈالنے کے بعد اس نے روئی رکھ کر پٹی لپیٹ دی اور بارہ سنگھے کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف لیٹ گیا۔ اس وقت بھی بارہ سنگھا تکلیف میں مبتلا تھا۔ اس کا زخم دواؤں سے جل رہا تھا۔

ولسن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک بارہ سنگھے کے لیے اپنی جان کو کیوں ہلکان کر رہا ہے؟ وہ اس بارہ سنگھے کو چھوڑ کر چلا کیوں نہیں جاتا؟ اس کی بَلا سے یہ زندہ رہے یا مر جائے، پھر دوسرے ہی لمحے دوسرا خیال اس کے ذہن میں آتا۔ بارہ سنگھا اس کا بہادر دشمن تھا اور وہ ایک شکاری ہونے کے ناتے اپنے بہادر دشمن کے ساتھ ایسی بزدلی کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

پانچ دن اور گزر گئے۔ ان پانچ دنوں میں ولسن ایک لمحے کے لیے بھی خالی نہیں رہا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہا تھا۔ اسے اب غذا بھی بہت احتیاط سے استعمال کرنا پڑ رہی تھی اور اس کی نیند بھی پوری نہیں ہو پا رہی تھی، جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں ہر وقت جلتی رہتی تھیں لیکن اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ بارہ سنگھا اب روبہ صحت تھا۔ اس کا زخم بھرنے لگا تھا۔ اس کی نقاہت بھی رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ پانچویں دن دوپہر کے وقت اس نے دور سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ کھلے علاقوں میں آوازیں بڑی آسانی سے ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیتی ہیں۔ وہ جلدی سے ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ وہ تین آدمی تھے۔ جو اس ٹیلے کی طرف چلے آ رہے تھے۔ ولسن نے ان کو پہچان لیا۔ ان میں ایک ہنری تھا۔ ان لوگوں نے بھی ولسن کو دیکھ لیا تھا۔

وہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آگئے۔

''ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم مر چکے ہو۔'' ہنری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا چکر ہے؟ تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

ولسن نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سب الاؤ کے گرد آکر بیٹھ گئے۔ اسی دوران ان کی نگاہیں بارہ سنگھے پر پڑیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی ولسن سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ولسن نے ان کے لیے کافی بنانا شروع کردی تھی۔ کافی تیار کرکے اس نے ان تینوں کی طرف کافی کی پیالیاں بڑھادیں۔ وہ تینوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔ وہ کبھی کبھی اس بارہ سنگھے کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے لیکن ابھی تک وہ لوگ اس کی طرف سے بے پرواہی نظر آرہے تھے۔ بالآخر کافی ختم کرلینے کے بعد ہنری کھڑا ہوگیا۔ وہ اس بارہ سنگھے کی طرف جانا چاہتا تھا۔

''اس طرف مت جانا ہنری!'' ولسن نے اسے منع کردیا۔ ''وہ ابھی زخمی ہے، تمہیں دیکھ کر بھڑک جائے گا۔''

''تو کیا ہوا؟'' ہنری نے کہا۔ ''میں نے ہی اسے زخمی کیا تھا اور مجھے دیکھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ تم اس کے لیے اتنے پریشان کیوں ہورہے ہو؟''

''میں نے کہہ دیا نا کہ تم اس کی طرف مت جانا۔'' ولسن جز بز ہوکر بولا۔ اس نے اپنی نگاہیں ہنری کے چہرے پر جمادی تھیں۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

''واہ، کیا رویہ ہے تمہارا۔'' ہنری نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم ہمارا شکریہ ادا کروگے۔ ہم تو یہ سمجھ کر تمہیں دیکھنے آئے تھے کہ تم کسی پریشانی میں تو مبتلا نہیں ہوگئے ہو اور یہاں تمہارا حال یہ ہے کہ ایک جانور کو ہم پر ترجیح دے رہے ہو۔ تم نے تو کمال ہی کردیا۔''

''میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے رہا۔ بس ایک اصول کی بات کررہا ہوں۔'' ولسن نے کہا پھر وہ الاؤ کے پاس سے اُٹھ کر بارہ سنگھے کے پاس آگیا اور اس نے بارہ سنگھے کے گرد بندھی ہوئی رسیاں کھولنا شروع کردیں۔ وہ بڑے آرام کے ساتھ یہ کام انجام دے رہا تھا، چند لمحوں کے بعد بارہ سنگھے کے گرد بندھی ہوئی رسیاں کھل گئیں، اور وہ دوبارہ آزاد ہوگیا۔ آزاد ہونے کے بعد اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگیں مڑ گئیں۔ ولسن بڑی تشویش بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بارہ سنگھے کو سہارا دیا اور وہ دوبارہ کوشش کرکے کھڑا ہوگیا پھر دو قدم آگے چلا۔ رکا پھر کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے مڑ کر ولسن کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ جیسے اس کا شکریہ ادا کررہا ہو۔

''چلو اب بھاگ جاؤ۔'' ولسن نے تالی بجائی۔ بارہ سنگھا اُچھلتا کودتا ہوا اپنی پُرانی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کی توانائی واپسی آگئی تھی۔

ولسن ان لوگوں کی طرف مڑا۔ ہنری نے اپنی بندوق اوپر کرلی تھی اور دوڑتے ہوئے بارہ سنگھے کو نشانہ بنانے والا تھا۔

''یہ کیا کررہے ہو ہنری؟'' ولسن جھپٹ کر اس کے پاس گیا۔

''میں اسے گولی مار رہا ہوں۔'' ہنری نے جواب دیا۔

ولسن نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ ہنری نے دوڑ کر بندوق اُٹھانا چاہی، لیکن ولسن نے اسے ایک طرف دھکا دے دیا۔ ہنری ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اس کے گرتے ہی ولسن نے اس کی بندوق اُٹھالی اور اسے ایک قریبی، بڑے سے پتھر پر جنونیوں کی طرح مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد بندوق کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ اس کا دستہ ٹوٹ چکا تھا۔ پھر اس نے ٹوٹی ہوئی بندوق کو اُچھال کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بے پناہ سکون تھا جیسے اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہو۔

''اب تم اسے گولی نہیں مار سکو گے ہنری۔'' وہ ہنری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ جو اس دوران میں کھڑا ہوکر اپنا لباس جھاڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ولسن کے لیے غصے کی آگ دھک رہی تھی۔

''ہم انسان ہیں ہنری۔'' اس نے ہنری کی طرف دیکھا۔ ''انسان اور جانور میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ وہ جب جانور ہوکر دشمنی کے سلسلے میں اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرسکتا ہے تو کیا ہم انسان ہوکر ایسا نہیں کرسکتے؟ وہ تو خیر کچھ نہیں سوچ سکتا، لیکن خدا نے ہمیں تو عقل دی ہے نا۔''

اس نے آگے بڑھ کر ہنری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ناراض مت ہو، آؤ میں تمہارے لیے ایک پیالی اور بنا دیتا ہوں۔ تھوڑی سی کافی بچی ہوئی ہے۔ آؤ... آخر ہم دوست ہیں نا...''

علی سُفیان آفاقی کی یادداشتیں

فلمی الف لیلہ

قسط: 207

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِ اوّل کی طرح تازہ دَم بھی۔ اُن کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُسی کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں اُنھیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اُس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شُنید اور میل مُلاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آیئے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دُنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

پانی بھی قدرت نے عجیب و غریب چیز بنائی ہے۔ اگر پانی نہ رہے تو قحط پیدا ہوجاتا ہے۔ زمین بنجر ہوجاتی ہے۔

دوسری طرف یہی پانی جب موسلادھار بارش، سیلابوں، سمندری نہروں اور طوفانوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے تو انسان اس کے سامنے بھی بے بس ہوکر رہ جاتا ہے۔ ان مصائب سے نجات حاصل کرنا انسانوں کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

پانی کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ پانی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ بھوک کا مقابلہ کرسکتا ہے لیکن پیاس پر قابو پانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اس طرح ہم نے پانی کے تین مختلف روپ دیکھے جن میں سے ہر ایک کی ضرورت، افادیت اور رنگ وروپ علیحدہ ہے۔

دنیا میں زلزلوں اور دوسری تباہیوں کی طرح قحط بھی ایک انسان کو بے بس اور بے قابو کرنے والی ہیبت ناک آفت ہے جس سے نجات دلانے کا فرض بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ادا کرسکتا ہے۔ اس طرح وہ مختلف اوقات میں ہم انسانوں کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ واقعی کائنات کی سب سے بااختیار اور طاقتور ہستی اللہ کی ذات کے سوا کوئی اور نہیں۔

یہ تو ایک تمہید سمجھ لیجیے۔ اس کا احساس پچھلے چند مہینوں میں ہوا تھا جب ملک میں قحط جیسے حالات پیدا ہوگئے تھے۔ بارش کا قطرہ تک نصیب نہ تھا یہاں تک کہ انسان اپنے ہونٹ تر کرنے کو بھی ترستا تھا۔ قحط کو سوکھا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ عموماً دیہاتی یا کم تعلیم یافتہ انسان استعمال کرتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ اللہ کیسا سوکھا پڑا ہے اس سال۔

گزشتہ سال پاکستان کے بعض حصوں میں بھی قحط پڑگیا تھا۔ انسان ایسی صورت میں اللہ سے پانی برسانے کی دعا کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ سب اس کے اختیار میں ہے کہ کب اور کتنی بارش برسائے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر بے وقت زیادہ بارش ہوجائے تو وہ بھی فصلوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ غرضیکہ پانی اللہ کی ایک رحمت بھی ہے، زحمت بھی۔

جب پاکستان میں قحط کے آثار پیدا ہوئے تو لوگوں نے دعائیں شروع کردیں۔ صاحب علم اور صاحب کمال بزرگوں کو ڈھونڈ کر ان سے بارش کے لیے دعائیں کراتے تھے مگر لاحاصل۔ ایک زمانے میں حکمران وقت ساری قوم سے التجا کرتے تھے کہ یا اللہ! بارش برساتا کہ ہم اس جان لیوا مصیبت سے نجات حاصل کرسکیں۔ لیکن ہمارے سیکولر حکمران شاید اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں یا پھر انہیں ان دعاؤں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے مصائب سے وہ عموماً بے خبر اور بے بہرہ رہتے ہیں۔ کچھ آئمہ کرام نے اپنے طور پر نماز استسقا پڑھوائی لیکن مطلب حاصل نہ ہوا۔

اس ضمن میں ہمیں دو بزرگوں کی کہانیاں یاد آگئیں۔ اشفاق احمد صاحب نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار دہلی میں شدید قحط پڑگیا اور نمازیں اور دعائیں بھی بے اثر ہوئیں۔ لوگوں نے کہا کہ ایک بزرگ ہستی ایسی ہے جن کی درخواست اللہ تعالیٰ کبھی رد نہیں کریں گے۔

لوگ ان کی تلاش میں نکلے اور جب ان کا پتا چلا ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک بزرگ پائے کے خواجہ سرا ہیں۔ خیر لوگوں کو تو اپنا مقصد حل کرانا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر ان کے پاس پہنچے اور درخواست کی کہ حضرت، دلی میں شدید قحط پڑگیا ہے۔ اب یہ شہر ایک بار پھر ویران ہونے کو ہے۔

بزرگ نے تمام داستان سن کر ملازم سے وضو کا پانی منگایا اور اللہ کے حضور دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی۔ انہوں نے ضرورت مندوں سے کہا کہ آپ لوگ جائیں شام تک بارش ضرور ہوگی۔ لوگ دعائیں کرنے اور نماز پڑھنے چلے گئے لیکن بارش نہ ہوئی۔ دوسری بار پھر پلٹ کر بزرگ خواجہ سرا کے پاس پہنچے اور بتایا کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوئی ہیں۔

بزرگ نے اپنی چادر میں سے ایک دھاگا کھینچا اور کہا کہ تم پھر جا کر دعا کرو اور رب کے حضور التجا کرو کہ اے اللہ خواجہ سرا جس نے کبھی خلافِ عقیدہ کوئی کام نہیں کیا اور ہمیشہ انسانوں کا خدمت گار رہا ہے اس کی درخواست ہے کہ اپنی عظمت کے طفیل اور اس کی عزت وآبرو برقرار رکھنے کے لیے ہم سب کی دعا قبول کرے اور خلق خدا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

سب لوگ امیدیں لے کر واپس آئے اور نماز پڑھنے کے بعد وہی الفاظ دُہرائے جو بزرگ خواجہ سرا نے فرمائے تھے۔ کچھ ہی دیر میں کالی گھٹائیں اُمڈ کر آگئیں اور موسلا دھار بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہوگیا۔ بارش اتنی شدید تھی کہ لوگ گھروں تک پہنچتے تک پانی میں شرابور ہوگئے۔

اسی قسم کی ایک حکایت سید غوث علی شاہ کے حوالے سے بیان کی گئی۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک بار دہلی میں ایسا قحط پڑا کہ مخلوق خدا کی زندگیوں کے لالے پڑگئے۔ جب زندگی دشوار ہوتی اور موت آسان ہوتی نظر آئی تو شہر میں نماز استسقا کی نمازیں شروع ہوگئیں لیکن سورج کی تپش اور گرمی کی شدت میں کمی نہ آئی۔ موت عام ہوگئی، زندگی سے لوگ مایوس ہونے لگے۔ ادھر دہلی والے کسی عالم بے بدل کی تلاش میں نکلے۔ مشکل یہ ہے کہ جعلی اور پیشہ ور عالموں کی تو کسی زمانے میں کمی نہیں رہی لیکن صحیح بزرگ اور اللہ کا منظورِ نظر تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

ضرورت مند اندھا ہوتا ہے۔ سارے شہر نے ایسے عالم کی تلاش شروع کردی۔ آخر بہت تلاش کے بعد ایک بزرگ کے بارے میں معلوم ہوا۔ لوگ ایک وفد کی صورت میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ دیکھا کہ ایک جھونپڑی نما کٹیا ہے جس میں سامان برائے نام ہے۔ چند پُرانے لباس دیواروں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ بان کی چارپائی پر بیٹھے قرآن کی تلاوت کررہے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔

ضرورت مندوں کے وفد نے کنڈی کھٹکھٹائی تو وہ بزرگ چونکے۔ انہوں نے صرف ایک بنیان اور ایک لنگوٹی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور لباس نہ تھا۔

وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ آپ لوگوں نے مجھے تلاش کرنے میں اتنی محنت اور کاوش کی، اب فرمایئے کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟

لوگوں نے رو رو کر انہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہونے کی حیثیت سے ان کی کچھ مدد کریں۔

بزرگ کچھ دیر سوچتے رہے پھر جھونپڑی کے اندر گئے اور وہاں سے لنگوٹی تبدیل کرکے باہر آئے۔ انہوں نے وہ میلی کچیلی لنگوٹی ان صاحبان کے سامنے ڈال دی اور کہا "یہ لنگوٹی اُٹھا کر تیز تپتی ہوئی دُھوپ میں ڈال دو۔"

لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک بادل گڑگڑانے لگے اور کالی گھٹاؤں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ یکایک دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ جل تھل ایک ہوگیا۔ دہلی کی گلیاں نہروں میں تبدیل ہوگئیں۔ ایک گھنٹے تک مینہ برستا رہا اور قحط کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

بزرگ نے اُٹھ کر اپنی پھٹی پُرانی لنگوٹی اُٹھا کر نچوڑی اور پھر اس کو تبدیل کرنے کے لیے جھونپڑی کے اندر چلے گئے۔ دیکھنے والے اس انوکھی کرامت سے حیران تھے۔ بزرگ نے جیسے ہی اپنی پُرانی لنگوٹی تبدیل کی حالات پُرسکون ہوگئے، بارش قطعاً رک گئی۔

لوگوں کی حیرت دیکھ کر انہوں نے کہا "بھئی، آج کل ہمارا ان سے بگاڑ ہے، ناراض ہیں ہم سے، ہماری لنگوٹی بھلا خشک کیسے رہنے دیں گے۔"

تو دیکھا آپ نے کہ اللہ کے نیک اور قریب ترین بندے ایسے بھی ہوتے ہیں مگر ہم دنیا دار لوگ انہیں پہچان بھی نہیں سکتے۔

☆☆☆

قحط اور خشک سالی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم درختوں کی دیکھ بھال نہیں کرتے، سرکاری ادارے اور دوسرے ضرورت مند سنگدلی سے درخت کاٹ دیتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اور خوبصورت کارآمد درخت لگانے پر اتنی توجہ نہیں دیتے۔

درختوں سے بہ ظاہر ہر طرف سبزہ ہوجاتا ہے جو آنکھوں کو بے حد خوش نما اور ذہن کو تازہ کردیتا ہے۔ درخت پانی برسانے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ جن ملکوں اور علاقوں میں درختوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، وہ خوشنما اور فائدہ مند ہوتے ہیں۔ درخت انسان کو مفت میں آکسیجن جیسی گیس دن رات فراہم کرتے ہیں۔ جو لوگ آکسیجن کی کمی پیدا ہوجانے کی وجہ سے اسپتالوں میں بھاری بل استعمال کرتے ہیں ان سے پوچھیے کہ آکسیجن کس قدر ضروری اور زندگی کے لیے اہم چیز ہے۔ جس جگہ درخت زیادہ ہوتے ہیں ہاں پولوشن (کثافت) بھی کم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں میں آپ کو ہر طرف سبزہ نظر آتا ہے۔ مٹی، گندگی یا کوڑا کرکٹ نظر نہیں آتا۔ یہی

وجہ ہے کہ ان لوگوں کی صحت بھی بہتر ہوتی ہے اور زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ درخت اور سبزہ انسانی صحت اور زندگی کے لیے ضروری ہے۔

اشفاق احمد نے لکھا ہے کہ ایک بار ان کے ننھے پوتے نے ان سے پوچھا کہ دادا ابا، اللہ تعالیٰ نے اتنے بہت سے درخت کیوں اُگا دیے ہیں، ان کا فائدہ کیا ہے؟

انہوں نے کہا کہ دیکھو بچو، درخت سے زیادہ بے غرض چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔ بس قدرت نے جہاں درخت لگا دیا وہ ساری زندگی اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ نہ وہ کبھی کہیں جاتا ہے، نہ کراچی، نہ راولپنڈی، اس کی ڈیوٹی جہاں لگا دی جاتی ہے وہ مرتے دم تک وہیں کھڑا رہتا ہے۔ کسی اور جگہ جانے کی ضد نہیں کرتا۔

درختوں کی بے غرضی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں طرح طرح کے پھل دیتا ہے۔ آم، کیلے، کینو غرضیکہ بے حساب قسم کے درخت ہوتے ہیں جو ہمیں سال کے مختلف حصوں میں مزے دار صحت مند پھل دیتے رہتے ہیں لیکن وہ خود نہیں کھاتے ہیں۔ نہ ضد کرتے ہیں کہ ہم اتنے آم پیدا کرتے ہیں مگر ہم نے کبھی لذیذ آم نہیں چکھا۔ کسی بھی پھل دار درخت نے کبھی اپنا پیدا کیا ہوا پھل نہیں کھایا۔ وہ صرف ہم انسانوں کے لیے ہر چیز پیدا کرتا ہے اور خوش رہتا ہے کہ میں نے انسانوں کی خدمت کی۔

درختوں اور پھلوں سے دوائیاں بھی بنتی ہیں جو کئی خطرناک امراض میں فائدہ مند ہیں۔ دیکھا جائے تو درخت انسان کو صرف فائدہ ہی پہنچاتا ہے مگر انسان خوش نمائی کے سوا اس کو کسی اور چیز کے لیے اہم نہیں سمجھتے۔

ایک بچے نے اپنے ابا سے پوچھا کہ ابو، درخت تو ہر خزاں کے موسم میں سوکھ کر لکڑی بن جاتے ہیں، ان کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور یہ بالکل ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں لیکن یہ کیا بات ہے کہ انسان جب ایک بار بوڑھا ہوتا ہے تو پھر دوبارہ جوان نہیں ہوتا حالانکہ درختوں پر بدلتے موسم میں پھر سے پتے آ جاتے ہیں؟

ابو نے کہا ”بیٹا، اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی زندگی اور موت اور خصوصیات کا نظام بنا دیا ہے۔ اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتے، اسی طرح انسان کے مقدر میں بھی یہ ہے کہ ایک بار بوڑھا ہونے کے بعد وہ جوان نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا کمپیوٹر دنیا بھر کے کمپیوٹرز سے زیادہ اور وقت مقررہ پر کام کرنے والا ہے۔ اس نے جو فیصلے، جو موسم، جو مخلوق کے کام مقرر کر دیے ہیں وہ بلا تاخیر ان... رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی زندگی کا عرصہ بھی مقرر... ہے۔ ایک عام انسان کی زندگی 60 سے 70 تک ہو... لیکن بعض اوقات وہ ایک سو سے زائد سال بھی زند... ہے لیکن اس کی زندگی کے اطوار و عادات تبدیل ہو... اللہ کا نظام یہ ہے کہ کوئی بھی مخلوق جتنے عرصے ماں کے... انڈوں میں رہتی ہے اس کی عمر بھی اتنی ہی ہوتی... انسان صحت کے اصولوں پر عمل کرے اور صرف وہ... کھائے جو قدرت نے اس کے لیے مقرر کی ہے تو... اور صحت مند زندگی حاصل کر سکتا ہے ورنہ کم عمری میں... وفات پا جاتا ہے۔ انسان کا بچہ 9 ماہ تک ماں کے پیٹ... رہتا ہے۔ اس حساب سے اس کی اوسط عمر 125 سال... چاہیے مگر وہ الابلا کھا کر اور غیر قدرتی زندگی گزار کر... مختصر کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے لیے قدرت... سبزی، ترکاری اور پھل کھانے کے لیے پیدا کیے... انسان گوشت، مچھلی، مرغی اور ہر قسم کی چیزیں کھا لیتا ہے... پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ قدرتی طریقۂ علاج کرنے والو... کہنا ہے کہ جانوروں کے لیے قدرت نے جو غذا بنائی... اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر شیر کی خور... گوشت ہے۔ اگر شیر کو دس دن بھی بھوکا رکھا جائے تو... یا گھاس نہیں کھائے گا اور گھوڑے کی غذا گھاس پھوس... اگر گھوڑے کو دس دن بھی بھوکا رکھا جائے تو وہ گوشت... کھائے گا۔ اسی طرح ہر چرند، پرند اور مخلوق کے لیے اللہ... غذا کا تعین کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ قدرتی زندگی... کر سکتے ہیں۔ مگر حضرت انسان دنیا کی ہر چیز پکا کر... ڈال کر اور چٹ پٹی بنا کر کھاتے ہیں۔ بعض قومیں... کھا جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مینڈک، سانپ اور... انسان کی غذا بن جاتے ہیں۔ زندہ بھی اور پکا کر بھی... یہ انسانی غذا نہیں ہے جدید سائنس کے مطابق انسان کو... وہی چیز ایسی صورت میں کھائے جو اس کے لیے مخصوص... وہ بہت سی بیماریوں سے بچ جائے گا اور قدرتی عمر پا... یہ بھی قدرت کی کارفرمائیاں ہیں، اس کے... ہوئے نظام کو توڑنا مشکل ہے۔ لیکن حضرت انسان... مخلوق ہیں کہ وہ ان اصولوں کی پیروی نہیں کرتے... طرح شیطان نے آدم کو بہکایا تھا آج بھی اسی... مصروف ہیں۔ انہوں نے انسان کے دل میں یہ خیال...

کہ بھائی حرام حلال کی تمیز کچھ نہیں ہوتی۔ جب بھوک سے جان نکل رہی ہو تو حرام کھانا بھی جائز ہے۔ یہ اصول ہمارے مفسرین، مجتہدین اور بزرگوں نے بنائے ہیں لیکن بہت سے انسان ان پر عمل نہیں کرتے۔ وہ بھوکے مر جائیں گے لیکن حرام چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ان باتوں کا انحصار انسان کی ذات اور فطرت پر ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی ہر مخلوق کے کھانے کی اشیا مقرر کر دی ہیں تو حضرت انسان اس سے کیوں کر مبرا ہو سکتے ہیں۔ درندے، پرندے، پانی میں رہنے والی مخلوق، سب اپنی خوراک کی پابند ہے۔ اسی لیے وہ فطری موت مرتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان الابلا کھا کھا کر بھاری بھرکم ہو کر مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر بے وقت مر جاتا ہے۔ بے وقت سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی طبعی عمر اسی سال ہے تو وہ اس سے پہلے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس میں قدرت کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا یہ خود اپنے کیے کا نتیجہ ہے۔ آپ بہت سی بیماریوں سے بچ سکتے ہیں اگر قانونِ قدرت پر عمل کریں۔

☆☆☆

پاکستان کی فلمی صنعت کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں نے جنہیں آپ انگریزی خواں کہتے ہیں نہ تو خود کبھی پاکستانی اردو فلم دیکھی اور نہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری حکومت نے فلمی صنعت جیسی کوثر اور انتہائی کارآمد حربے کو کبھی استعمال ہی نہیں کیا جبکہ بھارت میں شروع دن سے فلمی صنعت کی ترقی پر زور دیا گیا۔ تربیتی ادارے قائم کیے گئے اور ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ اچھے اور تعلیم یافتہ خاندانوں کے بچے بھی اس طرف راغب ہوئے۔ فرق کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہمارے نامور ترین فن کاروں نے بھی اپنے بچوں کو فلموں سے دور رکھا جبکہ بھارت میں بڑے فلمی فن کاروں کی تیسری چوتھی نسل بھی اس صنعت سے وابستہ ہے۔ سرمائے کی کمی نہ تھی۔ ہر بڑا سرمایہ دار فلموں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کو تیار تھا۔ فلمیں بے حد کامیاب ہو رہی تھیں۔ بھارت نے سنیما گھروں کے علاوہ اپنے سفارت خانوں میں بھی خصوصی لوگوں کو مخصوص شو میں فلمیں دکھائیں اور ان کے دل موہ لیے۔

پاکستان اس وقت پیر چلتا بچہ تھا، یہاں دلیپ کمار، دیو آنند، راج کپور، مینا کماری جیسے فن کار نہیں تھے۔ اس کے

مشرقی پاکستان کی شبانہ اور ندیم کی کامیاب فلم داغ

برعکس پاکستانی ہمیشہ سے معروف بھارتی فن کاروں کو دیکھتے اور پسند کرتے تھے۔ بھارتی حکومت نے بھارتی فلموں کو فروغ دینے کے لیے بیرونِ ملک میں ان فلموں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ بڑے بھارتی فن کاروں کے ساتھ سفارت خانے کے لوگ موجود ہوتے تھے جو اخبارات میں پریس کانفرنس کے ذریعے انہیں مقبول بناتے تھے۔ پھر جب چند خود غرض مفاد پرست پاکستانی تقسیم کاروں نے چند کامیاب بھارتی پاکستانی فلموں کی مقبولیت دیکھ کر ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت بھارتی فلم سازوں نے بھارتی فلموں کے چربے بنائے تو پاکستان اور غیر ممالک میں بھارتیوں کو بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ آپ اناڑی پاکستانی فن کاروں کی جگہ بھارتی فلمیں کیوں نہیں دیکھتے، یہاں تک کہ غیر ملکیوں کو بھی ہندی اردو میں ڈب کر کے بھارتی فلمیں دکھائی گئیں۔ ان کا گلیمر، رقص و نغمات غیر ملکیوں کو بھا گئے۔ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ پاکستان میں بھی فلمیں بنتی ہیں کیونکہ وہ سنیما گھروں کے علاوہ ویڈیوز پر بھی بھارتی فلمیں دیکھنے اور پسند کرتے ہوئے پاتے تھے۔

اس کے برعکس ہمارے بڑے بڑے اعلیٰ عہدے دار مجالس میں حقارت سے پوچھا کرتے کہ آخر آپ لوگ بھارت جیسی اچھی فلمیں کیوں نہیں بناتے؟ انہیں پاکستانی

فلموں کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا۔
ایک ایسی ہی محفل صدر کے پرنسپل سیکریٹری نے کھانے کے دوران میں ڈبلیو زیڈ احمد سے سوال کیا کہ آخر ہماری فلمیں اتنی گھٹیا کیوں ہوتی ہیں، کیا ہمارے ملک میں اچھے فنکار اور تخلیق کار نہیں ہوتے؟
احمد صاحب نے سگار سلگایا اور پوچھا ''پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے آج تک کتنی پاکستانی فلمیں دیکھی ہیں؟''
جواب ملا ''ایک بھی نہیں۔ میں ایسے افسر ٹائپ لوگ ''دوسرے درجے'' کی فلمیں دیکھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔''
مرحوم ڈبلیو زیڈ احمد ایک منہ پھٹ اور صاف گو آدمی تھے۔ مسکرا کر بولے ''عزیز احمد صاحب، ہم کون سی اچھی چیزیں بناتے ہیں۔ ہماری سڑکیں دو ماہ بعد ہی ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہماری تعلیم ناکارہ ہے، ہماری بلڈنگیں اور پُل چھ مہینے میں زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دفتروں میں جس طرح سے کام ہوتا ہے وہ تو آپ ضرور جانتے ہیں۔ اتنی خرابیوں کی جگہ اگر ہم ہندوستان سے سائنس داں، انجینئر اور اچھی تعمیر والے لوگ بلالیں تو کیا حرج ہے۔ ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی اور پھر آپ اپنی بیوروکریسی کو دیکھیے، کس قدر سست، نااہل اور رشوت خور ہے، ان کی جگہ ہم انڈیا سے اچھے لوگ کیوں نہ منگائیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال کا ہر جگہ چرچا ہے، ساری دنیا ان کو جانتی اور مانتی ہے، ہم اگر ہندوستان سے جواہر لال جیسا وزیراعظم بلالیں تو ہر طرف واہ واہ ہو جائے گی۔ دراصل ہمارے ہاں کوئی بھی چیز کام کی نہیں ہے۔ انڈیا سے مقابلہ کرنے کا یہ واحد طریقہ ہے۔''
عزیز احمد صاحب کے علاوہ محفل میں سارے بڑے بڑے عہدے دار چپ ہو گئے۔ احمد صاحب کے سوالوں کا جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔
ایک بار فلم سازوں کے وفد کے ساتھ ہم اسلام آباد گئے، ان دنوں جنرل یحییٰ نئے نئے آئے تھے اور ہر ایک کو ''ٹھیک'' کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ پاکستانی فلمی وفد کو ملاقات کی درخواست کے جواب میں دو سطریں خط بھی نہیں موصول ہوتا تھا۔ لیکن اب یحییٰ خان کا دور تھا اور سارے سرکاری افسر سہمے ہوئے تھے۔
مجید مفتی صاحب ایک اعلیٰ پائے کے قابل افسر تھے۔ انہیں فلم اور ثقافت کا محکمہ سونپ دیا گیا تھا۔
جب وفد سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت اخ[illegible] ملے۔ کافی پلائی پھر حال دریافت کیا۔ انہیں چند[illegible] بتائے تھے کہ وہ بولے ''معاف کیجیے گا، مجھے اس [illegible] چارج سنبھالے ابھی صرف چار ماہ ہوئے ہیں۔ [illegible] مسائل سے بے خبر ہوں۔ البتہ اگلی ملاقات میں کام کی [illegible] ہوں گی۔''
اس سے آپ فلمی صنعت کی اہمیت کا اندازہ [illegible] ہیں جہاں ہر چند ماہ بعد وزیر اور سیکریٹری بدل جا[illegible] اس کو فلموں کے بارے میں کسی چیز کا علم نہ ہوتا تھا۔ [illegible] افسران کا رویّہ بیان کر دیا ہے جن لوگوں نے اس کے گرتے پڑتے فلمیں بنالیں ہمارے افسر اور وزیر ان [illegible] تک نہیں جانتے تھے۔
ہدایت کار نذرالاسلام بھی ایسے ہی ہنرمند تخلیق [illegible] میں شامل تھے۔ وہ کلکتہ میں پلے بڑھے۔ پاکستان [illegible] کے بعد ڈھاکا آ گئے۔ وہ بنیادی طور پر فلم ایڈیٹر تھے [illegible] کے خیال کی رسائی اور فلمانے کا انداز سب سے ا[illegible] قابلِ دید تھا۔
ڈھاکا میں چند بنگلہ فلمیں بنانے کے بعد و[illegible] آ گئے۔ اور ایسے آئے کہ لاہور کی خاک میں دفن ہو[illegible]
نذرالاسلام لاہور کے لیے ایک نئے ہدایت کار [illegible] انہیں یہاں کوئی نہیں جانتا تھا مگر جب انہوں نے ہدا[illegible] کاری شروع کی تو سب کو حیران کر دیا۔
وہ دبلے پتلے، کم گو، زیادہ سوچنے اور کم بولنے وا[illegible] انسان تھے۔ ملاقات تو سب سے تھی مگر بے تکلفی [illegible] شوروغل سے گھبراتے تھے، ایک بار انہوں نے خود [illegible] چھوٹے بچوں کے بارے میں بتایا کہ اس قدر شور کرتے [illegible] کہ میں پردوں کے پیچھے چھپ کر سوچتا ہوں۔
نذرالاسلام صرف نام کے دادا ہی نہیں تھے، و[illegible] ہنر اور بلند خیالی کے اعتبار سے بھی دادا کہلانے کے [illegible] تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک عام فلم کو اپنے اسکرپ[illegible] اور سیناریو کی تبدیلی سے ایک خصوصی فلم بنا دیتے تھے۔ [illegible] سوچنے کا انداز، ان کے طریقۂ کار کے مطابق تھا۔ آپ کی مشہور فلمیں احساس، زندگی، بندش اور آئینہ دیکھ[illegible] موضوع اور کردار وہی ہیں لیکن اپنے انداز کی وجہ [illegible] انہوں نے ایک مختلف فلم بنا دیا ہے۔
انہیں شوکت حسین رضوی کی طرح سین اور سیٹ [illegible] سجانے کا شوق تھا۔ وہ اپنے مناظر کو خوبصورتی سے سجا[illegible]

[illegible] تھے۔ فلم کی معمولی سی معمولی تفصیل پر بھی نظر ہوتی تھی جس کی [illegible]جہ سے سین میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔
اداکاروں سے کام لینا ان کا ہی مخصوص انداز تھا۔ ندیم اور شبنم ان کی فلموں کے پسندیدہ اداکار تھے۔ لیکن وہ انہیں حقیقی اور روزمرہ کے انداز میں پیش کرتے تھے کہ یہی اداکار مختلف نظر آتے تھے۔ گانوں کی فلمبندی اور اداکاروں سے [illegible]نی پسندیدہ حرکات کرانا نذرالاسلام کی نمایاں خوبی تھی۔
انہوں نے بہت کم فلمیں بنائی ہیں اس لیے کہ وہ سوچ سمجھ کر اور کہانی کو مکمل اور اپنے خیالات کے مطابق بنائے بغیر فلم شروع نہیں کرتے تھے، وہ بعض اوقات اسکرپٹ لکھوانے کے بعد بھی اس فلم کو بنانے کا ارادہ ترک کر دیتے تھے۔ بشیر نیازان کے پسندیدہ مصنف تھے اور ان دونوں کی سوچ میں ہم آہنگی بھی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کی مشترکہ فلمیں تصویروں کی مانند ہوتی تھیں۔
ان کی مشکل پسند طبیعت کے باوجود ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا شوق تھا۔ وہ خود بھی جب ملتے تو کہتے دادا، ایک اسکرپٹ مجھے بھی لکھ دو۔ ہمارا اور ہماری فیملی کا ان کے گھر میں آنا جانا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ سخت تکلیف میں تھے، انہوں نے سب سے پہلا سوال یہ کیا، نادیہ اور پارو کو کیوں نہیں لائے؟
اگلے دن ہم دونوں بچیوں کو..... ساتھ لے کر ان کے گھر گئے مگر وہیں ان کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔
اب ان کے ساتھ ہمارے فلم بنانے کا واقعہ سنیے۔ چوہدری ثنا اللہ کے صاحب زادے شائق چوہدری ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ آخر کار ابا نے انہیں فری ہینڈ دے دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے تو ہدایت کار نذرالاسلام کا انتخاب کیا اور پھر اسکرپٹ کے لیے ہم دونوں کی ملاقات کرائی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دادا نے بیٹھے بیٹھے درجنوں آئیڈیاز سنا دیے۔ ہم نے بھی انہیں اپنی اور دیگر دوستوں کی کہانیاں سنائیں مگر کسی پر سمجھوتا نہ ہو سکا۔
دادا نے اگلی میٹنگ کے لیے وقت دے دیا جو چھ ماہ بعد تھا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا ''دادا، اتنے دن ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک دو میٹنگز میں طے ہو جائے گا۔''
دادا بولے ''دراصل میں دوسری فلم میں مصروف ہوں۔ درمیان میں وقت نکالا تو پھر بیٹھ جائیں گے مل کر۔''
دادا کے جانے کے بعد ہم نے شائق سے کہا کہ

RAHMAN'S
JAHAN BAJE SHEHNAI
SUCHANDA
RAHMAN

مشرقی پاکستان کی سچندا اور رحمان کی کامیاب فلم جہاں باجے شہنائی

چوہدری صاحب تمہاری فلم اگر بن بھی گئی تو کم از کم دو سال میں بنے گی۔
وہ گھبرا گئے ''مگر آفاقی کیوں؟''
''اس لیے کہ دادا ان دنوں مصروف ہیں۔ دو فلمیں بنا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور فلم سازوں سے انہوں نے وعدہ کر لیا ہے بلکہ ایڈوانس بھی شاید لے لیا ہے۔ ویسے بھی دادا بہت آہستہ، آرام سے کام کرتے ہیں۔ اب سوچ لو کتنا عرصہ لگے گا۔''
شائق پریشان تو ہوئے مگر انہیں امید تھی کہ ان کا کام جلد شروع ہو جائے۔ وہ ہر روز صبح دادا کے گھر حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔ تین ماہ بعد شائق نے خوش خبری سنائی کہ کل رات ہماری میٹنگ ہے، اگلے روز دادا نے پوچھا ''گورو کوئی کہانی سوچی؟''
ہم نے کہا ''دادا، سوچنے کا موقع تو نہیں ملا مگر روسی مصنف گوگول کا ایک ناول بہت موزوں رہے گا۔''
دادا خوش ہو گئے ''تو پھر وہ ناول تلاش کرنا چاہیے۔''
ہم نے کہا ''دادا وہ انگریزی میں مختصر سا ناول ہے۔ انڈیا میں اس پر ''افسر'' کے نام سے فلم بھی بنی ہے جس میں

دیوآنند تھا۔ یہ بہت دلچسپ اور طنزیہ کہانی ہے۔ لگتا ہے گوگول نے آج کے پاکستانی معاشرے اور افسر شاہی کے بارے میں لکھی ہے۔

یہ کہہ کر ہم نے انہیں ناول کی کہانی سنادی۔

دادا کچھ سوچتے رہے پھر شائق سے کہا ''تم اس ناول کو تلاش کرو۔''

شائق نے تلاش شروع کردی۔ چھ مہینے بعد کراچی سے وہ ناول آگیا جو ہم نے ان کے حوالے کیا۔

دو دن بعد انہوں نے کہا ''آفاقی صاحب، یہ تو وہی کہانی ہے جو آپ نے سنائی تھی۔''

ہم نے کہا ''ہم نے تو آپ کو بتادیا تھا کہ ناول کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے۔''

''اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں آپ ایک اور کہانی سوچیے۔''

ہم نے کہا ''دراصل آپ کس قسم کی کہانی چاہتے ہیں، کوئی آئیڈیا تو دیجیے تاکہ اس ایک تھیم پر سوچا جائے۔''

وہ مسکرائے ''دادا، مجھے ایک چھوٹی سی، میٹھی سی، محبت کی کہانی چاہیے جیسی کہ آپ لکھتے ہیں۔ مار پیٹ وغیرہ اس میں بالکل نہ ہو۔ خون خرابا نہ ہو، بس پیار ہی پیار ہو۔''

شائق نے لقمہ دیا ''ایسی کہانی لکھنا تو آفاقی صاحب کا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔''

ہم نے کہا ''مگر ہم دائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔''

''دادا تو پھر سوچیے نا چھوٹی سی، میٹھی سی کہانی۔ مجھے معلوم ہے ایسی کہانی آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔''

شائق نے کھانا کھلایا۔ کافی پلائی اور انہیں رخصت کردیا۔ اگلی میٹنگ کے لیے پندرہ دن کا وقفہ مقرر ہوا۔

ہم نے کہا ''دیکھو شائق، ہم اس طرح کہانی نہیں لکھتے۔ نہ تھیم، نہ کردار، نہ کہانی؟''

''آفاقی بھائی سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' انہوں نے ہمیں تسلی دی۔

پندرہ دن بعد ہم ایک بہت ہلکی پھلکی رومانی اور طنزیہ کہانی سوچ کر گئے۔ جیسے تیسے ہم نے انہیں کہانی کا خلاصہ سنایا۔ وہ بہت غور سے سنتے رہے، پھر بولے ''کہانی بہت اچھی ہے۔ میٹھی اور رومانٹک ہے مگر دادا میں نے سوچا کہ ہمیں کوئی انقلابی فلم بنانی چاہیے۔''

''انقلابی فلم؟''

''جی، میرا مطلب ہے کوئی غریب کسان ہو، ساہوکار اس کو لوٹتا ہے اور معاوضہ نہیں دیتا۔ وہ بے چارہ ساہو[کار] سے کیسے لڑسکتا ہے۔ ساہوکار کے بندوں نے اسے قتل [کر] اور راتوں رات اس کی قبر بنادی۔ فلم کا نام میں نے ''[…]'' سوچا ہے، مطلب یہ کہ ہمارے ملک میں غریبوں کی ز[ندگی] بھی دراصل قبر ہی میں گزرتی ہے۔ کیوں دادا، کیا خ[یال] ہے؟''

اب ہم تنگ آچکے تھے۔ ہم نے کہا ''ڈیڑھ سال ہو[گیا] مگر ابھی تک کہانی کا موضوع اور کہانی تک نہیں ملی۔ آ[پ] کہتے تھے کہ میٹھی میٹھی پیار کی کہانی چاہیے، اب آپ [کہتے] ہیں کہ باغی اور ایکشن کہانی ہونی چاہیے۔''

''دراصل آفاقی بھائی آج کل ایسی ہی فلموں [کا] دور ہے۔ میرے خیال میں تو آپ ویسٹرن فلمیں دیکھ کر [کوئی] آئیڈیا سوچیں۔''

''میرے خیال میں تو آپ بشیر نیاز کے ساتھ ہی [فلم] بنائیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔''

''ارے ارے، آپ تو ناراض ہوگئے۔ چھوڑ[یے] آپ اپنی پسند کی کوئی کہانی لکھ دیجیے۔''

''مگر میری پسند شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ ویسے آج کل میں نے ایک کہانی پر کام شروع کررکھا ہے۔''

یہ سن کر شائق بے چارے کا تو منہ اُتر گیا۔

دادا کے جانے کے بعد شائق نے بہت شکایت کی [کہ] رضامند ہوئے تو آپ نے گڑبڑ کردی۔

ہم نے کہا ''شائق، بچے! ہم نے تم سے پہلے ہی ک[ہا تھا] کہ دادا کو کاسٹ کرنا ہے تو بشیر نیاز کو لے لو۔ وہ دونوں [ایک] دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ کتنی اچھی فلمیں بنائی ہیں انہوں [نے۔] دیکھیے فلم میں دو دماغوں اور دو سوچوں کا یکساں [ہونا] ضروری ہے۔ ہدایت کار اور مصنف میں ذہنی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اچھی فلم نہیں بن سکتی۔''

شائق بولے ''اتنی مشکل سے تو ابا سے فری ہینڈ ملا [تھا] اب نہ جانے ملے نہ ملے۔''

''دیکھو شائق، دادا بہت اچھے آدمی ہیں مگر ان کی [سوچ] اور ہدایت کاری دوسروں سے مختلف ہے۔ تم خود ہی بتا[ؤ] ''آئینہ'' جیسی ایک معمولی کہانی کو انہوں نے اپنے خیال[ات] سے کیسے سجادیا۔ ان کی ہر فلم واقعی ایک شاہکار ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ شاہکار بنانے میں بہت خونِ جگر صرف [ہوتا] ہے اور کتنا عرصہ لگتا ہے۔''

شائق کی وہ فلم کبھی نہیں بنی بلکہ اس کی ایک فلم [بھی نہیں] بنی۔ لیکن نذرالاسلام صاحب نے کئی بہت یادگار فلمیں بنا کر بہت نام پیدا کیا۔ ان کی یہ فلمیں بھلا کون بھول سکتا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہر موضوع پر فلمیں بنائیں اور ہر فلم اپنی نوعیت کی الگ تھی۔ کیونکہ نذرالاسلام ایک مختلف قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر فلمیں بنائیں اسے کامیاب بھی کرائیں۔ سوائے ان کی اخری فلم ''خواہش'' کے جس سے انہیں بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں وہ دل کے مریض تھے۔ یہ فلم انہوں نے بیماری کے عالم میں ہی بنائی تھی۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی تھے لیکن پیسے کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ ایک دولت مند نوجوان نے اس شرط پر ان سے فلم بنوائی کہ سب سے اہم کردار اس کا ہوگا۔ عام حالات میں شاید وہ اس سے بات بھی نہ کرتے۔ مگر بیماری اور ضرورت کے ہاتھوں تنگ آکر انہوں نے یہ فلم بنائی۔ خدا جانے کس طرح بیماری کے عالم میں یہ فلم بنائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس فلم سے بہت امیدیں تھیں۔ ان کے خیال میں یہ ان کی بہترین فلم تھی۔

فلم مکمل ہوگئی تو اس کا ایک خصوصی شو کیا گیا جس میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ ہمارے خیال میں یہ فلم دادا کی فلم معلوم ہی نہیں ہوتی تھی مگر دادا اس سے بہت مطمئن تھے۔ فلم شروع ہوئی تو ہم کچھ دیر بعد ہی مایوس ہوگئے۔ یہ دادا کی فلم ہی نظر نہیں آتی تھی۔

فلم ختم ہوئی تو ہم دادا سے ملے بغیر ہی کھسک گئے۔ دراصل ہم نے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور نہ بولنا چاہتے تھے۔ مگر حیرت یہ کہ دوسرے لوگ انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کیسے کم فہم لوگ ہیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید دادا کو خوش کرنے کے لیے سب ایسا کررہے ہیں۔

فلم ریلیز ہوئی اور حسب توقع فلاپ ہوگئی۔ ہم دادا کے گھر گئے تو ڈیوڑھی میں ان کا جنازہ رکھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیسے کیسے قیمتی ہیرے ہمارے ملک میں پتھر کے ٹکڑے سمجھ کر ٹھکرا دیے جاتے ہیں۔

دادا میں یہ خوبی تھی کہ دوسروں کے اچھے کام کی بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ جب ہماری فلم ریلیز ہوتی، ایک طرف لے کر بیٹھ جاتے اور اپنی رائے دیتے۔ اپنا نکتہ نظر بیان کرتے تھے۔ ان کی فلموں پر بھی ہم دونوں دیانت داری سے اپنے خیالات بیان کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کی آخری فلم کے بارے میں یہ رسم جاری نہ رہ سکی کیونکہ وہ دنیا میں نہیں رہے تھے۔

☆☆☆

ہدایت کار نذرالاسلام کا تعلق تو کلکتہ سے تھا لیکن وہ ڈھاکا چلے آئے تھے۔ وہ فلم ایڈیٹر تھے اور یہی خوبی ان کی ہدایت کاری میں نمایاں نظر آئی۔ کلکتہ اور ڈھاکا میں قیام کرنے کی وجہ سے وہ بنگلہ کے علاوہ اردو سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ ان کا اردو تلفظ بہت اچھا تھا۔

ڈھاکا آکر پہلے تو انہوں نے فلم ایڈیٹنگ میں نام پیدا کیا اور پھر بحیثیت ہدایت کار پہلی فلم ''کاجل'' بنائی تھی جس نے درمیانے درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔ فلم ''پیاسا'' بنائی۔ اس وقت تک پاکستان بن چکا تھا۔ یہ خیال رہے کہ نذرالاسلام جو کہ ایک تعلیم یافتہ ہنرمند تھے، کلکتہ میں بھی

مشرقی پاکستان کی اداکارہ شبانہ

کامیابیاں حاصل کرسکتے تھے لیکن قیام پاکستان سے پہلے ہی انہوں نے ڈھاکا میں قیام کرنا پسند کیا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی میں آباد ہوگئے۔ کراچی شہر انہیں بہت پسند آیا تھا لیکن فلم کا مرکز تو لاہور تھا۔ کراچی ہی میں ان کی ملاقات فلم ساز نصرت شمسی سے ہوئی تھی۔ شمسی صاحب ان کی صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوئے کہ بعد میں انہوں نے نذرالاسلام سے بہت شاہکار فلمیں بنوائیں۔

کراچی میں ان کی ملاقات مردِ درویش الیاس رشیدی

مشرقی پاکستان کی اداکارہ انورہ

سے ہوئی۔ الیاس رشیدی کو اللہ نے ایک ہمدرد اور درد مند دل دیا تھا۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پاکستان کی فلمی صنعت کے معماروں میں وہ نمایاں تھے۔ جس ہدایت کار کو کام نہ ملتا اسے کام دلانا الیاس بھائی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جس فلم ساز کی فلم فلاپ ہونے کے بعد کوئی اس کو سرمایہ دینے کو تیار نہ ہوتا تھا اسے الیاس بھائی کسی نہ کسی سے سرمایہ ضرور دلا دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی ان خدمات کے لیے کبھی کسی سے ایک پیسا تک وصول نہیں کیا بلکہ اپنی گرہ سے خرچ کر دیتے تھے۔ فلمی صنعت میں ان کا بہت احترام تھا اور ہمیں یاد نہیں کہ کبھی کسی نے الیاس بھائی کی بات ٹالی ہو۔ ہم انہیں مذاق میں خدائی فوجدار کہا کرتے تھے اور وہ ہنستے رہتے تھے۔ جب نذرالاسلام جیسے ہدایت کار کو کام نہ ملا تو الیاس بھائی نے ان کی خاطر خود فلم ''احساس'' بنائی۔ یہ ایک معیاری اور کامیاب فلم تھی۔ اس طرح پاکستان میں دادا کو الیاس بھائی نے متعارف کرایا جو آگے چل کر پاکستان کا بہت بڑا ہدایت کار ثابت ہوا۔ فلم احساس 1972ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ہماری فلم ''آس'' 1973ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ناموں کی مناسبت کی وجہ سے اکثر لوگ ان دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ''آئینہ'' بنائی جو ایک ہی سنیما میں ایک سو ہفتے سے زائد چلی اور اس کے بعد بھی چلتی رہی۔

آئینہ میں درحقیقت نذرالاسلام اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ انڈیا میں بھی اس فلم کے چربے بنائے گئے مگر دادا کی فلم ''آئینہ'' ان سب سے برتر تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک شاہکار فلم تھی جو ہر ذوق کے لوگوں کو پسند تھی۔ روبن گھوش کی موسیقی نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے۔ شبنم اور ندیم نے اپنے کردار نہایت حقیقی انداز میں ادا کیے تھے۔ یہ ہدایت کاری، موسیقی، عکاسی اور اداکاری کے حساب سے ایک منفرد اور انوکھی فلم لگتی تھی۔ پاکستان میں یہ فلم سازی کا بالکل نیا تجربہ تھا۔

آئینہ میں مرکزی کردار شبنم اور ندیم نے ادا کیے تھے اور ان کرداروں میں جان ڈال دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں خالد سلیم موٹا بھی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئینہ دنیا کی کسی بھی فلم کے مقابلے میں بڑے فخر سے پیش کی جاسکتی ہے۔

نذرالاسلام کی دوسری کامیاب فلموں میں امبر، شیشے کا گھر، خواہش، لوا سٹوری، زندگی، تمہیں ابھی نہیں، بندش، میڈم باوری، کالا بازار، آنگن، چکر، نرگس وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر بے حد کامیاب فلمیں ہیں۔ نذرالاسلام کے موسیقار ہمیشہ روبن گھوش ہوتے تھے۔ مرکزی کرداروں میں وہ شبنم اور ندیم کو ترجیح دیتے تھے۔ یوں تو انہوں نے بابرہ شریف اور دوسرے فنکاروں کے ساتھ بھی کام کیا لیکن روبن کی موسیقی، شبنم اور ندیم کی جوڑی، بشیر نیاز کی تحریر اور خود ان کی ہدایت کاری ان کی فلموں کا قیمتی سرمایہ ہوتا تھا۔

ان کی بیشتر فلمیں اعلیٰ درجے کی تھیں لیکن آئینہ نے جو مقبولیت اور شہرت حاصل کی وہ کسی اور فلم کو حاصل نہ ہوئی۔ اس کے فلم ساز رؤف شمسی تھے جو ذاتی طور پر بھی نذرالاسلام کے مداح تھے۔ آئینہ وہ فلم تھی جو چار سو ہفتے جو کہ برصغیر کی فلمی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس سے پہلے قیام پاکستان سے قبل کلکتہ کے ایک ہی سنیما میں فلم ''قسمت'' ایک سال تک چلی تھی۔ لیکن ''آئینہ'' نے اس کا ریکارڈ بھی توڑ دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ''آئینہ'' ہر لحاظ سے قسمت سے بدرجہ بہتر فلم تھی۔ یوں سمجھے کہ ''آئینہ'' نذرالاسلام کا بنایا ہوا تاج محل تھی۔

اس فلم میں ہمارے ایک قریبی دوست (اب مرحوم ہو چکے ہیں) کنور آفتاب کے چھ سات سالہ بیٹے نے بھی محض نذرالاسلام کے اصرار پر کام کیا تھا۔ کنور آفتاب اس زمانے میں پی ٹی وی میں ایک بڑے افسر تھے۔ ان کا یہ بیٹا شاہ رخ اب ماشاءاللہ جوان اور شادی شدہ ہو چکا ہے۔

آئینہ کی کہانی کا بنیادی پہلو یہ تھا کہ ایک دولت مند باپ (ریحان) کی بیٹی شبنم ایک غریب نوجوان ''ندیم'' کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن باپ سخت مخالف ہے۔ بیٹی نے باپ کی مخالفت کے بعد شادی کر لی اور دونوں میاں بیوی بہت خوش ہیں۔ مشکلات بھی راستے میں آتی ہیں لیکن ان کی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہے۔ روبن گھوش کی موسیقی

اس فلم کی روح تھی تو ندیم اور شبنم کی اداکاری ان کی جان تھی۔ اس فلم کو تقریباً ہر شعبے میں ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ یہ فلم 1977ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی اور اس نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ یہاں تک کہ انڈیا میں بھی اس کے گانے اور کہانی کے بہترین حصے استعمال کیے گئے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

انڈیا میں اسے ''پیار جھکتا نہیں'' کے نام سے اور ایک بار پھر نکاح کے نام سے بنایا گیا تھا۔ مگر یہ دونوں فلمیں نذرالاسلام نے نہیں بنائی تھیں۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دادا اونچا سنتے تھے۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سنتے اور مسکراتے رہتے تھے لیکن جب کوئی بات سننا چاہتے تھے تو عینک لگا لیتے تھے۔ ان کی قوت سماعت کا راز آلۂ سماعت میں تھا۔

ان کا انتقال بیماری کے بعد 11 جنوری 1994ء کو ہوا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

☆☆☆

برصغیر میں جو رومانی کہانیاں لوک کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں ان میں ''دلا بھٹی'' کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ عموماً رومانی لوک کہانیاں فرضی یا خیالی واقعات پر مبنی ہوتی ہیں لیکن ''دلا بھٹی'' سچے واقعات پر مبنی کہانی ہے جس میں رنگ آمیزی پیدا کرنے کے لیے کچھ مبالغہ آمیزی بھی کر دی گئی۔

دلا بھٹی کو اگر آپ اس زمانے کے ''رابن ہڈ'' کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ایک انتہائی بہادر اور بے خوف انسان تھا۔ ریاست نظام پور میں ان کا قیام تھا۔ وہ امیروں کو لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ غریب اس کو دعائیں دیتے تھے لیکن قانون اس کا مخالف تھا اور اس کی تلاش میں رہتا تھا۔

دلا بھٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے میں تھا۔ شاہی فوجوں نے بالآخر اس کو گرفتار کر لیا اور اس کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ حکومت کی نظر میں وہ ڈاکو اور لٹیرا تھا لیکن عوام کے نزدیک وہ ان کا ہمدرد اور مددگار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دلا بھٹی کو آج تک کوئی بھولا نہیں ہے۔

دلا بھٹی کے موضوع پر دو بار فلمیں بنائی جا چکی ہیں اور دونوں بار یہ فلمیں بے حد کامیاب ثابت ہوئیں۔

دلا بھٹی کے بارے میں پاکستان میں دو فلمیں بنائی گئیں۔ پہلی بار یہ فلم 1956ء میں بنائی گئی تھی اور یہ ایک

مشرقی پاکستان کی فلم مالا کا بچہ سنگر

ہردلعزیز فلم قرار پائی تھی۔ اس کے بعد دوسری بار کچھ ترمیم کرنے کے بعد 1984ء میں بنائی گئی اور پہلی فلم کی طرح مقبول ہوئی۔ دونوں فلموں کے فلم ساز آغا جی اے گل تھے۔

پہلی دلا بھٹی کے مصنف عالم سیاہ پوش تھے جو پنجابی کے مانے ہوئے شاعر اور مصنف تھے۔ ان کے قلم نے اس فلم کو بہت سہارا دیا تھا۔ اس فلم میں یوسف خاں تھے۔

فلم ساز آغا جی اے گل نے دوبارہ فلم ''دلا بھٹی'' بنائی جس کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ بھی بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

دوسری بار جو فلم دلا بھٹی بنائی گئی اس کے ہدایت کار ہنرمند ایڈیٹر ایم اکرم تھے۔ اس فلم کے مرکزی کردار سدھیر اور صبیحہ خانم تھے۔ ان دونوں کی اداکاری نے اس فلم کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ طفیل ہوشیار پوری اس کے شاعر تھے۔ اس فلم میں دس نغمات تھے اور سب کے سب بہت مقبول ہوئے تھے۔ آشا پوسلے اور آصف جاہ نے اس فلم میں کامیڈی کردار کیے تھے۔ اس فلم کی کامیابی میں موسیقی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

دلا بھٹی کے دوسرے ایڈیشن نے سارے ملک میں دھوم مچا دی تھیں۔ اس فلم کے موسیقار بھی جی اے چشتی تھے۔ اسلم ڈار اس فلم کے عکاس تھے۔ اس فلم کے فلم ساز آغا جی اے گل، فلم ساز کے علاوہ تقسیم کار اور سنیماؤں کے مالک بھی تھے۔ کسی فلم کی کامیابی کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا۔

کہتے ہیں کہ دلا بھٹی کی قبر لاہور کے میانی صاحب کے قبرستان میں موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دلا بھٹی کے بارے میں سالانہ ایک دن بھی منایا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ... کوئی نہیں جانتا کہ دلا بھٹی کی قبر کہاں ہے؟

پاکستان میں دلا بھٹی کو نئی زندگی دینے میں مرحوم آغا

گل کے ادارے ایور نیو پکچرز نے بہت نمایاں حصہ لیا۔انہوں نے پہلی بار فلم دلا بھٹی 1956ء میں بنائی تھی۔ اس فلم کے موسیقار بابا چشتی اور نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری تھے۔اس فلم کے شریک ہدایت کار خلیل الرحمٰن تھے جنہوں نے انور کمال پاشا کی نگرانی میں یہ فلم بنائی تھی اور یہ بے حد کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ ہدایت کاری اور اداکاری کے علاوہ بابا چشتی کی سحر انگیز موسیقی کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔

فلم کی کہانی کا آغاز ایک بچوں کے اسکول سے ہوتا ہے ان ہی میں دلا بھٹی بھی شامل ہے۔ آغاز ہی میں دکھا دیا گیا ہے کہ وہ ایک نڈر، بے خوف اور صاف گو بچہ ہے۔اس کا کہنا تھا کہ وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ہاتھ پاؤں کا بھی مضبوط تھا اس لیے دوسرے بچے اس سے جھگڑا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

دلا بھٹی جوان ہو کر ایک جوان رعنا اور دلیر نوجوان بن جاتا ہے۔غریبوں پر دولت مند جو ظلم کرتے ہیں وہ اس ناانصافی کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔اس کا علاج اس نے یہ اختیار کیا کہ لوٹ مار اور ڈاکا زنی شروع کردی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں سے دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کردیا کرتا تھا۔حکومت کے لیے یہ ناقابلِ برداشت جرم تھا اور وہ اس کو راہزن اور ڈاکو قرار دے کر اس کی گرفتاری کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔دلا بھٹی کو دھوکا اور فریب سے گرفتار کیا گیا۔حاکم کے منتظمین فریب دے کر دلا بھٹی کو ناچ گانے کی محفل میں بلاتے ہیں اور بے ہوشی کے عالم میں گرفتار کرلیتے ہیں، ورنہ وہ خون خرابے کے بغیر ہاتھ نہ آتا لیکن دلا بھٹی کے حامی اس کو آزاد کرانے کے لیے بھیس بدل کر جاتے ہیں۔ آصف جاہ اور رقاصہ رخشی حکومت کا داؤ خود ان پر ہی آزماتے ہیں اور سرکاری کارندوں کو مدہوش کرکے دلا بھٹی کو آزاد کرالیتے ہیں۔

اس واقعے سے ناراض ہو کر حاکم وقت دلا بھٹی کے پاس ایک سرکاری نمائندہ بھیجتا ہے اور پیغام بھجوایا کہ وہ حکومت کی قوت سے نہیں لڑسکتا۔ بہتر ہے کہ خود کو سرکاری کارندوں کے حوالے کردے تو اس کو معافی مل جائے گی۔دلا بھٹی نے حاکم وقت کو سنانے کے لیے یہ حرکت کی کہ اس کے کارندے کی داڑھی مونچھیں مونڈ کر اس کو حاکم کے پاس بھیج دیا اور پیغام بھیجا کہ دلا بھٹی اپنے دشمنوں کا یہ حشر کرتا ہے۔

حاکم وقت کا بیٹا یوسف خاں جو بچپن میں دلا بھٹی کے ساتھ پڑھتا تھا، اس نے حاکم وقت کو پیش کش کی کہ وہ دلا بھٹی کو گرفتار کرا سکتا ہے۔ بچپن کے یہ دوست ایک دوسرے کی صورت بھول چکے تھے۔ یوسف خاں کا بچپن کا نام حیدری تھا۔اس نے دلا بھٹی کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں کہ وہ کس گاؤں میں آتا ہے۔ کسی لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے۔

حیدری جب اس گاؤں میں پہنچتا ہے تو کنوئیں پر لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں جن میں حسین وجمیل نوراں بھی شامل ہے جو دلا بھٹی سے پیار کرتی ہے۔حیدری نوراں سے پانی پلانے کی درخواست کرتا ہے جو اس کو پانی پلاتی ہے لیکن حیدری اس کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔گاؤں میں دستور کے مطابق گھوڑا بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے جس میں حیدری بھی شریک ہوجاتا ہے۔لڑائی کے دوران...دونوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں بچپن میں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ بچپن کے دونوں دوست ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور بچپن کے زمانے کی یادیں دُہراتے ہیں۔

حیدری دلا بھٹی کو بتاتا ہے کہ اس گاؤں کی ایک دوشیزہ کو پسند کرنے لگا ہے۔

دلا بھٹی کہتا ہے کہ تم جس لڑکی کی طرف اشارہ کردو گے وہ تمہاری ہوجائے گی۔ حیدری اگلے روز اشارے سے کنوئیں پر پانی بھرتی ہوئی نوراں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دلا بھٹی دم بخود رہ جاتا ہے۔ایک طرف محبت اور دوسری طرف دوستی۔

دلا بھٹی حیدری کو اپنی ماں سے ملواتا ہے جو اس کو بہت پسند کرتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ میں اس گاؤں کی ایک دوشیزہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔دلا بھٹی کی ماں یہ سن کر ساکت رہ جاتی ہے لیکن دلا بھٹی جو اپنے قول کا پکّا ہے، محبت کو خدا کی قربانی دے کر نوراں کی شادی حیدری سے کرا دیتا ہے۔

ادھر دارالحکومت میں وزیر حیدری کے باپ کے خلاف بغاوت کرکے خود حاکم بن جاتا ہے۔وہ دھوکے سے باپ اور حیدری دونوں کو گرفتار کرلیتا ہے۔

نوراں بھی قید خانے میں ہے مگر وہ کبوتر کے ذریعے دلا بھٹی کو خط بھیجتی ہے۔یوں تو اس فلم کے سبھی گانے سپر ہٹ تھے مگر چشتی صاحب کے اس گانے نے برصغیر میں دھوم مچادی اور گراموفون کمپنی نے انہیں گولڈن ایوارڈ سے نوازا۔

گانے کے بول یہ تھے۔

چٹھی میرے ڈھولا نوں پہنچاویں کبوترا

یہ گانا طفیل ہوشیار پوری کا لکھا ہوا تھا اور سارے برصغیر میں گایا جاتا تھا۔

اس گانے کے بارے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ فلم ہٹ ہوچکی تھی۔ لاہور کا نشاط سنیما کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ فلم کا شو شروع ہونے والا تھا کہ موسیقار چشتی نشے میں چور اپنے پورے خاندان کو لے کر سنیما پہنچ گئے اور سب کو سنیما میں بٹھانے کی فرمائش کی۔ منیجر نے انہیں سمجھایا کہ ہاؤس فل ہوگیا ہے۔آپ کل ایوننگ شو دیکھ سکتے ہیں مگر چشتی صاحب ''سن'' ہوچکے تھے۔انہوں نے سنیما پر ایک ہنگامہ کھڑا کردیا کہ ہمیں فلم دکھاؤ ورنہ میرا گانا ''کبوترا'' فلم سے نکال دو۔

یہ فلم کا آخری شو تھا۔ سنیما کے سامنے ایک ہجوم تھا۔ آخر آغا جی اے گل کو جگا کر اطلاع دی گئی۔انہوں نے کہا کہ کچھ لوگوں کو کل کے لیے دو دو ٹکٹ دے دو اور ان سے معذرت کرکے چشتی صاحب کی فرمائش پوری کردو۔ اس طرح چشتی صاحب نے اپنے گھر والوں کو یہ فلم دکھائی۔

یہ چٹھی ملتے ہی دلا بھٹی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل پر حملہ کردیتا ہے۔ حیدری بادشاہ کو آزاد کرالیتا ہے۔وزیر مرتے مرتے خنجر پھینکتا ہے۔نوراں سامنے آجاتی ہے اور اس خنجر سے زخمی ہوجاتی ہے۔دلا بھٹی نوراں کو دشمنوں سے بچاتے ہوئے مارا جاتا ہے اور اس طرح محبت، دوستی اور قربانی کی یہ فلم ختم ہوتی ہے جس نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

دلا بھٹی ایک سپر ہٹ پنجابی فلم تھی جس میں آغا جی اے گل اور انور کمال پاشا نے مقصد کے ساتھ ہر طرح کی تفریح بھی بھردی تھی۔ یوں تو ساری دنیا کے لوگ بہادر لوگوں کی قدر کرتے ہیں لیکن پنجاب کے لوگ نڈر اور بہادر لوگوں کو ہیرو کا درجہ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی دلا بھٹی کا نام لوگوں کے دلوں میں نقش ہے۔ پنجاب کا ہر شخص دلا بھٹی اور اس کے کارناموں سے واقف اور اس کا مداح ہے۔

آغا گل کے صاحب زادوں شہزاد گل اور سجاد گل نے فلم سازی میں بہت نام پیدا کیا۔

اس فلم میں سدھیر اور صبیحہ خانم نے بہترین اداکاری کی تھی جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ سدھیر نے غریبوں کے دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے بہت اچھا کام کیا تھا۔ وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں اداکاروں میں سنتوش کمار اور سدھیر ہی کا نام لیا جاتا تھا۔ سدھیر نے زیادہ تر پنجابی فلمیں کیں اور وہ ایکشن فلموں کی کامیابی کی وجہ سے ''جنگجو'' ہیرو مشہور تھے۔ فلم ''آخری نشان'' کی کامیابی کے بعد وہ پنجابی فلموں کے سب سے مقبول ہیرو تھے۔

بابا چشتی کا بنا ہوا نغمہ۔

واسطہ ای رب دا تو جاویں وے کبوترا

ایسا نغمہ تھا جس کی گونج سارے ہندوستان میں گونج رہی تھی۔ بعض بھارتی فلم سازوں نے اس کے حقوق خرید لیے تھے۔ محبوب اسٹوڈیوز میں بھی اس فلم کے پرنٹ موجود تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ ادارے ''دلا بھٹی'' نہ بنا سکے۔ بابا چشتی کو کمپنی نے اس زمانے میں تین لاکھ رائلٹی دی تھی جو آج کل تین کروڑ کے برابر ہے۔ یہ ناقابلِ یقین تھی مگر یہ گانا بھی لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تھا اور آج تک وہ اسے بھولے نہیں۔

ایم ایس ڈار نے ہدایت کار کی حیثیت سے بہت اچھا کام کیا تھا۔ سدھیر اس فلم میں ایک نگینے کہ طرح فٹ تھے۔ اس فلم کی سب سے نمایاں خرابی یہ تھی کہ اس میں کبوتر نظر تک نہیں آتا حالانکہ گانے نے دھوم مچادی تھی۔

ایک خاص بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ سنتوش کمار اور صبیحہ کی جوڑی مقبول ترین تھی لیکن سدھیر کے ساتھ بھی صبیحہ خانم نے یادگار فلمیں پیش کی ہیں جن میں گمنام، چھوٹی بیگم، سسی، سوہنی وغیرہ بے حد کامیاب فلمیں تھیں۔ علاؤالدین اس وقت بہت بڑے اداکار نہیں بنے تھے لیکن انہوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ ان کے علاوہ چاچا غلام اور شیخ مختار نے بھی بہت اچھا کام کیا تھا۔ آصف جاہ اس زمانے میں بہت مقبول کامیڈین تھے۔ عام طور پر نیلو کی پہلی فلم ''دلا بھٹی'' کو ہی کہا جاتا ہے، اس فلم کے دو گانے آشا پوسلے اور آصف جاہ پر فلمائے گئے تھے۔

فلم میں آشا پوسلے کو ایک شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی محبت کرتے دکھایا گیا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ آصف جاہ کو اپنے گھر بلاتی ہے اور جب شوہر اچانک گھر پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کو مزاحیہ انداز میں چھپا دیتی ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کے مناظر پر پابندی عائد تھی اور اس کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس پر فلم بینوں نے اعتراض بھی کیا تھا۔ جس پر آغا گل بعض فلمی صحافیوں سے ناراض بھی ہوگئے تھے۔ آج کی تو بات ہی کیا ہے۔ اب اس سے کہیں زیادہ قابلِ اعتراض مناظر عام طور پر دکھاتے ہیں لیکن نہ تو فلم بینوں کو اعتراض ہوتا ہے، نہ صحافیوں کو اور نہ ہی فلم سنسر بورڈ کو۔

دیکھیے وقت کس طرح بدلتا ہے۔

☆☆☆

پاکستان کی یادگار فلموں کے سلسلے میں بہتر ہے کہ آج نذرالاسلام صاحب کی فلم ''امبر'' کا تذکرہ کردیا جائے۔ دادا ہدایت کار تو بہت اچھے تھے ہی لیکن ان کی ہدایت کاری کی خوبی (اور فلم ساز کے لیے مصیبت) تھی کیونکہ وہ معمولی سے معمولی بات پر بھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے اور ان کے فلم کے شاٹ بے داغ ہوتے تھے کیونکہ وہ دوسرے فلم سازوں کی طرح شوٹنگ کے لیے وقت کے پابند نہیں تھے۔ جب تک مطمئن نہ ہوتے، فلم کی شوٹنگ روک دی جاتی تھی۔ ایک مثال پیش ہے۔ دادا فلم ''شیشے کا گھر'' کی اے ایم اسٹوڈیو میں شوٹنگ کررہے تھے کہ ان کی نظر پڑی کہ ڈنر ٹیبل پر جو چمچے رکھے ہوئے تھے وہ ایک جیسے نہ تھے۔ دادا نے شوٹنگ روک کر اسسٹنٹ سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ڈیکوریٹر نے جو چمچے بھیجے تھے، وہی استعمال کیے گئے ہیں۔

دادا نے اپنی عادت کے مطابق تحمل سے کہا ''تم دیکھ رہے ہو کہ فلم کا سیٹ کس قدر شاندار ہے۔ کھانے کی میز پر قیمتی برتن رکھے ہوئے ہیں۔ مہمان بھی معزز ہیں۔ کیا ایسے لوگ مختلف انداز کے چمچوں کو استعمال کرنا پسند کریں گے؟''

اسسٹنٹ لاجواب ہوگیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ کسی اور سیٹ سے اس سے ملتے جلتے چمچے لے آتے ہیں مگر دادا نے کہا کہ مجھے وہی قیمتی چمچے درکار ہیں۔ جب تک وہ چمچے نہ آئیں گے فلم کی شوٹنگ جاری نہیں رہ سکتی۔ ہماری فلموں میں ایک خامی یہ ہے کہ تفصیلات اور ضروریات پر زور نہیں دیا جاتا۔ بس وقت بچانے کی لیے جو بھی مل جائے اسی سے کام چلاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ فلم دیکھنے والے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت غور سے دیکھتے ہیں۔ ہم فلم دیکھنے والوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ہم فلم سازوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔

اے ایم اسٹوڈیو شہر سے کافی دور تھا۔ پھر بھی اسسٹنٹ چمچوں کی تلاش میں میکلوڈ روڈ گئے اور ویسے ہی چمچے تلاش کرکے لائے تو فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ ہم نے کئی بار انہیں بتایا کہ ہمارے ہاں آرٹسٹ مقررہ وقت ہی دیتے ہیں۔ اگر وقت مقررہ میں کام ختم نہ ہو تو فلم ساز کی مشکلات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہماری فلموں کا بجٹ کم ہوتا ہے۔ اس لیے پیسے بچائیں مگر ان کا کہنا تھا کہ اگر فلم کے لوازمات مکمل نہ کیے جائیں تو فلم بنانے کا فائدہ۔ اعلیٰ فلم کے لیے تو پیسے درکار ہیں۔ دادا خام فلم خرچ کرنے میں بھی کفایت نہیں کرتے تھے۔ جو شاٹ پسند نہ ہوتا تھا اس کو دوبارہ فلماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عام فلم کے تیس چالیس ہزار فٹ، خام فلم کے مقابلے میں ان کی فلم کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ مثلاً وہ ایک فلم مکمل کرنے میں 80 سے 100 ہزار فٹ فلم صرف کرتے تھے۔ اسی لیے انہیں فلموں کا مغل اعظم کہا جاتا تھا۔ وہ فلم کے ایک ایک فریم پر توجہ دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنی فلم کا ہر شاٹ فلم کا آخری شاٹ سمجھ کر لیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فلموں کی تکمیل میں دیر لگتی تھی۔

آیئے آج ان کی ایک یادگار فلم ''امبر'' کا تذکرہ کرتے ہیں جسے نئی نسل تو شاید بھول ہی چکی ہوگی لیکن جن لوگوں نے فلم ''امبر'' دیکھی ہے وہ آج بھی ان کے دلوں اور ذہنوں میں تازہ ہوگی۔

امبر کی کہانی بذات خود ایک کہانی ہے۔ ان کی یہ فلم بہت زیادہ دیر میں تیار ہوئی جس کی مختلف وجوہات تھیں۔

یہ فلم 1976ء میں ''سولہواں سال'' کے نام سے شروع ہوئی تھی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس کی تکمیل میں تاخیر ہوتی رہی۔ یہ فلم بھی نذرالاسلام کی رومانی یادگار فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس فلم کے خدوخال کو سنوارنے میں دادا نے حسبِ معمول بہت محنت کی تھی۔ اگرچہ اس فلم کی کاسٹ ان کے لیے نئی تھی لیکن انہوں نے اداکاروں سے بہت اچھا کام لیا تھا۔ ان کی ہدایت کاری بھی ناقابلِ فراموش تھی۔

فلم کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی ایک دولت مند جاگیردار ہیں۔ جب ان کی شادی ان کی پسندیدہ لڑکی دیبا سے ہوئی تو جیسے گھر میں خوشیاں جاگ اٹھیں۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ شادی کی خوشیوں میں حویلی کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کو بھی سجایا گیا۔ آخر جاگیردار کی پسند کی شادی تھی۔ حویلی میں ہر طرف خوشیاں بکھر گئیں۔ لوگ ان دونوں کے پیار کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد حویلی میں ایک اور پھول کھلا۔ دیبا اور محمد علی نومولود کی آمد پر بہت خوش تھے اور پیدائش سے پہلے ہی اس کی آمد کے انتظامات شروع کردیے گئے۔ ہر طرف خوشیوں اور پھولوں کا راج تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ مستقبل ان کے لیے غم کا پیغام لے کر آیا ہے۔ دیبا بیگم اس بچے (ندیم) کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

اب بچے کی پرورش کی ذمّے داری بھی باپ پر یعنی محمد علی کے کاندھوں پر آن پڑی۔ دیبا کی زندگی میں حویلی کا چپا چپا خوشیوں سے جگمگا رہا تھا لیکن ان کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد خوشیوں سے بھرپور یہی حویلی ماتم کدہ بن گئی۔ بچے ندیم کی دیکھ بھال کے سوا جاگیردار کے پاس کوئی اور کام نہیں رہا تھا۔ وہ ماں اور باپ دونوں کی ذمّے داریاں بہت خوبی سے ادا کررہے تھے۔

رفتہ رفتہ پیار و محبت کی چھاؤں میں پل کر ندیم ایک خوبرو نوجوان بن گیا۔ باپ کے تقاضوں سے بچنے کے لیے ندیم نے اپنے فوٹوگرافر دوست کی مدد سے ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر محمد علی کو بھجوادی جو انہیں بہت پسند آئی اور وہ فوراً اس لڑکی کو بہو بنانے کو تیار ہوگئے۔ ندیم نے تصویر کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ شریف خاندان کی اس لڑکی سے شادی کرچکا ہے۔ میری بہو کو مجھ سے لاکر ملاؤ۔ یہ پیغام ندیم تک پہنچا تو وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے باپ کو بہانے سے ایک تصویر تو بھیج دی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اب وہ لڑکی کہاں سے لائی جائے جسے نواب صاحب کی اپنی بہو ظاہر کیا تھا۔

دونوں دوست بہت غوروخوض کرتے رہے لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ بالآخر ندیم نے بہت کوششوں کے بعد اس لڑکی کو تلاش کرلیا جس کا نام امبر تھا۔ دوست کے مشورے پر ندیم نے امبر کے گھر میں باورچی کی ملازمت کرلی۔

امبر کی ماں اپنی بیٹی کی شادی اپنے نالائق بھتیجے منور سعید سے کرانا چاہتی تھی۔ لیکن امبر منور سعید کو پسند نہیں کرتی تھی۔

امبر نے پریشان ہوکر گھر کے ملازم باورچی سے مدد مانگی۔ دراصل ندیم ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا، اس لیے امبر اس سے ملازموں کی طرح سلوک نہیں کرتی تھی اور بعض معاملات میں اس سے مشورہ بھی کرلیا کرتی تھی۔ اس کی کوئی بہن یا بے تکلف سہیلی بھی نہیں تھی اس لیے مشورے طلب کرنے کے لیے وہ ندیم سے مشورہ لے لیتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اس معاملے میں ندیم سے مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔

جب اس نے ندیم سے بات کی تو اس نے کہا کہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم میری فرضی بیوی بن کر میرے والد کے سامنے آجاؤ۔ اس طرح ہم دونوں کے مسائل حل ہوجائیں گے۔ اس طرح تمہیں منور سعید سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا۔ امبر اس پر آمادہ نہ تھی مگر

ندیم کی اولین فلموں میں سے ایک چھوٹے صاحب

ندیم نے اس کو قائل کرلیا۔ ایک روز وہ لباس تبدیل کرکے ندیم کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

اس طرح ندیم نے امبر کو اپنی بیوی ظاہر کرکے اپنے والد نواب علی یار خان کے سامنے پیش کردیا۔ علی یار خان نے اپنے بیٹے کی پسند کی تعریف کی اور کہا کہ تم نے واقعی بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ نواب صاحب اپنے بیٹے کے انتخاب سے اتنے خوش ہوئے کہ گھر کی تمام ذمّے داری اور چابیاں اس کے حوالے کردیں۔ علی یار خان تو اپنی مرحومہ بیوی دیبا کے مرنے کے بعد دل شکستہ ہوکر شراب نوشی کے عادی ہوچکے تھے، دیبا کے انتقال کے بعد پہلی بار حویلی میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ امبر کی آمد اور اس کے طرزِ عمل نے سب کی زندگی ہی تبدیل کردی۔ مگر ندیم اور امبر کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر یہ راز کھل گیا تو کیا ہوگا؟

مگر یہ سب خوشیاں عارضی ثابت ہوئیں جب نواب صاحب پر حقیقت کھلی کہ ان کے بیٹے نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور جس لڑکی کو وہ اپنی بہو سمجھتے ہیں وہ ایک غیر لڑکی ہے جس کا ان کے بیٹے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو نواب صاحب نے سخت ناراضی کا مظاہرہ کیا اور امبر سے کہا کہ وہ اپنے گھر واپس چلی جائے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی بہت بُرا بھلا کہا۔

نواب کی خوشیاں ایک بار پھر غموں میں بدل گئیں۔ انہوں نے دوبارہ شراب نوشی کا سہارا لیا اور سب سے قطع تعلق کر کے بیٹھ گئے۔

ندیم نے امبر کے گھر جا کر تمام حقیقت بیان کر دی اور کہا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندانی اور تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ محض حالات اور جذبات سے مجبور ہو کر کیا۔

امبر کے والد کا دل پسیج گیا اور انہوں نے ندیم سے کہا کہ اگر اس کے والد بذات خود آ کر امبر کا ہاتھ مانگیں تو وہ اس معاملے پر غور کریں گے۔

ندیم واپس علی یار خان کے پاس گیا۔ ان سے معافی مانگی۔ تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہیں بتایا کہ امبر ایک بہت بڑے خاندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ علی یار خان بیٹے کا قصور معاف کر کے امبر کو اپنا لیں گے تو حویلی کی خوشیاں پھر لوٹ آئیں گی۔

علی یار خان بیٹے کی باتیں سن کر پگھل گئے اور اس کے ساتھ امبر کے گھر جا کر اس کو اپنی بہو بنانے پہنچ گئے، وہ اس کی خوبیوں سے پہلے ہی آگاہ ہو چکے تھے۔ اس طرح ماں باپ کی رضامندی سے امبر اور ندیم کی شادی ہو گئی۔ نواب علی یار خان کی حویلی میں ایک بار پھر خوشیاں لوٹ آئیں۔

امبر کی کہانی نذرالاسلام کی فلم ''احساس'' سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ بہت سے کردار بھی احساس ہی جیسے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس فلم کی کہانی نذرالاسلام نے بذات خود لکھی تھی اور وہ ذہنی طور پر فلم احساس سے متاثر تھے۔ فلم کے مکالمے بشیر نیاز نے حسب معمول بہت اچھے لکھے تھے۔ اس فلم کے بہترین مکالموں کے لیے انہیں 1978ء کا نگار ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

''امبر'' کی کہانی تو معمولی سی کہانی تھی لیکن نذرالاسلام نے ہدایت کاری اور دوسرے شعبوں میں محنت کر کے اس کو ایک خوبصورت فلم بنا دیا تھا۔ بہتر تھا کہ اگر ''احساس'' کے کچھ عرصے بعد امبر بنائی جاتی۔ کہانی کو دلچسپ اور بھرپور انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم میں ڈرامائی مناظر کے ساتھ کامیڈی مناظر بھی بہت دلچسپ تھے۔

فلم کا سب سے بھرپور ڈرامائی کردار محمد علی کا تھا۔ ایک ہلکی پھلکی فلم میں محمد علی نے اپنے ڈرامائی کردار سے فلم کو ایک طاقتور ڈرامائی فلم بنا دیا تھا۔ ندیم نے مزاحیہ کردار بہت دلچسپ اور حقیقی انداز میں پیش کیا تھا۔ ندیم کو ہمیشہ سے یہ آسانی رہی ہے کہ وہ ڈرامائی اور ہلکے پھلکے کردار یکساں خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔ ممتاز اس فلم کی ہیروئن تھیں اور انہوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ یہ ان کی بہترین فلموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

اس فلم کے موسیقار روبن گھوش تھے۔ روبن کی موسیقی کا انداز منفرد تھا۔ انہوں نے پاکستانی فلموں کے لیے کئی یادگار موسیقی بنائی ہے۔ وہ نذرالاسلام کے پسندیدہ موسیقار تھے۔ انکی بنائی ہوئی طرزیں آج بھی بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔

امبر کے نغمات بہت پسند کیے گئے تھے لیکن درج ذیل چار گانے بہت زیادہ مقبول ہوئے تھے۔ کلیم عثمانی اور تسلیم فاضلی کے لکھے ہوئے گانوں کو روبن گھوش نے ایک منفرد رنگ دیا تھا۔ گلوکاروں میں مہدی حسن، اے نیر اور نیرہ نور کے گائے ہوئے گانے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

1۔ جس دن سے دیکھا ہے تم کو صنم
گلوکار مہدی حسن۔ یہ گانا ندیم پر فلمایا گیا تھا۔

2۔ ٹھہرا ہے سماں
ہم تم ہیں جہاں ...... گلوکار مہدی حسن۔

3۔ ملے دو ساتھی، کھلی دو کلیاں
دیوانہ دل ہے، دیوانہ موسم ...... گلوکار، اے نیر۔

4۔ پاگل بے وقوف ادھر آ
...... آ گیا ...... گلوکار، نیرہ نور۔ یہ گانا ندیم اور ممتاز پر فلمایا گیا تھا۔

5۔ ہاں جی ...... میں نے پی ہے، تمہاری قسم
گلوکارہ، مہناز۔

اس فلم کے بہترین موسیقار کی حیثیت سے روبن گھوش کو ایوارڈ دیا گیا تھا۔ تیکنیکی اعتبار سے یہ ایک خوبصورت فلم تھی۔ افضل چوہدری نے بہت اچھی فوٹوگرافی کی تھی۔ افضل چوہدری کا تعلق ڈھاکا سے تھا لیکن انہوں نے لاہور میں بھی کئی فلموں کی بہت اچھی عکاسی کی تھی۔

نذرالاسلام کی روایت کے مطابق انہوں نے بہت اچھی ہدایت کاری اور کہانی کو اس انداز سے پیش کیا کہ فلم میں شروع سے آخر تک اسکرین سے نظر نہیں ہٹتی اور یہی ایک ہدایت کار کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

آج جو لوگ تکنیک کے اعتبار سے بھارتی فلموں کو ترجیح دیتے ہیں اگر وہ نذرالاسلام کی فلمیں دیکھیں تو ان کی رائے تبدیل ہو جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستانی فلمی صنعت عروج پر تھی۔

جاری ہے

سفیرِ موسیقی

سید عدنان ذاکر علی

ہر انسان خامیوں اور خوبیوں کا مرقع ہے۔ جس بھی مخفی قوت کو مہمیز کیا جائے ...... وہ ابھر کا سامنے آجائے گی۔ اسی لیے تو عمل کو حاصلِ حیات کہا گیا ہے۔ جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق مخفی قوت ابھرے گی۔ وہ بھی ایک عام سا بندہ تھا مگر اپنی ذہنی استطاعت کو صحیح طور پر استعمال کرنا جانتا تھا اسی لیے تو آج چہار سو اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دھنیں ہر ایک کا دل موہ لیتی ہیں اور یہ کمال اسے تب حاصل ہوا جب وہ ہندو سے مسلمان بنا۔

برصغیر کے ایک معروف موسیقار کی زندگی کا عکس

یہ 1991ء کا ذکر ہے۔ جنوبی ہندستان کے مشہور فلم میکر منی رتنم کو اپنی اگلی فلم کے لیے ایک نئے موسیقار کی تلاش تھی۔ یہ خاصی حیران کن بات تھی کیونکہ اس سے پہلے مشہور تامل موسیقار الیا راجا کے ساتھ رتنم کی دس سالہ رفاقت چلی آ رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ اگر منی رتنم فلم بنائے گا تو موسیقی کے لیے الیا راجا ہی کو منتخب کرے گا۔ دونوں ہی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور مدراس کی فلم انڈسٹری

میں ان کا نام ٹریڈ مارک کا درجہ رکھتا تھا۔ الیا راجا ایک اعلیٰ پائے کا موسیقار تھا۔ اس کے کام پر باقاعدہ تھیسس (Thesis) لکھا جاچکا ہے۔

اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب الیا راجا نے پریس کانفرنس میں رتنم کے بارے میں نامناسب باتیں کیں جن کا تعلق رتنم کی آخری فلم دلاپتی (تامل) سے تھا۔ فلم کی موسیقی ظاہر ہے کہ الیا راجا نے ہی ترتیب دی تھی اور اسی دوران دونوں کسی بات پر اُلجھ پڑے تھے۔ قصہ مختصر کہ منی رتنم نے الیا راجا سے تعلق توڑ لیا اور اپنی نئی فلم کے لیے کسی نوجوان لیکن باصلاحیت موسیقار کی تلاش شروع کردی۔

ایک دن وہ ایوارڈز کی ایک تقریب میں شریک تھے جو کہ ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے متعلق لوگوں نے منعقد کی تھی۔ وہیں پر اس کے کزن شاردا تری لوک نے، جو کہ اشتہاری فلموں کا تخلیق کار تھا۔ اسے ایک 24 سالہ نوجوان سے ملوایا۔ یہ تامل نوجوان شاردا کے لیے کافی سارے اشتہار کمپوز کرچکا تھا۔ اور Leo Coffee کے اشتہار کے لیے وہ اس تقریب میں ایوارڈ بھی حاصل کرچکا تھا۔ یہ نوجوان منی رتنم جیسے عظیم تخلیق کار سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے رتنم کو اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو آنے کی دعوت دی جو مدراس میں ہی واقع تھا۔

صرف چھ مہینے بعد ہی منی رتنم اس نوجوان کے اسٹوڈیو میں آپہنچا جہاں اس نوآموز موسیقار نے رتنم کو اپنی تخلیق کردہ کچھ دھنیں سنائیں۔ ایک خاص دھن جو اس نوجوان نے اپنے بچپن کے دوست بھارت بالا کے ساتھ مل کر بنائی تھی رتنم کو بہت پسند آئی تھی۔ مجموعی طور پر بھی اس نوجوان کا کام قابلِ تعریف تھا۔ رتنم نے اسی دن اس نوجوان کو اپنی اگلی فلم کے لیے بہ حیثیت موسیقار منتخب کرلیا۔

جس اسٹوڈیو میں اس تامل فلم کا معاہدہ طے پایا، وہ آج Panchattan Recording کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ نوجوان موسیقار اے۔ آر۔ رحمان تھا اور فلم تھی رُوجا۔

☆☆☆

دنیا جسے آج اے آر رحمان (اللہ رکھا رحمان) کے نام سے جانتی ہے، وہ پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ والدین نے اس کا نام دلیپ رکھا تھا۔ اس کا تعلق ایک تامل ہندو گھرانے سے تھا جو مدراس (موجودہ چنائے) میں رہ رہا تھا۔ مدراس کا ساحلی شہر جنوبی ہند کے صوبے تامل ناڈو کا دارالحکومت ہے اور تامل فلم انڈسٹری کا مرکز بھی۔ اس کے علاوہ یہاں ملیالم اور تیلگو فلموں کا کاروبار بھی عروج پر ہے۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری (بالی ووڈ) کی طرح تامل فلم انڈسٹری بھی نہایت منافع بخش صنعت ہے۔ 6 جنوری 1967ء کو پیدا ہونے والا دلیپ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ اس کے والد آر کے شیکھر ملیالم فلموں کے ایک قابل موسیقار تھے اور غالباً یہی صلاحیتیں دلیپ کو وراثت میں ملیں۔

دلیپ کے گھر میں لتا منگیشکر کی ایک قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ آر کے شیکھر لتا کے بہت بڑے پرستار تھے۔ انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہی عظیم گلوکارہ ان کے بیٹے کے کمپوز کردہ گیت بھی گائے گی۔

ایک قابلِ ذکر واقعہ اس وقت پیش آیا جب دلیپ صرف چار سال کا تھا۔ اس کے والد کے ایک موسیقار دوست سدرشنم ماسٹران سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دلیپ کو ہارمونیم بجاتے دیکھا۔ اتنی کم عمر میں مہارت سے ہارمونیم بجاتے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ امتحان کے طور پر انہوں نے ہارمونیم کی keys پر کپڑا ڈال دیا اور دلیپ سے کہا کہ اب بجا کر دکھاؤ۔ حیرت انگیز طور پر دلیپ نے بڑی مہارت سے بجا کر دکھایا وہ صاحب بہت متاثر ہوئے اور اپنے دوست آر کے شیکھر کو تاکید کی کہ اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دے۔

دلیپ کا بچپن زیادہ اچھا نہیں گزرا۔ وجہ اس کے والد کی بیماری تھی۔ ایک قیاس آرائی یہ ہے کہ ان کے حریفوں نے حسد میں آکر بدعملیات اور کالے جادو کا سہارا لیا تھا جس کی وجہ سے آر کے شیکھر ایک ناقابلِ تشخص بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ دلیپ کا زیادہ تر بچپن ہسپتالوں میں گزرا۔ کیونکہ اس کے والد گھر کے واحد کفیل تھے لہٰذا ان کی بیماری کی وجہ سے گھریلو حالات بدتر ہوگئے۔

ڈاکٹر اپنی سی کوشش کرتے رہے لیکن بیماری سمجھ میں نہ آسکی ..... ہندو پنڈتوں اور عاملوں سے روحانی علاج اور دعائیں کرائی گئیں، عیسائی مشنریوں سے بھی رابطہ کیا گیا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ جب تک مسلمان پیر اور روحانی معالج آئے، تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ دلیپ یتیم ہوگیا۔

یہ دلیپ اور اس کے گھرانے پر بڑا کڑا وقت تھا۔ والد کی موت کے بعد دلیپ ٹوٹ سا گیا تھا۔ اتنی کم عمر میں اس پر بیوہ ماں اور تین بہنوں کا بوجھ آپڑا تھا۔ گھر کے مالی حالات بھی اچھے نہ تھے۔ دلیپ سوچتا تھا کہ ساری مشکلات اور تکالیف اس کے گھرانے کے نصیب میں کیوں ہیں؟ اس کا خدا پر سے ایمان اُٹھ گیا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر خدا ہوتا تو اس کڑے وقت میں ان لوگوں کی مدد کے لیے ضرور آتا۔ غرضیکہ دلیپ نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہوگیا تھا۔

گھر چلانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنے والد شیکھر کے آلاتِ موسیقی کرائے پر دینا شروع کردیے۔ اس کے علاوہ دلیپ کی والدہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے والد کے دوستوں کی صحبت میں رہ کر موسیقی سیکھے۔ اس وقت دلیپ کی والدہ کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ مشورہ اس گھرانے کی قسمت بدل دے گا۔

دلیپ نے ماں کی تاکید کے مطابق تامل موسیقاروں کی صحبت میں رہنا شروع کردیا۔ یہ لوگ اس کے والد کی عمر کے تھے لیکن دلیپ کی یتیمی اور پھر اس کی قدرتی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس پر خصوصی توجہ دی۔ اب دلیپ مقامی موسیقاروں کے گروپ میں شامل ہوگیا تھا اور مختلف فنکشن میں پرفارم کرنے لگا تھا۔

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ گھر کے حالات کچھ سنبھل گئے تھے۔ لیکن دلیپ کی تخلیقی صلاحیتیں کچھ جدت کا مطالبہ کررہی تھیں۔ وہ مقامی موسیقاروں کے ساتھ لگے بندھے روٹین کا کام کرتے کرتے بور ہوچکا تھا۔ سب سے پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ گوکہ اب بھی وہ اتنا ریگولر طالب علم نہ تھا کیونکہ اکثر اسے میوزیکل گروپ کے ساتھ دوروں پر جانا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گیارھویں گریڈ میں وہ مدراس کرسچن کالج سے ڈراپ ہوگیا۔

یہی وقت تھا جب قدرت نے دلیپ کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کو الیا راجہ کے ٹروپ کے ساتھ لندن جانے کا موقع ملا۔ وہاں اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور Trinity College of Music سے ویسٹرن کلاسیکل میوزک میں ڈگری حاصل کی۔ اس دوران اس کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مشرقی اور مغربی موسیقی کا امتزاج، جو آگے چل کر اس کا ٹریڈ مارک کہلایا۔ اسے یہیں سیکھنے کو ملا، اس کے علاوہ اس نے مختلف مغربی سازوں اور آلاتِ موسیقی سے واقفیت حاصل کی جن کا استعمال مشرقی موسیقار ان دنوں ذرا کم ہی کرتے تھے۔

لندن سے واپسی پر دلیپ اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت پُرامید تھا۔ جو تربیت اس نے لندن میں موسیقی کے حوالے سے حاصل کی تھی اور وہ تجربہ جو اسے ایک مختلف دنیا کو قریب سے دیکھنے پر حاصل ہوا تھا۔ اس نے دلیپ کو بے حد پُراعتماد بنادیا تھا۔

ایک مستند ڈگری کی بدولت مختلف اشتہاری کمپنیوں نے دلیپ کو اپنی مصنوعات کے لیے جنگلز کمپوز کرنے کی دعوت دی۔ دلیپ نے انہیں غنیمت جان کر معاہدے شروع کردیے۔ انہی دنوں اس گھرانے پر پھر ایک امتحان آپڑا۔ دلیپ کی چھوٹی بہن ایک پراسرار بیماری میں مبتلا ہوگئی، یوں لگتا تھا کہ کوئی دشمن ہاتھ دھو کر اس بدنصیب گھرانے کے پیچھے پڑگیا ہے۔ مختلف ہسپتالوں میں علاج ہوتا رہا لیکن اس کی حالت بدستور بگڑتی رہی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ تمام گھرانے غم سے نڈھال تھے اور مایوس ہوچکے تھے۔ کسی عزیز نے دلیپ کی والدہ کو ایک مسلمان پیر صاحب کا پتا بتایا جو پیر قادری کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا تھا۔ مریضہ کو ان پیر صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ دلیپ ان نیک بزرگ کے چہرے پر پھیلے نور سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بزرگ نے مریضہ کے اہلِ خانہ کو تسلی دی اور اللہ کا نام لے کر مریضہ کا علاج شروع کیا۔ خدا نے اس گھرانے پر رحم کیا اور دلیپ کی بہن کو شفا نصیب ہوئی۔ گھر والوں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور نہایت عقیدت کا اظہار کیا۔

اس موقع پر بزرگ نے وہ باتیں بتائیں جو آگے چل کر دلیپ کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔ انہوں نے انسان اور زندگی کا فلسفہ بیان کیا۔ انہوں نے سمجھایا کہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی زندگی اور موت عطا کرنے والا ہے، وہی عزت اور ذلت دینے والا ہے۔ وہی بیماروں کو تندرستی دینے والا ہے۔ لہٰذا شکریہ اس ذات کا ادا کرنا چاہیے جس نے سب کو پیدا کیا۔ ان باتوں نے دلیپ، اس کی والدہ اور بہنوں کو بہت متاثر کیا۔ اتنا کہ انہوں نے زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرلیا۔

مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کوئی چھوٹا فیصلہ تو نہیں ہوتا۔ جی ہاں! تمام گھر والوں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دلیپ جو پہلے ہی حق کی تلاش میں تھا، آج کہتا ہے۔

"ہمیں کبھی اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہوا۔ جب تک میں دلیپ تھا، میری ذات ایک خول میں بند تھی اور میں احساسِ کمتری کا مارا ہوا تھا۔ مذہب اسلام نے مجھے ایک نیا

جنم دیا ہے۔"

دلیپ شروع سے ہی عظیم موسیقار نوشاد علی کا پرستار رہا تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ اس عظیم موسیقار کی خدمت میں حاضر ہوا اس اور اسلام قبول کرنے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ دلیپ کی والدہ چاہتی تھیں کہ دلیپ موسیقی کو بطور پیشہ اپنا لے لہٰذا انہوں نے نوشاد صاحب سے بیٹے کے حق میں دعا کی درخواست کی۔ نوشاد صاحب ماں بیٹے کی درخواست پر ان کے گھر تشریف لائے جہاں پیر قادری صاحب نے دلیپ اور اس کے اہلِ خانہ کو نوشاد صاحب کی موجودگی میں مشرف بہ اسلام کیا۔

دلیپ کا اسلامی نام رحمان رکھا گیا۔ بعد میں نوشاد صاحب کے مشورے سے ہی اس میں اللہ رکھا کا اضافہ کیا گیا۔

نوشاد صاحب سے آج تک رحمان کو قلبی لگاؤ ہے۔ اب بھی وہ اس عظیم موسیقار کی صحبت میں رہ کر موسیقی کے اسرار و رموز سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نوشاد صاحب خود بھی رحمان کی موسیقی کے اوپر دسترس اور اس کی فطری صلاحیتوں کا اعتراف کر چکے ہیں۔

دلیپ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ سن 1991ء کا ہے۔ یہ فیصلہ دلیپ اور اس کے گھر والوں نے گہری غور و فکر کے بعد سچے دل سے کیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اے آر رحمان تسلسل فن کی بلندیاں کامیابی سے عبور کرتا چلا آیا ہے۔ اتنا اطمینان، سکون اور حق کو پا لینے کی خوشی ان لوگوں نے پہلے کبھی نہ محسوس کی تھی۔ آج ساری دنیا میں رحمان کے چاہنے والے موجود ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رحمان کی مرتب کردہ دھنیں سنتے ہوئے دنیا سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ اپنے غم بھلا دیتے ہیں اور زندگی کے ایک نئے رُخ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ اتنی مسحور کن موسیقی تخلیق کرنا کسی عام انسان کا کام نہیں، یہ تو اللہ کی دین ہے۔

رحمان اپنی کامیابیوں کا کریڈٹ پورے آرکسٹرا کو دیتا ہے۔ رحمان کا ڈرمر Drummer، شیوامنی، جو رحمان کے بچپن کا دوست بھی ہے۔ دنیا کے چند بہترین ڈرمرز میں سے ہے۔ Flutist نوین بھی رحمان کی... کامیابیوں میں شریک رہا ہے۔ جسے بانسری بجانے کے فن پر حیرت انگیز عبور حاصل ہے۔ فلم Bombay کا تھیم میوزک نوین کا فنی شاہکار مانا جاتا ہے۔

رحمان موسیقی کا سارا کام رات کے سناٹے میں انجام دیتا ہے۔ اس کے خیال میں رات کا سکون اس کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ موسیقی بنانا ایک مکمل طور پر تخلیقی کام ہے۔

شامت ان بیچارے فلم میکرز اور ہدایت کاروں کی آتی ہے۔ جن کی فلم کے لیے رحمان گانے بنا رہا ہوتا ہے۔ عام طور پر ہدایت کار فلم کی سچویشن کے مطابق گانے بنواتے ہیں۔ لہٰذا ان کا جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ بہر حال حیرت انگیز ہوتا۔ رات کے وقت کام کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ کیریئر کے آغاز میں جب رحمان دن کے نارمل اوقات میں کام کرتا تھا تو دن بھر کی مصروفیت کے باعث رات گئے سونا نصیب ہوتا تھا اور یوں اس کی صبح کی نماز چھوٹ جاتی تھی۔ اب وہ عشاء کی نماز ادا کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے اور رات بھر یکسوئی کے ساتھ اپنے پیشے سے انصاف کرتا ہے۔ اس دوران کوئی ملاقاتی، نہ کوئی فون کال اس کو ڈسٹرب کرتی ہے۔ علی الصبح نماز پڑھ کر وہ سو جاتا ہے۔ دوپہر میں جاگتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے، گھریلو فرائض انجام دیتا ہے۔ فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہے اور رات کو پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو کا رُخ کرتا ہے جو اس کے گھر سے ہی ملحق ہے۔

رحمان کی بیوی کا نام سائرہ بانو ہے۔ اللہ نے اس جوڑے کو دو بیٹیوں سے نوازا ہے جو ابھی اسکول میں پڑھتی ہیں۔

رحمان پر اکثر یہ تنقید کی جاتی رہی ہے کہ وہ بہت سستی سے کام کرتا ہے۔ ایک فلم کی موسیقی بنانے میں بعض اوقات مہینوں لگا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمان خود اپنے کام کا سب سے بڑا نقاد ہے۔ جب تک وہ خود کسی دھن سے مطمئن نہیں ہو جاتا، آگے نہیں بڑھتا۔ اس کے علاوہ دیگر موسیقاروں ... کی طرح ایک ساتھ بہت ساری فلمیں سائن نہیں کرتا۔ وہ کم لیکن معیاری کام کرتا ہے۔

فی الوقت رحمان ایک فلم کی موسیقی تخلیق کرنے کے عوض 8 سے 10 کروڑ روپے لیتا ہے جبکہ اس کو اپنی پہلی فلم "روجا" کے صرف 25 ہزار روپے ملے تھے! 2004ء کے اکنامک سروے کے مطابق بھارت کی انٹرٹمنٹ انڈسٹری کے سب سے زیادہ کمانے والے افراد میں رحمان تیسرے نمبر پر ہے۔ سورج برجاتیہ اور سبھاش گھئی بالترتیب پہلے اور دوسرے نمبر پر ہیں۔ لیکن رحمان یہ ساری رقم اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو کو جدید سے جدید تر بنانے میں لگا دیتا ہے۔ رحمان بھارت کا پہلا فرد تھا جس نے اپنے اسٹوڈیو کے لیے جدید ترین کمپیوٹر Apple Macintosh بنا

سے درآمد کیا۔

☆☆☆

رحمان کی پہلی فلم "روجا" دراصل تامل زبان میں بنائی گئی تھی۔ فلم کا ابتدائی حصہ مدراس کے گرد و نواح میں اور باقی حصہ کشمیر کی خوبصورت پہاڑیوں پر فلمبند کیا گیا تھا۔ تقریباً دو سال بعد فلم کا ہندی ورژن ریلیز ہوا۔ لیکن اس سے پہلے ہی فلم کے گیت پورے بھارت میں دھوم مچا چکے تھے۔ تامل زبان سمجھنے والے بیشتر لوگ جنوبی بھارت میں مرکوز ہیں۔ تامل فلمیں بھی زیادہ تر جنوبی ہند میں ہی بزنس کرتی ہیں۔ لیکن جب روجا کی آڈیو مارکیٹ میں ریلیز ہوئی تو ایک طوفان آ گیا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ ایک نو آموز موسیقار اپنی پہلی ہی فلم میں ایسی لازوال دھنیں کیسے تخلیق کر سکتا ہے؟ جو لوگ تامل زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے، وہ بھی یہ گیت سن کر جھوم اُٹھے تھے۔ انہوں نے ایسی موسیقی پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اپنی پہلی ہی فلم پر رحمان کو بہترین موسیقی کا نیشنل ایوارڈ بھی دیا گیا۔

ہدایت کار منی رتنم اور پروڈیوسر کے بالا چندر کو بھی موسیقی کے اس طرح ہٹ ہو جانے کی توقع نہ تھی۔ فلم میں ساؤتھ انڈیا کے باصلاحیت اداکار اروند سوامی نے ایک محب وطن سرکاری افسر کا کردار ادا کیا تھا۔ روجا کا مرکزی کردار مدھو نے ادا کیا تھا جو اُن دنوں نو آموز اداکارہ تھی۔ اس فلم کے تقریباً تمام گیت ہی مشہور ہوئے۔

1۔ یہ حسین وادیاں (ایس پی بالا۔ چترا)
2۔ چھوٹی سی آشا (من منی)
3۔ روجا جان من (اس گانے کے دو ورژن بنائے گئے تھے۔ ایک ہری ہرن کی آواز میں اور دوسرا ایس پی بالا سبرمینم کی آواز میں)
4۔ رکمنی رکمنی (بابا سہگل۔ شوبتا شیتھی)

فلم کے گیت پی۔ کے۔ مشرا نے لکھے تھے۔ منی رتنم کو رحمان کا کام اتنا پسند آیا تھا کہ اس نے اپنی آئندہ فلموں کے لیے بھی اسی کی خدمات حاصل کرنا چاہیں۔ دراصل روجا کا میوزک ہٹ ہوتے ہی رحمان کو مختلف فلم میکرز کی طرف سے آفرز آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس میں سے بیشتر تامل فلم میکرز ہی تھے۔ رحمان جانتا تھا کہ فلموں میں گانے صرف خانہ پری کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ صرف ان فلمسازوں کے ساتھ کام کرنے کا خواہشمند تھا جو موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور جن پر رحمان کو بھروسا تھا کہ وہ اس کی محنت کو رائگاں نہیں جانے دیں گے۔ اس نے سوچ سمجھ کر چند فلمیں منتخب کیں اور یوں اس کا کیریئر چل پڑا۔ عزت، شہرت اور دولت اب اس کے لیے مسئلہ نہیں رہی تھی۔ قدردانوں کے ساتھ ساتھ اب اس کے دشمن بھی پیدا ہو گئے تھے۔ یہ وہ انتہا پسند ہندو تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ ایک مسلمان شخص بھارتیوں کے دلوں پر راج کرے۔

☆☆☆

1992ء میں ہونے والے بمبئی فسادات نے منی رتنم کے حساس ذہن کو بہت متاثر کیا تھا۔ خصوصاً بابری مسجد کا سانحہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام اقوام کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ چنانچہ منی رتنم نے اس موضوع پر فلم بنانے کا سوچا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اپنی فلموں کے لیے اچھوتے موضوع ڈھونڈنے کے لیے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اس کی فلموں میں انسانی فطرت کی بڑی خوبصورت عکاسی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لیجنڈ مانا جاتا ہے۔

یہ فلم Bombay تھی۔ فلم کا ہیرو ایک مرتبہ پھر تامل سپر اسٹار اروند سوامی تھا اور ہیروئن منیشا کوئرالہ تھی۔ اروند اب مکمل طور پر فلموں سے کنارہ کش ہو چکا ہے اور امریکا میں بزنس کرتا ہے۔

Bombay کے گیت معروف نغمہ نگار محبوب نے لکھے تھے۔ جبکہ موسیقی کے لیے منی رتنم نے ایک بار پھر رحمان کا انتخاب کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رحمان ہی اس حساس موضوع سے انصاف کر سکتا ہے۔ رحمان نے بھی اس اعتماد کا حق ادا کر دیا۔ اس نے محبوب کے ساتھ مل کر نہایت خوبصورت گیت تخلیق کیے تھے۔

1۔ کہنا ہے کیا (چترا۔ کورس)
2۔ حما حما (Remo Fernandes)
3۔ تو ہی رے (ہری ہرن۔ کویتا کرشنا مورتی)

حما حما کا تامل ورژن رحمان نے خود گایا تھا۔

فلم Bombay کے گانے رحمان کے تخلیق کردہ بہترین گانوں میں سے ہیں اور آج بھی سنے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

انہی دنوں ایک تامل فلم "جنٹلمین" بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں رحمان نے کافی تیز میوزک بنایا تھا۔ آنے والی فلموں میں بھی رحمان نے کچھ ایسے ڈانس نمبرز تخلیق کیے جو نوجوان نسل کو دیوانہ بنا گئے۔ فلم "ہم سے ہے مقابلہ" کے گانے Take it easy urvashi اور مکالا

مقابلہ' بہت مشہور ہوئے تھے۔جن ڈانس کلبز میں مائیکل جیکسن کے گانے بجا کرتے تھے۔ وہاں اب اے آر رحمان کی موسیقی گونجنے لگی تھی۔ برصغیر کے نوجوان جو پہلے مشرقی موسیقی سننے میں شرمندگی محسوس کرتے تھے، اب بڑے فخر سے رحمان کے کمپوز کردہ گانوں پر تھرکتے تھے۔

فلم ہم سے ہے مقابلہ میں تامل فلموں کے مشہور کوریوگرافر پربھودیوا کو ہیرو لیا گیا تھا۔اس نے رحمان کے گانوں پر کمال کا رقص کرکے سب کو حیران کردیا۔ پھر تو جیسے ان دونوں کی جوڑی مشہور ہوگئی اور لوگ کہنے لگے کہ رحمان کے انو کے میوزک کے ساتھ پربھودیوا ہی انصاف کرسکتا ہے۔خود پربھو نے بھی رحمان کے گانے پکچرائز کرنے کو ایک چیلنج قرار دیا۔

1995ء میں ہی رحمان نے مشہور تامل فلم میکرز رام گوپال ورما کی دو فلمیں سائن کیں۔ یہ فلمیں رنگیلا اور دوڑ تھیں۔ رام گوپال ورما جیسے جنونی تخلیق کار کے ساتھ کام کرکے رحمان نے وہ مشہور گانے تخلیق کیے جو آج بھی پسند کیے جاتے ہیں۔ انہی فلموں سے رحمان نے آشا بھوسلے کو فلمی موسیقی میں دوسرا جنم دیا جو اس وقت تک گمنامی کا شکار ہوچکی تھی۔

فلم 'دوڑ' ایک ہلکی پھلکی کامیڈی فلم تھی جس میں سنجے دت اور ارمیلا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ رحمان نے عام ڈگر سے ہٹ کے گانے تخلیق کیے تھے۔

1۔او بھنورے (آشا بھوسلے۔سری نواس)

2۔شبا شبا ہائے ربا (سوارن لتا۔سونو نگم)

''رنگیلا'' وہ پہلی فلم تھی جس میں عامر خان نے اپنی بھرپور اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ منا کا پاورفل کردار اس کو شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔اس کے علاوہ کاسٹ میں جیکی شروف اور ارمیلا بھی شامل تھے۔ رام گوپال ورما نے تمام فنکاروں سے بہترین کام لیا تھا۔رنگیلا کے تمام ہی گانے پسند کیے گئے تھے۔

1۔تنہا تنہا (آشا بھوسلے)

2۔رنگیلا رے (آشا بھوسلے)

3۔یاروسن لو ذرا (ادت نرائن۔چترا)

4۔ہائے راما یہ کیا ہوا۔ (ہری ہرن۔سوارن لتا)

☆☆☆

1996ء میں مشہور تامل اداکار اور فلم میکر کمل ہاسن نے رحمان کو اپنی فلم ''ہندوستانی'' کی موسیقی کے لیے منتخب کیا۔کمل ہاسن اور منیشا کوئرالہ نے فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

رحمان نے پھر تجربے کیے اور بالکل مختلف قسم کا کام پیش کیا۔

1۔ٹیلیفون دھن (کویتا کرشنا مورتی۔ہری ہرن)

2۔لٹکا دکھا دیا (واسندرا داس۔سوارن لتا)

3۔مایا مچھندرا (سوارن لتا۔ایس پی بالا)

اسی سال رحمان کی ایک اور فلم سپنے ریلیز ہوئی۔ اروند سوامی اور کاجول نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔رحمان نے بہت خوبصورت گیت پیش کیے تھے۔

1۔آوارہ بھنورے۔ (ہیما سرڈیسائی)

2۔اک بگھیا (چترا۔شنکر مہادیون)

3۔چندا رے (چترا۔ہری ہرن)

☆☆☆

رحمان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناتجربہ کار آوازیں استعمال کرنے سے نہیں ہچکچاتا ہے۔ کئی نوآموز گلوکاروں کو رحمان نے چانس دیا اور وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ آج کے مشہور پلے بیک سنگر سونو نگم کو فلمی دنیا میں روشناس کرانے کا سہرا بھی رحمان کے سر جاتا ہے۔ نامور گائک ہری ہرن کو بھی رحمان نے فلم 'روجا' کے ذریعے فلمی موسیقی میں روشناس کرایا تھا۔ سکھویندر سنگھ نے فلم دل سے ...... کا گیت 'چل چھیاں چھیاں' گایا اور راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا۔ آج وہ رحمان کے ٹروپ کا ایک اہم رکن ہے۔

آج بھی تمام پلے بیک سنگرز رحمان کے لیے گانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اپنی تمام مصروفیات ترک کرکے گانوں کی ریکارڈنگ کرانے مدراس جانا پڑتا ہے — جہاں 'پنچتن ریکارڈ ان' میں وہ بہترین وقت گزارتے ہیں۔

رحمان وقتاً فوقتاً اپنی آواز میں بھی گانے گاتا رہا ہے۔ تامل زبان میں بھی اور ہندی میں بھی۔اس کا ہندی تلفظ سو فیصد درست نہیں ہے لیکن یہی چیز گیت کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ رحمان نے اپنی آواز میں پہلا مکمل گانا 'مصطفیٰ مصطفیٰ' گایا تھا جو فلم 'دنیا دل والوں کی' میں شامل تھا۔اس کے بعد رحمان نے وندے ماترم، اور فلم دل سے ...... کا ٹائٹل سانگ بھی خود گایا تھا اور یہ گانے بھی بہت پسند کیے گئے تھے۔

☆☆☆

1997ء میں بھارت کی آزادی کے پچاس سال پورے ہورہے تھے۔ایک دن رحمان کے بچپن کے دوست بھارت بالا جو ایک معروف پروڈکشن کمپنی کا مالک بھی ہے

رحمان سے رابطہ کیا۔اس کا خیال تھا کہ دونوں کو مل کر بھارت کی گولڈن جوبلی کے لیے کچھ خاص کام کرنا چاہیے۔ رحمان اس خیال سے سو فیصد متفق تھا۔ دونوں کی حب الوطنی کسی شک وشبے سے بالاتر تھی۔

معروف ریکارڈز کمپنی sony music ان دنوں ایک انٹرنیشنل البم تیار کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔انہوں نے اس سلسلے میں لاتعداد فنکاروں پر غور کیا لیکن نظرِ انتخاب اے آر رحمان پر ٹھہری۔ رحمان اور بھارت بالا کے پاس اپنے خواب کی تکمیل کا یہ سنہری موقع تھا۔لہٰذا انہوں نے کام شروع کردیا۔

یہ البم وندے ماترم' تھا جس میں رحمان نے پہلی مرتبہ بین الاقوامی سطح پر کام کیا تھا۔اسی البم کے لیے رحمان نے معروف پاکستانی فنکار نصرت فتح علی خان صاحب کے ساتھ بھی ایک گانا ریکارڈ کیا اور خان صاحب کے بے مثال فن سے بے حد متاثر ہوا۔

دونوں کا آئندہ بھی کام کرنے کا ارادہ تھا لیکن خان صاحب کی زندگی نے وفا نہ کی۔

استاد نصرت فتح علی خان صاحب کی عظمت کے پیشِ نظر رحمان گیت کی ریکارڈنگ کے لیے خود پاکستان آیا تھا۔ لاہور میں ایک رات کے قیام کے دوران اس نے خان صاحب کے ساتھ ریکارڈنگ میں حصہ لیا اور اگلی دوپہر کی فلائٹ سے واپس مدراس روانہ ہوگیا۔ یہ رحمان کا اب تک پاکستان کا واحد دورہ ہے۔

دوستی نامی گیت رحمان اور خان صاحب نے مل کر گایا تھا اور اس کے علاوہ اسکول کی بچیوں کی آواز کورس کی صورت شامل ہیں۔اس خوبصورت گیت میں امن اور محبت کا پیغام دیا گیا تھا۔ گانا کچھ یوں ہے......

چندا سورج لاکھوں تارے
ہیں جب تیرے ہی یہ سارے
کس بات پہ ہوتی ہیں پھر تکراریں
کھینچی ہیں لکیریں اس زمین پہ، پھر نہ کھینچو دیکھو
بیچ میں دو دلوں کے یہ دیواریں......

البم کی ریلیز کے لیے 15 اگست 1997ء کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ جشنِ آزادی کی رات کو جب رحمان نے نئی دہلی کے مشہور گاندھی چوک پر البم کا ٹائٹل سانگ 'ماں تجھے سلام' پیش کیا تو موقع پر موجود لاکھوں افراد سمیت سارا بھارت دیوانہ ہوگیا تھا۔اس اعلیٰ سطح کے فنکشن میں بھارت کے صدر اور وزیراعظم بھی موجود تھے۔ سبھی کے دل میں رحمان کے لیے بے تحاشا محبت اور عقیدت کا اضافہ ہوگیا تھا۔

اس کے اگلے ہی دن استاد نصرت علی خان صاحب کا لندن میں انتقال ہوگیا تھا۔ان کی زندگی کی آخری پرفارمنس رحمان کے ساتھ ہی تھی۔ وہ بھی رحمان کی فنی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور آئندہ بھی اس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ رحمان اعتراف کرتا ہے کہ قوالی کا فن اس نے نصرت صاحب سے ہی سیکھا تھا۔

☆☆☆

1997ء میں ریلیز ہونے والی رحمان کی پہلی فلم ہدایت کار، پریادرشن کی ''کبھی نہ کبھی'' تھی۔اس فلم میں پوجا بھٹ، انیل کپور اور جیکی شروف نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم گوکہ باکس آفس پر ناکام رہی لیکن رحمان کے گیت ایک مرتبہ پھر پسند کیے گئے۔

یہ فلم 'شوگن فلمز لمیٹڈ' کے بینر تلے بنائی گئی تھی اور پروڈیوسر کی اناڑی پن کی وجہ سے اس خوبصور فلم کو اس کا جائز حق نہ ملا۔ کمزور پبلسٹی کی وجہ سے فلم کا امیج نہیں اُبھارا گیا تھا۔ فلم کے نمایاں گیت یہ تھے۔

1۔میرے یارا دلداء (چترا۔ایس پی بالا۔ہری ہرن)

2۔شکریہ تیرا شکریہ (ایس پی بالا۔کورس)

3۔مل گئی وہ منزلیں (الکا یاگنک۔کمار سانو)

4۔تو ہی تو (چترا۔ایم شری کمار)

5۔تم ہو میری نگاہوں میں (ہری ہرن)

6۔میرے دل کا وہ شہزادہ (آشا بھوسلے)

1997ء میں ریلیز ہونے والی دوسری فلم 'وشواودھاتا' تھی۔ یہ فلم بھی نامناسب پبلسٹی کی وجہ سے فلاپ رہی۔ عائشہ جھلکا، جیکی شروف، شرد کپور اور پوجا بٹرا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم کا میوزک بہرحال پسند کیا گیا تھا۔

1۔کل نہیں تھا وہ کیا ہے۔ (انورادھا سری رام)

2۔جان تم ہو میری (علیشا چنائے، ہری ہرن)

3۔نظروں کے ملنے سے (کویتا کرشنا مورتی۔ ہری ہرن)

فلم 'دوڑ' گوکہ 1995ء میں شروع گئی تھی لیکن وہ بھی اسی سال یعنی 1997ء میں ریلیز ہوئی۔

☆☆☆

تامل ہدایت کار شنکر نے اپنی اگلی فلم 'Jeans' کے لیے اے آر رحمان کو موسیقی بنانے پر مامور کیا۔ لیکن

1998ء کا ذکر ہے اس تامل فلم کا ہندی ورژن بھی ریلیز ہوا۔ اسی مناسبت سے رحمان نے گیت بھی دونوں زبانوں میں الگ الگ بنائے۔ ایشوریہ رائے نے فلم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

ہدایت کار شنکر کا کام کرنے کا اسٹائل رام گوپال ورما کی طرح ہے۔ دونوں موسیقی سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور اس معاملے میں کافی خوش ذوق بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رحمان نے ان دونوں کے ساتھ کام کر کے ہمیشہ لطف محسوس کیا ہے اور نتیجہ بھی اچھا ہی برآمد ہوتا ہے۔

Jeans کے گیت بھی کافی مشہور ہوئے تھے۔

1۔ کولمبس کولمبس (سونو نگم۔ کورس)
2۔ توبہ توبہ یہ جلوے (ہری ہرن)
3۔ عجوبہ (انورادھا سری رام، ہری ہرن)
4۔ ہائے ربا (کویتا کرشنا مورتی۔ ادیت نرائن)

اسی سال منی رتنم نے اپنی پہلی ہندی فلم بنائی۔ اس سے قبل اس کی توجہ صرف تامل فلموں کی طرف تھی جہاں وہ لازوال کام کر چکا ہے۔

یہ فلم دل سے...... تھی۔ فلم تو باکس آفس پر ناکام رہی لیکن اس کے گانوں کی آج تک مارکیٹ میں ڈیمانڈ ہے۔

سال کی دوسری ہٹ فلمیں 'کچھ کچھ ہوتا ہے' اور 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' تھیں۔ ان فلموں کے گانے بھی کافی اچھے تھے۔ لیکن دل سے...... کی موسیقی نے نہ صرف ان دو فلموں کا مقابلہ کیا بلکہ اس کو محض اپنی موسیقی کے بل پر us Top 10 فلم چارٹ میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

معروف شاعر گلزار کے نغمات کو جن میں صوفیانہ رنگ نمایاں تھا۔ رحمان نے باکمال موسیقی سے سجایا تھا۔ فلم کی کہانی عام آدمی کی سمجھ سے باہر تھی جو کہ شمالی ہند کے نازک سیاسی معاملوں کا احاطہ کرتی تھی اس کے باوجود سنیما ہال پبلک سے بھرے ہوئے تھے۔ جو صرف فلم کے گانوں کی وجہ سے ٹکٹ خریدتے تھے۔

اس فلم میں لتا منگیشکر نے پہلی مرتبہ رحمان کا کمپوز کردہ گانا ریکارڈ کرایا۔ رحمان ہمیشہ سے ہی عاجز اور انکسار پسند رہا ہے اس کا خیال تھا کہ وہ لتا منگیشکر جیسی عظیم گلوکارہ کے فن سے انصاف نہیں کر سکے گا۔ لیکن 'جیا جلے' کی ریکارڈنگ کے بعد جب لتا جی نے اس کے کام کو سراہا تو اس نے اپنے آپ کو کافی پُراعتماد محسوس کیا تھا۔

چند سال قبل اپنی 80ویں سالگرہ کے موقع پر لتا منگیشکر نے اپنے گائے ہوئے 10 بہترین گانوں کی فہرست مرتب کی تو اس میں فلم دل سے...... کا گیت جیا جلے بھی شامل تھا۔ یہ بلاشبہ اے آر رحمان کے لیے نہایت فخر کی بات ہے۔

دل سے کے تقریباً تمام گیت پسند کیے گئے۔

1۔ اے اجنبی (مہالکشمی۔ ادیت نرائن)
2۔ دل سے رے (اے آر رحمان)
3۔ ست رنگی رے (سونو نگم)
4۔ چل چھیاں چھیاں (سکھوندر سنگھ۔ سپنا)
5۔ جیا جلے (لتا منگیشکر۔ ایم شری کمار)

مغربی ممالک میں بھی اس شاہکار موسیقی کو بے حد سراہا گیا تھا۔ براڈوے پروڈکشن لندن میں قائم ایک معروف پروڈکشن ہاؤس ہے جو دنیا بھر میں تھیٹر اور اسٹیج ڈراموں کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے روحِ رواں سر اینڈریو لائڈ ویبر "دل سے" کی موسیقی سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ تمام گانوں کا میوزک اور ان کی پکچرائزیشن انہیں بہت پسند آئی تھی۔ انہوں نے شیکھر کپور سے اس بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ شیکھر کپور ہالی وڈ و فلم انڈسٹری میں بھارت کے چند نمائندوں میں سے ایک ہے۔ شیکھر نے سر ویبر کو اس موسیقی کے خالق اے آر رحمان کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ سر ویبر رحمان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوری طور پر اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ملاقات 1999ء کے اوائل میں شیکھر کپور کے توسط سے مدراس میں ہوئی جب سر ویبر بذاتِ خود بھارت تشریف لائے۔ اسی ملاقات کے دوران فیصلہ ہوا کہ رحمان براڈوے پروڈکشنز کی اگلی پیشکش Bombay Dreams کی موسیقی مرتب کرے گا۔ یہ منصوبہ 2000ء میں مکمل ہوا۔ اسی سال Bombay Dreams لندن میں اسٹیج ہوا۔ 2003ء میں اسے نیویارک میں اسٹیج کیا گیا۔

فلم دل سے میں رحمان نے تیسری مرتبہ منی رتنم کے ساتھ کام کیا تھا اور نتیجہ حسبِ سابق حیرت انگیز نکلا تھا۔ لوگ کہنے لگے تھے کہ منی رتنم کے لیے رحمان اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دیتا ہے۔ لیکن رحمان کے خیال میں بات صرف ذہنی ہم آہنگی کی ہے۔ وہ خود بھی منی رتنم کی تخلیقی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ اس سے پہلے روجا اور Bombay کا میوزک بھی ریکارڈ تعداد میں بکا تھا لیکن دل سے کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے تو سونی میوزک کو شروعات ہی دو ملین

کیسٹس سے کرنا پڑی تھی۔ اس فلم سے دورِ حاضر کی معروف اداکارہ پریتی زنٹا نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

1998ء کے آخر میں ہدایت کار پریادرشن کی فلم 'ڈولی سجا کے رکھنا' ریلیز ہوئی۔ اکشے کھنہ اور معروف تامل اداکارہ جیوتکا نے فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم تو باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہ ہوئی لیکن گانے پسند کیے گئے۔

1۔ چل کھوارے (سکھوندر سنگھ۔ رانو)
2۔ قصہ ہم لکھیں گے (انورادھا پوڈوال۔ ایم شری کمار)
3۔ جھولا بانہوں کا (سادھنا سرگم)
4۔ بول بجنی (کویتا کرشنا مورتی، سونو نگم)
5۔ یہ کھویا کھویا رہتا ہے (بابل سپریو)

☆☆☆

1999ء رحمان کے پرستاروں کے لیے مسرتیں لے کر آیا تھا۔ اس سال رحمان کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ گووند نہلانی کی فلم 'تھکشک'، گو کہ متنازعہ موضوع پر بنائی گئی تھی۔ لیکن عوام میں پسند کی گئی۔ اجے دیوگن، تبو اور راہول بوس نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ رحمان نے محبوب کے لکھے گیت بہت خوبصورتی سے کمپوز کیے تھے۔

1۔ رنگ دے (آشا بھوسلے۔ کورس)
2۔ خاموش رات (روپ کمار، راٹھور)

رحمان نے اس پورے گانے میں صرف گٹارز استعمال کیے تھے۔

3۔ بوندوں سے باتیں (سجاتا)
4۔ ڈھولنا (سکھوندر سنگھ)

سال کی دوسری فلم '1947- Earth' تھی۔ معروف ہدایت کارہ دیپا مہتا نے یہ فلم تقسیم ہند کے موضوع پر بہت بے باکی سے بنائی تھی۔ عامر خان، راہول کھنہ اور نندیتا داس نے اس فلم میں لازوال کردار ادا کیے تھے۔ رحمان نے پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی کہ اس فلم میں اس نے بہت مختلف کام کیا ہے اور جب میوزک ریلیز ہوا تو لوگ سچ مچ سحر زدہ رہ گئے تھے۔ ہر گانا فلم کے نازک موضوع سے انصاف کرتا تھا۔ اس فلم کو بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ملی اور رحمان کی موسیقی کو بھی پسند کیا گیا۔ گیت جاوید اختر نے لکھے تھے۔

1۔ رت آ گئی رے (سکھوندر سنگھ۔ کورس)
2۔ ہورانی (سادھنا سرگم۔ کورس)
3۔ دھیمی دھیمی (ہری ہرن)
4۔ رات کی دلدل (سکھوندر سنگھ)
5۔ یہ جو زندگی ہے (چترا، سکھوندر، سری نواس)

فلم کے گیت نوجوان ہدایت کار فرحان اختر کے والد جاوید اختر نے لکھے تھے۔ رحمان پہلے صرف تامل اور انگریزی زبان سے ہی واقف تھا۔ فلمی دنیا میں مختلف شاعروں کے ساتھ کام کرنے سے ہی اس کی ہندی اور اردو بہتر ہوئی لیکن اب بھی وہ روانی سے یہ دونوں زبانیں پڑھ لکھ نہیں سکتا۔

1999ء کی سب سے بڑی ہٹ فلم 'تال' تھی۔ شومین کے نام سے معروف ہدایت کار سبھاش گھئی نے رحمان سے پہلی مرتبہ اپنی کسی فلم کے لیے موسیقی بنوائی تھی۔ انیل کپور، اکشے کھنہ اور ایشوریہ رائے نے فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ سبھاش گھئی نے اعتراف کیا کہ اسے لاتعداد راتوں تک جاگنا پڑا تا کہ رحمان کے اسٹوڈیو 'پنچتن ریکارڈ اِن' میں گانوں کی ریکارڈنگ کے وقت موجود رہے۔ تال بنیادی طور پر ایک میوزیکل فلم تھی جس کا ہر گانا موسیقی کا شاہکار تھا۔

1۔ عشق بنا (انورادھا سری رام، اے آر رحمان، سونو نگم)
2۔ کہیں آگ لگے (آشا بھوسلے، کورس)
3۔ نہیں سامنے (ہری ہرن)
4۔ تال سے تال ملا (الکا یاگنک، ادیت نرائن)
5۔ رمتا جوگی (الکا یاگنک، سکھوندر سنگھ)
6۔ نی میں سمجھ گئی (ریچا شرما، سکھوندر سنگھ)
7۔ کریئے نا (الکا یاگنک، سکھوندر سنگھ)

اس سال رحمان کی چوتھی فلم 'پکار' تھی۔ ہدایت کار راج کمار سنتوشی کے ساتھ رحمان نے پہلی مرتبہ کام کیا تھا۔ انیل کپور اور مادھوری ڈکشٹ کی برسوں پرانی جوڑی اس فلم میں ایک بار پھر یکجا ہو گئی تھی۔ فلم کے گیت بھی نہایت خوبصورت تھے۔

1۔ سنتا ہے میرا خدا (کویتا کرشنا مورتی۔ ادیت نرائن)
2۔ کے سرا سرا (کویتا کرشنا مورتی۔ شنکر مہادیون)
3۔ ہمرا ہی جب ہو مستانہ (ہیما سردیسائی، ادیت نرائن)
4۔ قسمت سے ہم (انورادھا پوڈوال۔ سونو نگم)
5۔ ہے جانا (سجاتا)

سال کی آخری فلم 'دل ہی دل سے' تھی۔ یہ دراصل ایک تامل فلم تھی جس کا میوزک ہندی میں بھی ریلیز کیا گیا تھا۔

سوزالی بندرے کے ساتھ ایک تامل نوجوان وشال کو ہیرو لیا گیا تھا۔ اس کے گیت بھی عوام میں پسند کیے گئے۔

1۔ ڈولا ڈولا (سوارن لتا۔ سری نواس)
2۔ اے نازنین (ابھی جیت)

3۔اوماریا (Remo Fernandes)

1999ء کا سال رحمان کے لیے بہت اچھا ثابت ہوا کیونکہ اس کی پانچوں فلموں کے گیت بہت پسند کیے گئے تھے۔ اور اس کے پرستاروں میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اسے بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ملی تھی اور اس کے کام کو دیگر بھارتی موسیقاروں سے بہتر قرار دیا گیا تھا۔

☆☆☆

2000ء کا ابتدائی حصہ تو رحمان نے لندن میں گزارا جہاں وہ Bombay Dreams کے لیے موسیقی بنا رہا تھا۔ یہ معاہدہ چونکہ پہلے ہی طے پا گیا تھا۔ لہٰذا اس کو بھارت میں تمام کام چھوڑ کر آنا پڑا۔ لندن سے واپس آتے ہی اس نے لیجنڈ فلم میکر شیام بینگل کی فلم زبیدہ پر کام شروع کیا۔ یہ ایک شہزادی کی کہانی تھی جس کا مرکزی کردار کرشمہ کپور نے ادا کیا تھا۔ منوج باجپائی اور ریکھا نے بھی فلم میں عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔۔ جاوید اختر نے فلم کے نہایت خوبصورت گیت لکھے تھے۔ اور رحمان نے باکمال موسیقی سے انہیں سجا دیا تھا۔

1۔دھیمے دھیمے گاؤں (کویتا کرشنا مورتی)
2۔ہے نا (الکا یاگنک، ادت نرائن)
3۔سو گیا ہے۔ (لتا منگیشکر)
4۔چھور مورے بتیاں (ریچا شرما)
5۔مہندی ہے (الکا یاگنک)

اس سال رحمان کی یہ واحد فلم ریلیز ہوئی۔ اس سال رحمان نے دبئی میں لائیو کنسرٹ کیا۔ رحمان کے پرستار اس شو میں اس اس کے بہترین گانوں سے لطف اندوز ہوئے اور ساری رات جاری رہنے والا یہ کنسرٹ ایک یادگار ثابت ہوا۔

☆☆☆

2001ء کے آغاز میں ہی ہدایت کار کیلاش سریندر ناتھ کی فلم 'لو یو ہمیشہ' ریلیز ہوئی۔ کمزور پبلسٹی اور ناتجربہ کار ہدایت کار کی وجہ سے فلم باکس آفس پر ناکام رہی۔ پاکستان میں تو یہ فلم اب تک آئی ہی نہیں! آنند بخشی نے اس فلم کے گیت لکھے تھے جنہیں رحمان نے خوبصورت راگوں سے سجایا تھا۔

1۔گپ چپ باتیں (سادھنا سرگم۔ ہری ہرن)
2۔لو یو ہمیشہ (شویتا شیٹی۔ سونو نگم)
3۔یار تیری بیوفائی (مہالکشمی)
4۔بوتل توڑ دے (ہیما سرڈیسائی۔ سونو نگم)

5۔سونے کا پلنگ (کویتا کرشنا مورتی، ایلا ارون، ادت نرائن)
6۔ایک لڑکی تھی (کویتا کرشنا مورتی)

عامر خان جو اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کافی عرصے سے فلم پروڈکشن کے لیے پر تول رہا تھا۔ آخر کار ایک کہانی منتخب کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ کہانی تقسیم ہند سے بہت پہلے انگریزوں کے دور کی عکاسی کرتی تھی۔ مقامی باشندوں کے بلند حوصلے اور جذبات کو اس فلم میں اجاگر کیا گیا تھا جو حاکموں کے سامنے سر اٹھا کر جینے کی تمنا رکھتے تھے۔

اس فلم کا نام ''لگان'' تھا۔

فلم کی ہدایات آشوتوش گواریکر منجھے ہوئے ڈائریکٹر کے سپرد تھیں۔ اس نے عامر خان کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس تاریخ ساز موضوع کے ساتھ اے آر رحمان ہی انصاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ موسیقی کا کام رحمان کو سونپ دیا گیا جبکہ گیت ایک مرتبہ پھر جاوید اختر نے لکھے تھے۔

1۔متوا (الکا یاگنک۔ ادت نرائن۔ سکھویندر سنگھ)
2۔گھنن گھنن (الکا یاگنک، شنکر مہادیون، سکھویندر سنگھ)
3۔رادھا کیسے نہ جلے (آشا بھوسلے، ادت نرائن)
4۔او ری چھوری (الکا یاگنک، ادت نرائن)
5۔چلے چلو (اے آر رحمان، سری نواس)

نہایت معیاری فلم ہونے کی بنا پر ''لگان'' کو سال کے بیشتر ایوارڈ نصیب ہوئے اور رحمان کی موسیقی بھی بہت پسند کی گئی۔ فلم کو بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ملی تھی اور یہ آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہونے والی بھارتی فلم تھی۔

☆☆☆

2002ء میں رحمان زیادہ تر تامل اور تیلگو فلموں میں معروف رہا۔ 'Boys' اور kandukond an kandukonda وہ فلمیں تھیں جن کا میوزک بے حد پسند کیا گیا۔ اب رحمان کی سحر انگریزی کی بدولت تامل فلمیں پورے بھارت میں دیکھی جانے لگی تھیں ورنہ پہلے ان فلموں کے شائقین بہت محدود تھے۔

سال کے آخر میں رحمان ہندی سنیما کی طرف لوٹ آیا۔ منی رتنم کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر شاد علی اپنی پہلی فلم ساتھیا بنا رہا تھا۔ یہ یش راج فلم کے بینر تلے بننے والی فلم تھی جس کا پروڈیوسر بابی بیدی تھا۔ شاد علی نے اپنے باس منی رتنم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے رحمان کو ہی موسیقی کے لیے منتخب کیا۔ گیت گلزار نے لکھے تھے جو بڑی منفرد نوعیت کے تھے۔

رحمان نے فلم کی موسیقی بڑے جدید انداز میں بنائی تھی جو نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

1۔او ہمدم سنور (کنال گانجاوالا۔ کے کے ہردین۔ شان)
2۔ساتھیا (سونو نگم)
3۔میرا یار ملا دے (اے آر رحمان)
4۔چھلکا دے (ریچا شرما۔ مہالکشمی۔ ویشالی)
5۔اے اڑی اڑی (عدنان سمیع خان)
6۔چپکے سے (سادھنا سرگم۔ مرتضیٰ۔ قادر)
7۔مانگلیم (سری نواس کلنٹن)
8۔نینا ملا کے (سادھنا سرگم۔ مدھوشری)
9۔چوری پہ چوری (آشا بھوسلے۔ کارتھک)

اسی سال رحمان نے امریکا کے شہر لاس اینجلس میں ایک لائیو کنسرٹ بھی کیا۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے رحمان کے پرستاروں نے اس محفل موسیقی کا بھرپور لطف اٹھایا۔

☆☆☆

رحمان پر وقتاً فوقتاً الزامات لگتے رہتے ہیں کہ وہ مغربی دھنوں سے انسپائر ہو کر گانے تخلیق کرتا ہے۔ الزامات عائد کرنے والوں میں اس کے حاسدین نمایاں ہیں۔ ان لوگوں کو ایک سنہری موقع اس وقت ملا جب فلم 'ساتھیا' کا گانا 'او ہمدم سیورے' منظرِ عام پر آیا۔ مخالفین نے اس کے گانے کو Backsreet boys کے گانے Everybody کا چربہ قرار دیا حالانکہ دونوں گانے بہ غور سننے پر یہ الزام غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

ان حاسدین میں کئی نمایاں میوزک ڈائریکٹرز اور گلوکار بھی شامل ہیں جن کو رحمان اپنی موسیقی میں زیادہ گانے کے مواقع نہیں دیتا۔ وجہ یہی ہے کہ ان کی آوازیں رحمان کی طرزِ موسیقی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ معروف پلے بیک سنگر کمار سانو نے رحمان کے لیے صرف ایک گانے فلم 'کبھی نہ کبھی' میں گایا ہے۔ اس طرح ابھیجیت نے بھی صرف ایک گانا فلم 'دل ہی دل میں' میں گایا ہے۔ یہی دونوں گلوکار اپنے اکثر انٹرویوز میں رحمان کو ایک فلاپ موسیقار قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابھیجیت کا بھارت کے معروف جریدے 'فلم فیئر' کو دیا گیا انٹرویو قابلِ ذکر ہے جو اپریل 2005ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

حال ہی میں موسیقار اسمائیل دربار کا بھی بیان منظرِ عام پر آیا ہے جس میں اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کا کام رحمان سے کہیں زیادہ اچھا ہے اور یہ کہ رحمان پچھلے چند سالوں سے اس میدان میں قطعی ناکام رہا ہے۔ صرف ایک ہٹ فلم 'ہم دل دے چکے صنم' کے بعد سے مسلسل ناکام رہنے والے اسماعیل دربار کی طرف سے ایسے بیان کی کسی کو توقع نہ تھی۔ یہ خیالات اس کی اپنی جگ ہنسائی کا سبب بنے ہیں اور اس نے اپنی رہی سہی عزت کو بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ واضح رہے کہ رحمان نے اسماعیل دربار کے ساتھ مشترکہ طور پر حال ہی میں فلم ''کہنا'' میں کام کیا ہے جو کہ مکتا آرٹس کی پروڈکشن ہے۔ ہدایت کار سبھاش گھئی نے صرف دو گانے اور فلم کا انسٹرومینٹل میوزک رحمان سے بنوایا جبکہ باقی گانے اسمائیل دربار کے تخلیق کردہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم کے وہی گانے زیادہ پسند کیے گئے جو رحمان کے تخلیق کردہ ہیں۔

2003ء میں بھی رحمان زیادہ تر تامل میوزک اور بین الاقوامی معاہدوں سے منسلک رہا۔ اکتوبر میں رحمان کی واپسی فلم تہذیب کے ساتھ ہوئی۔ فلم فیئر میگزین کے ایڈیٹر خالد محمد اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ نہایت کمزور پبلسٹی کی وجہ سے فلم کا کسی نے نوٹس تک نہ لیا۔ حتیٰ کہ فلم کا میوزک بھی زیادہ مقبول نہ ہوا حالانکہ رحمان نے بہت عمدہ گانے تخلیق کیے تھے۔

1۔مہربان مہربان (آشا بھوسلے۔ سکھویندر سنگھ)
2۔کھوئی کھوئی آنکھیں (شان)
3۔I wanna be Free (انویما)

فلم کے گیت جاوید اختر نے لکھے تھے۔

تہذیب کے فوراً بعد فلم ''لکیر'' کا میوزک ریلیز ہوا۔ یہ فلم معروف کوریوگرافر سروج خان کے صاحبزادے احمد خان نے بنائی تھی اور اسے وویک کمار نے پروڈیوس کیا تھا۔ فلم انتہائی غیر معیاری تھی جس کا سبب ہدایت کار کی ناتجربہ کاری تھی۔ فلم کا کوئی مقصد اور موضوع نظر نہیں آتا تھا۔ بیشتر سنیما بین بہ مشکل انٹرول تک بیٹھ سکے۔ گیت محبوب نے لکھے تھے۔

1۔نچ لے (دلیر مہدی، کنال۔ گانجاوالا)
2۔پیغام (کویتا کرشنا مورتی۔ شان ان دونوں باصلاحیت گلوکاروں میں حقیقی زندگی میں دیور بھابی کا رشتہ ہے)
3۔شہزادے (کنال گانجاوالا)
4۔روزانہ (Viva- A girls pop band)
5۔صدیاں (مہالکشمی۔ ادت نرائن۔ ہری ہرن)
6۔اف او جلتا ہے (آشا بھوسلے۔ سونو نگم)

2004ء کے آغاز میں ہی معروف مصور ایم۔ ایف۔ حسین کی فلم 'منیا کشی' ریلیز ہوئی۔ یہ ٹھیک آرٹ

فلم تھی جسے حسب توقع عوام میں پذیرائی نہ مل سکی۔رحمان نے فلم کے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا اور نہایت غیر روایتی موسیقی ترتیب دی۔ راحت اندوری نے بہت خوبصورت اور پُراثر گیت لکھے تھے۔اس فلم میں رحمان نے ایک نوخیز گلوکارہ رینا بھردواج کو موقع دیا جس کی مسحور کن آواز لوگوں نے بہت پسند کی تھی۔

1۔دوقدم (سونونگم)
2۔دھواں دھواں (آشا بھوسلے)
3۔یہ رشتہ (رینا بھردواج)
4۔چینا کمہ چیلا کمہ (سکھویندر سنگھ۔کورس)
5۔رنگ ہے (الکایاگنک)
6۔نورالانور (مرتضیٰ۔قادر)

اس سال رحمان کی دوسری فلم ”Yuva“ تھی۔یہ منی رتنم کی فلم تھی جو مدراس ٹاکیز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔فلم میں لمبی چوڑی کاسٹ لی گئی تھی۔ اجے دیوگن ،ایشادیول ،دویک اوبرائے ،کرینہ کپور، ابھیشک بچن ،رانی مکرجی فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔فلم غیر روایتی ہونے کے باوجود باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ۔گیت محبوب نے لکھے تھے اور رحمان نے منی رتنم کے لیے ایک مرتبہ پھر اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کردی تھیں۔

1۔اے خدا حافظ (سنیتا،کارتھک،لکی علی)
2۔فنا (سنیتا،تانوی،اے آر رحمان)
3۔دھکا لگا بگا (کارتھک،محبوب،رحمان)
4۔کبھی نیم نیم (مدھوشری۔رحمان)
5۔ڈول ڈول (شاہین بدر)
6۔بادل (الکایاگنک۔عدنان سمیع)

لگان میں رحمان کے ساتھ کامیاب تجربے کی وجہ سے آشوتوش گواریکر نے رحمان کے ساتھ دوبارہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔یہ فلم ”سوادیس“ Swades تھی جس میں شاہ رخ نے Nasa کے ماہر فلکیات کا کردار ادا کیا تھا۔ بنیادی طور پر فلم جذبہ حب الوطنی پر مبنی تھی۔اس میں پردیس میں رہنے والے بھارتیوں کی جذبات کی عکاسی کی گئی تھی۔ اس فلم کے خوبصورت گیت بھی جاوید اختر نے لکھے تھے جس کے ساتھ اب رحمان کی کافی ذہنی ہم آہنگی قائم ہوچکی تھی۔

1۔سانوریا سانوریا (الکایاگنک)
2۔یونہی چلا چل (کیلاش کھیر۔ہری ہرن۔ادت نرائن)
3۔یہ تارا وہ تارا (ادت نرائن)
4۔یہ جو دیس ہے تیرا (اے آر رحمان)
5۔آہستہ آہستہ (سادھنا سرگم۔ادت نرائن)
6۔دیکھونا (الکایاگنک۔ادت نرائن)

☆☆☆

رحمان کی نا بھلانے والی فلموں میں سے ایک فلم ہدایت کار شیام بینگل کی Bose- the forgotten Hero ہے۔یہ فلم تحریک آزادی کے عظیم رہنما سبھاش چندر بوس کی مات زندگی پر مبنی ہے۔ رحمان نے بڑی محنت سے فلم کے گانے تخلیق کیے ہیں۔ رحمان ٹائٹل سانگ ’آزادی‘ اس نے اپنی آواز میں ریکارڈ کیا ہے اور یہ سحر انگیز گیت مختلف ٹی وی چینل پر مقبولیت حاصل کرتا رہا ہے۔

شیام بینگل ان ہدایت کاروں میں سے ہیں جو موسیقار کے کام میں بالکل دخل نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود رحمان نے فلم کے موضوع اور مقصد سے پورا انصاف کیا ہے۔

رحمان کی فلموں میں چند بڑے پراجیکٹ ہیں دیپا مہتا کی فلم ’Water‘ عامر خان کی ’The Rising‘ قابل ذکر ہیں۔ The Rising میں..... منگل پانڈے کا کردار ادا کیا ہے جو 1857ء کے غدر کا ایک اہم کردار تھا۔

☆☆☆

رحمان کا سفر ابھی جاری ہے۔24 سال کی عمر میں اپنا کیریئر شروع کرنے والا رحمان اب زندگی کے 39 ویں سال میں داخل ہوچکا ہے۔اس کی اب تک کی تخلیقات ہی اس کو ایک عظیم موسیقار کہلانے کے لیے کافی ہیں۔لیکن رحمان کا خیال کہ ابھی اس کا بہترین کام آنا باقی ہے۔جون 2005ء میں رحمان ورلڈ ٹور پر نکلا تھا۔جس کے دوران وہ اپنے لمبے چوڑے آرکسٹرا کے ساتھ آسٹریلیا، برطانیہ امریکہ اور ملائیشیا کے علاوہ متعدد ممالک میں کنسرٹ کیا۔2012ء کے دوران بھی اس کے کنسرٹ کامیاب رہے۔

اتنی کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی رحمان کے مزاج میں عاجزی ہے۔وہ اپنی ہر کامیابی کا کریڈٹ خدا کی بابرکت ذات کو دیتا آیا ہے نماز پابندی سے ادا کرتا ہے۔شاید خدا کو اس کی یہی ادا پسند ہے اور وہ رحمان کو مسلسل نوازتا چلا جارہا ہے۔

صائمہ اقبال

ایک بدنام زمانہ مجرم کی زندگی کے اتار چڑھاؤ

وہ امریکی ریاست ٹیکساس میں دہشت کی علامت بن کر ابھرا پھر اس کا خوف پورے امریکا پرچھاگیا۔ امریکا کی ہر ریاست میں اسے ظالم ترین انسان کہا جانے لگا مگر قانون اس پر ہاتھ ڈالنے سے مجبور تھا۔ وہ جرم کرتا ضرور تھا ، مخالفین کو عبرت ناک سزا بھی دیتا تھا لیکن اس طرح کہ قانون اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ پوری دنیا میں جس مجرم کا چرچا ہے اس کی زندگی کیسی تھی؟

وہ رات خاصی تاریک تھی۔ بادلوں نے چاند کو ڈھانپ رکھا تھا اور تیزی سے گرتے درجۂ حرارت نے شہر کے باسیوں کو ان کے گھروں تک محدود کردیا تھا۔جونہی رابرٹ جان نے دفتر سے باہر قدم رکھا، ایک سرد جھونکا اُس کے بدن سے ٹکرایا۔

اس نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی جس کا مرکزی کانٹا تین کے ہندسے کی جانب بڑھ رہا تھا۔”شکاگو ٹربیون“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے یوں تو وہ اکثر رات گئے تک اپنے دفتر

میں بیٹھا کرتا تھا لیکن آج اُسے کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی۔

دراصل شہر میں بڑھتے جرائم پر اداریہ لکھنے کے دوران اُسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب مضمون مکمل کر کے اُس نے سر اُٹھایا، تو دفتر تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صرف اُس کا اسسٹنٹ اور ایک ٹائپسٹ وسیع و عریض دفتر میں موجود تھے۔ اگلے ایک گھنٹے تک وہ کل صبح شائع ہونے والے اخبار کی ''کاپی'' پر جُھکا رہا، جس میں شگاگو میں جرائم کی بڑھتی شرح اور اس کے اسباب کی نشان دہی کرتے ہوئے حکام سے جرائم پیشہ افراد کو فی الفور گرفتار کرنے کا تقاضا کیا گیا تھا۔ اِسی عرصے میں ٹائپسٹ اور اسسٹنٹ بھی رخصت ہو گئے۔

رابرٹ ایک اصول پسند اور باہمت صحافی تھا۔ صاف گوئی اور بے باکی کے باعث اسے مختلف جرائم پیشہ گروہوں کی جانب سے تواتر سے دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھا، یہی سبب ہے کہ سر پر منڈلاتے خطرات کے باوجود اُس نے سچ بیان کرنے کی عادت ترک نہیں کی۔

اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑے رابرٹ نے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کے اردگرد سنّاٹے اور وحشت کا راج تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اُس نے کالر کھڑے کر لیے اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال کر ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب بڑھنے لگا جو لگ بھگ دو سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اُسے امید تھی کہ اسٹینڈ پر اُسے کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل ہی جائے گی۔

رابرٹ تیز تیز قدم اُٹھا رہا تھا۔ شاذ شاذ ہی سنّاٹے کو چیرتی ہوئی کوئی گاڑی اُس کے پہلو سے گزرتی اور تاریک سڑک پر گم ہو جاتی۔

دفعتاً اُسے اپنے پیچھے بریک چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے گاڑی کا انجن بند ہو گیا۔ اُس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

چار کیم شحیم آدمی اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بیس بال بیٹ تھے اور چہروں پر مکروہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

تین چہرے تو رابرٹ کے لیے بالکل انجانے تھے لیکن ایک شخص کو وہ بہ آسانی پہچان گیا۔ اُس کے سفّاک چہرے پر زخم کا نشان تھا اور آنکھیں انگارے اُگل رہی تھیں۔

اُن کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا کیونکہ اُس کے غیر متوقع ملاقاتیوں کے ارادے واضح تھے۔

اگلے پانچ منٹ تک چاروں بدمعاش نہتے رابرٹ پر لاتوں اور مکّوں کی بارش کرتے رہے اور وہ درد کی شدت سے چلّاتا رہا لیکن کوئی اُس کی مدد کے لیے نہیں آیا۔

رابرٹ ادھ موا ہو چکا تھا لیکن چاروں بدمعاش تازہ دم تھے اور اب بیس بال بیٹ استعمال کرنے کے لیے پَر تول رہے تھے۔

بیٹ کی مسلسل ضربیں اس کی روح میں اُتر گئیں۔ وہ جلد ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔

آخری ضرب اُس کے سر پر لگی تھی جو اُسی آدمی نے لگائی جس کے گال پر زخم کا نشان تھا۔ جب لہولہان رابرٹ زمین پر گرا، وہ آدمی بڑبڑایا۔

''یہ ہے مجھ سے ٹکرانے کا انجام!''

اِس یقین کے ساتھ کہ رابرٹ کی روح پرواز کر چکی ہے، وہ چاروں گاڑی میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد سنّاٹے کو چیرتے ہوئے گاڑی رخصت ہو گئی۔

ایک شریف ٹیکسی ڈرائیور جو دور سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا فوراً رابرٹ کی جانب بڑھا۔

حیرت انگیز طور پر اتنی درگت بننے کے بعد بھی رابرٹ کی سانس چل رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے فوراً اسپتال پہنچا دیا جہاں ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں نے اُسے موت کے منہ سے نکال لیا۔

اِس ہیبت ناک تشدد کا نشانہ بننے کے ٹھیک آٹھ گھنٹے بعد جب رابرٹ کو ہوش آیا، وہ خود کو زندہ پا کر حیران رہ گیا۔ واقعی شدید زخموں کے باوجود اُس کا زندگی کی جانب لوٹ آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

وہ ڈیڑھ ہفتے اسپتال میں رہا۔ خوش قسمتی سے اس کے زخم تیزی سے مندمل ہو گئے۔ جب صحت یاب ہونے کے بعد وہ اسپتال کا بل ادا کرنے کاؤنٹر پر گیا، تو وہاں ایک اور حیرت اُس کی منتظر تھی۔

''آپ کا بل تو ادا ہو گیا ہے سر!'' حسین ریسپشنسٹ کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

''ادا ہو گیا؟'' اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''کس نے ادا کیا؟''

''سوری سر، اُنہوں نے اپنا نام تو نہیں بتایا... میرے مسلسل سمجھانے کے باوجود بل پر دستخط بھی نہیں کیے...'' ریسپشنسٹ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''...لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ صاحب خاصے لمبے چوڑے تھے۔ اچھا لباس زیب تن کیے ہوئے تھے اور... غالباً اُن کے بائیں گال پر زخم کا پُرانا نشان تھا۔ وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور...''

نیلی آنکھوں والی معصوم ریسپشنسٹ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی، لیکن حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رابرٹ سن نہیں رہا تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا۔

''کیپون!'' بالآخر اُس نے گہرا سانس لیا۔ ''مگر... کیوں؟'' یقینی طور پر وہ تذبذب کا شکار تھا۔

رابرٹ اگلے کئی برس زندہ رہا لیکن پھر کبھی ''الکیپون'' کے نام سے پکارے جانے والے شگاگو کے سب سے بڑے بدمعاش نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ کبھی نہیں۔ وہ... واقعی ایک عجیب شخص تھا!

☆☆☆

مسافروں سے بھرا بحری جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے تیزی سے بندرگاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اِس برطانوی جہاز نے دورانِ سفر کئی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ کبھی اِسے خونخوار سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا، کبھی پوری قوت سے برستے آسمان کا قہر سہنا پڑا لیکن مئی 1893ء کی اُس خوش گوار دوپہر سمندر کے پانیوں پر جھلملاتی سورج کی حسین کرنیں اور مشرق سے چلنے والی صحت بخش ہوا نے عرشے پر موجود مسافروں کے چہروں سے تھکن دھو ڈالی تھیں۔ جُونہی نیویارک کی بندرگاہ کے ابتدائی آثار نمودار ہوئے، اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

یوں تو جہاز میں یورپ کے دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے باشندے بھی سوار تھے لیکن اکثریت اطالوی باشندوں کی تھی جو آنکھوں میں حسین مستقبل کے سپنے سجائے، اپنا سب کچھ تج کر امکانات کی سرزمین امریکا کی جانب نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اُن مسافروں میں دراز قد، وجیہہ گبرئیل کیپون بھی شامل تھا، جس کا تعلق نیپلز سے سولہ کلومیٹر دور جنوب میں واقع ایک قصبے سے تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک حجام تھا۔

گبرئیل تنہا نہیں تھا، اس کی حسین بیوی تھریسا بھی ساتھ تھی۔ اِس سفر کا مقصد بہتر مستقبل کا حصول تھا۔ اُس زمانے میں یورپ سے ہجرت کی ایک لہر چلی تھی۔ گروہوں کی صورت لوگ بحری جہازوں میں سوار ہو کر امریکا آ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اُس وسیع و عریض ریاست میں کچی بستیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جہاں یہ امید پرست مہاجرین ڈیرے ڈالتے اور اپنے سپنے سچ کرنے کی جدوجہد کو کُل وقتی مصروفیت بنا لیتے۔

جب جہاز بندرگاہ سے لگا، تھکے ہارے مسافر فرطِ جذبات سے ناچنے لگے۔ گبرئیل اور تھریسا کے چہرے بھی دمک رہے تھے۔

اس خاندان نے بروکلن کے مرکزی علاقے نیوی یارڈ کو رہائش کے لیے چُنا۔ گبرئیل ایک تہذیب یافتہ اور محنتی آدمی تھا، اُس کی بیوی بھی انتہائی سگھڑ اور شائستہ عورت تھی، وہ دونوں چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے زندگی کی چادر رفو کرنے کا ہنر جانتے تھے اور اُنہیں یقین تھا کہ وہ نئی زمین پر پاؤں جمانے میں کامیاب رہیں گے۔

اور وہ غلط نہیں تھے۔ جلد ہی گبرئیل کو ''29 پارک ایونیو'' پر واقع ایک باربر شاپ میں ملازمت مل گئی۔ خود کو منوانے اور نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں اُسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

دھیرے دھیرے اِس کفایت شعار خاندان کے حالات میں سدھار آنے لگا۔ زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ جب خدا نے اس جوڑے کو اولاد کی نعمت سے سرفراز کیا، چھوٹے سے آشیانے میں خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ مجموعی طور پر قدرت نے شریف النفس گبرئیل اور تہذیب یافتہ تھریسا کو نو بچوں سے نوازا۔ دیگر والدین کی طرح اُن کی بھی آرزو تھی کہ اُن کی اولاد خاندان کا نام روشن کرے۔

یہ خواہش پوری تو ہوئی لیکن بے حد عجیب ڈھنگ سے کہ آنے والے برسوں میں لفظ ''کیپون'' دہشت کی علامت بن گیا جس کا سبب اُن کا چوتھا بیٹا الفانسو گبرئیل بنا، جسے آج تاریخ ''الکیپون'' کے نام سے یاد کرتی ہے!!

☆☆☆

مستقبل میں مظالم کی نئی تاریخ رقم کرنے والے الفانسو نے 17 جنوری 1899 کی ایک طوفانی رات بروکلن میں آنکھ کھولی۔

کون سوچ سکتا تھا کہ کل یہ بچہ جرائم کی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دے گا۔ اُس وقت تو اُس کے چہرے سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ اُس کی قلقاریاں جب گھر میں گونجتیں، تو ماں باپ کے دل میں خوشیاں انگڑائی لیتیں۔

تھریسا اور گبرئیل اسے اپنے لیے خوش قسمتی کی علامت تصور کرتے تھے کیونکہ اس کی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے معاشی حالات میں یکدم سدھار آ گیا تھا۔ اسی باعث انہوں نے سستا علاقہ چھوڑ کر نسبتاً بہتر

علاقے ”پارک سلوپ“ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔

گو کہ الفانسو ایک حلیم اور تہذیب یافتہ جوڑے کا سپوت تھا لیکن اپنے ماں باپ کے برعکس وہ بلند آہنگ کا مالک تھا۔ خاصا ضدی اور سرکش تھا۔ کم سنی میں وہ اپنی بات منوانے کے لیے زور زور سے رویا کرتا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو اپنی خواہشات پوری کروانے کے لیے نئے ہتھکنڈے تلاش کر لیے۔ اب وہ گھر والوں سے بات چیت بند کر دیتا اور اِس طرح جو چاہتا، اُسے حاصل کر لیتا۔

ماں باپ کا خیال تھا کہ اسکول میں داخل کروانے کے بعد اس کے مزاج میں سدھار آجائے گا۔ اس کی توجہ بٹ جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔

اس کا شمار مشکلات پیدا کرنے والے بچوں میں ہوتا تھا۔ گو کہ وہ پڑھائی میں اچھا تھا لیکن شرارتی بلا کا تھا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ شرارتی بچوں کے ٹولے کا سرغنہ تھا۔ ہر وقت متحرک رہتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ اِس دوران ہاتھا پائی بھی ہو جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اسکول سے اکثر یہ شکایت آتی کہ آپ کا بچہ انتہائی جذباتی ہے، اُس میں برداشت کم ہے۔

تھریسا اپنے صاحب زادے کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتی اور وہ اپنی ماں سے وعدہ بھی کرتا کہ آئندہ اسے شکایت کا موقع نہیں دے گا لیکن چند ہی ہفتے بعد پھر تھریسا کو اسکول سے ایک لیٹر موصول ہوتا جس میں الفانسو کے کارناموں کی تفصیلات ہوتیں۔

پہلے جس محلّے میں گبریئل رہا کرتا تھا، وہاں کی گلیوں میں الفانسو کو زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا، پارک سلوپ کے علاقے میں رہائش اختیار کرنے کے بعد ہی وہ حقیقی معنوں میں باہر کی دنیا سے متعارف ہوا۔ ایسی دنیا جس نے اُسے بدل ڈالا۔

اُسے دوستی گانٹھنے کا فن آتا تھا۔ بولتا بھی خوب تھا۔ لیڈر شپ کی صلاحیت بھی تھی۔ سو جلد ہی وہ فتنہ ساز کے طور پر مشہور ہو گیا۔

اس دور کا امریکا آج کے امریکا سے یکسر مختلف تھا۔ اس زمانے میں جرائم کی شرح خاصی بلند تھی۔ بے روزگاری اور مواقع کی کمی کے باعث نوجوان تعلیم حاصل کرنے کی بجائے دادا گیر بننے کو ترجیح دیتے۔

الفانسو بھی ایسے نوجوانوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا جن کے ذہن میں تخریبی منصوبے پنپتے ہیں۔ لیکن وہ بے چارے خوف کے باعث کوئی بڑے اقدام کرنے کی بجائے چھوٹی موٹی چوریوں پر اکتفا کر لیتے۔

ایک آدھ واردات میں الفانسو نے بھی ٹولے کے ساتھ شرکت کی لیکن وہ بہت جلد اُس سے اوب گیا۔ اس کی مایوسی کا سبب چوری شدہ مال سے حاصل ہونے والی مختصر رقم تھی جو ٹولے کے ارکان میں تقسیم ہونے کے بعد اپنی حیثیت کھو دیتی۔ اسی باعث اس نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ ایسا منصوبہ جس میں اُس کے مستقبل کی ابتدائی علامات ملتی ہیں۔

اس نے محلّے کے بچوں کے ساتھ ایک گروہ تشکیل دیا جو چھوٹی موٹی چوریاں کرتا لیکن اِن وارداتوں کا مقصد تفریح یا مالی فائدہ نہیں بلکہ اپنی تشہیر کرنا ہوتا۔ چوری کی کارروائی میں الفانسو حصہ نہیں لیتا لیکن دور کھڑے ہو کر اپنے گروہ کی سرپرستی ضرور کرتا۔ اس کے ساتھی جو بھی شے چوری کرتے، وہ اُس کے حوالے کر دیتے۔ اور پھر الفانسو بڑی شان سے اُسے اُس کے اصل مالک تک پہنچا دیتا۔

”جناب، میرا نام الفانسو کیپون ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے چند بدمعاش لڑکوں کو آپ کی دکان سے نکلتے دیکھا تھا، اُن کے ہاتھ میں ٹافیوں کا یہ پیکٹ تھا۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ پیکٹ اُن سے چھین لیا۔ ساتھ ہی ان کی ٹھکائی بھی لگائی۔ اب وہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں گے!“

”اوہ... شکریہ... تم کتنے اچھے ہو... میری طرف سے تم یہ پیکٹ تحفے میں رکھ لو بچے!“ دکان دار کے چہرے پر مشفقانہ مسکراہٹ ہوتی۔

شاطر الفانسو نے بڑی مہارت سے ڈیڑھ برس یہ سلسلہ جاری رکھا۔

کبھی وہ کسی خاتون کو اُس کا پرس واپس کرتے ہوئے کہتا۔

”میڈم، میں نے اچکوں کو ایسا سبق سکھایا ہے کہ وہ دوبارہ آپ کی طرف نہیں دیکھیں گے!“

اور کبھی کسی شخص کو اُس کی گھڑی واپس کرتے ہوئے کہتا۔

”دھیان رکھا کریں جناب، یہاں اچکوں کی کمی نہیں... وہ تو شکر ہے کہ میں نے دیکھ لیا...“

کئی بار وہ بوڑھی خواتین اور ننھے بچوں کو سڑک پار کرواتا ہوا بھی نظر آیا۔ الغرض وہ چھوٹا ”رابن ہڈ“ بن گیا تھا۔

گو کہ وہ خود کو نیکوکار ثابت کرنے کی کوششوں میں لگا تھا لیکن تھریسا کو تواتر سے شکایتی خطوط موصول ہو رہے تھے۔ اسکول انتظامیہ اس نوجوان کی بابت طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھی۔ اور پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا، جس کے بعد الفانسو کا تعلیمی سلسلہ تمام ہو گیا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز 14 سالہ الفانسو نے اپنی ٹیچر کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا جس کی گونج کلاس روم کے باہر بھی سنی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پرنسپل کے کمرے میں کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کی رمق بھی نہیں تھی۔ نہ ہی تاسف تھا۔

وہ الفانسو کیپون کا اسکول میں آخری دن ثابت ہوا!

☆☆☆

الفانسو کو اسکول سے بے دخل کیے جانے کا رتی بھر افسوس نہیں تھا۔ وہ سڑکوں کو درس گاہوں سے زیادہ اہمیت دیتا تھا جہاں زندگی اپنی حقیقی شکل میں نظر آتی تھی، جہاں کے تلخ شب و روز جینے کا ڈھنگ سکھاتے تھے۔ اور نوجوان الفانسو سیکھنے کے لیے تیار تھا۔

اسکول کے جھنجھٹ سے آزادی کے بعد اُس کا زیادہ وقت اسنوکر کلب میں گزرنے لگا لیکن جلد ہی گھر کی بڑھتی ذمے داریوں کے باعث اس نے بے کاری کے دنوں سے نجات حاصل کر لی اور خود کو چھوٹی موٹی ملازمتوں کے لیے تیار کر لیا۔

چند ڈالرز کے عوض کبھی وہ پرنٹنگ مشین پر بیٹھا، کبھی اخبارات کے اسٹال پر۔ کینڈی اسٹور پر بھی کام کیا، تاہم وہ مطمئن نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ پرآسائش زندگی کا حصول دولت کے حصول کے بغیر ناممکن ہے اور دولت صرف طاقتوروں کے حصے میں آتی ہے۔

الفانسو بھی طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور اِس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ بدمعاشوں کے گروہ کا حصہ بن جائے۔

جلد ہی اس خواہش نے سلگتے ہوئے انگارے کی شکل اختیار کر لی، اِس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے اسے کسی ایسے شخص کا سایہ بننا پڑے گا جو دہشت کی علامت تصور کیا جاتا ہو، جس کا نام سن کر لوگ تھر تھر کانپتے ہوں۔ اور نیویارک میں ایک ہی ایسا شخص تھا، جونی ٹوریو!

شہر کی تاریک گلیوں میں ہونے والی مختلف وارداتوں کے طفیل وہ پہلے ہی جونی کی نظروں میں تھا۔ جب جونی نے دیکھا کہ الفانسو اپنے مقصدِ زیست کا تعین کر چکا ہے، تو اُس نے اس نوجوان کو مین ہٹن کے بدنام زمانہ The Five Points گینگ کا حصہ بنا لیا۔ یہ گینگ الفانسو کے لیے تربیت گاہ ثابت ہوا۔

اُس زمانے میں الفانسو بروکلن میں اپنا اثر بڑھانے میں مصروف ایک شخص فرینکی یل کے بیئر بار میں ملازمت کر رہا تھا۔ یہ ملازمت اُسے جونی ہی نے دلوائی تھی۔

جہاں تک فرینکی کا تعلق ہے، وہ جونی کا بزنس پارٹنر تھا اور انتہائی شاطر اور ظالم آدمی تھا۔ آنے والے برسوں میں اُس نے نیویارک کے سب سے بااثر بدمعاش کا مقام حاصل کر لیا لیکن اُس کی زندگی کا اختتام بے حد عجیب انداز میں ہوا، جس کا سبب کوئی اور نہیں، بلکہ الفانسو ہی بنا!

☆☆☆

فرینکی کے بیئر بار میں کام کرتے ہوئے ہی الفانسو کو وہ زخم ملا، جس کی وجہ سے اُسے تاریخ میں "Scarface" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک شام الفانسو کی نظر بار میں بیٹھی ایک انتہائی حسین لڑکی پر پڑی جو اپنے بھائی اور خاندان کے چند دیگر افراد کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔

کچھ طاقت کا نشہ تھا، کچھ شراب کا اثر، الفانسو اس میز پر پہنچ گیا جہاں وہ لڑکی بیٹھی تھی اور بہ آواز بلند، بڑے ہی ناشائستہ انداز میں اُس کے جسم کی تعریف کرنے لگا۔

ابھی وہ دوشیزہ کی تعریفوں کے پُل باندھ ہی رہا تھا کہ اسے اپنے چہرے کے بائیں جانب آگ کی رگڑ محسوس ہوئی۔

اِس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، لڑکی کا بھائی چاقو سے اُس کے چہرے پر تین خطرناک وار کر چکا تھا۔

ہوش بحال ہوتے ہی زخمی الفانسو آگ بگولا ہو گیا۔

اِس سے پہلے کہ وہ جوابی حملہ کرتا، فرینکی وہاں آگیا۔

اس نے الفانسو کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اُس شخص سے درخواست کی: ”براہِ مہربانی جناب، بیٹھ جائیں!“

دراصل وہ شخص انتہائی بااثر تھا اور فرینکی ایک جذباتی اطالوی نژاد امریکی کے لیے اپنے تعلقات نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

”فوراً ان صاحب سے معافی مانگو!“ جب فرینکی کے یہ الفاظ الفانسو کے کانوں سے ٹکرائے، اُسے یوں لگا،

جیسے کسی نے اس کے زخموں میں نمک بھر دیا ہو۔ بے عزتی کے احساس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس وقت معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس واقعے نے اس کی زندگی بدل دی۔ چہرے پر لگنے والا زخم تو چند ہفتوں میں مندمل ہوگیا لیکن اس کا نشان باقی رہا۔

اِس نشان نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ آنے والے برسوں میں وہ اسے چھپانے کی حتیٰ الامکان کوششیں کرتا رہا۔ اگر کوئی اِن کی بابت پوچھ بیٹھتا تو الفانسو یہی جواب دیتا کہ وہ دورانِ جنگ زخمی ہوگیا تھا۔ اسی زخم کے باعث اسے "Scarface" کا لقب ملا، جسے وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔

تاہم اِس واقعے نے اُسے ایک سبق بھی دیا۔

"جب تک میں جرائم کی چوٹی پر نہیں پہنچ جاتا، میں ایسے ہی ذلیل ہوتا رہوں گا۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے خود سے کہا۔ "مجھے سب سے طاقتور انسان بننا ہے، سب سے طاقتور!"

☆☆☆

اِس واقعے کے بعد وہ انتہائی دُرشت ہوگیا۔ ماضی میں وہ فقط ایک بدمعاش تھا لیکن اب وہ ایک ظالم اور جابر شخص کا روپ اختیار کر گیا جو نت نئے طریقوں سے لوگوں پر تشدد کرتا۔ ضرورت پیش آتی تو ان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اس زمانے میں الفانسو، فرینکی یل کی سرپرستی میں کام کر رہا تھا۔ اس کا استاد، ٹوریو چند ضروری معاملات نمٹانے شکاگو گیا ہوا تھا۔

دراصل جونی ٹوریو کے ایک رشتے دار کو شکاگو کے مضافات میں سرگرم ایک گینگ "بلیک ہینڈ" کی وجہ سے شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ سفاک جونی نے شکاگو جا کر اس گینگ کے تمام ارکان کو چن چن کر قتل کر دیا، تاہم اس کارنامے کے بعد وہ نیویارک نہیں لوٹا، اس نے شکاگو ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا، جس کے دو اسباب تھے۔

بنیادی سبب تو شکاگو کا جرائم پیشہ افراد کے لیے انتہائی سازگار ماحول تھا، دوسرا اُس کی خالہ وکٹوریہ کا شوہر جیمس کولوسمو!

جیمس کولوسمو نے جسم فروشی کے کاروبار کو ایک ادارے کی شکل دے دی تھی۔ وہ شاطر شخص اپنے مفادات کے لیے عورتوں کے استعمال میں ماہر تھا اور نہ صرف [illegible] پیشہ افراد، بلکہ اعلیٰ حکام میں بھی خاصا اثر و رسوخ رکھتا [illegible]

گو کہ جونی کو کولوسمو کے طریقۂ کار سے [illegible] اختلاف تھا، لیکن پیسے کی ریل پیل دیکھتے ہوئے وہ [illegible] سرپرستی میں کام کرنے لگا۔ نیویارک کی ذمے داری [illegible] نے فرینکی کو سونپ دی تھی جو تیزی سے اپنا اثر و رسوخ [illegible] رہا تھا۔

1918 میں فرینکی نے جونی سے اچانک رابطہ [illegible] وہ خواہش مند تھا کہ جونی اس کے زیرِ سایہ کام کر [illegible] والے دو نوجوانوں الفانسو کیپون اور جمی کو شکاگو بلوا [illegible] بڑھتی وارداتوں کی وجہ سے نیویارک پولیس کی نظروں [illegible] آگئے ہیں اور اب پولیس اہل کار پاگلوں کی طرح ا[illegible] تلاش کر رہے ہیں۔

جونی دونوں نوجوانوں کی صلاحیتوں سے واقف [illegible] اسے یقین تھا کہ ان کی شکاگو میں موجودگی اس کے حق [illegible] فائدہ مند ثابت ہوگی کیونکہ وہ کُھلی طور پر اس کے دو [illegible] ہیں۔ اس نے فرینکی سے تھوڑا وقت مانگا۔ اور اِسی دوران [illegible] الفانسو کی زندگی میں ایک واقعہ رونما ہوا۔

☆☆☆

وہ بدمعاش ضرور تھا لیکن اُس کے سینے میں بھی ا[illegible] حساس دل تھا جس پر محبت سایہ فگن تھی۔ دراصل ایک [illegible] قبل وہ ایک آئرش کیتھولک لڑکی، مے جوزفین کی زلف [illegible] اسیر ہوگیا تھا اور اب ان کا عشق زوروں پر تھا۔

جوزفین شادی کی خواہش مند تھی لیکن الفانسو [illegible] خیال کا شدید مخالف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جرائم پیشہ افر[illegible] خاندان اُن کی کمزوری بن جاتا ہے۔ اسی لیے وہ [illegible] جوزفین کو ٹالتا رہا لیکن جب اسے پتا چلا کہ جوزفین [illegible] ہوگئی ہے، وہ قسمت کے ہاتھوں مجبور ہوگیا۔ 1918ء [illegible] دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

جوزفین الفانسو کی مجرمانہ سرگرمیوں سے [illegible] واقف تھی لیکن اُس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔ اسے [illegible] کہ ایک نہ ایک دن وہ اُسے راہ راست پر لے آئے [illegible] یہی سبب تھا کہ وہ شادی والے روز بہت خوش تھی۔

وہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ آنے والے برسوں میں [illegible] رشتہ اُس کے لیے عذاب بن جائے گا۔

اُسی برس الفانسو کے پہلے بیٹے البرٹ فرانسس [illegible] پیدائش ہوئی۔

اُس روز فرینکی یل اس کے گھر آیا، اس کی آمد کا مقصد بیٹے کی پیدائش پر الفانسو کو مبارک باد دینا نہیں تھا بلکہ وہ یہ بتانے آیا تھا کہ جونی نے اس کی درخواست قبول کر لی ہے۔ وہ شکاگو جانے کی تیاری کرے!

☆☆☆

بیسویں صدی کے اوائل کا شکاگو ایک زندگی سے بھرپور شہر تھا۔ وہاں عیش و عشرت، رنگ و روشنی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ مسرت رقص کناں تھی۔ شہر کے باسیوں کی [illegible]ش لباسی کا پورے ملک میں چرچا تھا۔ سچ تو یہ ہے [illegible] 1871ء میں شکاگو میں لگنے والی "عظیم آگ" سے ایک [illegible] شہر ابھرا تھا، جہاں طرزِ تعمیر میں ماڈرن آرکیٹیکٹ کے حسین [illegible] نمونے جابہ جا نظر آتے تھے.... تاہم یہ شکاگو کا حقیقی چہرہ نہیں تھا کیونکہ رنگوں کے پیچھے جرائم کے گہرے سائے تھے۔ [illegible] وہاں شراب خانوں، جوئے کے اڈوں، جسم فروشوں کے ٹھکانوں کی بھرمار تھی۔ نشہ آور اشیاء کھلے عام فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کا بنیادی سبب بدعنوانی تھی۔ شکاگو کی پولیس کا [illegible]شمار دنیا کے کرپٹ ترین پولیس ڈیپارٹمنٹس میں ہوتا تھا۔ [illegible]بیش تر افسران بکے ہوئے تھے۔ یہی معاملہ سیاست دانوں کا تھا جو رشوت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ یوں تو شکاگو نیویارک کے بعد امریکا کا دوسرا بڑا شہر کہلاتا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ جرائم کے معاملے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مورخین 20 سالہ الفانسو کیپون کی شکاگو آمد کو ایک [illegible]اہم واقعہ گردانتے ہیں کیونکہ اس نے نہ صرف الفانسو کو نئی شناخت عطا کی، بلکہ شکاگو کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا!

1919ء کے اوائل میں جب الفانسو نے نیویارک چھوڑا اُس وقت وہ تنہا تھا۔ حسین بیوی، معصوم بیٹا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ جان بوجھ کر انہیں ساتھ نہیں لایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شکاگو جانے کے بعد وہ خاندانی معاملات میں اُلجھ کر اپنا مقصد بھول جائے۔

الفانسو جہاں شکاگو جانے پر مسرور تھا، وہیں اسے [illegible]س بات کا شدید دکھ تھا کہ اس کے دیرینہ ساتھی جمی نے [illegible] نیویارک چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے، تاہم جونی ٹوریو سے سامنا ہوتے ہی وہ تمام دکھ بھول گیا۔

اُس کے سامنے اس کا استاد تھا، ایسا شخص جسے وہ جرائم کی دنیا میں قابلِ تقلید خیال کرتا تھا۔

جونی ٹوریو نے الفانسو کو شکاگو میں قائم اپنے ایک قحبہ خانے میں ملازم رکھ لیا۔ ساتھ ہی اُسے ہدایت کی کہ وہ شکاگو کے جرائم پیشہ گروہوں کے بارے میں شدبد حاصل کرے۔ دھیرے دھیرے وہ مختلف وارداتوں میں بھی حصہ لینے لگا۔

جلد ہی الفانسو، جونی ٹوریو کا باڈی گارڈ بن گیا۔ عوام کے لیے وہ سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کا ڈیلر تھا لیکن حقیقتاً وہ جرائم کی دنیا میں تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔

☆☆☆

شکاگو امریکا کا کرپٹ ترین شہر تھا، رشوت شہر کی رگوں میں سرایت کر چکی تھی اور کولوسمو رشوت کے استعمال میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی ریاست جسم فروشی، نشہ آور اشیاء کی فروخت اور جوئے کے اڈوں پر قائم تھی۔

جونی اپنے خالو جیمس کولوسمو سے شدید اختلاف کے باوجود اس کے ساتھ کام کر رہا تھا لیکن پھر 1920ء کے آغاز میں خالو بھانجے کے اختلافات شدت اختیار کرنے لگے۔

دراصل حکومت نے جنوری 1920ء میں شراب کی تیاری، ترسیل اور فروخت پر کُلی طور پر پابندی عائد کر دی، جو اگلے تیرہ برس قائم رہی۔ حکومت کی جانب سے شراب کے خاتمے کی مہم وسیع پیمانے پر شروع کی گئی۔ شراب سے بھرے لاکھوں گیلن ضایع کیے گئے۔ ہزاروں بوتلیں توڑی گئیں۔ کنستر کے کنستر نالیوں میں بہا دیے گئے۔ اس اقدام کی اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے تشہیر بھی کی گئی۔

مخلص حکومتی نمائندے تو شراب کا آخری قطرہ بھی ضایع کر دینا چاہتے تھے لیکن شومئی قسمت، امریکا میں بدعنوان افسران کی کمی نہیں تھی جن کی اکثریت شکاگو میں مقیم تھی۔

ایک جانب انتہائی مہنگی غیرملکی شراب کی بوتلیں دیواروں پر مار کر پھوڑی جا رہی تھیں، دوسری جانب اس سودمند کاروبار کو جاری رکھنے کے نت نئے طریقے تلاش کیا جا رہے تھے۔

اُس وقت شہر کا میئر ولیم بگ بل تھامسن نامی ایک شخص تھا، جو بدمعاشوں سے بڑا بدمعاش تھا۔ پیسے کا وہ پجاری کھلے عام رشوت لیا کرتا تھا۔

جونی ٹوریو نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ شکاگو کے افسران کو خرید کر کوئی بھی شخص شراب کی اسمگلنگ اور غیرقانونی فروخت کے ذریعے کروڑوں ڈالر کما سکتا ہے۔

جونی ٹوریو زر پرست میئر سے ایک خفیہ میٹنگ کر چکا

تھا، جس میں اُسے نے نوجوان جونی کو یقین دلایا تھا کہ اگر اُس کا منہ نوٹوں سے بھر دیا جائے تو وہ بہ خوشی اسے bootlegging، یعنی شراب کی غیر قانونی فروخت کی اجازت دے دے گا۔

میئر سے ملاقات کے بعد اُس نے یہ تجویز اپنے خالو کولوسمو کے سامنے رکھی جس نے اُسے یہ کہتے ہوئے رَد کردیا کہ وہ قحبہ خانہ چلانے میں خود کو مطمئن پاتا ہے اور اِس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس موضوع پر دونوں میں شدید بحث ہوئی لیکن کولوسمو سے رشتے داری کے باعث جونی نے صبر کا گھونٹ پی لیا۔

رشتے داری جونی کے پیروں کی بیڑی نہیں بنی۔ اپریل 1920ء میں کولوسمو نے اس کی خالہ وکٹوریا کو طلاق دے کر ایک اوپرا سنگر، ڈیل ونٹر سے شادی کرلی۔ یہی شادی کولوسمو کے زوال کا سبب بنی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر شکاگو میں یہ خبر پھیل گئی کہ کولوسمو اپنے گینگ پر گرفت کھو رہا ہے اور اب وہ مزید حکومت کرنے کا حق دار نہیں۔ کولوسمو کے چند خیر خواہوں کو یقین تھا کہ یہ خبریں کوئی اور نہیں بلکہ خود جونی ٹوریو پھیلا رہا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے سدِّباب کے لیے کوئی اقدام کرتے 11 مئی کا سورج طلوع ہوگیا۔

اس روز کولوسمو اپنے ہی ہوٹل کی لابی میں مردہ پایا گیا۔ اُسے بے حد نزدیک سے گولیاں مار کر قتل کیا گیا تھا۔

ہر شخص جانتا تھا کہ اِس قتل کا ذمے دار جونی ٹوریو ہے اور ایسا تھا بھی، اس واردات میں نہ صرف الفانسو، جو اَب ال کیپون کے نام سے پکارا جانے لگا تھا، پوری طرح شامل تھا بلکہ اِس کے ڈانڈے نیویارک میں بیٹھے فرینکی کے غیر قانونی کاروبار سے بھی ملتے تھے۔ بدقسمتی سے پولیس کو اِن افراد کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔

آیندہ چند ہفتوں میں جونی نے کولوسمو کے پورے کاروبار پر قبضہ کرلیا۔ اب وہ اپنے سب سے بڑے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے آزاد تھا!

☆☆☆

غیر قانونی شراب کی خرید و فروخت کا دھندا شروع کرنے کا خواہش مند جونی اب کُلی طور آزاد تھا۔ اسے الفانسو کیپون جیسے وفاداروں ساتھیوں کا تعاون حاصل تھا۔

اس وقت تک ملک بھر میں پھیلے شراب سازی کے بیش تر کارخانے بند کردیے گئے تھے۔ جو چھوٹے موٹے کارخانے چل بھی رہے تھے، ان کے مالکان ہمہ وقت ... میں بتلا رہتے۔ جونی چھوٹے بھٹوں کے مالکان ... نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تو بے حد وسیع تھا۔

امریکا میں خریداروں کی کوئی کمی نہیں تھی اور شکاگو اس نئے کاروبار کا مرکز بننے کی قابلیت رکھتا تھا جو ریاست کے دیگر شہروں کے برعکس کینیڈا کے قریب تھا جہاں ... وقت شراب سازی زوروں پر تھی۔

کینیڈا کا مافیا، خصوصاً شراب کے اسمگلروں سے ... کرنا جونی کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا جو اِس کاروبار کا حصہ بننے کے حوالے سے انتہائی پُرجوش تھے۔

شراب کے حصول کا ذریعہ سمندر تھا۔ امریکا کی ... مشرقی ساحلی پٹی پر بنیں چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں اس ... میں معاون ثابت ہوسکتی تھیں۔ گو کہ ساحل پر نیوی تعینات تھی، تاہم ان کے اعلیٰ افسران کو خریدنا جونی کے لیے ... نہیں تھا۔

اسمگلنگ کے لیے جونی ٹوریو کا وضع کردہ طریقہ ... ہونے کے باوجود خاصا پُراثر تھا۔ کینیڈا سے جو بحری ... شراب کے کنستر لے کر آتے، وہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے سے قبل ہی خالی ہوجاتے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی مدد ... شراب ساحل پر پہنچادی جاتی۔ رشوت خور اہل کار ملاحوں کی بھرپور رہنمائی کرتے۔ یوں شراب سے بھری کشتیاں قانون کا مذاق اُڑاتے ہوئے بہ آسانی ساحل تک پہنچ جاتیں ... سے اُنہیں ٹرکوں میں بھر کر براستہ نیویارک شکاگو پہنچایا جاتا۔ نیویارک میں شراب سے لدے ان ٹرکوں کو ... راستہ فراہم کرنے کا کام فرینکی یل انجام دیتا جس ... پولیس ڈیپارٹمنٹ کے بڑے حصے کو خرید لیا تھا۔

جونی نے اس کام کے لیے ایسے افراد کا انتخاب ... جو خود بھی شراب کے رسیا تھے اور اس عمل کو اپنی ضرورت ... کر انجام دیا کرتے تھے۔ اس خطرناک کام کے عوض ... معاوضہ تو تھوڑا ملتا لیکن اعلیٰ شراب کے چند گھونٹ ... جاتے۔

جونہی کینیڈین شراب کی پہلی کھیپ شکاگو پہنچی، شہر ... کھلبلی مچ گئی۔

پھر رنگ و نور کی بارش ہونے لگی۔ رقص و سرود کی محافل برپا ہونے لگیں، قحبہ خانوں کی ماند پڑ چکی رونق لوٹ آئی۔ کرپٹ سرکاری اہل کار، جرائم پیشہ افراد ... ہی میز پر اکٹھے بیٹھنے لگے۔

... شراب کی فروخت شروع کرنے سے قبل جونی نے ... بدمعاش میئر کو اس کا حصہ اور وہسکی کی چند بوتلیں پہنچادی تھیں!!

☆☆☆

رنگین مزاج شہر شکاگو انتہائی وسیع تھا۔ وہاں کئی بااثر افراد مقیم تھے، مختلف جرائم پیشہ گروہ سرگرم تھے جو جونی کی بڑھتی قوت کے باعث شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔

ماضی میں جرائم پیشہ گروہوں نے علاقے بانٹ رکھے تھے۔ وہ اپنے اپنے علاقے میں کام کرتے لیکن جونی ایسی کسی حد بندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، وہ چاہتا تھا کہ پورے شکاگو پر اسی کا راج ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس نے دیگر گینگ کے زیرِ اثر آنے والے علاقوں میں قائم شراب خانوں کے مالکان پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ فقط اس کی فراہم کردہ شراب فروخت کریں۔

اس پراجیکٹ کی ذمّے داری اس نے اپنے دستِ راست الفانسو کیپون کو سونپی۔ کیپون نے اِس کام کے لیے پندرہ خونخوار بدمعاشوں کی ایک ٹیم تشکیل دی۔ وہ اسلحے سے لیس اپنے ساتھیوں کو لیے شراب خانوں میں داخل ہوتا اور ان کے مالکان سے کہتا ہے "دوستو، اس وقت صرف جونی ٹوریو ہی اعلیٰ کوالٹی کی شراب فراہم کر رہا ہے، براہ مہربانی آپ ہم سے شراب خریدیں، آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

جو شراب خانے جونی کے علاقے میں قائم تھے، ان کے مالکان نے تو بے چوں و چرا اس پیشکش کو قبول کرلیا لیکن دیگر جرائم پیشہ گروہوں کے زیرِ اثر آنے والے علاقوں میں موجود شراب خانوں کے مالکان نے اس دھمکی نما پیشکش کو درخورِ اعتناء نہیں جانا۔

کیپون کے پاس انہیں سیدھا کرنے کے لیے سادہ سا نسخہ تھا۔ انتہائی کارروائی سے قبل اس نے ایک بار پھر ان سے رابطہ کیا۔ اس بار لہجے میں دھمکی کا عنصر بے حد واضح تھا۔ چند تو مان گئے، لیکن جو اَب بھی شراب خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، ان کے شراب خانوں پر ہلکی نوعیت کے دستی بموں سے حملہ کیا گیا۔

کیپون کا طریقہ دلچسپ تھا۔ جس شراب خانے پر وہ حملہ کرتا، دوسرے دن چہرے پر ہمدردی سجائے اس کے مالک کے پاس پہنچ جاتا۔

"مجھے بہت دکھ ہے کہ کسی بدمعاش نے آپ کی ملکیت کو نقصان پہنچایا۔ خیر، پروا نہ کریں۔ میں آپ کو اُدھار دینے کے لیے تیار ہوں، آپ شراب خانہ ٹھیک کروالیں۔ پیسے لوٹانے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور ہاں جناب... اگر شراب خریدنی ہے، تو ہم سے خریدیں۔ ہم بہترین شراب فراہم کرتے ہیں!"

یہ طریقہ انتہائی مؤثر ثابت ہوا۔ چند شراب خانوں کے مالکان کو یہ خدشہ تھا کہ جونی کی اطاعت قبول کرنے کے بعد وہ دیگر جرائم پیشہ گروہوں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ کیپون کو اس مسئلے کی شدت کا اندازہ تھا اور اس نے اِس کا حل بھی سوچ رکھا تھا۔

اس نے اپنے مخالفین کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور یوں شکاگو میں غیر قانونی شراب کی فروخت کا آغاز ہوتے ہی خون کی ندیاں بہنیں لگیں۔

کبھی کسی تاریک گلی سے لاش ملتی، کبھی کچرا کنڈی سے۔ کبھی کسی شخص کو اس کی گاڑی میں نشانہ بنایا جاتا، کبھی گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کردیا جاتا۔

ان واقعات نے جونی ٹوریو کے مخالفین میں کھلبلی مچادی۔

اسی عرصے میں کیپون کو اطلاع ملی کہ دیگر جرائم پیشہ گروہ بھی شراب اسمگلنگ کرنے کے منصوبے ترتیب دے رہے ہیں اور انہیں حکام کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔

جب اس ضمن میں جونی نے شکاگو کے بدمعاش میئر سے رابطہ کیا تو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اُسے فقط پیسوں سے غرض ہے۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں نوجوان، لیکن کیا کروں، وہ بھی رشوت دینے کے لیے تیار ہیں... ہاں تمہیں انہیں راستے سے ہٹانے کی اجازت ہے، میں تمہاری طرف سے آنکھیں بند کرلوں گا۔ پولیس تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔" اس دولت پرست انسان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میئر سے ملاقات کے بعد جونی نے کیپون کو واضح ہدایت کردی کہ دشمنوں سے کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے۔

"اگر تمہیں انتہائی حد تک بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ ان کے دل میں اپنا خوف بٹھادو، سمجھ گئے!" جونی نے کیپون کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا باس!" کیپون کی آنکھوں میں درشتی تھی!

☆☆☆

سبز اور پیلے رنگ کو ترجیح دینے والا خوش لباس کیپون تضادات کا مجموعہ تھا!

اُس پانچ فٹ دس انچ کے صحت مند اطالوی نژاد امریکی کو عام لوگ ایک خوش اخلاق شخص کے طور پر جانتے تھے۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد اُس نے پورے خاندان کو شکاگو بلوالیا تھا۔ اس کے مکان میں پندرہ کمرے تھے، جہاں اُس کے اہلِ خانہ نے رہائش اختیار کی۔ کیپون کے بھائیوں نے بھی اس کے نقوش پا کا تعاقب کرتے ہوئے جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ اِسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک شریف النفس جوڑے کے تمام بیٹے بدمعاش نکلے، لیکن شکاگو کے پوش علاقے میں قائم الکیپون کے گھر میں کبھی کاروباری معاملات زیرِ بحث نہیں آئے۔ یوں تو وہ اکثر گھر سے باہر ہی رہتا، لیکن جب کبھی گھر میں ہوتا، تو ایک اچھے انسان کی طرح پیش آتا۔ البتہ اپنے بیوی سے وہ وفادار نہیں تھا۔ اس کی کئی محبوبائیں تھی، لیکن اُس نے اُن عورتوں کو اپنے گھر سے دور رکھا۔

باہر کی دنیا بھی اسے ایک ملن سار انسان کے طور پر جانتی تھی۔ جب کبھی وہ ریسٹورنٹ جاتا تو ویٹروں کو خاصی ٹپ دیتا۔ اگر کوئی شخص اس کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کرتا تو وہ اس کی بھرپور مدد کرتا۔ غریبوں کی دست گیری بھی کیا کرتا۔ الغرض وہ ایک عجیب آدمی تھا۔

گوکہ الکیپون خاصا اثر و رسوخ حاصل کر چکا تھا، کئی قتل کر چکا تھا، دشمنوں کے دل میں اپنا خوف بیٹھا چکا تھا، لیکن تاحال شکاگو کے عام باسی اس کے نام سے ناواقف تھے۔ اُسے پہچان ایک عجیب واقعے سے ملی۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ وہ گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنے کا تو قائل تھا لیکن اس کے لیے بھی اس نے دو طریقے وضع کر رکھے تھے۔ ایک شریفوں والا طریقہ، ایک بدمعاشوں والا طریقہ!

بدمعاشوں والا طریقہ تو سادہ تھا، وہ اپنے ساتھ ریوالور رکھتا تھا۔ شریفوں والا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی جیب میں پولیس شیرف کا جعلی بیج بھی رکھتا جس کی مدد سے چھوٹے موٹے کام نکال لیتا۔ اور یہی بیج شکاگو آنے کے بعد اس کی پہلی گرفتاری کا موجب بنا۔

یہ 1922ء کی ایک سرد رات کا ذکر ہے۔ کیپون نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اچانک گاڑی قابو سے باہر ہوگئی اور ایک ٹیکسی سے جاٹکرائی۔ نشے میں دھت کف اُڑاتا ہوا گاڑی سے باہر نکلا اور ٹیکسی ڈرائیور کو گر... سے پکڑ لیا۔ جب ٹیکسی ڈرائیور نے سمجھانے کی کوشش... جناب غلطی تو آپ کی ہے! تو اس نے جیب سے ... شیرف کا بیج نکال کر ہوا میں لہرایا۔

"احمق، میں پولیس شیرف ہوں۔ اب تم ... زندگی جیل میں سڑو گے!"

یہ سلسلہ جاری تھا کہ اصلی پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ... کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت تک وہ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ ... نے پولیس افسر کو سمجھایا کہ اسے گرفتار کرنا لاحاصل ہے ... بہ آسانی رہا ہوجائے گا۔

"دیکھتا ہوں، تم کیسے جیل سے نکلتے ہو!" پولیس ... نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اگلے دن اِس واقعے کی تفصیلات خبر کی صورت ... میں شائع ہوگئی، الکیپون کی تصویر بھی ساتھ تھی، لیکن حیرت انگیز طور پر چند روز بعد وہ شکاگو کی سڑکوں پر آزاد گھوم رہا تھا۔ اُس نے درست ہی کہا تھا کہ اسے گرفتار ... ایک لاحاصل عمل تھا۔

1923ء انتہائی خونی ثابت ہوا۔ جونی کے ... دشمنوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا، اُن کا ایک ... مقصد تھا، جونی کی اجارہ داری ختم کرنا، لیکن شاطر جونی غافل نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے اپنی چالیں چل رہا تھا۔ سفاک کیپون اس کا ہتھیار تھا۔

کیپون نے اپنے گرد ایسے گھاگ قاتل اکٹھے کر... تھے، جو قتل کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

اس برس شاید ہی کوئی ایسی رات گزری ہوئی، جب شکاگو کی تاریک گلیوں میں کوئی قتل نہ ہوا ہو۔ شہر کے بگڑ... ہوئے حالات نے امریکا کے اعلیٰ حکام کو بھی تشویش میں مبتلا کردیا لیکن شکاگو پولیس کے کرپٹ اہل کار اس معاملے میں سدھار کے متمنی نہیں تھے، انہیں تو فقط پیسے سے غرض تھی سو قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری رہا۔

پھر ایک روز کاروبار کو وسعت دینے کے لیے کیپون نے گھوڑوں کی دوڑ پر پیسے لگانے کی تجویز پیش کردی۔ جونی اِس ضمن میں تذبذب کا شکار تھا لیکن کیپون نے اسے یقین دلایا کہ یہ سودا سودمند ثابت ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا، تاہم اس بار کیپون نے تشدد کو بہ طور ہتھیار استعمال نہیں کیا۔ وہ ایسا ... بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ گھوڑوں کی ریس پر پیسے لگانے والے

افراد انتہائی بارسوخ ہوتے تھے۔ اُن میں کئی ایسے لکھ پتی شامل تھے جو اپنی سیکورٹی کے لیے جونی ہی کو ماہانہ بھتہ دیا کرتے تھے۔ ان دولت مندوں کو ٹھگنے کے لیے کیپون نے روایتی جعل سازوں والا طریقہ اختیار کیا۔

جب کبھی گھوڑوں کی ریس ہوتی، اُس کے ساتھی نفیس لباس زیب تن کیے، سگار منہ میں دبائے ریس کورس پہنچ جاتے۔ وہ مختلف گروہوں کے قریب کھڑے ہوکر بہ آواز بلند اس موضوع پر بحث کرتے کہ اس بار کس گھوڑے کے جیتنے کے امکانات ہیں اور اُنھوں نے کس پر رقم لگائی ہے۔

ایک کہتا۔ "مسٹر جے، میرا یقین کریں، اندر کی خبر ہے، اس بار آٹھ نمبر کا گھوڑا جیتے گا!"

دوسرا حیران ہونے کی اداکاری کرتا۔ "آپ وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں مسٹر اورگن؟"

"میں نے کہا ناں جناب، اندر کی خبر ہے۔" پہلا مسکراتا۔ "آپ میرا یقین کریں۔ نیویارک میں بیٹھے افراد نے بھی اسی گھوڑے پر پیسے لگائے ہیں۔"

"کیا بات کر رہے ہیں جناب!" دوسرا حیران ہوتا۔ "پھر میں بھی اسی پر رقم لگا دیتا ہوں۔"

وہ مختلف گروہوں کے نزدیک کھڑے ہوکر بڑی مہارت سے اُن کی ذہن سازی کرتے۔ لوگ بہ آسانی ان کے جھانسے میں آجاتے۔ کچھ دیر بعد ہر دوسرا شخص آٹھ نمبر کے گھوڑے پر پیسے لگا چکا ہوتا۔ نتائج کی بابت غور کرنے کی ضرورت نہیں، آٹھ نمبر کا گھوڑا ہار جاتا۔

دراصل شاطر کیپون ریس شروع ہونے سے پہلے ہی گھڑسواروں کو خرید لیا کرتا تھا۔

یہ سلسلہ ایک برس کامیابی سے جاری رہا لیکن پھر ایک صحافی نے اپنی اسٹوری میں کیپون کا پردہ چاک کر دیا جس کے بعد اس نے گھوڑوں کی ریس سے اپنی توجہ ہٹا کر صحافیوں پر مرکوز کرلی۔

ایک بدمعاش ہونے کے باوجود کیپون خواہش مند تھا کہ معاشرہ اسے ایک اچھے انسان کے طور پر دیکھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس ضمن میں اخباری صفحات بے حد سودمند ہیں، وہ اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرسکتے ہیں۔ ساتھ ہی اُسے اس بات کا بھی ادراک تھا کہ اخبارات اُس کا امیج تباہ کرسکتے ہیں۔ گھوڑوں کی ریس کا اسکینڈل اخبارات کی زینت بننے کے بعد کیپون سمجھ گیا کہ شکاگو پر راج کرنے کے لیے صحافیوں کو اپنی مٹھی میں رکھنا ازحد ضروری ہے۔

اُن ہی دنوں کیپون نے "شکاگو ٹریبون" کے ایڈیٹر رابرٹ جان پر ایک جان لیوا حملہ کیا۔ اپنے تئیں تو وہ رابرٹ کو قتل کرچکا تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ شخص بچ گیا۔ اِس واقعے سے کیپون کی شخصیت کے تضادات کا اظہار ہوتا ہے۔

کیپون نے پیسے کی طاقت سے کئی صحافیوں کو خرید لیا۔ جو نہیں بکے، انہیں دھمکیاں دی گئیں، ضرورت پڑنے پر تشدد بھی کیا گیا۔

کیپون نے نہ صرف رابرٹ کے اسپتال کا بل ادا کیا بلکہ آنے والے برسوں میں پھر کبھی اُس کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا!

☆☆☆

کیپون کا اثر فقط شکاگو تک محدود نہیں تھا۔ نیویارک میں فرینکی کے بڑھتے رسوخ کے باعث وہ اپنے آبائی شہر کے معاملات میں مداخلت کرنے کے لیے بھی آزاد تھا۔

اس کے کئی رشتے دار ریاست الونائی کے علاقے سیسورو میں آباد تھے۔ اِس شہر میں بھی وہ خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔

1924ء میں سیسورو میں ہونے والے ٹاؤن کونسل کے الیکشن کا شمار امریکی تاریخ کے بدترین انتخابات میں ہوتا ہے جس میں دھاندلی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے۔

میئر کا انتخاب لڑنے والا شخص کیپون کا منظورِ نظر تھا جس نے مستقبل کے حوالے سے اُس سے کئی وعدہ کر رکھے تھے۔ یہی وجہ کہ کیپون اپنے بااعتماد ساتھیوں کو ٹرک میں بھر کر سیسورو پہنچ گیا جہاں اُس کے غنڈے بندوق کی نوک پر ووٹروں کو اُس کرپٹ سیاست داں کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لیے مجبور کرتے رہے۔

الیکشن والے روز کیپون خود اپنے غنڈوں کی کارروائیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ ساتھ میں اُس کا بھائی فرینک بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں پستول تھے اور وہ چہرے پر دُرشتی سجائے ووٹروں کو ڈرا دھمکا رہے تھے۔

تبھی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے کیپون کو گہرے صدمے سے دوچار کردیا۔

کیپون اور فرینک ریوالور لیے پولنگ بوتھ پر کھڑے تھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔

کیپون اور اس کے ساتھیوں نے فوراً پوزیشن سنبھال

لی۔ گولیوں کا تبادلہ شروع ہوگیا۔ پولیس کا پلہ بھاری تھا۔ ایک ایک کر کے کیپون کے ساتھی گرنے لگے۔ جان بچانے کے لیے کیپون کو وہاں سے بھاگنا پڑا، تاہم اُس کا بھائی فرینک اتنا خوش نصیب ثابت نہیں ہوا۔ فائرنگ کے تبادلے میں فرینک شدید زخمی ہوگیا تھا اور موقع ہی پر دم توڑ گیا۔

اس سانحے نے اس کے سخت دل کو گہری چوٹ لگائی لیکن مزید صدمے اس کے منتظر تھے۔ دوسرے دن کے اخبارات اس پولیس مقابلے کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔ اسے ایک مکروہ شخص کے طور پیش کیا گیا تھا۔ دوسری جانب جس شخص کو کیپون سپورٹ کر رہا تھا، اس نے جیت کے فوراً بعد ایک بیان جاری کر دیا کہ وہ جلد الکیپون نامی ناسور کو شہر سے نکال باہر کرے گا۔

اس بات پر کیپون آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے ہیٹ سر پر رکھا سیدھا ٹاؤن ہال پہنچ گیا جہاں وہ احمق صحافیوں میں گھرا قہقہے لگا رہا تھا۔

اس کے قہقہے دم توڑ گئے۔ اب وہ جبڑا تھامے زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ کیپون کے بھاری مکّے نے اس کے اگلے دو دانت توڑ دیے تھے۔

اُسی شام کیپون نے شہر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

شکاگو میں لاشیں گرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر وہ انسان جو جونی کے خلاف آواز اُٹھانے کی جسارت کرتا، موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ کیپون کی قیادت میں جونی کا گینگ شکاگو کے شمالی حصے میں داخل ہونے کی بھی کوشش کر رہے تھا، تاہم انہیں ایک بااثر سسلی نژاد امریکی خاندان کی وجہ سے شدید مزاحمت کا سامنا تھا، جس کا سربراہ ڈین اوبینین نامی ایک انتہائی بارسوخ اور دولت مند آدمی تھا۔

اُس نے رشوت اور طاقت جیسے مہلک ہتھیاروں سے شمالی علاقے پر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ وہاں شراب فروخت کرنے کا اختیار بھی اُسے ہی حاصل تھا۔

گو کہ شکاگو کی پولیس کرپٹ تھی لیکن بگڑتے حالات کی وجہ سے اب وفاقی اہل کار اس معاملے میں کود پڑے تھے اور وہ شکاگو کے جرائم پیشہ گروہوں کو قابو کرنے کی کوششوں میں جُٹے تھے۔

ایک شام اپنے بیئر بار میں بیٹھے ڈین اوبینین کو یہ اطلاع ملی کہ وفاقی اہل کار ٹھیک ایک ہفتے بعد اس کے شراب کے گوداموں پر چھاپا مارنے والے ہیں۔ یہ اس کے لیے پریشان کن نہیں تھی، تاہم اس نے ایک خیال سجھایا۔

اوبینین نے فوراً ایک آدمی اپنے دشمن نمبر ایک ٹوریو کی جانب روانہ کر دیا اِس پیشکش کے ساتھ کہ چاہے تو شمال میں شراب کی فروخت کے کاروبار میں پارٹنر بن سکتا ہے۔

پیشکش مشکوک اور حیران کُن تھی، تاہم اس سے حیران کن امر یہ تھا کہ جونی نے اسے قبول کر لیا۔ گو کہ کو ابتدا ہی سے سازش کی بو آرہی تھی لیکن وہ چپ رہا۔

اگلی شام جونی اور اوبینین کی ملاقات ہوئی جس دونوں نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اب وہ پارٹنر تھے۔

اوبینین کی چال کامیاب رہی۔ چند روز بعد شمال موجود شراب کے گوداموں پر چھاپا پڑ گیا جن کا مالک فقط اوبینین نہیں تھا... جونی ٹوریو بھی اِس کاروبار میں پوری طرح شریک تھا۔

چند گھنٹوں میں جونی کے نام کا وارنٹ جاری ہو اور وفاقی اہل کاروں نے ایک بھی لمحہ ضایع کیے بغیر گرفتار کر لیا۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دوسرے دن کے اخبارات تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔

’’شکاگو کا بدمعاش بادشاہ، سلاخوں کے پیچھے تھا‘‘

گو کہ اوبینین بھی گرفتار ہوا لیکن وہ پہلے ہی انتظامات کر چکا تھا۔ چند ہی روز بعد وہ آزاد گھوم رہا تھا۔ رہائی کے لیے بھی مسئلہ نہیں تھی، تاہم بے عزتی کا احساس کچوکے لگا رہا تھا۔

بااثر جونی پہلی بار گرفتار ہوا تھا اور اِسے اُس کا زوال سمجھا جا رہا تھا۔ مخالفین جشن منا رہے تھے۔

اِس واقعے نے کیپون کو آگ بگولا کر دیا۔ اس دنیا میں وہ ایک ہی انسان کو اپنا استاد مانتا تھا اور وہ تھا جونی ٹوریو جو اَب سلاخوں کے پیچھا تھا۔ اس نے اوبینین سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ غصیل جونی نے بھی اِس انتہائی فیصلے کی توسیع کر دی۔

ایک بار پھر نیو یارک کے داداگیر فرینکی سے رابطہ کیا گیا جو کرائے کے قاتل کی پوری کھیپ رکھتا تھا۔

10 اکتوبر 1924ء کی صبح پھولوں کی ایک دکان میں

تین افراد نے ڈین اوبینین کو موت کے گھاٹ اُتار دیا!

☆☆☆

سسلی نژاد امریکیوں کے گینگ کو اوبینین کے قتل سے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ شکاگو کا شمال سوگ میں ڈوب گیا اور اسی سوگ کے آتش فشاں سے انتقام کا لاوا اُبلا۔

اوبینین کی موت والے روز اُس کے دو قریبی ساتھیوں سفاک بگز مورین اور شاطر ہیمن وائس نے قسم کھائی کہ وہ جونی اور اُس کے دست راس کیپون کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ایک جانب جونی کا گینگ جشن منا رہا تھا، وہیں دوسری جانب شہر کے شمالی حصہ میں چھائی خاموشی میں ایک منصوبہ پنپ رہا تھا۔

بگز اور ہیمن وائس جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔

اوبینین کے قتل کے دو ماہ بعد 1925ء کے اوائل میں جونی ٹوریو پر ایک جان لیوا حملہ ہوا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا لیکن خوش قسمتی سے اس موقع پر کیپون اس کے ساتھ تھا جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کی۔

جونی کے جسم میں کئی گولیاں اُتر گئی تھیں۔ اسے صحت یاب.... ہونے میں خاصا وقت لگا۔ اس عرصے میں کیپون، بگز اور ہیمن کو پاگل کتے کی طرح تلاش کرتا رہا لیکن وہ دونوں انڈر گراؤنڈ ہوگئے تھے، تاہم انہوں نے جونی کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھا۔

حملے کے چند روز بعد شکاگو کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں ہوگئے جن میں جونی کا مذاق اُڑاتے ہوئے اُس کی اجارہ داری کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تھا۔

شکاگو کا سب سے بڑا داداگیر صحت یاب ضرور ہوگیا لیکن اب وہ اس دھندے سے اوب چکا تھا اور اُسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے۔ اُسے اپنی وراثت منتقل کر دینی چاہیے۔

صحت یابی کے جشن والے روز اس نے اٹلی جانے کا اعلان کرتے ہوئے کیپون کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

کیپون اپنے قابلِ احترام استاد کی جگہ لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے خاصی بحث کی لیکن بالآخر اسے جونی کی محبت اور ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ گینگ کے نئے لیڈر کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا!

گو کہ جونی کے بیماری کے دنوں میں شمال میں بگز اور ہیمن خاصے مضبوط ہو چکے تھے لیکن کیپون کی مرکزی دھارے میں آمد کے بعد کھیل کے اصول بدل گئے۔ گینگ وار میں شدت آگئی جس میں کیپون کا پلڑا بھاری تھا۔

غیر قانونی شراب کے فروخت میں بھی اچانک تیزی آگئی۔ ہزاروں گیلن شراب اسمگل کی گئی۔ دیگر شہروں میں شراب کی فراہمی بھی شروع ہوگئی۔ ایک اندازے کے مطابق اُس برس کیپون نے غیر قانونی شراب کی فروخت کے کاروبار سے سو ملین ڈالر جیسی خطیر رقم کمائی۔

شراب خانوں کے علاوہ جوئے کے اڈے بھی زور و شور سے چل رہے تھے۔ جسم فروشی کا کاروبار بھی وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یوں دھیرے دھیرے کیپون کا اثر بڑھنے لگا۔

شکاگو پر مکمل اختیار حاصل کرنے کے لیے اس نے لاکھوں ڈالر رشوت دی۔ سیاست دانوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو خریدنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس کسی نے مخالفت کی اُسے قتل کر دیا۔ اور جب کبھی اس کی جانب انگلی اُٹھی، اس نے منٹوں میں ثابت کر دیا کہ جس روز فلاں شخص قتل ہوا تھا وہ تو شہر سے باہر تھا۔

پھر اُسے بدمعاش میئر کی بھی بھرپور سپورٹ حاصل تھی جو کیپون کی طاقت کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اِس طرح بگز اور ہیمن کی طاقت آہستہ آہستہ گھٹنے لگی۔

کیپون کی سرگرمیوں کا مرکز شکاگو کا لیکسنٹن ہوٹل تھا جسے ’’کیپون کا قلعہ‘‘ کہا جاتا تھا۔ اس ہوٹل میں کئی خفیہ راستے تھے جن کی مدد سے وہ خاموشی سے ہوٹل میں داخل ہوتا اور چپکے سے نکل جاتا۔

اسے احساس تھا کہ دشمن اس کے خون کے پیاسے ہیں سو اس نے اپنی سیکورٹی بڑھا دی۔ کہنے والے کہتے ہیں، اُس کے ساتھ چلنے والے باڈی گارڈز کی تعداد صدر امریکا کے حفاظتی دستوں میں موجود اہل کاروں سے زیادہ ہوتی تھی۔

کیپون نے خود کو انڈر گراؤنڈ نہیں کیا۔ وہ وقتاً فوقتاً عوام کے سامنے آتا رہا۔ وہ اچھے اچھے ریسٹورنٹ میں لنچ کرتا، مہنگے ہوٹل میں ڈنر کرتا۔ دعوتیں دیتا، ثقافتی تقریبات میں شرکت کرتا۔ لوگوں سے گھلتا ملتا۔ فلاحی سرگرمیوں میں حصہ

لیتا۔
اگر کبھی صحافی اس سے تلخ سوالات کرتے تو وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتا ”دوستو، میں ایک بزنس مین ہوں۔ لوگوں کو وہی دیتا ہوں جو وہ مانگتے ہیں!“
اور کبھی کہتا۔ ”میں تو عوامی خواہشات پوری کرنے والا ایک تاجر ہوں، بس!“
نیویارک پر بھی اُس کی دہشت طاری تھی جہاں وہ اکثر جایا کرتا لیکن ان دوروں کا مقصد چھٹیاں گزارنا نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں ہونے والے جرائم میں بھی کپون براہِ راست شریک تھا۔
ایسا ہی ایک واقعہ 1925ء کے وسط میں پیش آیا جب کپون اپنے دوست فرینکی کی سالگرہ کے جشن میں شرکت کی غرض سے نیویارک گیا اور وہاں اس نے ایک ایسے بااثر سرکاری اہل کار کو قتل کردیا جو فرینکی کے لیے مشکلات پیدا کررہا تھا۔ اُس کے بہ قول یہ فرینکی کے لیے سالگرہ کا تحفہ تھا!
شاید فرینکی اس تحفے پر خوش ہوا ہو لیکن نیویارک میں کھلبلی مچ گئی۔ اسٹیٹ پولیس حرکت میں آگئی۔ اس کے خلاف وارنٹ جاری ہوگئے لیکن کپون نیویارک سے فرار ہونے میں کامیاب رہا اور الونائی چلا گیا جہاں اس نے خود کو رضا کارانہ طور پر پولیس کے حوالے کردیا۔
گرفتاری کے وقت اُس نے ایک بیان جاری کیا
”میں بے گناہ ہوں، لیکن قانون کا احترام کرتا ہوں، اس لیے خود کو پولیس کے حوالے کررہا ہوں!“
اس زمانے میں ریاستی اداروں کے درمیان رابطے کا شدید فقدان تھا۔ فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن بھی خاصا کمزور تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ بہ آسانی بے گناہ ثابت ہوگیا۔
یہ بڑی کامیابی تھی۔ وہ فاتح کی حیثیت سے شگاگو لوٹا جہاں جشن منایا گیا۔
چند روز بعد کپون نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ اس نے شگاگو کے ایک معروف رپورٹر اور فوٹو گرافر کو ساتھ لیا اور مرکزی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔
”جناب، میرا نام الفانسو کپون ہے، اگر میرے خلاف کوئی الزام ہے، تو مجھے گرفتار کرلیں!“
اس عجیب و غریب پیشکش پر پولیس اہل کار بے بسی سے مسکرا ہی سکتے تھے۔
پولیس اسٹیشن سے نکل کر وہ کورٹ پہنچ گیا خود کو جج کے سامنے پیش کردیا۔ ”جناب میرا نام الفانسو...“
جج بھی ہنس کر رہ گئے۔ اس دوران فوٹو گرافر تصاویر اُتارتا رہا، رپورٹر کا قلم چلتا رہا۔ دوسرے دن اخبارات میں یہ مسالے دار اسٹوری شایع ہوگئی جس نے اُس کی شہرت کو چار چاند لگادیے۔
سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک ”سیلیبریٹی“ بن چکا تھا!

☆☆☆

کپون کی بڑھتی شہرت اور اثر نے اس کے مخالفین کو سیخ پا کردیا تھا۔ وہ ہر صورت اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ سو اُنہوں نے اُسے قتل کرنے کے لیے ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا۔
20 ستمبر 1926ء کو جب کپون ہیو تھرنی ہوٹل میں بیٹھا لنچ کررہا تھا، جدید اسلحے سے لیس دشمنوں کی پوری فوج نے ہوٹل پر حملہ کردیا۔
دشمنوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دس گاڑیوں پُر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں انتہائی مہلک تصور کی جانے والی ٹامی گن تھی۔
اُس دوپہر ہوٹل پر گولیوں کی بارش ہوئی۔ اُس کی دیواریں چھلنی ہوگئیں۔ اندازاً پانچ ہزار گولیاں برسائی گئیں۔
خوش قسمتی سے اس شام کپون کو ایک وفادار نوجوان فرینکی ریو کا ساتھ حاصل تھا جس نے گولیوں کی آواز سنتے ہی خود کو کپون پر گرادیا تھا۔ یوں اس بھیانک حملے میں وہ محفوظ رہا۔
جلد ہی اُسے پتا چل گیا کہ یہ حملہ بگز مورین نے کروایا تھا جس نے دیگر ریاستوں کے چند بااثر دوستوں کی مدد سے شگاگو کی شمالی حصے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوششیں تیز کردی ہیں۔
اس واقعے کے فوراً بعد کپون نے ایک انتہائی مہنگی گاڑی ”کیڈلک“ خریدلی جس کی باڈی اور تمام شیشے بلٹ پروف تھے۔ ساتھ ہی اُس میں اسلحہ رکھنے کے لیے کئی خانے بنے ہوئے تھے۔ اِس کار کا بہت چرچا ہوا۔
ہیو تھرونی ہوٹل کے واقعے کے بعد کپون کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ دشمنوں کا خاتمہ از حد ضروری تھا۔ اس نے ایک ڈیتھ اسکواڈ تشکیل دیا جس کا مقصد دو آدمیوں کے گرد گھیرا تنگ کرنا تھا، ایک ہیمن وائس اور دوسرا بگز مورین!
11 اکتوبر 1926ء کی دوپہر بڑی مہارت سے

کرائے کے قاتلوں نے ہیمن وائس کے جسم میں چار گولیاں اُتار کر اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔
یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ کپون کے ساتھی جشن منانا چاہتے تھے لیکن اُس کے منصوبے کچھ اور تھے۔
ہیمن کی موت کے بعد اس نے بگز مورین کے نام ایک اخباری تعزیتی پیغام جاری کردیا اور دوسرے ہی روز بگز کو صلح کا پیغام بھجوادیا ”شگاگو میں بہت جگہ ہے دوست۔ پیسے کمانے کے بڑے امکانات ہیں۔ لڑنا بے کار ہے، آؤ دوست بن جائیں!“
بگز غصے اور انتقام کے جذبے سے سُلگ رہا تھا لیکن اس وقت عقل مندی یہی تھی کہ وہ کپون سے ہاتھ ملالے کیونکہ وہ بہت کمزور ہوگیا تھا اور موجودہ حالات میں خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر تھا!

☆☆☆

بگز اور کپون کے امن معاہدے سے شگاگو میں جرائم کی شرح یکدم بڑھ گئی لیکن کپون پُرسکون تھا۔ اسے آرام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔
اب وہ با قاعدہ ایک کاروباری آدمی کی طرح آفس میں بیٹھنے لگا۔ اس کے دفتر میں داخل ہونے والے کو چنداں احساس نہیں ہوتا تھا کہ اُسے ایک بدمعاش چلارہا ہے۔ اُسی زمانے میں اُس نے چار ہزار ڈالر کے عوض پام آئرلینڈ، فلوریڈا میں ایک مینشن خریدا اور اس کی تزئین و آرائش پر ہزاروں ڈالر خرچ کر کے اُسے ایک محل کی شکل دے دی۔
بگز کو چھوڑ کر اُس کے بیش تر دشمن ختم ہوچکے تھے، تاہم اس نے سیکورٹی کے معاملے پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ اب بھی اس کے گرد باڈی گارڈز کی فوج ہوتی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حالات کسی بھی وقت بگڑ سکتے ہیں۔ اور ایسا ہی ہوا، اُس کا قریبی دوست فرینکی اُس کے خلاف ہوگیا!
دراصل اس وقت تک فرینکی نیویارک کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا، تاہم غیر قانونی کاروبار سے حاصل ہونے والی اُس کی آمدنی شگاگو پر راج کرنے والے کپون کی آمدنی سے خاصی کم تھی، جس کا اسے قلق تھا۔ اسے یاد تھا کہ کبھی کپون اس کے ہاں ملازمت کیا کرتا تھا اور اب وہ کروڑوں میں کھیل رہا ہے۔ اِسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ جونی ٹوریو نے اُس کی جگہ کپون کو اپنا جانشین مقرر کیا۔
تاہم یہ اختلافات اُن کے تصادم کا سبب نہیں بنے۔ معاملہ خالصتاً مفادات کا تھا۔ جب مفادات ٹکرائے، دو دوست دشمن بن گئے لیکن پہل فرینکی ہی نے کی۔
دراصل کینیڈین وہسکی سے بھرے ٹرک نیویارک ہی سے گزرتے تھے جن کی حفاظت کی ذمّے داری فرینکی ہی کی تھی۔ اسی وہسکی کے طفیل کپون لاکھوں ڈالرز کمارہا تھا۔ فرینکی کو قلق تھا کہ اسے کپون کے منافع سے بہت تھوڑا حصہ مل رہا ہے۔
شراب خریدنے کے خواہش مند دیگر گروہ اس بات سے واقف تھے اور کافی عرصے سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ وہ کپون کو چھوڑ کر اُن کے لیے کام کرنا شروع کردے۔
ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ بالآخر فرینکی نے کپون کی کمر میں چھرا گھونپنے کا فیصلہ کرلیا۔
کپون کے لیے یہ خبر حیران کُن تھی کہ بروکلن سے روانہ ہونے والے کئی ٹرک راستے میں غائب ہوگئے ہیں۔ اس نے فوراً فرینکی سے رابطہ کیا جس نے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی لیکن کپون کے دل میں شک بیٹھ چکا تھا۔
اُس نے بروکلن میں مقیم ایک مشترکہ دوست جیمس ڈی ایمیو کو خفیہ طور پر فرینکی پر نظر رکھنے کی ہدایت کردی۔
اُس کا شک صحیح ثابت ہوا۔ چند روز بعد جیمس شواہد کے ساتھ اُس کے سامنے موجود تھا۔
”ٹرک کوئی اور نہیں، بلکہ تمہارے قریبی دوست فرینکی ہی غائب کروارہا ہے!“ جیمس نے اسے بتایا۔
کپون نے سوچ بچار میں وقت ضایع نہیں کیا، اس نے فوراً ہی اپنے دیرینہ دوست کے ”ڈیتھ وارنٹ“ پر دستخط کردیے۔
یکم جولائی 1927ء کو نیویارک میں چند نامعلوم افراد نے ایک تاریک سڑک پر فرینکی پر حملہ کردیا۔
حملہ آور اپنے کام میں ماہر تھے لیکن ان کا مقابلہ کسی عام انسان سے نہیں تھا وہ فرینکی تھا نیویارک کا سب سے بڑا بدمعاش!
حملہ ناکام گیا۔ گو کہ فرینکی کے چند ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن وہ اس حملے میں محفوظ رہا۔
اس ناکام حملے کے ٹھیک چھے دن بعد بروکلن کی ایک خاموش، تاریک سڑک پر جیمس کی لاش پڑی تھی۔
اس بات کا تعین کبھی نہیں ہوسکا کہ جیمز کو کس نے قتل کیا۔ آیا فرینکی نے اُسے غداری کی سزا دی، یا اپنے خلاف

ثبوت مٹانے کے لیے کیپون نے اُسے راستے سے ہٹادیا۔
فرینکی پر حملے کے بعد نیویارک سے گزرنے والے کیپون کے اکثر ٹرک غائب ہونے لگے۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے کیپون نے فرینکی اور اپنے پُرانے تعلقات بحال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
اُس نے فرینکی کو شکاگو مدعو کیا۔ فرینکی جانتا تھا کہ کیپون ہی نے اس پر حملہ کروایا تھا لیکن اُس نے دعوت قبول کرلی۔
شکاگو میں اس کا شان دار استقبال کیا گیا۔ کیپون ایک اچھا میزبان ثابت ہوا لیکن فرینکی کا ذہن بدل چکا تھا۔ نیویارک لوٹنے کے بعد اُس نے کیپون کی مہمان نوازی کو یکسر بھلادیا۔ ٹرک غائب ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔
کچھ عرصے تک کیپون کاروبار میں نقصان برداشت کرتا رہا، لیکن پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب فرینکی بہت محتاط ہوگیا ہے، اس کے گرد محافظوں کا پورا جتھا ہے۔ سو اُس نے روایتی حملہ کرنے کے بجائے ایک ٹھوس منصوبہ ترتیب دیا۔
جولائی 1928ء کی ایک صبح اپنے کلب میں موجود فرینکی کو ایک مشکوک فون کال موصول ہوئی۔ فون کرنے والے نے فرینکی کو بتایا کہ اُس کی بیوی اور کم سن بیٹی کے ساتھ ایک بھیانک حادثہ پیش آ گیا ہے، وہ فوراً گھر پہنچے۔
فرینکی اس چال کو نہیں سمجھ سکا۔ وہ کلب سے نکل کر سیدھا گاڑی میں سوار ہوا اور گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ جلد بازی میں اس نے کسی باڈی گارڈ کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ گھر کے نزدیک موت اس کی منتظر تھی۔ اس اُداس صبح وہ گولیوں کی بوچھار کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ نیویارک کی جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ زندگی کی جنگ ہار چکا ہے۔
جب یہ خبر شکاگو میں بیٹھے منصوبہ ساز تک پہنچی، اس نے سوگ منانے کا اعلان کردیا۔
آخر فرینکی اس کا برسوں پُرانا دوست تھا!

☆☆☆

1929ء کا آغاز شان دار تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ کیپون کی قوت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا لیکن شکاگو کا شمالی علاقہ تاحال بگز مورین کے قبضے میں تھا جس کے ساتھ کیپون نے چند برس قبل امن معاہدہ کرلیا تھا لیکن اب بگز نے پُرپرزے نکالنے شروع کردیے تھے۔
بگز کے گینگ کا نشانہ کیپون کے شراب سے بھرے ٹرک تھے۔ جنوری میں کیپون کے تین ٹرک پُراسرار طور پر لاپتا ہوگئے۔ اس کی سرپرستی میں چلنے والے چند شراب کے اڈوں پر بھی دستی بموں سے حملہ ہوا۔ یہ سب تو کیپون نے برداشت کرلیا، لیکن جس روز اُس کے قریبی ساتھی اور باڈی گارڈ، جیک میگر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے اِس باب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
کیپون نے ایک منظم منصوبہ ترتیب دیا جس کے نتیجے میں 14 فروری والے دن ایک ایسے ہولناک واقعے نے جنم لیا جسے آج "سینٹ ویلنٹائن کے روز ہونے والا قتلِ عام" (Saint Valentine's Day Massacre) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
اِس وحشیانہ منصوبے پر عمل درآمد کرنے سے ایک رات قبل شاطر کیپون نے شکاگو چھوڑ دیا اور فلوریڈا چلا گیا۔ اُس نے اپنی روانگی کی اطلاع اخباری نمائندوں اور پولیس حکام کو دے دی تھی۔ یوں اُس نے بہ آسانی 14 فروری والے روز شکاگو میں اپنی غیر موجودگی کے گواہ پیدا کرلیے۔
ابھی 14 فروری کا سورج طلوع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بگز مورین کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ فون کرنے والے نے بتایا کہ وہ ایک علاقائی گینگ کا سرغنہ ہے، اُس نے کیپون کا وہسکی سے بھرا ایک ٹرک اغوا کیا ہے، جو وہ بگز کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔
مسرور بگز نے اُسے صبح ساڑھے دس بجے نارتھ کلارک اسٹریٹ پر واقع اپنے گودام پہنچانے کی ہدایت کردی جو اُس کے گینگ کا اڈا تھا۔
اُس نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی یہ پیغام بھیج دیا کہ وہ ساڑھے دس بجے تک گودام پہنچ جائیں جہاں وہ مستقبل کے حوالے سے ایک میٹنگ کرنے کا خواہش مند تھا۔
"اُس احمق کیپون پر کاری ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے!" یہ بگز کے جملے تھا۔ وہ بے چارہ اِس بات سے یکسر لاعلم تھا کہ کیپون اگلے چند گھنٹوں میں اُس کے گینگ پر ایک مہلک حملہ کرنے والا ہے۔ ایسا حملہ، جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے مفلوج کردے گا۔
بگز کے چھ اہم ترین ساتھی وقت مقرر پر کلارک اسٹریٹ پر واقع گودام پہنچ گئے۔ وہ شراب سے بھرے ٹرک

کے منتظر تھا لیکن حقیقتاً موت اُن کی منتظر تھی۔
یہ بگز کی خوش قسمتی تھی کہ اس صبح وہ وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ اس کی گاڑی گودام سے چند میٹر کے فاصلے پر تھی کہ اس کی نظر سڑک کے کنارے کھڑی ایک گاڑی پر پڑی جس سے دو پولیس اہل کار ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی چند سادہ لباس اہل کار بھی موجود تھے۔
"شاید مخبری ہوگئی!" بگز بڑبڑایا اور ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کردیا۔ اِسی غلط فہمی نے اس کی جان بچالی کیونکہ گودام کے باہر کھڑے افراد پولیس اہل کار نہیں تھے۔ وہ تو کرائے کے قاتل تھے۔
اُس خاموش صبح لگ بھگ پونے گیارہ بجے کے قریب گودام کے اردگرد کا علاقہ فائرنگ سے گونج اُٹھا۔ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ گودام کے قریب بسنے والے خوف سے لرزاُٹھے۔
توقع کے عین مطابق پولیس کے پہنچنے سے قبل قاتلوں کی ٹولی وہاں سے فرار ہوچکی تھی۔ اس صبح گودام میں بگز گینگ کے سات اہم ترین افراد کو دیوار کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا کرکے بھون دیا گیا۔ مرنے والوں کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔ شکاگو کی تاریخ کا سب سے ہیبت ناک واقعہ رونما ہوچکا تھا۔
خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں ماسوائے اِس واقعے کی تفصیلات کے کوئی قابلِ ذکر خبر نہیں تھی۔ بگز مورین گینگ ختم ہوچکا تھا۔ گوکہ سب جانتے تھے کہ یہ قتل کس نے کروائے لیکن ہر شخص خاموش تھا۔ اور پھر... بھلا وہ کس پر الزام لگاتے، کیپون تو شہر میں تھا نہیں۔
واقعے کے فوراً بعد صدر امریکا کی ہدایت پر تفتیش شروع ہوگئی۔ وفاق اِس کیس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اطلاع پہنچانے والے کے لیے ایک ہزار ڈالر کے انعام کا اعلان بھی کیا گیا تھا لیکن توقع کے عین مطابق کوئی سامنے نہیں آیا۔
کسی بھی ممکنہ ردِعمل سے بچنے کے لیے کیپون نے ایک دلچسپ چال چلی۔ اُس نے پولیس میں موجود اپنے دوستوں کی مدد سے خود کو گرفتار کروادیا۔ ایسا کرنے کی وجہ واضح تھی... وہ جیل کو انتہائی محفوظ خیال کرتا تھا۔
اب وہ جیل میں تھا جہاں وہ دس ماہ ایک راجا کی طرح رہا۔ اُسے ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ اُس کے بیرک میں ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی بھی تھا۔ ملاقات کی بھرپور آزادی تھی۔
بالآخر چند ماہ جھک مارنے کے بعد حکومت کی جانب سے یہ فیصلہ صادر کردیا گیا کہ کیس حل نہیں ہوسکا۔ اور یہ متوقع تھا، شکاگو کی پولیس تو کیپون کی جیب میں تھی۔

☆☆☆

کیپون بادشاہ بن چکا تھا۔ اب کوئی اُس کے مدمقابل نہیں تھا، ماسوائے تین سسلی نژاد امریکیوں پر مشتمل منشیات فروشوں کے ایک گروہ کے، جن میں جونٹر نامی ایک ایسا شخص بھی شامل تھا، جو کبھی کیپون کا گن مین ہوا کرتا تھا۔
ویلنٹائن کے روز ہونے والے قتلِ عام کے تین ماہ بعد کیپون نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں منشیات فروشی کا دھندا کرنے والی اِس تکون کو بڑے ہی دوستانہ انداز میں مدعو کیا گیا۔ جو جونٹر اور اُس کے ساتھی اس جھانسے میں آ گئے۔
جب وہ تقریب میں پہنچے، کیپون بڑے ہی دوستانہ انداز میں پیش آیا، رضاکارانہ طور پر اپنا ریوالور اُن کے حوالے کردیا۔ سسلی کے باشندے مطمئن تھے۔ اُن تینوں نے بھی مسکراتے ہوئے نئی دوستی کے نام پر اپنے ہتھیار ہال کے باہر ہی چھوڑ دیے۔
رقص وسرود کی محفل کا آغاز ہوا۔ شراب پانی کی طرح بہائی گئی۔ ہر شخص مطمئن و مسرور تھا۔ ہر شخص جام کے جام حلق میں اُنڈیل رہا تھا، ماسوائے کیپون کے!
جب کیپون نے دیکھا کہ تینوں سسلی باشندے نشے میں دھت ہیں، اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے جو جونٹر اور اُس کے ساتھی فرش پر پڑے ہوئے تھے۔
منٹوں میں اُن کا نشہ ہرن ہوگیا۔ بیس بال بیٹ سے کیپون نے اُن کی اتنی درگت بنائی کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ اپنے سابق گن مین کا تو اُس نے سر پھاڑ دیا۔ بعد میں کیپون کے باڈی گارڈز نے تینوں کو ٹھکانے لگادیا۔
اِس واقعے پر کسی نے سوال نہیں کیا۔ خوف نے ہر زبان پر مہر لگادی تھی۔

☆☆☆

1929ء کے وسط میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اٹلانٹک سٹی میں امریکا کے تمام بڑے جرائم پیشہ گروہوں کے سربراہان کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس کی صدارت

جونی ٹوریو کررہا تھا۔ تمام بڑے غنڈوں کو ایک چھت تلے اکٹھا کرنے کا خیال کیپون ہی کو سُوجھا تھا جو اَب اپنے کاروبار کو ملک گیر حیثیت دینے کا متمنی تھا۔

اِس میٹنگ میں ڈیٹ شلٹس، فرینک کسٹیلو اور لکی لوچانو جیسے امریکا کے بدنام زمانہ بدمعاشوں نے شرکت کی اور اُن مفاد پرستوں کی ملاقات اور اشتراک کے فیصلے کے بعد امریکا میں ایک عفریت نے جنم لیا۔

''مافیاراج'' کا آغاز ہوگیا تھا۔

کیپون آزاد تھا، بااثر تھا۔ اس کی آمدنی بڑھتی جارہی تھی۔ کاروبار وسعت اختیار کرتا جارہا تھا۔ لیگنسٹن ہوٹل شکاگو کی تقدیر کا مرکز تصور کیا جانے لگا تھا۔

اب کیپون اپنی آئرش بیوی کے ساتھ کم کم ہی نظر آتا۔ عام طور سے محبوبائیں اُس کے پہلو میں ہوتیں۔

دوسری جانب دنیا بدل رہی تھی۔ اکتوبر 1929ء میں وال اسٹریٹ کریش ہوگئی۔ امریکا عظیم مالیاتی بحران کی لپیٹ میں آگیا۔ اس واقعے نے پوری دنیا کو بدل دیا۔

امریکا میں لاکھوں لوگ بے روزگار ہوگئے، غربت اور جرائم بڑھنے لگے، مایوسی قوی ہونے لگی۔

شکاگو بھی اِس بحران سے شدید متاثر ہوا تھا۔ شاطر کیپون نے اِس بحران کو اپنی شہرت کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ہدایت پر شہر بھر میں ''سوپ کچن'' قائم کیے گئے، جہاں غریبوں کو دووقت کا کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ کیپون نے باقاعدہ اُن کی تشہیر کی۔ مختلف اشتہارات تیار کیے گئے جو ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر چلے، اخبارات کی زینت بنے۔ اشتہارات میں ان سوپ کچن سے استفادہ کرنے والے کیپون کی ستائش کرتے نظر آتے۔

اس کی چال کارگر ثابت ہوئی۔ یاسیت میں لپٹے اُن دنوں میں قائم کردہ ''سوپ کچن'' امریکا بھر کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ وہ ایک دردمند انسان کے طور پر خود کو پیش کرنے میں کامیاب رہا۔

اِن مراکز سے مجبوری کے ہاتھوں کئی ایسے افراد نے بھی اپنا پیٹ بھرا، جو کبھی کیپون کے شدید مخالف ہوا کرتے تھے۔ اسے قاتل اور ٹھگ تصور کرتے تھے۔ گوکہ وہ جانتے تھے کہ ''سوپ کچن'' بدمعاش کیپون کی سازش ہے لیکن اب وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور تھے۔

کیپون مصلح بن چکا تھا اور اِس کا سہرا ''شکاگو ٹریبون'' سے وابستہ ایک صحافی جیک لینگ کے سر تھا جو اُس کا انتہائی قریبی دوست اور مشیر تھا۔ جیک انتہائی بااثر صحافی تھا۔ گوکہ اُس کی تنخواہ فقط 65 ڈالر ماہانہ تھی، لیکن وہ ایک شاہانہ زندگی گزار رہا تھا۔ دراصل کیپون اسے سالانہ 60 ہزار ڈالر دے رہا تھا، جس کا مقصد اُس کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔ ''سوپ کچن'' کا خیال بھی اُسے ہی سُوجھا تھا۔

☆☆☆

ایسا نہیں تھا کہ حکومت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ گوکہ شکاگو کے کئی سیاست دان اور پولیس افسران کیپون کی جیب میں تھے، لیکن ایسے بھی لوگ تھے جو اسے قرارواقعی سزا دلوانا چاہتے تھے۔ ان مخلص افراد کی فہرست میں مارچ 1929ء میں امریکی صدر کا عہدہ سنبھالنے والا ہربرٹ ہوور بھی شامل تھا جو کیپون کو سبق سکھانے کے لیے بے تاب تھا۔

اُس نے ایک نوجوان لیکن انتہائی باصلاحیت اور شاطر وفاقی افسر جے ایڈگر کو یہ ذمّے داری سونپی کہ وہ کیپون کے کیس پر کام کرے۔

گوکہ یہ کیس انتہائی مشکل تھا لیکن جس روز کیپون کی فائل ضدی جے ایڈگر کی میز پر پہنچی، اُس نے قسم کھائی کہ وہ اس بدمعاش کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل کر ہی دم لے گا۔

اس زمانے میں جے ایڈگر ''جسٹس ڈیپارٹمنٹ'' کے سربراہ کے طور پر کام کررہا تھا۔ اُس نے اس کیس کے لیے ایجنٹس کا ایک گروہ تشکیل دیا جس میں فقط کھرے اور بے داغ افسران کا چناؤ کیا گیا جن کا ریکارڈ صاف تھا۔ ایمان دار افسران کے اُس گروہ کو تاریخ میں "The Untouchables" کے نام سے پکارا گیا۔

اس گروپ میں وفاقی اہل کار ایلیٹ نیس بھی شامل تھا جو کیپون کے کاروبار پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ شراب پر عائد پابندی کی خلاف ورزی کے حوالے سے ثبوت اکٹھے کرنا اس کی ذمّے داری تھی۔ وہ ماضی میں بھی کیپون پر ہاتھ ڈالنے کی کئی کوششیں کرچکا تھا لیکن کرپٹ اہل کاروں کے باعث وہ ناکام رہا۔ خوش قسمتی سے اس بار اسے ایسے افسران کا ساتھ حاصل تھا، جو کیپون کے اثر سے مکمل طور پر آزاد تھے۔

اس گروپ میں انتہائی باصلاحیت ایجنٹ فرینک ولسن بھی شامل تھا جسے جے ایڈگر کی مکمل آشیرباد حاصل تھی۔ اُسے ایڈگر نے کیپون کی جانب سے ٹیکس کی ادائیگیوں میں

کیے جانے والے گھپلوں پر نظر رکھنے کی ہدایت کررکھی تھی۔ ایجنٹس خفیہ طور پر کیپون کے قریبی ساتھیوں سے بھی تفتیش کررہے تھے جن میں ''شکاگو ٹریبون'' کا صحافی جیک لینگ بھی شامل تھا۔

جیک لینگ نے شاہانہ طرز زندگی تو اختیار کرلیا تھا لیکن وہ کیپون کے مانند محتاط نہیں تھا۔ اس کی آمدنی اور اخراجات کے گوشواروں میں پائے جانے والے تضادات واضح تھے، جن کی مدد سے وفاقی ایجنٹ اُس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کررہے تھے۔ انہیں امید تھی کہ اس شخص سے حاصل ہونے والے شواہد کی بنیاد پر وہ بہ آسانی بدمعاش کیپون کی گردن دبوچ لیں گے۔

کیپون غافل نہیں تھا۔ 9 جون 1930ء کو وفاقی ایجنٹس سے ملاقات سے ایک دن قبل جیک کو قتل کردیا گیا۔ یہ واقعہ ایک ہوٹل کی لابی میں رونما ہوا۔ قاتلوں نے جیک کو انتہائی قریب سے گولیاں ماری تھیں۔

پہلا شک کیپون ہی پر گیا کیونکہ یہ اطلاع گردش کررہی تھی کہ جیک اُس کے خلاف وفاقی اہل کاروں کو اہم معلومات فراہم کرنے والا ہے لیکن پولیس کچھ ثابت نہیں کرسکی۔ قتل والی شام ہوٹل میں موجود ایک بھی شخص بہ طور گواہ سامنے نہیں آیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں کیپون کا ایک بیان قانون نافذ کرنے والے اداروں کو منہ چڑارہا تھا جس میں اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ جیک کو اُس کے مخالفین نے قتل کروایا ہے اور جب تک وہ اُن ظالموں کو قرارواقعی سزا نہیں دلوا دیتا، وہ چین سے نہیں بیٹھے گا!

☆☆☆

گوکہ جیک لینگ کی موت کے باعث کیپون کے خلاف جاری تحقیقات کو شدید دھچکا پہنچا تھا لیکن مستقل مزاج جے ایڈگر نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ یہ جنگ لڑنے کے لیے تیار تھا اور اسے اپنے ساتھیوں پر پورا بھروسا تھا۔

the untouchables میں شامل ایجنٹس نے کیپون کیس پر کام جاری رکھا۔ اُنہوں نے چند موثر کارروائیاں کی۔ اُس کے گوداموں پر چھاپے مار کر انہیں سیل کردیا گیا۔ اُس کے کئی آدمی گرفتار کیے گئے۔

طاقت کے نشے میں مست کیپون کو بہت بعد میں اندازہ ہوا کہ اُس کے گرد گھیرا تنگ ہورہا ہے۔ دراصل یہ پہلا موقع تھا، جب اس کا کھرے افسران سے پالا پڑا تھا جو بکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پھر ان کے پیچھے جے ایڈگر جیسا ضدی انسان کھڑا تھا جو تیزی سے اپنا رسوخ بڑھا رہا تھا۔ اُس کے ماتحت ایجنٹس کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور وہ شکاگو پولیس ڈیپارٹمنٹ کو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بیش تر افسران کیپون کی جیب میں تھے۔

کیپون کی سرپرستی میں چلنے والے جوئے خانے، شراب کے اڈے، جسم فروشی کے ٹھکانے اب وفاقی ایجنٹس کے نشانے پر تھے۔ یومیہ بنیادوں پر کارروائی ہورہی تھی۔

غیرقانونی شراب سمندری راستے امریکا پہنچ رہی تھی۔ اس راستے کو بند کرنے کے لیے جے ایڈگر نے بندرگاہوں پر ایمان دار افسر تعینات کردیے۔ نیوی بھی متحرک ہوگئی۔ اس اقدام نے اسمگلنگ پر گہری ضرب لگائی۔ غیرقانونی شراب کی شکاگو آمد سکڑنے لگی۔ اس اقدام نے کیپون کو حواس باختہ کردیا تھا۔

"the untouchables" کے اقدامات نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ اِس کیس پر کام کرنے والوں میں ایک بہادر افسر ایجنٹ مائیک بھی شامل تھا جس نے کیپون کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے کے لیے بھیس بدل کر لیگنسٹن ہوٹل میں ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ گوکہ جان کا خطرہ تھا لیکن اُس ایمان دار افسر نے کسی نہ کسی طرح اُن اہم ترین دستاویزات تک رسائی حاصل لی جنھوں نے یہ عیاں کردیا کہ کیپون کے کاروبار میں بڑے پیمانے پر گھپلے ہورہے ہیں۔

پہلے کیپون کا بھائی رولف گرفتار ہوا۔ اُس کے دفتر اور گھر سے ملنے والی دستاویزات واضح اشارہ کرتی تھیں کہ اُس نے اپنی آٹھ ملین ڈالر کی آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں دیا۔ ٹھوس ثبوت اور مضبوط دلائل نے اُسے بہ آسانی مجرم ثابت کردیا۔ رولف کو تین برس کی سزا سنائی گئی۔ یہ کیپون کے لیے پہلا دھچکا تھا۔

ایجنٹس نے کیپون گینگ کے خزانچی جیک گیسری پر بھی ہاتھ ڈالا۔ اُسے مجرم ثابت کرنے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ عدالت نے اُسے پانچ برس کی سنائی۔

کیپون اب واقعی مشکل میں پڑگیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی ریاست بکھرنے لگی تھی۔

اور پھر ایک روز باصلاحیت ایجنٹ ولسن اُس شخص تک

بھی پہنچ گیا جو کیپون کے تمام کاروباری معاملات کا ریکارڈ رکھا کرتا تھا۔

اب کیپون پر ہاتھ ڈالنا آسان تھا۔ اُس پر ٹیکس کی عدم ادائیگی کے شدید الزامات تھے۔ عدلیہ مقدمہ سُننے کو تیار تھی اور افسر اُسے ہر صورت سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتے تھے۔

کیپون کے وکلا نے اسے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ جیوری کو دھمکیاں دیں، عدلیہ کو خریدنے کی کوشش کی گئی لیکن اُنھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

27 اکتوبر 1931 شکاگو کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن تھا۔ سفاک، شاطر کیپون کو قصوروار قرار دیتے ہوئے گیارہ برس کی سزا سُنا دی گئی۔ سزا سُنائے جانے کے دوران اُس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ پہلے بھی جیل میں کچھ وقت گزار چکا تھا اور جانتا تھا کہ قید خانے کی چاردیواری کو کس طرح ایک شاندار اپارٹمنٹ کی شکل دی جاسکتی ہے۔

اُسے کوک کاؤنٹی جیل منتقل کیا گیا جہاں بیٹھ کر وہ بڑی سہولت سے اپنی حکومت چلاتا رہا، اب بھی شکاگو پر اُس کا مکمل کنٹرول تھا۔ تاہم حالات میں جلد ڈرامائی تبدیلی آنے والی تھی حقیقتاً وہ اپنے زوال کے بے حد نزدیک تھا۔

اُس کے اثر کو توڑنے کے لیے کچھ ہی عرصے بعد حکام نے اُسے جورجیا کے مرکزی جیل منتقل کروادیا۔ اب صورتحال بدلنے لگی۔ وہ نسبتاً محدود ہوگیا تھا۔ گو کہ اُس نے پُرانے ہتھکنڈے مثلاً رشوت، لالچ اور دھمکیوں کو برتنے کی کوشش کی، لیکن ناکامی اُس کا مقدر بنی۔ حالات اس وقت مزید بگڑ گئے جب 1934ء میں اُسے سان فرانسسکو کے ایک ایسے جیل خانے میں ڈال دیا گیا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں سے کوئی فرار نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ایک جزیرے پر واقع تھا۔

چالاک کیپون اُس ہیبت ناک جیل کو توڑنے میں ناکام رہا اور یوں بدمعاشوں کا بادشاہ، ال کیپون کے نام سے معروف اُس بدمعاش کا سیاہ دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

☆☆☆

درجنوں قتل کرنے والے اِس درندے نے جیل میں خود کو دیگر قیدیوں سے الگ تھلگ رکھا۔ اس کے منفی رویّے کی وجہ سے قیدی اُس سے متنفر ہوگئے اور وہ ایک ناپسندیدہ شخص تصور کیا جانے لگا۔

ایک بار قیدیوں نے اپنے حقوق کے لیے ہڑتال کی تو اُس نے اُن کا ساتھ دینے سے صاف انکار کردیا جس پر ایک قیدی نے اُس کا گریبان پکڑلیا۔ کیپون بھول گیا کہ وہ شکاگو میں نہیں بلکہ سان فرانسسکو کے ایک جیل خانے میں ہے۔ اس نے جواباً اُس قیدی کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔ بس پھر کیا تھا، دیگر قیدی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ دیر بعد وہ بستر پر پڑا کراہ رہا تھا۔

آنے والے برسوں میں بھی اُسے ساتھی قیدیوں کی جانب سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اِس مسلسل ذلت اور بے بسی کے باعث وہ اپنا ذہنی توازن کھونے لگا۔ حالات کا بگاڑ اُس وقت اپنی انتہا پر پہنچ گیا جب ایک اُداس شام اُس پر فالج کا حملہ ہوگیا۔

بیماری کے دن اذیت ناک تھے۔ وہ جیل کے خستہ حال اسپتال میں پڑا سڑ رہا تھا۔ روز بہ روز اُس کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔

طویل انتظار کے بعد 1939ء میں بالآخر علاج کی غرض سے اُسے سان فرانسسکو کی اس ہیبت ناک جیل سے نکالا گیا۔

ڈاکٹروں نے چیک اَپ کے بعد اعلان کردیا کہ وہ ایک موذی مرض میں مبتلا ہے، جس کا سبب جنسی بے راہ روی ہے۔

ڈاکٹروں نے اُس کی بیوی کی بھی تشخیص کی، تاہم اُس میں اِس مرض کے جراثیم نہیں پائے گئے جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ دونوں کے درمیان برسوں سے جسمانی تعلق نہیں تھا۔

کیپون کو فلوریڈا کے مکان میں منتقل کردیا گیا جہاں اُس کی بیوی، جسے شادی کے بعد ایک دن کی بھی خوشی نصیب نہیں ہوئی، سات برس اُس کی دیکھ ریکھ کرتی رہی۔

اُس کا ذہنی توازن اس حد تک بگڑ گیا تھا کہ بہتری کے تمام امکانات دم توڑ چکے تھے۔ بالآخر 25 جنوری 1947ء کو بیماری کے مسلسل حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ 48 برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

کسی زمانے میں پورے شکاگو کو اپنی انگلیوں پر نچانے والے اُس سفاک شخص کی تدفین میں صرف چند افراد نے شرکت کی۔ یوں اس کی رنگین زندگی کا اختتام ایک المناک موت پر ہوا!

غالب

محمد ایاز راھی

اردو ادب میں غزل کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور غزل کی دنیا میں غالب کو۔ غالب پر بے شمار مضامین اور شراحین لکھی گئی ہیں پھر بھی نئی تحریر کے لیے جگہ خالی رہتی ہے۔

فنِ غالب پر ایک مختصر سی تحریر دل پذیر

فنونِ لطیفہ سے مراد وہ فنون یا ہنر ہیں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی کشش پائی جائے یا وہ فن جس کا ناتا اس حسن سے ہے جو کسی تخلیق سے جھلک رہا ہو اور ذوقِ سلیم کے اصولوں پر پورا اترتا ہو۔ اربابِ علم وفن نے فنونِ لطیفہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے، شاعری، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی اور فنِ تعمیر۔ ان میں سے پہلے دو کا تعلق تو حسِ سماعت سے ہے جبکہ باقی تین فنون کی بنیاد بصارت پر استوار ہے لیکن یہاں چشمِ بصارت کے ساتھ ساتھ چشمِ بصیرت بھی شرط ہے کہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ فنونِ لطیفہ ظاہری حواسِ خمسہ (دیکھنا، سننا، چھونا، چکھنا، سونگھنا) کے ہمراہ باطنی حواسِ خمسہ (حسِ مشترک، حسنِ واہمہ، حسِ متصرفہ، حسِ حافظہ، حسِ خیال) کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ ان میں خاص طور پر شاعری نہایت اعلیٰ، دقیق اور نازک ترین ہنر ہے جو شیشہ گری سے کہیں زیادہ دشوار تر مرحلہ ہے۔ حواسِ عشرہ کی سبھی کلیاں یہاں چٹکتی، کھلتی اور خوشبو بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی اس دنیا میں غالب فنِ شاعری ہی کے بے مثل اور یکتا شہسوار ہیں۔ دودمان سلاجقہ کا یہ سلجوق ترک زادہ فطری طور پر دولتِ تخلیق سے مالا مال تھا، جیون بھر اقلیم ادب کا یہ تاجور عقلِ سلیم اور دانشِ کامل کا استعارہ بنا رہا اور اپنے کلام کی صورت میں بعد از مرگ بھی آج تک منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے عبدالرحمٰن بجنوری بے اختیار کہہ اٹھے تھے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالب۔ ایک دانشور کا کہنا ہے کہ ہند میں شاعری ایک ترک زادے (امیر خسروؒ) سے شروع ہوئی اور ایک ترک زادے (غالب) پر آکر ختم ہوگئی۔ محترم رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین تحفے بخشے، تاج محل، اردو اور غالب۔ اسد اللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ بنیادی طور پر ان پانچ خواص سے مملو تھے۔ فطرتِ سلیم، بے پناہ قوتِ مقابلہ، زبردست فہمِ صالح، مزاج کی شگفتگی اور خرد تخیلی۔ لہٰذا غالب کا ذہن رسا نالۂ نارسا کو بھی فن کا پیراہن رنگیں عطا کرتا ہے، اس خوبصورتی سے کہ آج بھی دنیائے علم وادب سر دھنتی اور وجد کرتی نظر آتی ہے۔ غالب کا رنگ امیرانہ ہے، ان کا مشہور شعر ہے کہ

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھاکے بدمزہ نہ ہوا

اب غالب اگر عام رنگ کے اور دوسرے یا تیسرے درجے کے شاعر ہوتے تو شاید اس شعر کو اس رنگ میں اور یوں لیتے

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ اسد
گالیاں کھاکے بدمزہ نہ ہوا

اپنے مخصوص امیرانہ انداز کے حامل غالب ہی یہ بات کہہ سکتے تھے کہ ۔ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے۔ تقلید کی عام پامال راہوں سے درگزر کرنا اور اپنی ایک الگ نئی راہ بنانا اس طور کہ دوسرے حیرت واستعجاب سے صرف تکتے ہی رہ جائیں، اس ترک زادے کا طرۂ امتیاز ہے، بقول فراق گورکھ پوری غالب پہلا شخص ہے جس نے رچی

اور سنوری ہوئی موسیقیت اردو شاعری میں پیدا کی لیکن پنچایتی طور پر عامیت زدہ کانوں کے سننے، سنانے یا سطحی طور پر گانے بجانے کی چیز غالب کی موسیقیت نہیں ہے اسی طرح بقول شخصے اردو شاعری میں غالب پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا۔ وزیر آغا کے الفاظ میں غالب کے ہاں شخصیت کی توانائی اور مردانہ پن نے احساس مزاح کو جنم دیا ہے اور وہ آنسوؤں میں بھی مسکراتا نظر آتا ہے۔ غالب اگر سچے، کھرے جوہری تھے تو جوہر شناس بھی تھے۔ انہوں نے حالی کے اندر شاعری کے جوہر بھانپ لیے تھے سو حالی نے ایک غزل غالب کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی تو غالب نے کہا ”اگر چہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔“ فرمان فتح پوری کی تحقیق ہے کہ غالب کے اسلوب شاعرانہ میں جو چیز بہت نمایاں ہے، وہ ان کا سوالیہ یا استفہامیہ لب ولہجہ ہے، اس لب ولہجے سے ان کی جدت طرازی، مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرز فکر تینوں چیزوں کا سراغ ملتا ہے ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کلمات استفہام کے استعمال سے جیسا فائدہ شاعری میں انہوں نے اٹھایا ہے، کسی دوسرے اردو شاعر نے نہیں اٹھایا۔ جہاں تک اسلاف کی خوشہ چینی کا تعلق ہے، غالب تقلید کرتے ہوئے بھی غالب ہی رہتا ہے نیز غالب اوروں سے استفادہ کرتے ہوئے بھی اپنے رنگ میں غالب ہی رہتا ہے۔ غالب کے سادہ اشعار میں بھی میریت نہیں بلکہ غالبیت ہے جو امر ہے۔ انور سدید رقم طراز ہیں کہ تقلید غالب کو ہمارے عہد تک ایک رجحان خاص کی حیثیت حاصل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا ایک مخصوص اسلوب ہے، جو لفظ بھی اس کی ٹکسال سے نکلتا ہے، اس پر غالب کی ذاتی مہر لگی ہوتی ہے چنانچہ دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ غالب نے وسیع پیمانے پر اعلیٰ درجے کی ترکیب سازی کر کے مستقبل کے بہت سے شاعروں کا کام آسان کر دیا گو کہ اس کا اعتراف برملا انداز میں کبھی نہیں کیا گیا۔ اس حقیقت کے اعتراف میں تامل نہیں کیا جا سکتا کہ زبان وادب میں ترقی اور نمو کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یہ جامد نہیں نمو پسند بلکہ نمو سرشت ہے۔ غالب کی شاعری کی مثال ہمارے سامنے ہے، اس نے ، دامان خیال یار، زود پشیماں اور کاغذی پیرہن جیسی ترکیبیں ایجاد کیں اور انہیں قبول کر لیا گیا۔ غالب سے پہلے اس انداز میں کون شعر کہتا تھا کہ ”نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا“ یہ وہ مقام ہے جہاں سے اردو شاعری ایک نئے موڑ پر مڑتی نظر آتی ہے یعنی خیال کی بلندی بھی، فکر کی جدت اور رعنائی بھی اور اسلوب کا نیا پن بھی۔ بیسویں صدی میں اعتراف غالب کے جو زاویے ابھرے ہیں، ان میں یاس یگانہ چنگیزی کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہیں غالب شکن کہا گیا۔ انہوں نے اپنی انا کو غالب مرحوم کی انا کا مدمقابل سمجھ لیا اور پھر شیشے کو شیشے سے ٹکرانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، افسوس کہ غالب اس وقت دنیائے فانی سے کوچ کر چکے تھے لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو ایک معرکہ یگانہ و غالب میں ضرور بپا ہوتا۔ یاس یگانہ چنگیزی نے بہ ظاہر بطلانِ غالب کیا ہے لیکن دراصل یہ بھی اعترافِ غالب کا ہی ایک زاویہ ہے جو نفی سے اثبات کا منظر پیش کرتا ہے اور نخچیرانِ غالب کی نقاب کشائی کرتا اور عظمت کا اقرار کرتا نظر آتا ہے۔ غالب جتنے بڑے شاعر ہیں، اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی ہیں۔ اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہی ہوتے تو بھی غالب، غالب ہی رہتے۔ انہوں نے نثر کو بھی وہ انوکھا رنگ عطا کیا کہ باید وشاید۔ اسی لیے تو انہوں نے بانگ دہل کہہ دیا تھا

ما نبوریم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد دفن ما

یعنی، میری شاعری خودساختہ نہیں بلکہ ایک امر خداداد وخداساز ہے، میں نے خود شاعر بننے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ شعر نے خود مجھے تاکا اور اس نے میرا فن بننا چاہا“ لاریب کہ شعر ان کے فن کا حصہ نہ بھی بنتا تو ان کی نثر ہی انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی سو خطوط غالب کی تین بڑی خصوصیات ہیں۔ سادہ و بے تکلف انداز، طریق اظہار کے نئے اور مختلف راستے اور خطوط نویسی کو ادب بنا دینا، ان خصوصیات نے غالب کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ غالب نے مکتوب نگاری میں بھی ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے کہ جو بھی اس کے رنگ میں خود کو رنگنا چاہتا ہے، اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے نتیجتاً وہ غالب کی عظمت کو حیرت سے صرف تکتا رہ جاتا ہے۔ غالب کے کلام کی پہلی شرح غالب کی زندگی میں ہی درگا پرشاد نادر نے کی تھی، یہ نثار احمد فاروقی کی تحقیق ہے، انہوں نے اپنے مقالے میں چوہتر اشعار کا حوالہ دیا تھا۔ درگا پرشاد نادر کے بعد قمر الدین راقم، عبدالعلی والہ، حسرت موہانی سے لے کر مولانا غلام رسول مہر تک بہت سے شارحین غالب ہیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں شرح غالب لکھی۔

محمد عمران الحق

قدیم ترین کھیلوں کا مقابلہ اس وقت برطانیہ میں جاری ہے۔ پوری دنیا کی نظریں ادھر ہی مرکوز ہیں۔ یہ میلہ کب اور کس طرح شروع ہوا، اہم نکات کیا ہیں، اس بارے میں ایک مختصر سا جائزہ۔

باذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر

اولمپک گیمز سمر اور ونٹر گیمز پر مشتمل سب سے بڑا بین الاقوامی کھیلوں کا میلا ہے جس میں ہزاروں کھلاڑی مختلف مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اولمپک گیمز کو دنیا کا پہلا کھیلوں کا مقابلہ قرار دیا جاتا ہے جس میں 200 سے زائد ممالک شرکت کرتے ہیں۔ یہ گیمز ہر دو سال کے بعد سمر گیمز اور ونٹر گیمز کے نام سے منعقد ہوتی ہیں۔ جبکہ یہ علیحدہ علیحدہ ہر چار سال بعد ہوتے ہیں۔ درحقیقت قدیم اولمپک گیمز یونان میں اولمپیا کے مقام پر 8ویں صدی قبل از مسیح سے چوتھی صدی عیسوی

تک منعقد ہوئے۔ یہ مقابلوں کا ایک سلسلہ تھا جو کہ قدیم یونان کے مختلف شہروں ، ریاستوں اور بادشاہتوں کے نمائندوں کے درمیان منعقد ہوتے تھے۔ ان کھیلوں میں زیادہ تر ایتھلیٹکس کے مقابلے ہوتے تھے۔ تاہم کشتی اور رتھ ریس (بگھی ریس) بھی منعقد ہوتی تھی۔ اولمپک گیمز کے دوران تمام جنگیں روک دی جاتی تھیں تاکہ کھلاڑی امن و امان سے ان کھیلوں میں حصہ لے سکیں۔

اولمپکس کا آغاز بہت سی کہانیوں اور اسراروں کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ مشہور ترین افسانوں میں سے ایک کے مطابق Heracles اور اس کا باپ Zeus ان گیمز کے بانی تھے۔

ایک کہانی کے مطابق یہ Heracles تھا جس نے گیمز کو اولمپک کا نام دیا اور چار سال کے بعد انعقاد کی رسم کو اپنایا جبکہ دوسری کہانی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ Heracles نے اپنی بارہویں مہم جوئی میں کامیابی کے بعد Zeus کے اعزاز میں اولمپک اسٹیڈیم بنایا۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد وہ 200 قدم سیدھا چلا اور اس فاصلے کو اسٹیڈیم کا نام دیا جو کہ بعد میں فاصلے کی اکائی بنا۔ زیادہ تر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اولمپکس اسٹارٹ ہونے کا زمانہ 776 قبل مسیح ہے۔ اس تاریخ کی بنیاد اولمپیا سے ملنے والے کتبے ہیں۔

قدیم اولمپکس میں رننگ ایونٹس پینٹاتھلون (جو کہ جمپنگ ایونٹ، ڈسکس تھرو، جیولین تھرو، فٹ ریس اور کشتی) پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ باکسنگ، ریسلنگ اور گھڑ سواری کے ایونٹس بھی شامل تھے۔

روایات کے مطابق ایلس (Elis) شہر کا ایک باورچی کوروبس پہلا اولمپک چیمپئن تھا۔ تب یہ گیمز ہر چار سال کے بعد منعقد ہوتے تھے۔

پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں اولمپکس اپنے عروج پر پہنچ گئے لیکن اس کے بعد یہ بتدریج زوال پذیر ہونے لگے کیونکہ رومن طاقت میں آ رہے تھے اور یونان پہ ان کا اثر بڑھ رہا تھا۔

393 عیسوی میں شاہ تھیوڈوسیس 1 نے تمام مذہبی رسومات کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو اولمپک گیمز کا بھی اختتام ہو گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق 426 عیسوی میں شاہ تھیوڈوسیس 2 نے ان کو ختم کیا۔ اپنے اختتام کے بعد یہ انیسویں صدی تک دوبارہ منعقد نہیں ہوئے۔

پہلی نمایاں کوشش جو قدیم اولمپکس کے مقابلے پر کی گئی وہ فرانس میں ہونے والا سالانہ نیشنل اولمپک فیسٹول تھا جو کہ 1796ء سے 1798ء تک منعقد ہوا۔ اس فیسٹول میں قدیم یونانی اولمپکس کے بہت سے کھیل شامل کیے گئے۔ 1796ء کے گیمز میں پہلی دفعہ نظام پیمائش بھی متعارف کروایا گیا۔

1850ء میں ڈاکٹر ولیم پینی بروکس نے انگلینڈ میں اولمپین کلاس کا آغاز کیا۔ 1859ء میں ڈاکٹر بروکس نے اس کا نام وین لاک اولمپین گیمز رکھ دیا اور یہ ہر سال منعقد ہوتے تھے۔ ڈاکٹر بروکس نے 15 نومبر 1860ء کو وین لاک اولمپین سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔

1862ء اور 1867ء کے دوران لیورپول میں سالانہ گرینڈ اولمپک فیسٹول منعقد ہوا۔ جان ہوی اور چارلس میلی کی کوششوں سے منعقد ہونے والے یہ گیمز بین الاقوامی نوعیت کے تھے۔ اگرچہ اس میں صرف امیچور کھلاڑی ہی حصہ لے سکے۔ پہلے ماڈرن اولمپکس 1896ء کا پروگرام لیورپول اولمپکس کا ہی عکس تھا۔ 1865ء میں ہولی، ڈاکٹر بروکس اور ریوینسٹین نے لیورپول میں نیشنل اولمپین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جو کہ برٹش اولمپک ایسوسی ایشن کی پیش رو ثابت ہوئی۔ اس نے ہی انٹرنیشنل اولمپکس چارٹر کا فریم ورک فراہم کیا۔ 1866ء میں لندن کے کرسٹل پیلس میں پہلے نیشنل اولمپک گیمز منعقد ہوئے۔

1821ء میں یونانی سلطنت عثمانیہ سے جنگِ آزادی کے ساتھ ہی اولمپکس کی بحالی کے لیے دلچسپی لینے لگے۔ اس کا سب سے پہلے خیال شاعر اور ایڈیٹر پیناگیوٹس ساؤٹسس نے 1833ء میں اپنی چھپنے والی نظم Dialogue of the Dead میں پیش کیا۔ Evangelis Zappas جو کہ ایک دولت مند یونانی عوام دوست آدمی تھا نے 1856ء میں پہلی دفعہ شاہ یونان اوٹو کو خط لکھا اور اولمپکس کی مستقل بحالی کے لیے فنڈز کی پیش کش کی۔ Zappas نے 1859ء میں پہلے اولمپکس کو اسپانسر کیا جو کہ ایتھنز سٹی اسکوائر میں منعقد ہوئے۔ یونان اور سلطنتِ عثمانیہ کے کھلاڑیوں نے اس میں حصہ لیا۔ Zappas نے قدیم Panathenaic Stadium کی بحالی کے لیے فنڈز جاری کیے تاکہ یہ مستقبل کے تمام اولمپکس کی میزبانی کر سکے۔ اس اسٹیڈیم نے 1870ء اور 1875ء کے اولمپکس کی میزبانی کی۔ 30 ہزار تماشائیوں نے 1870ء کے اولمپکس کو دیکھا جبکہ 1875ء کے گیمز کے آفیشل حاضری کے ریکارڈز دستیاب نہیں ہیں۔

1890ء میں وین لاک اولمپکس میں شرکت نے بیرن ڈی کوبرٹن کو انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کی بنیاد رکھنے کے لیے

متحرک کیا۔ کوبرٹن نے Zappas اور بروکس کے کام اور آئیڈیاز کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چار سال بعد اولمپک گیمز کروانے کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ اس نے 1894ء میں فرانس میں ہونے والی پہلی آئی او سی کانگریس میں یہ منصوبہ پیش کیا۔ کانگریس کے آخری دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے اولمپک گیمز آئی او سی کے زیرِ سرپرستی 1896ء میں ایتھنز میں منعقد ہوں گے۔ آئی او سی نے یونانی مصنف ڈیمٹری ویکی لاس کو اپنا پہلا صدر منتخب کیا۔

پہلے اولمپک گیمز 1896ء میں ایتھنز کے Panathenaic Stadium میں منعقد ہوئے۔ 14 ممالک کے 241 کھلاڑیوں نے 43 ایونٹس میں حصہ لیا۔ یونانی حکومت نے اس موقع پر یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ یونان کے لوگ اور عہدیداران اولمپکس کی میزبانی کے تجربے سے اتنے پُرجوش تھے کہ انہوں نے ایتھنز کو مستقل طور پر اولمپک گیمز کا میزبان قرار دینے کا مطالبہ کر دیا لیکن IOC نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ کمیٹی نے پلان بنایا کہ جدید اولمپکس ہر چار سال بعد دنیا کے مختلف شہروں میں ہوں گے۔ اگلے اولمپکس کے لیے پیرس کا انتخاب کیا گیا۔

1896ء کے گیمز کے بعد اولمپکس جمود کے دور میں داخل ہو گئے جس سے اس کے وجود کو خطرات لاحق ہو گئے۔ 1900ء میں پیرس Exposition کے موقع پر سائیڈ شو کے طور پر اولمپکس ہوئے جس میں اسٹیڈیم بھی باقاعدہ طور پر موجود نہ تھا۔ ان اولمپکس میں پہلی دفعہ خواتین نے شرکت کی۔ 1904ء کے اولمپک گیمز کی میزبانی امریکی شہر شکاگو کو دی گئی لیکن ورلڈ فیئر تقریبات جو کہ سینٹ لوئیس میں ہونا تھی کی وجہ سے اولمپکس کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بھی ایک سائیڈ شو تھا۔ ان گیمز میں 650 کھلاڑیوں نے حصہ لیا جن میں 580 کا تعلق امریکا سے تھا۔ اس طرح کی تقریبات اور مقابلوں سے اولمپک تحریک کو دھچکا لگا۔ تاہم ایتھنز میں 1906ء میں دس سال مکمل ہونے پر دوبارہ اولمپکس ہوئے تو یہ گیمز دوبارہ اسی جوش اور جذبے سے بحال ہوئے۔ اگرچہ 1906ء کے گیمز کو آئی او سی نے باقاعدہ تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ ہی دوبارہ اس طرح کے گیمز منعقد ہوئے۔

1924ء میں فرانس کے شہر کیمونکس میں پہلے سرمائی گیمز منعقد ہوئے جن میں سردی اور برف کے وہ کھیل شامل تھے جو کہ گرمائی اولمپکس کے ساتھ کروانا ممکن نہیں تھا۔ فگر اسکیٹنگ 1908ء اور 1920ء میں جبکہ آئس ہاکی 1920ء کے گرمائی اولمپکس میں شامل تھے جبکہ آئی او سی کی خواہش تھی کہ دوسرے مزید گیمز شامل کر کے اس لسٹ کو بڑھا دیا جائے۔ 1921ء کی لوزان (سوئٹزرلینڈ) میں ہونے والی اولمپک کانگریس میں فیصلہ کیا گیا کہ ونٹر اولمپکس علیحدہ سے گرمائی اولمپکس کے سال میں ہی منعقد ہوں گے۔ سلسلہ 1992ء تک جاری رہا پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ 2 گرمائی اولمپکس کے درمیان سرمائی اولمپکس ہوں گے۔ 1994ء سے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

1948ء میں سرگٹ مین نے دوسری جنگِ عظیم کے زخمی سپاہیوں کی بحالی کے لیے مختلف اسپتالوں کے درمیان ملٹی اسپورٹس ایونٹ کا انعقاد کیا جو کہ لندن اولمپکس کے ساتھ ہی منعقد ہوئے۔ گٹ مین ایونٹ جو اس وقت Stoke Mandeville Game کہلاتا تھا۔ سالانہ اسپورٹس فیسٹول بن گیا۔ اگلے 12 سال گٹ مین اور دوسروں نے اپنی کوششوں کو زخم بھرنے کا ذریعہ بنائے رکھا۔ 1960ء کے روم اولمپکس میں گٹ مین اپنے ساتھ 400 کھلاڑی لایا جو کہ اولمپکس کے متوازی ایونٹ میں شریک ہوئے۔ ان گیمز کو پہلا پیرالمپک گیمز قرار دیا جاتا ہے۔ تب سے پیرالمپک گیمز ہر اولمپک کے سال میں منعقد ہوتے ہیں۔ 1988ء کے سیول اولمپکس سے ہر میزبان شہر پیرالمپک گیمز کا بھی میزبان ہوتا ہے۔

2001ء میں IOC اور انٹرنیشنل پیرالمپک کمیٹی نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے یہ گارنٹی دی گئی کہ میزبان شہر اولمپکس اور پیرالمپکس دونوں کا انتظام کرے گا۔ یہ معاہدہ 2008ء کے بیجنگ اولمپکس اور 2010ء کے وینکوور سرمائی اولمپکس سے قابلِ عمل ہے۔

14 سے 18 سال تک کے کھلاڑیوں کو مقابلے کا موقع دینے کے لیے 2010ء سے یوتھ گیمز کا انعقاد ہوا۔ اس کا آئیڈیا آئی او سی کے صدر جیکس روگ نے 2001ء میں آئی او سی کے 119 ویں کانگریس کے موقع پر پیش کیا تھا۔ پہلے سمر یوتھ گیمز اگست 2010ء میں سنگاپور میں منعقد ہوئے جبکہ ونٹر گیمز 2012ء میں آسٹریا کے شہر انس برک میں ہوں گے۔ سمر گیمز 12 دن جبکہ ونٹر گیمز 9 دن منعقد کیے جاتے ہیں۔ آئی او سی نے سمر اولمپکس کے لیے 3500 کھلاڑیوں اور 875 آفیشلز جبکہ ونٹر گیمز کے لیے 970 کھلاڑیوں اور 580 آفیشلز کی اجازت دی ہے۔ تاہم ان گیمز میں ایونٹس کی تعداد کم رکھی جاتی ہے۔

1896ء میں ہوئے پہلے اولمپک گیمز میں 14 ممالک

کے 241 کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا جبکہ اب یہ تعداد بڑھ چکی ہے۔ 2008ء کے بیجنگ اولمپکس میں 204 ممالک کے 10500 کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا۔ سرمائی اولمپکس کا اسکیل بھی بڑھا ہے۔ 2006ء میں ٹیورن میں 80 ممالک کے 2508 کھلاڑیوں نے 84 ایونٹس میں حصہ لیا تھا۔ گیمز کے دوران کھلاڑی اور آفیشلز اولمپک ویلج میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ اولمپک ویلج میں کیفے ٹیریاز، مراکزِ صحت اور عبادت گاہیں بھی ہوتی ہیں۔

اولمپک تحریک میں وہ تمام نیشنل اور انٹرنیشنل اسپورٹس آرگنائزیشنز اور فیڈریشنز، میڈیا، کھلاڑی، آفیشلز، ججز، شخصیات اور ادارے شامل ہیں جو اولمپک چارٹر کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے قوانین پر عمل کرتے ہیں جبکہ ان تمام کے اوپر موجود آئی او سی میزبان شہر کا انتخاب کرنے، اولمپک گیمز کی پلاننگ پر نظر رکھنے، اسپورٹس پروگرامز کی منظوری دینے اور اسپانسرز اور میڈیا براڈ کاسٹر حقوق کے بارے میں مذاکرات کرنے کی ذمّے داری ہے۔ اولمپک تحریک تین بڑے عناصر پر مشتمل ہے۔

1- بین الاقوامی فیڈریشنز؛ یہ انٹرنیشنل لیول پر کھیل منعقد اور سپروائز کروانے کی ذمّے دار ہیں۔ جیسے فیفا فٹبال کی گورننگ باڈی ہے اور IBA باکسنگ کو کنٹرول کرتی ہے۔ 35 انٹرنیشنل فیڈریشنز اولمپک تحریک کا حصہ ہیں۔

2- نیشنل اولمپک کمیٹی؛ یہ ہر ملک کے اندر اولمپک تحریک کی نمائندہ ہوتی ہے اور ملک کے اندر اولمپک کھیلوں کا انعقاد کرتی ہے مثلاً USOC امریکا کی نیشنل اولمپک کمیٹی ہے۔ آئی او سی کی تسلیم کردہ NOC کی تعداد 205 ہے۔

3- آرگنائزنگ کمیٹی فار دی اولمپک گیمز؛ یہ کسی بھی میزبان ملک میں بنائی جاتی ہے تاکہ گیمز کا انعقاد ہو سکے اور جب یہ گیمز کے بعد اپنی فائنل رپورٹ آئی او سی کو پیش کر دے تو یہ ختم ہو جاتی ہے۔

انگریزی اور فرانسیسی اولمپک تحریک کی آفیشل زبانیں ہیں جبکہ اولمپکس کے دوران میزبان ملک کی زبان بھی بولی جاتی ہے۔ افتتاحی تقریب میں پریڈ کے دوران یہ تینوں زبانیں اناؤنسمنٹ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

IOC نے آغاز سے ہی تجارتی اسپانسرز سے فنڈز لینے کی مخالفت کی اور یہ سلسلہ 1972ء تک جاری رہا پھر IOC نے ٹی وی اور اشتہاری مارکیٹ سے فنڈز لینا شروع کیے۔ سمارانچ کے دور میں گیمز انٹرنیشنل اسپانسرز کی طرف شفٹ ہوئے جنہوں نے اپنی پراڈکٹس کو اولمپک برانڈ کے طور پر پیش کیا۔

بیسویں صدی کے پہلے ہاف میں IOC کا بہت چھوٹا بجٹ ہوتا تھا۔ جیسا کہ ایوری برنڈیج (1952-1972ء) نے اولمپکس کو کمرشل مفادات سے لنک کرنے کی ہر کوشش کو مسترد کر دیا۔ ان کا یقین تھا کہ کمرشل اداروں کی لابی IOC کے فیصلہ سازی پر غیر ضروری طور پر اثر انداز ہوگی۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو IOC کے اثاثہ جات صرف 2 ملین امریکی ڈالرز تھے۔ صرف آٹھ سال بعد یہ اثاثے 45 ملین ڈالرز تک پہنچ گئے۔ یہ سب ابتدائی طور پر کارپوریٹ اسپانسر شپ اور ٹی وی حقوق کی فروخت سے ہوا۔

1980ء میں جب سمارانچ صدر بنے تو ان کی خواہش تھی کہ یہ مالی طور پر ایک خودمختار ادارہ بنے۔

1984ء کے لاس اینجلس اولمپکس اولمپک کی تاریخ میں ہوا کا جھونکا ثابت ہوئے جب لاس اینجلس آرگنائزنگ کمیٹی نے 225 ملین ڈالرز کا منافع کمایا۔ یہ سب کمپنیوں کو اسپانسر شپ حقوق بیچنے کی وجہ سے ہوا۔

سمارانچ نے اولمپک برانڈ بنانے کے لیے 1985ء میں دی اولمپک پروگرام (Top) بنایا۔ Top کی ممبر شپ بہت مہنگی تھی۔ 4 سال کے لیے ممبر شپ کی فیس 50 ملین ڈالر تھی۔ Top ممبرز کو بین الاقوامی طور پر اپنی پروڈکٹ اولمپک برانڈ کے طور پر تشہیر کرنے کے لیے حقوق مل جاتے تھے اور وہ اولمپک سمبل یعنی 5 دائرے اپنے اشتہارات میں استعمال کر سکتے تھے۔

اولمپک گیمز کو سب سے پہلے 1936ء کے برلن اولمپکس میں ٹی وی پر دیکھا گیا۔ اگرچہ یہ صرف مقامی شائقین کے لیے ہی تھا۔

1956ء کے ونٹر اولمپکس کو سب سے پہلے بین الاقوامی طور پر ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ ونٹر گیمز کے حقوق پہلی دفعہ فروخت کیے گئے۔ CBS نے امریکی شائقین کے لیے 394000 ڈالر جبکہ یورپین براڈ کاسٹنگ یونین نے 660000 ڈالر ادا کیے۔ آنے والی دہائیوں میں کولڈ وار کی وجہ سے سپر پاورز کے درمیان اولمپکس کے حوالے سے کافی مقابلے کا رجحان دیکھنے میں آیا۔ جس کا IOC نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

1998ء کے ناگانو ونٹر گیمز کے حقوق CBS کو 375 ملین ڈالرز میں فروخت کیے گئے جبکہ NBC نے 2000 سے 2012 تک کے تمام اولمپکس کے حقوق 3.5 ارب ڈالرز میں حاصل کیے۔

اولمپکس گیمز کے پرچم پر پانچ دائرے ہیں جوکہ پانچ براعظموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ امریکا، افریقا، ایشیا، آسٹریلیا، یورپ۔ ماضی میں یہ تمام براعظم اکٹھے تھے پھر علیحدہ ہو کر ایک دوسرے سے دور چلے گئے۔ اولمپک دائروں کے رنگ 5 ہیں۔ نیلا، سیاہ، پیلا، سرخ اور سبز۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے پرچم میں ان میں سے ایک رنگ موجود ہے۔ اس پرچم کو 1914ء میں اپنایا گیا تھا لیکن پہلی بار 1920ء کے انٹورپ (بیلجیم) اولمپک کے موقع پر لہرایا گیا۔

اولمپک موٹو لاطینی زبان کے الفاظ ہیں

Citius,Altius,Fortius,Faster,Higher, Stronger

اولمپک مشعل اولمپکس کے آغاز سے کئی مہینے پہلے یونان میں اولمپیا کے مقام پر سورج کی شعاعوں سے روشن کی جاتی ہے اور پھر یہ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اولمپکس اسٹیڈیم پہنچتی ہے۔ 1928ء سے مشعل اولمپکس سمبل ہے۔ 1936ء میں پہلی دفعہ اولمپکس مشعل ریلی نکالی گئی۔

ہر اولمپکس کے لیے ایک مسکوٹ بھی ہوتا ہے جو میزبان ملک کی کوئی اہم شخصیت یا جانور ہوتا ہے جو میزبان کے ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔

افتتاحی تقریب اولمپک گیمز کا ایک لازمی حصہ ہے۔ 1920ء کے انٹورپ گیمز سے باقاعدگی سے افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تقریب کے آغاز میں میزبان ملک کے گلوکار اور فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس دوران اپنے ملک کی ثقافت کو بہترین انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ تقریب اتنی بہترین ہو کہ تمام دنیا اس کو مدتوں یاد رکھے۔

آج کل اس تقریب کو بہت بڑے پیمانے پر منعقد کیا جاتا ہے۔ اس پر کافی اخراجات بھی آتے ہیں۔ بیجنگ اولمپکس کی افتتاحی تقریب پر 100 ملین ڈالرز کے اخراجات آئے جو کہ کسی بھی ثقافتی سیگمنٹ پر آنے والی سب سے بڑی لاگت ہے۔

اولمپک گیمز کی افتتاحی تقریب بھی ایک بہت اہم ایونٹ ہوتا ہے۔ تمام گیمز کے اختتام پر ہر ملک کا ایک ایتھلیٹ اپنا جھنڈا اٹھائے گراؤنڈ میں داخل ہوتا ہے اور باقی تمام ایتھلیٹ بغیر کسی تفریق کے اکٹھے اسٹیڈیم میں آتے ہیں۔

اس موقع پر تین ملکوں کے پرچم لہرائے جاتے ہیں اور قومی ترانہ بجایا جاتا ہے۔

1- یونان......اولمپکس کی جائے پیدائش۔

2- موجودہ میزبان ملک۔

3- اگلے گیمز کا میزبان ملک

اس موقع پر اولمپک آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر اور IOC کے صدر اپنی اختتامی تقاریر کرتے ہیں اور اولمپکس کے اختتام کا اعلان کیا جاتا ہے نیز اولمپکس مشعل بجھا دی جاتی ہے۔ موجودہ میزبان شہر کا میئر اولمپکس پرچم IOC کے صدر کو دیتا ہے اور وہ اس کو اگلے میزبان شہر کے میئر کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگلے میزبان ملک کے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اولمپک گیمز کے دوران پہلے 3 نمبر پر آنے والے کھلاڑیوں کو گولڈ، سلور اور برونز میڈل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر اولمپکس کمیٹی کا ممبر یہ میڈلز پیش کرتا ہے۔ تینوں میڈلسٹ کے قومی پرچم لہرائے جاتے ہیں اور گولڈ میڈل جیتنے

والے ملک کا قومی ترانہ بجایا جاتا ہے۔ ماضی میں قدیم اولمپکس کے موقع پر جیتنے والوں کو زیتون کی شاخوں کا تاج پہنایا جاتا تھا۔ ایتھنز اولمپکس 2004ء کے موقع پر بھی یہ روایت دہرائی گئی۔

اولمپک گیمز پروگرام میں 41 کھیلوں کے تقریباً 400 ایونٹس شامل ہیں۔ گرمائی اولمپکس میں 26 اور سرمائی اولمپکس میں 15 کھیل شامل ہیں۔ ایتھلیٹکس، سوئمنگ، تلوار بازی اور آرٹسٹک جمناسٹک ہر اولمپک گیمز میں شامل رہے ہیں۔ کراس کنٹری اسکیئنگ، فگر اسکیٹنگ، آئس ہاکی، اسکی جمپنگ اور اسپیڈ اسکیٹنگ 1924ء سے ہونے والے ہر اولمپکس کا حصہ رہے ہیں۔ کچھ گیمز شروع میں اولمپکس میں شامل تھے جنہیں بعد میں نکال دیا گیا۔

صرف آسٹریلیا، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ ایسے ممالک ہیں جنہوں نے 1896ء سے آج تک ہر اولمپک گیمز میں شرکت کی ہے۔

سب سے پہلا بائیکاٹ 1936ء کے برلن گیمز کے موقع پر اولمپک کونسل اور آئرلینڈ نے کیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ IOC نے اس کی ٹیمز کو صرف آئرش فری اسٹیٹ تک محدود کرنے کے لیے کہا تھا جبکہ کونسل تمام جزیرہ آئرلینڈ کی نمائندگی کرنا چاہتی تھی۔ 1956ء کے میلبورن اولمپکس میں ہالینڈ، اسپین اور سوئٹزرلینڈ نے سوویت یونین کے ہنگری پر حملے کی وجہ سے بائیکاٹ کیا تھا لیکن گھڑ سواری کا ایونٹ جو کہ اسٹاک ہوم (سویڈن) میں ہوا اس میں اپنے دستے کو بھیجا جبکہ کمبوڈیا، مصر، عراق، لبنان نے نہر سویز کے بحران کی وجہ سے ان گیمز کا بائیکاٹ کیا تھا۔ تائیوان کو ان گیمز میں حصہ لینے کی اجازت دینے کی وجہ سے چین نے بھی بائیکاٹ کیا تھا۔ 1972ء اور 1976ء میں بہت سے افریقی ممالک نے IOC کے بائیکاٹ کی دھمکی دی کیونکہ وہ جنوبی افریقا کی نسل پرستانہ پالیسوں کی وجہ سے اس پر پابندی لگوانا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نیوزی لینڈ بھی ان کے ٹارگٹ پر تھا کیونکہ اس کی رگبی ٹیم نے جنوبی افریقا کا دورہ کیا تھا۔ IOC نے جنوبی افریقا پر تو پابندی لگا دی لیکن نیوزی لینڈ پر پابندی لگانے سے انکار کر دیا کیونکہ رگبی اولمپکس میں شامل نہیں تھی۔ دھمکی پر عمل کرنے کے لیے تنزانیہ کی قیادت میں گیانا اور عراق کے ساتھ 20 افریقی ممالک نے مونٹریال گیمز 1976ء کا بائیکاٹ کیا۔ تائیوان نے بھی ان گیمز کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا کیونکہ چین نے مونٹریال آرگنائزنگ کمیٹی پر دباؤ ڈالا کہ وہ صرف چین کے نام شامل ہونے والے وفد کو رکھے۔ تائیوان نے اس تجویز کو رد کر دیا جس میں ان کو ریپبلک آف چائنا کا جھنڈا اور ترانہ استعمال کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

تائیوان نے 1984ء تک گیمز میں شرکت نہیں کی تھی پھر یہ چائنیز تائی پے اور خصوصی جھنڈے اور ترانے کے ساتھ شریک ہوئے۔

1980ء اور 1984ء میں سرد جنگ کے حریفوں نے ایک دوسرے کے گیمز کا بائیکاٹ کیا۔ افغانستان پر روس کے حملے کی وجہ سے 1980ء کے ماسکو اولمپکس میں 65 ممالک نے بائیکاٹ کیا۔ 1984ء کے لاس اینجلس اولمپکس میں رومانیہ کے علاوہ روس اور اس کے 14 مشرقی حلیفوں نے بائیکاٹ کیا۔

مشرقی بلاک کے ان ممالک نے جولائی اور اگست میں اولمپکس کے متبادل کے طور پر علیحدہ فرینڈ شپ گیمز منعقد کیے۔ مسلمان ممالک میں ایران واحد ملک ہے جس نے یہ قدم اٹھایا ہے کہ اس کا کوئی بھی کھلاڑی اسرائیلی کھلاڑی کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ 2004ء کے اولمپکس میں ایرانی جوڈو پلیئر، آرش مائرس ماٹیلی نے بھی اسرائیلی کھلاڑی کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ایرانی حکومت نے اس آرش کو 125000 یو ایس ڈالرز انعام دیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کھلاریوں نے پرفارمنس بڑھانے کے لیے مختلف ادویات کا سہارا لینا شروع کر دیا مثلاً 1904ء کے اولپلس میں میراتھن ونر تھامس ہکس کو اس کے کوچ نے Strychnine اور برانڈی دی تھی۔ اب تک ممنوعہ ادویات کی وجہ سے ایک موت بھی ہو چکی ہے۔ 1960ء میں روم اولمپکس میں سائیکل روڈ ریس کے دوران ڈینش سائیکلسٹ کنوڈ اینی مارک جینسن سائیکل سے گر گیا اور بعد میں فوت ہو گیا۔

1960ء کی دہائی کے وسط میں کھیلوں کی فیڈریشنز نے ادویات کے استعمال پر پابندی لگا دی۔

1968ء کے میکسیکو اولمپکس سویڈن کے پینٹاتھلون پلیئر ہینس گنر پہلا کھلاڑی تھا جس کا ڈرگ ٹیسٹ مثبت آیا اس نے الکوحل استعمال کی تھی۔ اس سے کانسی کا تمغا واپس لے لیا گیا۔ سب سے مشہور کیس بین جانسن کا تھا۔ کینیڈا کے ایتھلیٹ کو 1988ء کے اسٹیول اولمپکس میں ڈرگ ٹیسٹ مثبت آنے پر 100 میٹر ریس کا جیتا ہوا گولڈ میڈل واپس کرنا پڑا جو کہ امریکا کے کارل لوئیس کو دے دیا گیا۔

1999ء میں IOC نے World Anti-Doping Agency (WADA) بنائی جس نے اپنے طے شدہ طریقہ کار کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وجہ سے اب ممنوعہ ادویات کا استعمال کافی کم ہوا ہے۔ بیجنگ اولمپکس میں 3667 کھلاڑیوں کے ٹیسٹ لیے گئے اور صرف تین کے مثبت نکلے۔

خواتین نے 1900ء سے اولمپکس سے گیمز میں حصہ لینا شروع کیا۔

اب تک 3 اولمپکس منعقد نہیں ہوئے۔ 1916ء کے اولمپکس پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے منعقد نہ ہو سکے ان کی میزبانی برلن کے پاس تھی۔ 1940ء اور 1944ء کے اولمپکس دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے منعقد نہ ہو سکے۔ 1940ء کا میزبان ٹوکیو اور 1944ء کا لندن تھا۔

1972ء کے میونخ اولمپکس کے موقع پر فلسطینی مجاہدین کے ایک گروپ نے 11 اسرائیلی کھلاڑیوں کو اغوا کر لیا تھا جن میں 2 کھلاڑیوں کو فوری طور پر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ باقی 9 کھلاڑی ائرپورٹ پر جرمنی کی طرف سے ہونے والے کمانڈو ایکشن کے دوران فلسطینیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کارروائی میں 5 فلسطینی شہید اور ایک جرمن پولیس افسر مارا گیا تھا۔

1996ء کے اٹلانٹا اولمپکس کے موقع پر ایک مقامی امریکی دہشت گرد نے بم دھماکا کیا جو کہ اولمپک پارک میں ہوا جس میں 2 افراد ہلاک اور 111 زخمی ہوئے۔

اولمپکس گیمز کی میزبانی کا فیصلہ 7 سال پہلے کیا جاتا ہے۔ اس سے دو سال پہلے سلیکشن کا عمل شروع کر دیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد امیدواروں کو شارٹ لسٹ کر دیا جاتا ہے اور پھر فائنل بولی میں ممبران ووٹنگ کے ذریعے میزبان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

2016ء تک 23 ممالک کے 44 شہر اولمپکس کی میزبانی کر چکے ہوں گے۔ شمالی امریکا اور یورپ سے باہر یہ صرف 8 دفعہ منعقد ہوئے ہیں جبکہ 1988ء کے سیول اولمپکس سے یہ 4 دفعہ ایشیا اور اوشیانا میں منعقد ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے 92 سال میں یہ 4 دفعہ منعقد ہوئے تھے۔ 2016ء میں برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں ہونے والے اولمپکس براعظم جنوبی امریکا کے پہلے گیمز ہوں گے۔ اب تک افریقا میں اولمپکس منعقد نہیں ہوئے۔

امریکا نے سب سے زیادہ اولمپکس کی میزبانی کی۔ 4-4 بار سمر اور ونٹر اولمپکس کی میزبانی کی ہے۔

سمر اولمپکس میں انگلینڈ نے دو دفعہ میزبانی کی ہے جبکہ 2012ء کے اولمپکس کے بعد یہ 3 دفعہ میزبانی کرنے والا ملک بن جائے گا۔ 2-2 سمر اولمپکس کی میزبانی کرنے والے ممالک جرمنی اور آسٹریلیا، فرانس اور یونان ہیں جبکہ 2-2 بار میزبانی کرنے والے شہر لاس اینجلس، پیرس اور ایتھنز ہیں جبکہ لندن اس سال تیسری دفعہ میزبانی کر چکا جو کہ سب سے زیادہ ہے۔

ونٹر اولمپکس میں فرانس نے 3 دفعہ میزبانی کی ہے جبکہ سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، ناروے، جاپان اور اٹلی نے 2-2 بار میزبان بننے کا شرف حاصل کیا ہے۔

1908ء کے لندن اولمپکس میں 10 جولائی سے مینز ملٹری رائفل شوٹنگ کے مقابلے شروع ہوئے۔ ان مقابلوں میں 9 ٹیمیں شریک تھیں لیکن روسی ٹیم لندن میں نہیں تھی۔ منتظمین حیران و پریشان تھے۔ ان دنوں موبائل یا ٹیلی فون نہیں تھے اس لیے صورتِ حال کا پتا نہ چل سکا۔ دراصل اس زمانے میں روس سمیت بعض یورپی ممالک میں جولین کیلنڈر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ بیشتر ممالک جارجین کیلنڈر اپنا چکے تھے۔ ان دونوں کیلنڈر میں 13 دن کا فرق تھا۔ اس لیے روسی یہی سمجھتے رہے کہ شوٹنگ مقابلے 3-2 جولائی کو ہوں گے، جب وہ لندن پہنچے تو یہ جان کر حیران رہ گئے کہ مقابلے ختم ہو گئے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ جیت جائیں گے مگر ایک چھوٹی سی حسابی غلطی نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

ناانصافی ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ 1908ء کے لندن گیمز کے دوران 27 اکتوبر کو مڈل ویٹ باکسنگ کلاس کا فائنل منعقد ہوا۔ مقابلہ آسٹریلوی باکسر ریگنڈ بیگر اور برطانوی باکسر جونی ڈگلس کے درمیان تھا۔ مقابلے کے دوران بیگر کا پلڑا بھاری رہا لیکن اختتام پر جب ریفری نے ڈگلس کو فاتح قرار دیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کھلی دھاندلی پر بیگر نے احتجاج کیا لیکن اس کی شنوائی نہ ہوئی۔ تب تک بیگر کو علم نہ تھا کہ ریفری جونی ڈگلس کا باپ جے ایچ ڈگلس تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایچ ڈگلس نے ہی بحیثیت صدر امیچور باکسنگ ایسوسی ایشن انگلینڈ نے بیٹے کی گردن میں طلائی تمغا ڈالا۔ ایک اور مزے کی بات یہ کہ بعد میں جونی ڈگلس بیگر سے ایک اور مقابلے کے لیے مان گیا۔ یہ مقابلہ لندن باکسنگ کلب میں ہوا۔ پہلے ہی راؤنڈ میں بیگر نے مدِمقابل کو ناک آؤٹ کر دیا۔

1920ء کے انٹورپ (بیلجیم) گیمز میں سویڈن کے 72 سالہ آسکر سوان نے 100 میٹر رننگ ڈیئر ڈبل شاٹ میں ٹیم ایونٹ جیتا۔ وہ تاریخ کے سب سے معمر اولمپک چیمپئن ہیں۔

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط:65

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیجا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہوگیا پھر دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہورہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میں زرین کو لے کر میر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ جب اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچادو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا و سادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کرلیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کرکے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرکے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکادی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کررہا تھا۔ میں نے اس عورت کو مدد لانے کے لیے فرار کرادیا۔ تب فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کرکے ایمن کو بلوالیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر پیغام پہنچادیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہوگیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کرکے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہورہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہوگئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے اغوا کیا تھا پھر اسے حویلی پہنچادیا۔ میں نے شہلا کا نیا ٹھکانا دریافت کرلیا اور رات کے اندھیرے میں گھر کی تلاشی لینے پہنچ گیا۔ باہر وسیم وغیرہ کو پہرے پر بٹھادیا تھا کہ مجھے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ وسیم وغیرہ کے موبائل سے جواب نہیں آرہا تھا پھر کمرے میں آ کر گیس کا گولا گرا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آیا تو فتح خان کی قید میں تھا۔ اس نے مجھے ایک گاڑی میں بند کرکے روانہ کردیا۔ گاڑی طویل سفر کے بعد رکی تو سامنے کرنل کھڑا تھا۔ کرنل زریسکی کو شیف عرف عبدالرحمٰن۔ اس نے مجھے انڈین آرمی کے حوالے کیا مگر میں ان کی قید سے نکل بھاگا۔ میں جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ہمارے درمیان تکرار ہورہی تھی کہ باہر سے بے آواز فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ کرنے والا جب اندر آیا تو فتح خان بھی حیران رہ گیا۔ (اب آگے پڑھیں)

اندر قدم رنجہ فرمانے والی شخصیت کرنل زریسکی عرف عبدالرحمٰن کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا جس سے اس نے دو افراد کو دنیا سے رخصت کیا تھا اور ان کے سرغنہ کو نہتا کردیا تھا جو زیادہ مشکل کام تھا۔ یہ مشکل خود کرنل نے لی تھی ورنہ اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ فتح خان کو بھی اس کے ساتھیوں کی طرح دنیا سے رخصت کردیتا لیکن وہ کسی وجہ سے اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ کرنل نے اندر آتے ہی ایک رومال فتح خان کی طرف اُچھال دیا۔ "اسے اپنے زخم پر لپیٹ لو۔"

فتح خان نے رومال کی طرف دیکھا بھی نہیں جو اس کے قدموں میں گرا تھا۔ وہ خونی نظروں سے کرنل کو دیکھ رہا تھا۔ کرنل کے پیچھے اس کے دونوں گرگے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مخصوص ساخت کی شارٹ گنیں تھیں جو میں کیبن سے نکال لایا تھا اور ایک گہری کھائی میں پھینک دی تھیں ظاہر ہے یہ وہ شارٹ گنیں نہیں تھیں۔ میں اس میز کی آڑ سے نکل آیا تھا جہاں میں فائرنگ سے بچنے کے لیے لیٹ گیا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کرنل نے ایک بھی فالتو گولی نہیں چلائی تھی۔ اس نے صرف تین فائر کیے تھے اور تینوں گولیاں اپنے نشانے پر لگی تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ اس کا نشانہ کتنا اچھا تھا۔

"کرنل یہ کیا ہے؟" فتح خان جنگل سے تازہ تازہ چڑیا گھر میں وارد ہونے والے شیر کی طرح دہاڑا۔

"یہی تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔" کرنل نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "وہ ہیرے کہاں ہیں جن کے لیے تم نے اتنا لمبا چوڑا چکر چلایا؟"

"ہیرے نہیں ملے۔" فتح خان نے اطمینان سے کہا اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ "میرا اسکیم ناکام رہا۔"

"لیکن میری اسکیم ناکام نہیں رہے گی۔" کرنل نے کہا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اس کی تلاشی لو۔"

فتح خان نے صورتِ حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کرلیے تھے۔ منکر نکیر نے اس کی تلاشی لے کر ایک عدد پستول، ایک خوفناک خنجر، سیٹلائیٹ فون اور کچھ رقم برآمد کی تھی۔ فتح خان نے ہاتھ نیچے کرنے کے بعد اپنا رومال نکال کر ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ "کرنل تمہارا نیت خراب ہوگیا ہے کیا؟"

"نہیں مجھے عقل آگئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں تم جیسے گدھے کے کہنے پر چلتا رہا اور اپنا نقصان کرتا رہا۔"

کرنل کے آدمی نے فتح خان کے پاس سے نکلنے والی چیزیں وہیں پھینک دی تھیں۔ فتح خان ہنسا۔ "اب تم کو عقل آگیا ہے لیکن بہت دیر سے آیا اب تم کیا کرے گا؟"

"تم دیکھ لو گے۔" کرنل نے کہا۔ "اب روانگی کی تیاری کرو۔"

"میرا خیال ہے ہماری واپسی ہوگی کیبن کی طرف اور وہاں سے میری روانگی ہوگی بھارتیوں کے ساتھ۔" میں نے پہلی بار کہا۔ "کرنل شاید تم نے کوئی نیا سودا کرلیا ہے۔"

اس نے بے نیازی سے میری طرف دیکھا اور باہر چلا گیا اس کے گرگوں نے اپنے ہتھیاروں سے اشارہ کیا اور ہمیں بھی باہر آنا پڑا۔ دن میں اس جگہ کو دیکھ کر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا یہ بالکل ویرانہ نہیں تھا لیکن باقاعدہ آبادی بھی نہیں تھی۔ دور دور ایسی ہی کوٹھیاں پہاڑیوں پر بکھری ہوئی تھیں جیسی کوٹھی میں اس وقت ہم تھے۔ یہ امرا کا علاقہ تھا۔ مجھے پورچ میں اس آدمی کی لاش دیکھ کر افسوس ہوا جو شاید یہاں چوکیدار تھا اور اس نے چند سو یا ہزار کے لالچ میں موت خرید لی تھی۔ اسے بے خبری میں پشت سے گولی ماری گئی تھی جو اس کے دل میں اُتر گئی تھی اسے تڑپنے تو کیا آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ قتل و غارت گری ضروری تھی؟"

"یہ میں بہتر جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "وین میں بیٹھو۔"

وین کا عقبی حصہ ایک بار پھر میرے لیے چشم برا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار میں اکیلا نہیں تھا بلکہ فتح خان کو بھی میرے ساتھ سفر کا اعزاز حاصل ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے فتح خان سے پہلے آپ کہا اور وہ مجھے گھورتا ہوا وین میں گھس گیا۔ جیسے ہی ہم دونوں وین میں داخل ہوئے باہر سے اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ "مجھے افسوس ہے تم نشست گاہ کو میرے خون سے بچانے کی کوشش کررہے تھے لیکن تمہارے ساتھیوں نے تو اسے مذبح خانہ بنادیا۔"

فتح خان کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "تمہارا قسمت اچھا ہے تم ایک بار پھر بچ گیا۔"

"حالانکہ موت سے کوئی بندہ بشر کبھی نہیں بچ سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بہرحال میں پوری نیک نیتی سے تمہارے ہاتھوں مرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔"

فتح خان نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے اب تک یقین نہیں آرہا ہے۔“

”اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے؟ اگر تقدیر نے میری موت یہاں تمہارے ہاتھوں لکھی ہوتی تو میں کچھ بھی کر لیتا بچ نہیں سکتا تھا اور اگر ایسا نہیں تھا جیسا کہ نہیں ہوا تو تم کچھ بھی کر لیتے میری جان نہیں لے سکتے تھے جیسا کہ ہوا۔“

”تمہیں پتا تھا کہ کوئی آجائے گا؟“ اس نے شک سے کہا۔ ”جو تم کو بچالے گا۔“

”ہاں خواب میں آیا تھا کرنل۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اس نے کہا تھا میں بس آنے والا ہوں مرنا نہیں۔“

”میں اسے چھوڑے گا نہیں ایسے مارے گا کہ اس کا روح بھی قیامت تک بلبلاتا رہے گا۔“ فتح خان نے غالباً خود سے کہا اور روئے سخن یقیناً کرنل کی طرف تھا۔

”تمہیں شک نہیں ہوا کہ کرنل تمہارا دشمن بن گیا ہے؟“

”شک کا کوئی وجہ نہیں تھا پھر میرا خیال تھا اسے اس جگہ کا پتا نہیں ہے۔“

”لیکن اسے پتا تھا اور اس نے عین موقع پر پہنچ کر تمہارے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان کیا تم نے اسے ہیروں کے بارے میں بتادیا تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے زندگی کا سب سے بڑا غلطی کیا اس خنزیر کو بتا کر۔“

”اب تمہارے ساتھ میں بھی بھگتوں گا ویسے یہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟“ میں نے ایک طرف ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بڑی ظالم وین ہے تم نے کہاں سے حاصل کی؟“

”یہی لایا تھا روس سے۔“ فتح خان بولا۔

میں حیران ہوا۔ ”اس کا مطلب ہے اس کی نمبر پلیٹ جعلی ہے۔“

”ہاں صرف نمبر پلیٹ ہی نہیں کاغذات بھی جعلی ہیں۔“ فتح خان نے انکشاف کیا۔ ”اس علاقے میں چلنے والی اکثر گاڑیاں ایسی ہی ہیں۔ یہ یہیں چلتی ہیں اور شہروں کی طرف نہیں جاتی ہیں۔“

فی الحال مجھے ایسی گاڑیوں پر ریسرچ سے کوئی .... دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے کرنل کی فکر تھی۔ وہ ہمیں اور خاص طور سے مجھے کہاں لے جا رہا تھا؟ ”تم بتا سکتے ہو کہ کرنل مجھے کیوں لے جا رہا ہے؟“

”میں کیا بتا سکتا ہے۔“ اس نے شانے اُچکائے۔

”بھارتیوں سے رابطہ کس کا تھا؟“

فتح خان چونکا۔ ”بھارتیوں سے معاملات کرنل دیکھ رہا تھا۔“

”تم یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہو کہ تمہارا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔“

”مجھے ظاہر کرنے کا کیا ضرورت ہے سچ یہی ہے۔ بھارتیوں سے کرنل بات کرتا تھا۔“

”لیکن ڈیوڈ شا سے معاملہ تم کرتے ہو اور یہ سارا کھیل اصل میں اسی کا ہے ورنہ بھارتیوں کو اب تک تو میرا خیال نہیں آیا تھا۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہے۔“ فتح خان نے بیزاری سے کہا۔

”تم مجھے مارنے میں ناکام رہے اب خود تمہاری جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔“ میں نے اسے چھیڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

”دو میں سے ایک بات ہوگا یا تو ہم بچ جائے گا یا نہیں بچے گا۔“ اس نے زندگی کا فلسفہ بیان کیا اور آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا، اسی لمحے وین حرکت میں آگئی۔ پتا نہیں کرنل اور اس کے آدمی اتنی دیر سے یہاں کیا کر رہے تھے۔ مجھے تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ اگر بھارتیوں سے کرنل کا رابطہ تھا تو وہ ایک بار پھر ان سے میرا سودا کر سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی میرے لیے ایک ملین امریکی ڈالرز دے چکے تھے اور اب زیادہ دے سکتے تھے۔ میں نے ان کے دو بندے اور زخمی کر دیے تھے اور ایک قیمتی ہیلی کاپٹر بھی تباہ کر دیا تھا۔ ممکن ہے کرنل اس بار زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا اور رقم لے کر مجھے بھارتیوں کے حوالے کر دیتا۔ وہ فتح خان کی طرح ہیروں کی تلاش میں عمر گنوا دینے والا بندہ نہیں تھا۔ میری طرح فتح خان بھی غور و فکر میں تھا۔

فتح خان سے میری دشمنی دو ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلی دشمنی صرف چند دن چلی تھی اس کے بعد اس میں ایک طویل وقفہ آیا تھا۔ جب میری زندگی نے پلٹا کھایا اور اس میں مرشد شاہ اور نادر جیسے شیطان داخل ہوئے تو فتح خان بھی ایک منفی کردار کی طرح پھر سے لوٹ آیا۔ اس بار فتح خان بالکل بدل کر سامنے آیا۔ وہ ایک ایسا دشمن بن گیا جو میرے خلاف سازشیں تو کرتا لیکن اس نے مجھے جسمانی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی براہِ راست میرے کسی مفاد کو زک پہنچائی۔ اس کا انداز مجھے استعمال کرنے والا رہا تھا یا وہ ڈیوڈ شا اور مرشد جیسے لوگوں کا آلۂ کار بنا رہا۔ یہ پہلا موقع تھا جب فتح خان نے اچانک ہی دشمنی کا انداز بدلا تھا اور مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ کچھ ایسا کر رہا ہے جس میں میں لازمی ٹانگ اڑاؤں گا اور اس سے اس کا بہت بڑا مفاد وابستہ تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کون سا کام کر رہا ہے جس کے لیے اسے خدشہ ہو کہ میں اس میں ٹانگ اڑاؤں گا اور وہ اس میں ناکامی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بہ قول اس کے ہیرے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کے پاس یہ آخری چانس تھا۔ اس نے ایمن کے بدلے تاوان کے مطالبے سے بھی دست برداری اختیار کر لی تھی۔ فتح خان نے مجھے بتانے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا اب بھی نہیں بتاتا۔ بہر حال محاورے میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ دشمن زندہ صحبت باقی۔ آئندہ بھی میری اور فتح خان کی ملاقاتیں جاری رہتیں اور کبھی نہ کبھی کھل جاتا کہ وہ کون سا کام مجھ سے چھپا کر سرانجام دے رہا تھا۔ مجھے ایمن کا خیال آیا اور میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے ڈیوڈ شا اپنے وعدہ پر قائم رہے گا۔“

”وہ بڑا آدمی ہے اگر اس نے تم سے وعدہ کیا ہے تو وہ اس کا پاس کرے گا۔“

”لیکن مجھے اس پر اعتماد نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا مرضی کا بات ہے۔“ فتح خان بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے مارشل کا کیا انجام ہوا ہے؟“

میں چونکا۔ ”نہیں لیکن ایک بار ڈیوڈ شا سے میری فون پر بات ہوئی تھی اور میں نے اسے ثبوت کے ساتھ مارشل کے جھوٹ کا بتا دیا تھا۔ مارشل بھی اس کے قابو میں تھا۔ کیا ڈیوڈ شا نے اسے مار دیا؟“

”نہیں اس پر انسانوں کی اسمگلنگ کا الزام لگا ہے اور وہ فرانس میں قید ہے اگر الزام ثابت ہو گیا تو وہ پچاس ساٹھ سال کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔“

”یعنی جیتے جی وہ جیل سے باہر نہیں آسکے گا؟“

”بالکل یہ گورا لوگ کا سزا کا انداز ہے۔ شکر ہے اِدھر سزائے موت دیا جاتا ہے۔“ فتح خان نے کہا۔

”تمہارے ساتھ صرف یہی دو لوگ تھے؟“

”ہاں اِدھر یہی دو تھا۔ باقی اُدھر شہر میں اور دوسری جگہوں پر ہے۔“

”یعنی کسی کو نہیں معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا گزری اگر کرنل نے تمہیں مار کر کہیں دفنا دیا تو....؟“

”تو کیا۔“ اس نے شانے ہلائے۔ ”اب تک میں مارتا رہا ہے۔ میں بھی مارا جا سکتا ہے۔“

”اتنی آسانی سے؟“

”نہیں میں بھی تمہاری طرح آخری سانس تک لڑنے کا عادی ہے۔ ممکن ہے میں مارا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کرنل کا آخری وقت آگیا ہو۔“

جس وقت فتح خان نے یہ بات کی تو نہ جانے مجھے خیال آیا کہ واقعی کرنل کا آخری وقت آگیا ہے وہ ہمیں نہیں اپنی شامت کو ساتھ لے جا رہا ہے۔ کرنل کا یہ قدم ظاہر کرتا تھا کہ اس کے دل میں شروع سے کوئی کھوٹ تھا اور وہ ہیروں کی بازیابی کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب ہیرے نہیں ملے اور ان لوگوں کا منصوبہ ناکام رہا تو کرنل نے متبادل منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا یہ منصوبہ اس نے فتح خان کو بائی پاس کر کے تیار کیا تھا۔ اس کا ایک نقطہ تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیں بھارتیوں کے حوالے کر کے جو مل رہا ہو اسے سمیٹ کر واپس روس چلا جائے۔

”تم نے کسی بینک اکاؤنٹ کا ذکر کیا تھا جس میں بھارتیوں سے حاصل ہونے والی رقم جمع ہے کیا یہ اکاؤنٹ تم نے خود کھلوایا تھا؟“

میرے سوال پر فتح خان چونکا۔ ”نہیں اکاؤنٹ کرنل نے کھلوایا تھا۔ مجھے ان معاملات کا زیادہ نہیں معلوم ہے۔“

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”تم بہت چالاک صحیح لیکن کہیں کہیں مار کھا جاتے ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں ایسے کسی اکاؤنٹ کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ تمہارے حصے کے پانچ لاکھ ڈالرز بھی کرنل ہضم کر چکا ہوگا۔“

فتح خان کی آنکھوں میں مزید خون اُتر آیا اور اس نے اپنے قبائلی انداز میں مختلف قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ ایسی صورت میں کرنل کے ساتھ بہت بُرا ہوگا۔ میں نے سرد آہ بھری۔ ”فی الحال تو ہمارے ساتھ بُرا ہوتا نظر آرہا ہے، ہم بالکل نہتے ہیں ایک پنسل تراش تک نہیں ہے۔ ویسے جب میں کرنل سے ملا تو میرا خیال دوسرا تھا کہ وہ تم پر اعتماد کر کے سخت حماقت کا ثبوت دے رہا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں نہیں جانتا ہے لیکن اب لگ رہا ہے یہ حماقت تم نے کی تھی اور

درحقیقت تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔"
فتح خان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "ہم نے اچھا نہیں کیا اس جگہ کا بات گاڑی کے آگے سنا جاتا ہے۔"
یہ سن کر میں اُچھل پڑا تھا۔ "یہ تم اب بتا رہے ہو تم سچ مچ پٹھان ہو۔"
اس نے خفت سے کہا۔ "میرے کو خیال نہیں رہا۔"
اس کے بعد ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ وین کو چلتے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ اگر ہم واپس اسی کیبن کی طرف جا رہے تھے تو یہ ابھی تین چار گھنٹے کا سفر اور تھا۔ وہ بھی موسم اگر ٹھیک ہو۔ بند وین میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ آگے کا موسم کیسا تھا۔ مگر خلاف توقع کچھ دیر بعد وین رک گئی تھی۔ ایک منٹ بعد عقبی دروازہ کھلا۔ وین سڑک کے ساتھ ایک جنگل کے کنارے کھڑی تھی۔ کرنل اور اس کا ایک ساتھی ہتھیار بدست اور چوکنا موجود تھے۔ کرنل نے شارٹ گن سے اشارہ کیا۔ "نیچے آجاؤ۔"
"آجاؤ میرے دوست نما دشمن۔" میں نے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔ "شاید ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔"
میں اور فتح خان نیچے اُتر آئے۔ فتح خان نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم جو کر رہا ہے تم کیا سمجھتا ہے بچ جائے گا؟"
"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" کرنل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بولنے کے بجائے چلنے کی کرو۔"
یہاں بھی ہر طرف برف نظر آ رہی تھی لیکن سردی کی شدت بہت زیادہ نہیں تھی۔ کرنل کے اشارے پر ہم سڑک سے اُتر کر درختوں کے درمیان ایک پگ ڈنڈی پر چلنے لگے۔ درختوں کے نیچے کہیں کہیں برف تھی۔ جو برف درختوں کی شاخوں پر تھی وہ دھوپ پڑنے سے پگھل گئی تھی۔ پانی پڑنے سے زمین نم اور نرم ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک سو گز چلنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے کچے مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ باقاعدہ کیبن نہیں تھا۔ مٹی اور پتھروں کی مدد سے اسے بنایا گیا تھا اور اس کی چھت ٹین کی شیٹ سے ڈالی گئی۔ یہ کسی لکڑ ہارے یا چرواہے کا عارضی ٹھکانہ لگ رہا تھا۔ جو وہ موسم گرما میں استعمال کرتا ہوگا۔ سردیوں میں یہ لوگ نچلے علاقوں میں چلے جاتے ہیں جہاں برف نہیں پڑتی ہے اور ان کے معمولات زندگی چلتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ واپس آ جاتے ہیں۔
ہم مکان میں آئے اندر بہت معمولی سا ساز و سامان پڑا تھا اس میں ایک انگیٹھی اور ایک چارپائی تھی۔ مٹی کے چند برتن بھی پڑے تھے۔ کرنل کے اشارے پر ہم دو ایک طرف دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ کرنل کسی وجہ سے ہمیں زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اگر مارنا ہوتا تو جہاں فتح خان کے تین آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں وہیں ہماری بھی دو لاشیں رہ جاتیں۔ فتح خان اس وجہ سے واقف تھا اس لیے کسی قدر بے خوف تھا۔ مجھے زندہ رکھنے کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں اس کے لیے ایک بلینک چیک تھا جسے وہ کسی بھی بھارتی بینک سے کیش کرا سکتا تھا۔ فتح خان سے بھی اس کا کوئی ایسا مسئلہ اٹکا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اسے زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔ کرنل اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ "فتح خان شہلا کہاں ہے؟"
"مجھے کیا معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا اس سے بہت عرصے سے رابطہ نہیں....."
"جھوٹ مت بولو صرف تین دن پہلے تم مری میں اس سے ملے تھے۔" کرنل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم دوسروں کو بے وقوف بنا سکتے ہو مجھے نہیں۔"
"کیوں تم میں ایسا کیا بات ہے، اگر تم چاہے تو ہم تم کو بھی بے وقوف بنا سکتا ہوں۔" فتح خان کا لہجہ مذاق اُڑانے والا تھا۔
"اگر شہلا میرے آدمیوں کو جل دے کر نہ نکل گئی ہوتی تو تم اس طرح بات نہ کر رہے ہوتے۔" کرنل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "فتح خان مجھے ہر صورت میں شہلا کا پتا چاہیے۔"
"تم نے شہلا کا کیا کرنا ہے؟" فتح خان کسی قدر سنجیدہ ہو گیا۔
تین دن پہلے شہلا سے ملنے کا مطلب تھا کہ شہلا نے جب مجھے مارنے کی کوشش کی تھی تو اس کے فوراً بعد وہ فتح خان سے ملی تھی۔ شاید مجھے بریف کیس دینے کے بعد وہ واپس اسلام آباد کی طرف جانے کی بجائے مری چلی گئی تھی۔ مگر میں نے گفتگو میں مداخلت نہیں کی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کرنل شہلا تک رسائی کیوں چاہتا تھا؟ اس کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان اور شہلا کا تعلق نہ صرف پرانا تھا بلکہ اس میں مزید گہرائی آ گئی تھی۔ فتح خان کے سوال پر کرنل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"تم جانتے ہو.... کیا میں شہباز کے سامنے بتا دوں۔"
اس بات نے فتح خان کو کسی قدر مضطرب کر دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "کرنل میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔"
کرنل نے سر ہلایا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"
میرا خیال تھا کہ وہ دونوں کہیں باہر جائیں گے لیکن کرنل نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے باہر لے جائے۔ اس نے شارٹ گن لہرائی اور میں اس کے ساتھ باہر آگیا۔ جب میں فتح خان کی قید میں آیا تھا تو اس کے آدمیوں نے میری بھاری گرم جیکٹ اُتار لی تھی۔ اس کی جگہ مجھے مقامی موسم کے لحاظ سے ایک ہلکی جیکٹ دے دی تھی۔ میں اسی ہلکی جیکٹ میں تھا۔ مجھے یاد تھا کرنل کے اس آدمی کا نام آغا تھا وہ مجھے جھونپڑے سے کوئی بیس تیس گز دور لے آیا۔ اس کا دوسرا ساتھی شاید وین کے پاس تھا۔ میرا چھیڑ چھاڑ کا موڈ ہونے لگا۔ "تم شروع سے کرنل کے پالتو ہو یا حال ہی میں اس کے ساتھ شامل ہوئے ہو؟"
اس نے غرّا کر مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے گل فشانی جاری رکھی۔ "تم شاید دوغلی نسل سے ہو اس لیے ذاتی عقل سے محروم ہو۔"
میں نے ان دونوں کو بہت کم بولتے دیکھا تھا۔ حد یہ کہ وہ آپس میں بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ اپنے انداز سے ادا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ایک ایسی مشین لگتے تھے جو صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتی ہو۔ مگر میرے اشتعال انگیز جملوں نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ وہ غراتا ہوا میری طرف آیا۔ پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ مجھے گولی نہ مار دے۔ لیکن اس نے شارٹ گن کی نال مجھے مارنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا وار بازو پر روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے سیمنٹ کی بوری پر مکا مارا ہو۔ وہ غرایا اور اس بار اس نے نال میرے سر پر مارنا چاہی۔ اس وار کو ہاتھ پر روکنے کا مطلب تھا میں اپنی کلائی تڑوا لیتا اس لیے میں نے سر جھکاتے ہوئے اس کے پیٹ میں اسی جگہ ٹکر ماری جہاں مکا مارا تھا۔ شارٹ گن کی گھومتی نال میری کمر پر لگی لیکن اتنے پاس سے اس کا زور ختم ہو گیا تھا۔ میں اسے لے کر نیچے جا گرا۔ اس نے شارٹ گن نہیں چھوڑی تھی اس لیے میں نے ایک ہاتھ سے اس کی نال پکڑ لی تاکہ وہ تیسری بار اسے نہ استعمال کر سکے۔ اس نے چلا کر کسی اجنبی زبان میں کچھ کہا ظاہر ہے وہ میری مدح سرائی تو کرنے سے رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے منہ پر مکا مارا۔ اس سے پہلے میں دوسرا وار کرتا عقب سے کرنل کی آواز آئی۔
"شہباز رک جاؤ۔"
میں رک گیا اور پھر آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہوا میں نے ہاتھ بھی بلند کر لیے تھے۔ کرنل نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا تھا؟"
"کچھ نہیں میں نے تمہارے آدمی سے اس کے بارے میں کچھ سوالات کیے تھے یہ غصے میں آگیا اور زبان کے بجائے ہاتھ سے جواب دینے لگا۔"
کرنل نے اپنے آدمی سے کہا۔ "تم دفع ہو جاؤ اور جا کر مبشر کو یہاں بھیجو۔"
مجھ پر غرانے والا آغا کرنل کے حکم پر دُم دبا کر وہاں سے چلا گیا۔ ایک منٹ بعد مبشر آ گیا۔ کرنل نے اسے حکم دیا۔ "اس پر کڑی نظر رکھو اور اگر یہ کوئی غلط حرکت کرے تو اس کے پاؤں پر فائر کرنا گھٹنے پر۔"
مبشر نے فوراً شارٹ گن کا رُخ میرے دائیں گھٹنے کی طرف کر دیا اور میں ساکت ہو گیا۔ کرنل حکم دے کر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر مبشر کو دیکھا تاکہ اس کے تنے ہوئے اعصاب نرم پڑ جائیں۔ وہ جذبات سے عاری مشین نما انسان تھا اور حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کرتا میری کسی حرکت پر وہ سچ مچ فائر کر سکتا تھا اور شاٹ گن کا فائر صرف میرا گھٹنا نہیں توڑتا بلکہ اسے جسم سے الگ بھی کر دیتا۔ مجھے حیرت تھی کہ اندر فتح خان سے مذاکرات میں مصروف کرنل کو کیسے پتا چلا کہ باہر کچھ گڑبڑ ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ فتح خان کو چھوڑ کر کیسے آ گیا۔ یقیناً اس نے کچھ ایسا کیا ہوگا کہ اس کی عدم موجودگی میں فتح خان فرار نہ ہو سکے۔ مبشر شارٹ گن کا رُخ میری طرف کیے بالکل ساکت کھڑا تھا۔ مارے خوف کے میں بھی ساکت تھا۔ اگر کرنل اسے حکم دیتا کہ مجھے شوٹ کر دے تب بھی میں اتنا خوفزدہ نہیں ہوتا جتنا اس حکم پر ہوا تھا۔ ایک پاؤں سے محروم ہو کر معذور بن جانا مجھے گوارہ نہیں تھا اس کے مقابلے میں مجھے موت زیادہ آسان لگ رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد کرنل جھونپڑی سے باہر آیا اور اس نے مبشر کو حکم دیا۔ "اسے اندر لاؤ۔"
میں جھونپڑی میں داخل ہوا اور ٹھٹک گیا۔ فتح خان اس حالت میں کھڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت سے بندھے تھے اور یہی رسّی چھت کو سہارا دینے والی لکڑی کی بلی سی گزاری گئی تھی۔ یہ رسّی دیوار میں ایک کھونٹے سے بندھی تھی اور فتح خان نہایت اذیت ناک پوز میں کھڑا ہوا تھا کیونکہ رسّی

آخری حد تک کھنچی ہوئی تھی۔ اگر اسے ذرا سا اور اوپر کھینچا جاتا تو فتح خان کے دونوں ہاتھ شانوں سے اکھڑ جاتے۔ دائیں آنکھ کے اوپر چوٹ کا نشان بتا رہا تھا کہ کرنل نے کچھ تفتیش بھی کی تھی فتح خان کے منہ پر ٹیپ چپکا رکھا تھا اس لیے وہ آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ کرنل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے تمہیں خوشی ہوگی اسے اس حال میں دیکھ کر؟"

"اگر تم ایسی ہی ایک رسّی مہیا کرسکو تو میں تمہیں بھی اسی پوز میں لٹکا کر زیادہ خوش ہوسکتا ہوں۔"

کرنل کا موڈ آف ہوگیا اور اس نے فتح خان کے منہ سے ٹیپ ایک جھٹکے سے اُتار دیا۔ فوراً ہی فتح خان کے منہ سے پشتو کی وہ نایاب گالیاں نکلی تھیں جو اَب سننے میں بھی کم آتی ہیں۔ کرنل نے ذرا بھی بُرا نہیں منایا کیونکہ وہ پشتو سے ناواقف تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر تم نے مجھے شہلا کا پتا نہیں بتایا تو پہلے تمہارے دونوں ہاتھ شانوں سے الگ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں اُلٹا لٹکا دوں گا اور تمہارے سر کے نیچے اس انگیٹھی کو روشن کردوں گا اور اس کی گرمی سے تمہارا مغز پگھل کر گرے گا۔"

"مجھے شہلا کا نہیں معلوم۔" فتح خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا کرو میرا مغز نکال کر ڈائریکٹ فرائی کر کے اپنے کتّوں کو کھلا دو۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میں اسے تلاش نہیں کرسکتا۔ میں بس ذرا زحمت سے بچنا چاہ رہا تھا ورنہ اسے تلاش کرنا ناممکن نہیں ہے۔"

"تم اسے تلاش نہیں کرسکتا ہے۔" فتح خان نے یقین سے کہا۔

"اچھا تم نے اسے ایسی جگہ چھپایا ہے؟" کرنل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس پر فتح خان نے کرنل کی والدہ کے حوالے سے جگہ کا بتایا اس پر کرنل کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور میں نے پہلی بار اسے جذباتی دیکھا۔ اس نے فتح خان کو گھونسا مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون چھلک آیا تھا۔ کرنل بالکل اپنے آدمیوں کی طرح غرّانے لگا۔ "فتح خان میں آخری بار پوچھ رہا ہوں، اگر تم نے شہلا کا پتا نہیں بتایا تو تمہاری موت بہت خوفناک ہوگی۔"

"اگر میرے کو پتا ہوتا تب بھی نہیں بتاتا۔" فتح خان نے کہا اور اچانک کرنل کے منہ پر تھوک دیا۔ "فتح خان تم جیسے کسی حرامی کتے سے نہیں ڈرتا ہے۔"

کرنل غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس نے پے در پے فتح خان پر مکّوں کی برسات کی اور اس کا ناک نقشہ بگاڑ دیا۔ کرنل کے ہاتھ بہت سخت تھے اور فتح خان کئی مقامات سے لہولہان ہوگیا تھا۔ میں ایک طرف کھڑا تھا اور مبشر میری نگرانی کررہا تھا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اس نے جیکٹ سے پستول نکالا تو میں سمجھا وہ فتح خان کو ختم کرنے جارہا ہے۔ لیکن اس نے پستول نیچے کیا اور اس کی ران میں گولی اُتار دی۔ فائر کی آواز زیادہ نہیں تھی مگر فتح خان کی دہاڑ بہت بلند تھی۔ وہ بلبلایا اور دوبارہ کرنل کی مداح سرائی کرنے لگا۔ کرنل سکون سے کھڑا تھا۔ جب فتح خان کی بلبلاہٹ ذرا کم ہوئی تو اس نے کہا۔ "میں اسی طرح تمہارے ہاتھ پیروں میں ایک ایک کر کے گولی اُتارتا رہوں گا اس میں کوئی زخم ایسا نہیں ہوگا جس سے تم فوراً مر جاؤ۔ میرے پاس پستول میں ابھی گولیاں اور ہیں۔ دونوں ٹخنوں، دونوں گھٹنوں، کہنیوں اور دونوں کلائیوں کے لیے آٹھ گولیاں کافی ہوں گی۔ اس کے بعد تمہاری دوسری ران اور پھر بازوؤں کی باری آئے گی۔ ابھی تمہاری ہڈی بچا کر گولی چلائی ہے۔ اس کے بعد میں براہِ راست ہڈی میں گولی ماروں گا۔ معلوم ہے ہڈی ٹوٹنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے اگر تم جاننے تو جلد جان جاؤ گے۔"

کرنل کا منصوبہ سن کر نہ جانے فتح خان کی اندر کیا حالت ہوئی تھی لیکن میرے اندر سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ نہایت خوف ناک اور اذیت ناک منصوبہ تھا۔ فتح خان کی جینز اس جگہ سے خون سے تر ہوگئی تھی جہاں گولی لگی تھی خون بہہ کر اس کے جوتے تک چلا گیا تھا۔ وہ اس پاؤں پر زور ڈالنے کے بجائے دوسرے پاؤں پر زور ڈال رہا تھا۔ جب کرنل خاموش ہوا تو فتح خان نے ایک بار پھر سر اُٹھایا اور کرنل پر تھوک دیا۔ اس بار تھوک اس کے منہ تک نہیں گیا تھا لیکن کرنل کی جیکٹ پر گرا تھا کرنل مشتعل نہیں ہوا تھا۔ اس نے فتح خان سے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ یہی کر رہا ہوں اس سے زیادہ اور کیا کروں لیکن اب ہر دو منٹ میں تمہیں ایک گولی مارتا رہوں گا۔ آدھے گھنٹے میں تم اس قابل نہیں رہو گے چھلنی بن جاؤ گے لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں اس پر بھی تم نہیں مرو گے تمہیں مرنے میں ایک گھنٹا لگے گا۔"

"کرنل۔" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

خان بہت ضدی آدمی ہے، یہ مر جائے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔"

"ٹھیک ہے تب یہ مرے گا۔" کرنل نے سفاک لہجے میں کہا۔ "مجھے اس سے مہرو کا حساب بھی برابر کرنا ہے۔"

فتح خان نے قہقہہ لگایا۔ "تم مجھے مار دے گا لیکن اس سے مہرو کے ساتھ جو ہوا تھا وہ واپس....."

کرنل نے فتح خان کے منہ پر پستول والا ہاتھ مارا۔ اس کی بات اُدھوری رہ گئی اور جب اس نے کھانس کر تھوکا تو خون کے ساتھ ایک عدد دانت بھی باہر گرا تھا۔ کرنل نے بالکل ٹھیک کیا تھا مہرو کے ساتھ فتح خان کے ساتھیوں کا انسانیت سوز سلوک مجھے بھی نہیں پسند آیا تھا۔ اس لحاظ سے فتح خان سزا کا مستحق تھا۔ مہرو کی آبروریزی میں جو لوگ شامل تھے وہ خود مہرو کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اب فتح خان ہی باقی تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں کرنل کے اس منصوبے سے متفق ہوگیا تھا جو اس نے فتح خان کے بارے میں بنایا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ مچ اپنے منصوبے پر عمل کرے گا۔ اس نے پستول سیدھا کیا۔ میں نے اسے روکا۔

"ایک منٹ کرنل کیا تم میری بات سننا پسند کرو گے؟"

اس نے پستول نیچے نہیں کیا لیکن میری طرف دیکھا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کرنل کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تمہیں شہلا کی تلاش کیوں ہے؟"

کرنل نے کچھ دیر سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"اوکے، اگر تم فتح خان کے لیے اپنے منصوبے پر عمل درآمد فی الحال ملتوی کردو تو میں شہلا کی تلاش میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

کرنل نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے مجھے دیکھا۔ یقیناً اس کے دل میں یہی بات ہوگی کہ میں اپنے دشمن کو بچانے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں، جس نے پہلے مجھے بھارتیوں کے حوالے کیا اور پھر خود قتل کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس نے میری پیشکش کو مسترد کردیا۔ "مجھے تمہارے مدد کی ضرورت نہیں ہے میں خود شہلا کو تلاش کرلوں گا۔"

کرنل سے اس گفتگو کے دوران، میں بہت غیر محسوس انداز میں دائیں طرف سرک رہا تھا۔ فتح خان بھی اسی طرف بندھا ہوا تھا۔ کرنل اور مبشر بائیں طرف تھے۔ میں اس پوزیشن میں آنے کی کوشش کررہا تھا جس میں مجھے کرنل اور مبشر دونوں سامنے دکھائی دیں۔ مجھے انکار کر کے کرنل فتح خان کی طرف متوجہ ہوا۔ "فتح خان کیا کہتے ہو؟"

فتح خان خاموش رہا تھا کرنل نے پستول کا رُخ اس کے بائیں پاؤں کے ٹخنے کی طرف کیا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ مبشر کی توجہ بھی میرے بجائے ان دونوں کی طرف گئی تھی۔ وہ فتح خان کے پاؤں میں گولی لگنے کا منظر دیکھنا چاہتا تھا اور میں اسی موقع کا انتظار کررہا تھا میرا دایاں ہاتھ جو جیکٹ کی جیب کے پاس تھا تیزی سے اندر گیا۔ یہ ہاتھ ان دونوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ میں نے جیب سے ہاتھ نکالا اور اسے پشت کی طرف لاتے ہوئے مبشر پر فائر کیا۔ یہ اندازے سے کیا گیا فائر تھا کیونکہ سامنے ہاتھ لانے کی صورت میں کرنل اور مبشر دونوں پستول دیکھ لیتے۔ اس لیے میں نے ہاتھ پشت کی طرف کر کے فائر کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ مبشر کراہا اور پیچھے جا گرا، گولی اس کے سینے میں اُتر گئی تھی۔ کرنل چونکا اور ایک لمحے کے لیے کنفیوژ ہوگیا کہ گولی کہاں سے چلی تھی کیونکہ میرے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس ایک لمحے کے کنفیوژن کا فائدہ اُٹھایا اور زمین پر گرتے ہوئے ہاتھ سامنے لا کر دوسرا فائر کرنل پر کیا۔ خوش قسمتی سے یہ فائر بھی نشانے پر لگا تھا۔ گولی کرنل کے دائیں شانے میں اُتر گئی۔ وہ کراہا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جھک کر پستول اُٹھاتا میں نے اسے لات مار کر چارپائی کے نیچے کردیا اور پستول کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"بس کرنل اب حرکت مت کرنا۔"

گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی اور بازو جھول رہا تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر اپنے زخم سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ تکلیف سے زیادہ اس کے تاثرات میں حیرت تھی۔ "یہ پستول کہاں سے آیا تمہارے پاس؟"

"جب تم نے فتح خان کے ایک آدمی کو شوٹ کیا تھا اور وہ پلٹ کر گرا تھا تو اس کا پستول چھوٹ کر میرے سامنے آگرا تھا میں میز کے پیچھے تھا اس سے پہلے کہ تمہیں یا فتح خان کو پتا چلتا میں نے پستول اُٹھا کر جیکٹ میں رکھ لیا تھا۔"

کرنل کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ "تم مسلح تھے اور میرے کسی آدمی کو خیال نہیں آیا۔"

"خیال تو تمہیں بھی نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا اور

اسے نشانے پر رکھے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ مبشر بے ہوش تھا یا مر چکا تھا۔ بہ ظاہر اس کے جسم میں حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں کرنل پر نظر رکھے ہوئے اس تک گیا اور اس کی شاٹ گن اُٹھالی۔ فائرنگ کی آواز یقیناً باہر تک گئی ہوگی اور کرنل کا دوسرا ساتھی آغا آنے والا ہوگا۔ شارٹ گن اُٹھا کر میں نے کمرے میں ایک ایسی جگہ پوزیشن سنبھال لی کہ آنے والے کو دیکھ سکوں اور ضرورت پڑے تو اسے شوٹ کر دوں۔ فتح خان بولا۔ ''شہباز پہلے اسے شوٹ کر دو پھر اس کا ساتھی سے نمٹنا۔''

''تم چپ کرو۔'' میں نے اسے جھڑکا۔

کرنل طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''اسے خوف ہے میں اس کا راز نہ فاش کردوں۔''

میں نے ان دونوں کی باتوں سے توجہ ہٹا لی تھی اور میرے کان باہر سے آتی آہٹوں پر مرکوز تھے۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دبے قدموں جھونپڑی کے آس پاس چل رہا ہو۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے سرگوشی میں کرنل سے کہا۔ ''اپنے آدمی کو آواز دو۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا بولنے سے گریز کیا تھا۔ میں نے اسے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں۔ یہاں سب ایک سے بڑھ کر ایک ضدی تھے جان چلی جائے لیکن اپنی ضد سے نہیں ہٹنا تھا۔ چند لمحے بعد آہٹ دروازے تک آ گئی تھی۔ میں اس آدمی کو مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن کرنل کی ہٹ دھرمی کے بعد یہ مشکل کام ہوگیا۔ وہ اندر آنے سے ہچکچا رہا تھا اور اگر آتا تو مجھے مارنے کی کوشش کرتا۔ جواب میں، میں بھی اس پر پھول نچھاور نہیں کرتا۔ اس مار دھاڑ کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی بچتا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''آغا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''آغا تم نے اس کی کوئی بات نہیں سننی ہے۔'' کرنل بھی بولا۔

''تم خاموش رہو۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا لیکن تم اس پر تلے ہوئے ہو کہ میں تمہارے دوسرے ساتھی کی لاش بھی گرا دوں۔''

''وہ ہتھیار نہیں ڈالے گا۔'' کرنل نے اطمینان سے کہا۔ ''چاہے تم مجھے قتل کرنے کی دھمکی ہی کیوں نہ دو۔''

''میں تمہیں دھمکی نہیں دوں گا بلکہ قتل کر دوں گا۔'' میں نے گرج کر کہا اور پستول سے ہوا میں گولی چلا دی اور فوراً ہی کرنل کے سر پر پستول کا دستہ بجا دیا۔ وہ چلایا اور نیچے جا گرا۔ فائر اور کرنل کی چیخ نے باہر موجود آغا کو مشتعل کر دیا تھا۔ اسے یقیناً یوں لگا ہوگا کہ میں نے کرنل کو شوٹ کر دیا۔ وہ کسی اندھے بیل کی طرح اندر آیا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے اور اس نے اسے ٹکر مار کر توڑنے کی کوشش کی لیکن دروازہ کھلا تھا اس لیے وہ جھونک میں اندر آن گرا۔ اس نے خود میرا کام آسان کر دیا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے شارٹ گن اوپر کرنے کی کوشش کی۔ میں نے لات مار کر اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی، سر پر چند تسلی بخش قسم کی ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ لمبا لیٹ گیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے ایک پستول اور ایک عدد چاقو برآمد کیا۔ اسی طرح کرنل کے پاس سے ایک اضافی پستول اور اس کا مخصوص خنجر تھا۔ ان لوگوں نے کوئی ایسی چیز جس سے شناخت ہوسکیں اپنے پاس نہیں رکھی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مبشر جان سے گزر گیا تھا۔ اب اسے اتفاق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ میں نے ہاتھ پشت کی طرف کر کے گولی چلائی تھی اور وہ اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ میں نے مزید رسّی تلاش کر کے کرنل اور آغا کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ وہ عام انسان نہیں تھے جو گولی کا زخم کھا کر بے بس ہو جاتے ہیں، وہ اس حالت میں بھی میرے خلاف کچھ بھی کر سکتے تھے، ان کا بے بس ہونا بہت ضروری تھا۔ فتح خان خاموشی سے کھڑا تھا، پاؤں میں گولی کھانے اور نہایت مشکل انداز میں بندھے ہونے کے باوجود اس نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں اسے کھول دوں۔ دوسری طرف میں کرنل والی غلطی نہیں دُہرانا چاہتا تھا۔ اس نے فتح خان کے ٹھکانے پر میری تلاشی نہیں لی تھی اس کا خیال تھا میں فتح خان کا قیدی تھا اور میرے پاس اسلحے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جب کہ میں نے ایک عدد پستول حاصل کر لیا تھا۔

میں نے سارا اسلحہ سمیٹ کر اور بے کار کر کے چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔ اس کے بعد خنجر سے رسّی کاٹ کر فتح خان کو کھولا۔ وہ کراہتا ہوا نیچے ڈھیر ہوگیا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر زخم کا معائنہ کیا اور پھر خنجر سے جینز کاٹ ڈالی۔ گولی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سوراخ کرتی نکل گئی تھی۔ زخم سے خون بہنے کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی۔ میں نے مبشر کی قمیص کا دامن پھاڑا اور اسے ہی پٹی کر کس کر فتح خان کے زخم پر باندھ دیا۔

فتح خان اب تک خاموش تھا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز خان، تم نے یہ میری خاطر کیا ہے؟''

''میں بھی کسی سے کچھ مفت میں لینا پسند نہیں کرتا۔ تم نے ایمن کے بدلے میری جان مانگی تھی مگر قدرت کو ابھی میری زندگی منظور ہے اس لیے تم ناکام رہے۔ اس کے باوجود مجھے اچھا نہیں لگا تم نے میرے کہنے پر ایمن کو چھوڑا ہے اس لیے میں نے تمہاری زندگی بچا کر حساب برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''اب تم کیا کرے گا؟''

''کچھ نہیں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

وہ بے چین ہوگیا۔ ''لے جائے کہاں.... کیوں؟''

''اگر تم سوچ رہے ہو کہ میں تمہیں یہاں ان لوگوں کے پاس چھوڑ جاؤں گا اور تم کرنل سے اپنا حساب چکاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ جس طرح میں کرنل کے ہاتھوں تمہاری موت گوارا نہیں کروں گا اسی طرح مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میری آڑ میں تم کرنل سے اپنا حساب چکاؤ۔ اپنے بدلے اپنے بل بوتے پر چکاؤ۔''

''تمہیں اس سے کیا ہمدردی ہے؟'' فتح خان نے بگڑے لہجے میں کہا۔

''کوئی ہمدردی نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور کرنل کو ہلانے جلانے لگا۔ اس کے زخمی بازو کو ہلانا زیادہ کارآمد ثابت ہوا تھا۔ وہ جلدی ہوش میں آ گیا۔ اس دوران... فتح خان نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں اس پر لعنت بھیجوں اور یہاں سے چلوں ایسا نہ ہو کہ اس کا کوئی اور ساتھی آجائے۔ مگر میں نے فتح خان کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ میں اس کی تشویش کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ میں کرنل سے اس بارے میں پوچھ گچھ نہ شروع کر دوں، جو وہ مجھ سے چھپا رہا تھا اور اس سے زیادہ خطرہ اسے کرنل سے تھا کہ وہ ازخود نہ اُگل دے۔ اگرچہ مجھے اب بھی اس معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ کرنل ہوش میں آیا اور اُٹھ بیٹھا۔ اب اس کے چہرے سے تکلیف اور نقاہت کے آثار نظر آرہے تھے۔

''کرنل مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''اسے چھوڑو، میں تمہیں راستے میں سب بتا دوں گا۔'' فتح خان جلدی سے بولا۔ ''مجھے سب معلوم ہے۔''

''تم خاموش بیٹھو۔'' میں غرایا اور پھر کرنل کی طرف دیکھا۔ ''کرنل یہ کیا چکر ہے، تم وہاں کیسے پہنچے اور ہمیں کیوں اُٹھا لائے؟''

وہ کچھ دیر فتح خان کو معنی خیز نظروں سے گھورتا رہا اور وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اوکے، تب مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیوں اُٹھا لائے تھے؟''

اس بار اس نے بلا جھجک جواب دیا۔ ''میرا انڈین سے دوبارہ معاہدہ ہوگیا تھا۔''

''گویا تم مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنے لائے تھے۔'' میں نے غور کیا۔ ''کیا اسی جگہ مجھے ان کے حوالے کیا جانا تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہاں نہیں لیکن یہاں سے کچھ دور ان کا ایک فیلڈ یونٹ تمہیں لینے آتا۔ آدھی رات کے وقت۔''

ابھی دوپہر کا ایک بج رہا تھا یعنی خاصا وقت تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں لینے آتا؟''

''میں اس جگہ کے نام سے واقف نہیں ہوں، لیکن تمہیں چل کر دکھا سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کرنل تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ بھارتی مجھے پیدل کیسے لے جا سکتے ہیں، اس طرف بہت اونچے پہاڑ ہیں؟''

''تم نے ٹھیک کہا لیکن اب وہ بار بار سرحد کی فضائی خلاف ورزی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے اب تمہیں زمینی راستے سے افغانستان میں موجود ایک بھارتی قونصلیٹ لے جایا جائے گا اور وہاں سے بھارت روانہ کر دیا جائے گا۔''

''کیا یہ سب بھارتیوں نے بتایا ہے؟''

''نہیں میرے اپنے ذرائع ہیں۔ اس خطے میں بھارتیوں کے انٹیلی جنس یونٹ موجود ہیں۔''

اب کرنل کی بات قابلِ غور تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''آدھی رات ہی کیوں تم نے ابھی مجھے حوالے کیوں نہیں کیا؟''

''مجھے اس سے بھی نمٹنا تھا۔'' کرنل نے فتح خان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس لیے میں نے انہیں آدھی رات کا وقت دیا۔''

''فتح خان سے نمٹ کر تم مجھے لے جا کر بھارتیوں کے حوالے کر دیتے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، اس کے بعد میری ذمّے داری ختم ہو جاتی۔''

''جیسے پہلے ہوگئی تھی۔'' میں نے طنز کیا۔ ''اگر میں ایک بار پھر بھاگ جاتا تو تم تیسری بار معاہدہ کرتے یا ہول سیل میں معاہدہ کر لیتے ہر بار پکڑنے کے اتنے ہوں گے، اس بار کتنے لیے؟''

''دو ملین ڈالرز۔'' اس نے بے ساختہ بتا دیا۔

''کیش یا بینک اکاؤنٹ میں گئے ہوں گے؟''

''بنک اکاؤنٹ میں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ مجھے ڈرافٹ دیتے جب میں انہیں تمہارے حوالے کرتا۔''

''ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں آج رات تک...'' میں نے کہا۔

فتح خان بے چین ہوگیا۔ ''شہباز خان، یہ تم کس چکر میں پڑ گیا ہے لعنت بھیجو اس پر چلو ادھر سے....''

''فتح خان، بھارتی میرے لیے بے چین ہو رہے ہیں اور میں بھی ان کو اپنی بے چینی دکھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس معاملے میں مت بولو اور ہاں، میں تمہیں آزاد کردوں گا۔''

فتح خان چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب میں تمہیں نہیں بلکہ کرنل کو لے کر جارہا ہوں۔''

''تم مجھے یہاں چھوڑ جاؤ گے؟''

''یہاں تو یہ آغا صاحب رہیں گے۔'' میں نے بے ہوش آغا کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں میں سڑک پر کسی ایسی جگہ اُتار دوں گا جہاں سے تم کسی آبادی تک جاسکو۔''

''اس موسم میں....'' وہ ہچکچایا۔

اس کی طرف توجہ دیے بغیر میں نے کرنل سے کہا۔ ''تم مجھے وہاں لے چلو گے، جہاں بھارتی مجھے لینے آئیں گے۔''

''میں لے چلوں گا لیکن یہ بہت رسکی کام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں لینے کے لیے آنے والے تربیت یافتہ لوگ ہیں، ان پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا۔''

''مجھے آسان کام کرنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ اب تو چند دن کوئی مشکل کام نہ کروں تو ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا تو کرنل پریشان نظر آنے لگا۔

''دیکھو اس میں میرے لیے رسک بہت زیادہ ہے۔ انڈین میرے دشمن ہو جائیں گے؟''

''یہ تو اچھی بات ہے میرے دو دشمن آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں۔''

''دیکھو مجھے مت لے کر جاؤ۔'' کرنل نے کس قدر عاجزی سے کہا۔ ''میں تمہیں جگہ بتا دیتا ہوں تم خود چلے جاؤ۔''

''میں تمہیں لے کر کیوں نہ جاؤں؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ ''میرے لیے یہ زیادہ آسان کام ہے۔''

کرنل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ واضح طور پر بھارتیوں کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ان کے لیے کام کرتا تھا اور اگر بھارتی یہ سمجھتے کہ میں نے کرنل کی مدد سے انہیں نقصان پہنچایا ہے تو وہ اس کے بھی دشمن ہو جاتے۔ بزنس تو بھاڑ میں جاتا خود کرنل کو بھی جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''شہباز، میں تمہیں اس جگہ نہیں لے جاسکتا۔''

میں نے شارٹ گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ ''تب میں تمہیں یہیں گولی مار کر نہ چھوڑ جاؤں۔ میرا کم سے کم ایک دشمن کم ہوگا۔''

میرے لہجے سے اسے لگا کہ میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوں تو اس نے جلدی سے کہا۔ ''ایک منٹ رکو میں تمہیں ایک ایسی بات بتا سکتا ہوں جو تمہارے لیے بہت اہم ہے لیکن تم اس بارے میں نہیں جانتے۔''

''کرنل۔'' فتح خان نے دانت پیس کر کہا۔ ''اپنی زبان بند رکھ کتے۔''

''کون سی بات ہے کرنل، جو میرے لیے اہم ہے اور مجھے ہی اس کے بارے میں معلوم نہیں ہے؟''

''کرنل اگر تم نے اس معاملے میں زبان کھولا تو بھول رہا ہے مہرو میرا نظر میں ہے۔''

کرنل نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تم جھوٹ کہہ رہے ہو مہرو وہاں سے جاچکی ہے۔''

''ہاں، لیکن میرا ایک آدمی مسلسل اس کے پیچھے ہے۔'' فتح خان بولا۔ ''جیسے تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے اسی طرح میں بھی تم پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔ مجھے معلوم تھا تم کبھی نہ کبھی کتا پن کرے گا۔ اس لیے میں نے پہلے سے بندوبست کر رکھا تھا۔''

میں نے دیکھا کرنل کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے یعنی اس نے فتح خان کی بات کو غلط نہیں سمجھا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی نظر نہ آنے والی

کشمکش جاری تھی جس کے سر پیر کا فی الحال مجھے پتا نہیں تھا اور بقول ان دونوں کے وہ مجھ سے متعلق تھی۔ مگر میرے ذہن میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرنل نے مجھے یہی بتانے کی دھمکی دی تھی اور فتح خان نے جوابی دھمکی دے کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ''آخر ایسی کیا بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو؟''

''شہباز خان، اگر تم میرے ساتھ وہ کرے جو اس کرنل نے کہا تھا تب بھی میں نہیں بتائے گا۔'' فتح خان نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اگر پستول کی پندرہ عدد گولیاں اس کے جسم میں اُتار دوں تب بھی وہ مجھے وہ بات نہیں بتائے گا۔ اب تک میں کسی نامعلوم بات کے چکر میں پڑنے کے بجائے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس چکر سے جان چھڑاؤں۔ مگر اب مجھے تجسس لاحق ہوگیا تھا کہ آخر فتح خان کس معاملے کو مجھ سے چھپانے کے لیے اتنے جتن کر رہا ہے۔ وہ اسے چھپانے کے لیے مرنے کو بھی تیار تھا۔ دوسرے اس معاملے میں کرنل بھی ملوث تھا۔ مہرو کے بارے میں میرا شبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ اس خانہ بدوش قبیلے میں میں نے جس عورت کی جھلک دیکھی تھی وہ مہرو ہی تھی۔ وہ وہاں کیا کر رہی تھی اور اب کہاں تھی؟ کچھ دیر بعد میں نے زیادہ غور و فکر کو بے سود قرار دیا اور حالات حاضرہ کی طرف توجہ ضروری سمجھی۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ''کرنل کے شانے کی مرہم پٹی کردو۔''

''مجھے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کرنل غرایا۔

''مجھے بھی تمہیں ہاتھ لگانے کا شوق نہیں ہے۔'' فتح خان نے جوابی غراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس صورت میں تمہیں ایسے ہی سفر کرنا ہوگا۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''راستے میں ہونے والی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑے گی۔''

میں نے چارپائی کے نیچے سے اسلحے کا تمام ایمونیشن نکال لیا۔ ایک سے زیادہ پستول اور شارٹ گن میرے لیے بیکار تھیں۔ البتہ دوسرا پستول مختلف کلیبر کا تھا اس لیے میں نے رکھ لیا۔ ان کے میگزین اور گولیاں جیکٹ کی مختلف جیبوں میں ڈال لی تھیں۔ میرے اصرار پر کرنل نے کپڑے کی پٹی کی سلنگ بنا کر اپنا ناکارہ ہاتھ لٹکا لیا تھا۔ فتح خان کے لیے میں نے چارپائی کی ایک پٹی نکال دی اس وارننگ کے ساتھ کہ وہ اسے میرے اوپر آزمانے کی حماقت نہ کرے۔ روانہ ہوتے ہوئے میں نے آغا کے پاؤں کھول دیے تھے البتہ ہاتھ بندھے رہنے دیے تھے۔ وہ یہاں سے نکلتا تو کہیں نہ کہیں پہنچ جاتا جہاں اس کی جان بچ جاتی۔ ہم وین تک آئے میں نے عقبی دروازہ کھولتے ہوئے فتح خان اور کرنل کو اندر جانے کا حکم دیا۔ ''خیال رہے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ دوسرے کو میں مار دوں گا۔''

دراصل مجھے فتح خان کی فکر تھی۔ کرنل نے دیکھ لیا تھا کہ میں اسے لے جا رہا تھا گویا فتح خان میرے لیے غیر ضروری تھا۔ کرنل کا بازو زخمی تھا اس کے باوجود وہ زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ فتح خان کمزور نہیں تھا لیکن وہ کرنل کی طرح مضبوط اور تربیت یافتہ نہیں تھا۔ کرنل کو قتل کرنے کی پیشہ ورانہ تربیت دی گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ مار کر فتح خان کی زندگی ختم کرسکتا تھا۔ اس خیال نے مجھے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا اور میں نے فتح خان کو باہر آنے کا اشارہ کیا تو کرنل کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی یقیناً اس کے دل میں فتح خان کے لیے اچھے عزائم نہیں تھے۔ فتح خان نیچے اُترا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور اس سے کہا۔ ''تم میرے ساتھ سفر کرو گے۔''

''اس عنایت کی وجہ؟'' اس نے کسی قدر زہریلے انداز میں کہا۔

''میرا خیال تھا کہ کرنل تمہیں فوت کرنے کی کوشش کرے گا۔'' میں نے اسے وین میں فرنٹ سیٹ پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے میں وین کی اندر سے تلاشی لے چکا تھا کہ اس میں کہیں کوئی ہتھیار تو نہیں رکھا ہے۔ ''تم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔''

''کرنل کیا جنرل بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا......'' اس نے دعویٰ کیا۔

''فتح خان جب موت آتی ہے تو چیونٹی بھی وجہ بن جاتی ہے بہرحال، میں نہیں چاہتا کہ ابھی تم مارے جاؤ۔'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وین اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ ''میں تمہیں کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں گا جہاں سے تم مدد لے سکو۔''

''تم مجھے اس کوٹھی تک پہنچا سکتا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں جانا رسکی ہوگا، اب تک پولیس آچکی ہوگی۔''

''تب تم مجھے اس کے آس پاس اُتار دو۔''

اس بار میں نے صاف کہا۔ ''فتح خان میں تمہیں کسی

ایسی جگہ نہیں اُتار سکتا جہاں تم میرے لیے خطرہ بن جاؤ میں تمہیں کسی آبادی کے پاس اُتاروں گا جہاں سے تمہیں اپنے کسی ٹھکانے تک پہنچنے میں کچھ وقت لگے۔ اس سے زیادہ کی امید مت رکھو۔"

اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ "شہباز خان، تم بہت چالاک ہو گیا ہے۔"

وہ مجھے اب مستقل شہباز خان کہنے لگا تھا اور میں نے تھک ہار کر اسے ٹوکنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاؤں سے خون رسنا بند ہو گیا تھا لیکن اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ یہ سارا علاقہ میرے لیے اجنبی تھا۔ مگر میں فتح خان کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ مجھے رہنمائی کے بہانے گمراہ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں پورے اعتماد سے ڈرائیو کرتا رہا۔ ہم جہاں سے گزر رہے تھے، یہ ویران اور غیر آباد علاقہ تھا جہاں جنگل تھے اور ان میں کہیں کہیں چرواہوں کی گرمائی بستیاں تھیں لیکن فی الحال، یہ بستیاں خالی پڑی تھیں۔ چرواہے اپنے جانور لے کر اپریل کے شروع میں اس طرف آتے۔ کچھ دیر بعد فتح خان نے پوچھا۔ "تم مجھے کہاں لے جارہا ہے؟"

"میں نے بتایا نا تمہیں کسی آبادی کے آس پاس چھوڑ دوں گا جہاں سے تمہیں مدد مل جائے گی۔"

اس کا زخم ٹھنڈا ہو کر اب زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ وہ سیٹ سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے سڑک کے کنارے ایک آبادی نظر آئی۔ یہ آبادی اسی قسم کی تھی جو پہاڑوں پر سڑکوں کے کنارے کسی ضرورت کے تحت وجود میں آجاتی ہیں۔ میں نے وین ذرا دور روک دی۔ "فتح خان یہاں سے تم کو مدد مل جائے گی۔"

اس نے تشویش سے دیکھا۔ "یہ تو بہت چھوٹی سی آبادی ہے۔"

"اس چھوٹی سی آبادی میں بھی انسان رہتے ہیں۔" میں نے کہا اور دروازہ کھولتے ہوئے اچانک اسے باہر دھکا دے دیا۔ فتح خان اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا، وہ سڑک پر جا گرا اور زخم کی تکلیف سے چلّا اُٹھا تھا۔ وہ صرف چلّایا نہیں تھا اس نے اور بھی بہت کچھ فرمایا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ میری طرف سے تمہاری تمام حرکتوں کا بہت چھوٹا سا جواب ہے۔ لیکن فتح خان یہ آخری موقع ہے۔ میرے ساتھی فیصلہ کر چکے ہیں کہ روز روز کے تماشوں سے بہتر ہے تمہارا ایک ہی بار خاتمہ کر دیا جائے تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ مجھ سے اور میرے معاملات سے دور رہو۔ ورنہ موت اس تمہارا مقدر بنے گی۔"

"فتح خان کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا......" اس نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"کیوں کیا تم نے اپنی زندگی موت کا اختیار بھی حاصل کر لیا ہے۔" میں نے اسے گھورا۔ "فتح خان [illegible] بول مت بولو اور میں بتا رہا ہوں اب اگر میرے معاملات میں تمہاری طرف سے مداخلت ہوئی تو تمہیں کوئی [illegible] نہیں ملے گی۔"

میں نے دروازہ بند کر کے وین گھمائی اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چل پڑا۔ کچھ دور جا کر میں نے [illegible] میں موجود نقشے کا بہ غور معائنہ کیا اور جان گیا کہ میں اس [illegible] کہاں تھا۔ یہ جگہ سوات کے شمال مغرب میں کہیں تھی [illegible] سڑکوں سے واضح تھا کہ اب مجھے کہاں جانا تھا۔ میں [illegible] طرف نہیں جانا چاہتا تھا جس طرف سے آیا تھا۔ ممکن [illegible] وہاں فتح خان یا کرنل کے آدمی گھوم رہے ہوں اور ان [illegible] لیے یہ وین جانی پہچانی تھی۔ صبح کا ناشتا اگرچہ تگڑا تھا [illegible] ہضم ہو چکا تھا اور اس موسم میں بھوک ویسے بھی زیادہ [illegible] ہے۔ میں نے وین ایک ذیلی سڑک کی طرف [illegible] دی۔ یہاں میں ممکنہ دشمنوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا [illegible] اور کوئی چھوٹی موٹی آبادی مل جاتی تو کھانے کا انتظام بھی [illegible] جاتا۔ مجھے کرنل کی فکر نہیں تھی۔ اگر مرہم پٹی کا سامان مل [illegible] تو میں اس کی ڈریسنگ کر دیتا ورنہ ایسے بھی گزارا چل [illegible] وہ مرتا نہیں۔

ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک مجھے دائیں طرف بلندی پر ایک کوٹھی دکھائی دی۔ یہ پتھروں اور لکڑی سے بڑی خوب صورت اور عالی شان قسم کی کوٹھی تھی۔ اس [illegible] جانے کا راستہ ذرا آگے آیا۔ یہ کھردرے پہاڑی [illegible] سے بنا راستہ تھا اس قسم کی ڈھلان کے لیے ایسے ہی موزوں تھے، ورنہ چکنے پتھروں پر چڑھنے والی گاڑی [illegible] ٹائر پھسل سکتے تھے۔ میں نے بلا تکلف وین اس راستے [illegible] دی۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو میں معذرت کر کے مدد طلب [illegible] سکتا تھا اور کوئی بالکل ہی غیر مہذب نکلتا تو میں واپس بھی [illegible] سکتا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مجھے یہاں [illegible] مدد مل جائے گی۔ کوٹھی کا کوئی گیٹ نہیں تھا۔ ذرا اوپر [illegible] ایک خوب صورت محراب سے راستہ گزرا جس کے بعد [illegible] لان اور باغ تھا۔ سردی کی وجہ سے فی الحال اس کی [illegible] ماند پڑی ہوئی تھی لیکن اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ بہار میں یہاں کیا غضب کی دلکشی پائی جاتی ہوگی۔ کوٹھی کسی قدر مقامی اور جدید طرزِ تعمیر کا ملا جلا امتزاج تھی۔ جیسے ہی وین محراب سے اندر داخل ہوئی اور اس کے انجن کا شور اندر پہنچا عمارت کا داخلی دروازہ کھلا اور ایک کسی قدر طویل قامت اور صحت مند بوڑھا شخص باہر آیا۔ اس نے گاؤن پہن رکھا تھا اور اپنے حلیے اور انداز سے اس کوٹھی کا مالک لگ رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً وین پورچ سے پہلے روک دی اور نیچے اُتر آیا شارٹ گن میں نے اندر ہی چھوڑ دی تھی۔

"ویل ینگ مین ہو آر یو؟" اس نے کھرے انداز میں پوچھا اس کے بولنے کا انداز کسی آرمی آفیسر جیسا تھا۔

"میرا نام شہباز ملک ہے سر اور میں مدد کی امید لے کر اس کوٹھی میں بلا اجازت داخل ہوا ہوں۔" میں نے نپے تلے انداز میں کہا۔ "مجھے امید ہے آپ میری اس حرکت کو معاف فرمائیں گے۔"

اس کے پتھر جیسے سخت چہرے پر مسکراہٹ کی ننھی سی کونپل پھوٹی وہ بولا تو اس بار اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔ "ول تم نے وضاحت کر کے خود کو مصیبت میں پڑنے سے بچا لیا ہے۔"

اس کا ایک ہاتھ مستقل گاؤن کی جیب میں تھا اور شاید اس میں کوئی ہتھیار پوشیدہ تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ "سر میں ویسے ہی بہت بڑی مشکل میں پڑا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں آپ کے لیے کسی مشکل کا باعث نہیں ہوں گا۔"

"اندر آؤ یہاں سردی بہت ہے۔"

"میرے ساتھ ایک شخص ہے اس کے شانے میں گولی لگی ہے اور اسے طبّی امداد کی ضرورت ہے۔" میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس شخص سے ممکنہ حد تک سچ بولوں گا بغیر کوئی فالتو بات کیے۔ اس ویرانے میں اس کی مدد نعمت غیر متوقع ثابت ہوئی تھی۔

"تب ایک منٹ رکو میں شاکر کو بھیجتا ہوں وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

وہ اندر غائب ہو گیا اور جب تک شاکر آتا میں نے وین کا خانہ کھول کر کرنل کو اپنے میزبان کے بارے میں بتایا۔ "موصوف شکاری ہیں اور برفانی لومڑیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ کسی اناڑی کی گولی نے تمہیں زخمی کر دیا۔ تمہارا نام عبدالرحمٰن ہوگا۔ میں نے تمہارا اصل نام بتایا ہے۔ کوئی فالتو بات یا حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس نے سر ہلایا۔ اس کا تمتماتا چہرہ بتا رہا تھا کہ گولی کا زہر اثر کر رہا تھا۔ اسے بخار ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھ گئی تھی۔ شاکر عمر میں تقریباً ہمارے میزبان جتنا تھا مگر صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ صورت اور لہجے سے وہ بھی شہر کا لگتا تھا۔ اس نے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"نہیں صاحب، میں تو چالیس سال سے صاحب کا اردلی ہوں۔" اس نے تصدیق کر دی کہ ہمارا میزبان آرمی آفیسر ہی تھا اور یقیناً ریٹائر ہو گیا تھا۔ شاکر نے میری مدد کے بغیر ہی کرنل کو سہارا دے کر نیچے اُتارا لیکن نیچے آ کر وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اس نے مزید سہارا لینے سے انکار کر دیا۔

"میں خود چلوں گا۔"

شاکر ہمیں کوٹھی کے اندر لایا۔ گیسٹ ہاؤس سامنے والے حصے میں تھا۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لایا۔ اس نے کرنل کی جیکٹ اُتاری اور اس وقت کرنل کو صحیح معنوں میں چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ بازو مستقل ایک ہی پوزیشن میں رہنے کی وجہ سے اکڑ گیا تھا۔ اس کی کراہیں نکل گئی تھیں۔ شاکر نے میری طرف دیکھا۔ "آپ آرام کریں میں انہیں صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں۔"

"صاحب کیا کریں گے؟"

"کچھ نہ کچھ کریں گے وہ فوج میں رہ چکے ہیں۔" شاکر نے کہا۔ وہ کرنل کو لے جانے لگا تو میں بھی ساتھ چل پڑا۔ شاکر رک گیا اس نے ہچکچا کر کہا۔ "صاحب نے صرف ان کے لیے کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن مجھے تمہارے صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس شخص کے بارے میں۔"

شاکر نے سوچا اور پھر ہمیں وہیں رکنے کا کہہ کر چلا گیا کرنل مسکرایا۔ "تم مجھ پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"کیا مجھے اعتماد کرنا چاہیے؟" میں نے اس سے سوال کیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ شاکر کچھ دیر بعد آیا اس نے مجھ سے کہا۔ "صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے کرنل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

شاکر نے اچانک اپنے لباس سے ایک چھوٹا سا آٹو میٹک نکال لیا۔ "آپ اطمینان سے جائیں یہ کوئی حرکت نہیں

کرے گا دائیں طرف دوسرا دروازہ ہے۔"

شاکر کا صاحب ایک چھوٹی سی اسٹڈی میں میرا منتظر تھا اس نے بلا تمہید کہا۔ "مسٹر ملک یہ کیا چکر ہے؟"

"سر پہلے تو میں آپ کا نام جاننا چاہوں گا۔"

"ریٹائرڈ کرنل ضیاالدین۔" اس نے جواب دیا۔

"کرنل کیا میں آپ پر اعتماد کر سکتا ہوں۔"

"وائے ناٹ۔" اس نے میز پر رکھا سگار اُٹھا کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"یہ شخص جس کا نام کرنل زریسکی یا عبدالرحمن ہے۔ سابق سوویت فوج کا کرنل ہے اور آج کل کرائے کا فوجی بنا ہوا ہے۔"

کرنل ضیاالدین نے سر ہلایا۔ "بہت سارے سابق روسی فوجیوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے لیکن یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"یہاں یہ ایک مقامی جرائم پیشہ شخص فتح خان کے لیے کام کر رہا ہے۔ فتح خان کے مراسم وسط ایشیا میں جرائم پیشہ گروہوں سے ہیں۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ میرا دشمن بن گیا ہے۔ کرنل اس کا آدمی ہے۔ میں اسے پکڑ کر لے آیا ہوں۔"

"اگر یہ مجرم ہے تو تم نے اسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

"یہ پولیس کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسرے مجھے اس سے کچھ حساب برابر کرنا ہے۔"

"دشمنی کا معاملہ ہے؟"

"ویسی دشمنی نہیں جس میں آدمی دشمن کا وجود مٹانے پر تُل جاتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں اسے ساتھ لیے کیوں پھر رہا ہوتا۔ مار کر کسی جنگل میں نہ پھینک دیتا۔"

کرنل کچھ دیر سوچتا رہا۔ اسے کوئی مسئلہ یا خوف نہیں تھا بلکہ وہ میرٹ پر فیصلہ کر رہا تھا کہ میری مدد کی جائے یا نہیں بالآخر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے نوجوان تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"اس کا علاج اگر ہو سکے تو اور آج رات تک آپ کی چھت تلے پناہ چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے شاکر کے ساتھ اسے یہاں بھیج دو فوج میں ہمیں فرسٹ ایڈ اور چھوٹی موٹی سرجری کا کورس بھی کرایا جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں سامان میرے پاس سارا ہے۔" اس نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ "میرا خیال ہے تم تھکے ہوئے ہو اور بھوکے بھی ہو۔"

"جی کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"ٹھیک ہے شاکر کو اس کے ساتھ بھیج دو۔"

"کرنل وہ خطرناک آدمی ہے اگرچہ زخمی ہے اور ... ہے لیکن پھر....."

"تم فکر مت کرو۔" ریٹائرڈ کرنل کا لہجہ ... ہوگیا۔ "میں ایس ایس جی گروپ میں ہوتا تھا۔"

میں کمرے میں آیا اور شاکر کو کرنل کی طلبی سے آگاہ کیا۔ وہ کرنل کو لے کر چلا گیا۔ میں نے پہلے باتھ روم میں جھانکا۔ یہ آراستہ اور شاندار قسم کا باتھ روم تھا جس میں صفائی ستھرائی کے تمام تر لوازمات موجود تھے۔ گرم پانی آ رہا تھا اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر غسل کرنے کا فیصلہ کیا۔ دس منٹ میں میل کچیل کے ساتھ میری ساری تھکن بھی دور ہو گئی تھی اور مجھے بے پناہ سکون ملا تھا۔ صاف ستھرا ہو کر میرا یہ گندے کپڑے پہننے کو دل نہیں چاہ رہا لیکن میرے پاس اور کپڑے موجود نہیں تھے ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ میری مشکل شاکر نے آسان کر دی۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے ذرا سا کھول کر دیکھا۔

"آپ کے لیے کھانے کی کچھ چیزیں لایا ہوں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔"

مجھے شرم آ رہی تھی لیکن میں نے دل کڑا کر کے درخواست کر دی۔ "شاکر کیا کوئی صاف سوٹ مل سکتا ہے شلوار قمیص یا پینٹ شرٹ؟"

"کیوں نہیں صاحب، اگر آپ نے اپنے کپڑے دھلوانے ہیں تو وہ بھی مجھے دے دیں۔"

اس نے مجھے ایک استعمال شدہ اونی ٹراؤزر اور ایک موٹی جرسی لا دی کوٹھی کے اندر کی حد تک یہ لباس کافی تھا۔ میرے میلے کپڑے اور جوتے موزے لے گیا۔ اس نے کہا کہ دو گھنٹے میں یہ صاف ہو کر مل جائیں گے۔ ایک طرف سیٹر صوفہ اور اس کے آگے چھوٹی شیشے کی ٹاپ والی میز تھی اس پر ایک ٹرے میں رول سموسے، چنے کی چاٹ اور ... بھلے رکھے تھے۔ یہ سب نعمتیں یہاں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا اور جب میں پوری ٹرے صاف کر چکا تھا تب بھی میرا شک برقرار تھا۔ اِدھر میں نے ٹرے صاف کی اور اُدھر شاکر کسی جن کی طرح کافی لے آیا۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "اللہ ...

خوش رکھے دوست اس وقت میں کچھ اور مانگتا تو شاید وہ بھی مل جاتا مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ کافی کی خواہش کرے اور اللہ اسے چائے بھجوا دے۔" میں نے کہا اور پہلا سِپ لیا طبیعت نیس کیف کی مہک سے تر و تازہ ہو گئی تھی میں نے کھانے کی چیزوں کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گیا۔

"یہ سب میں نے خود بنایا ہے صاحب۔"

"شاکر میں نے کہیں بھی یہ تینوں چیزیں اتنے مزے کی نہیں کھائی ہیں۔"

"ارے نہیں صاحب۔" اس نے انکساری سے کہا۔ "میں تو بس ٹھیک بنا لیتا ہوں۔"

"اس کا کیا ہوا؟" میرا اشارہ کرنل زریسکی کی طرف تھا۔

"صاحب نے گولی نکال کر پٹی کر دی ہے۔ ابھی اسے نیند کا انجکشن دے کر سلایا ہوا ہے۔ رات تک وہ بہتر... ہو جائے گا۔"

"اس کا خون بھی بہت نکلا ہے۔"

"اسے طاقت کا انجکشن بھی دیا ہے۔" شاکر نے بتایا۔ "ویسے مضبوط آدمی ہے اس کے لیے یہ معمولی زخم ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر یہاں رابطے کا کوئی ذریعہ تھا تو میں عبداللہ کو اطلاع دے سکتا تھا لیکن پوچھنے پر شاکر نے بتایا کہ کوٹھی میں فون ہے لیکن لائن پچھلے تین دن سے مردہ ہے اس موسم میں یہ خرابی آئے دن ہوتی تھی۔ میں مایوس ہو گیا تھا۔ کسی ہنگامی حالت میں وہ فون کرنے کے لیے کوئی دس کلومیٹر دور ایک قصبے تک جاتے تھے۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے اور میں نے سوچا کہ کچھ دیر سو جاؤں میں نے شاکر سے کہا۔ "مجھے نو بجے اٹھا دینا۔"

اس کے بعد جو میں سویا تو شاکر نے باقاعدہ ہلا کر مجھے اُٹھایا۔ "جناب نو بج گئے ہیں اور صاحب کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ سات بجے شام کو کھانا کھا لیتے ہیں۔"

میں عجلت میں منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ہال میں پہنچا تو کرنل ضیاالدین میز پر موجود تھے، میں نے تاخیر پر معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرائے۔ "ہم تو نوجوانی میں بھی ایسی نیند نہیں سوئے۔"

کھانے میں بھیڑ کے گوشت کا پلاؤ تھا اور شامی کباب تھے، خمیری نان کے ساتھ بکرے کا بھنا گوشت تھا۔ لیکن کرنل نے بہت تھوڑا سا کھایا تھا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے زیادہ ہی کھلا دیا تھا۔ کھانا بھی لذیذ تھا اور میں زیادہ ہی کھا گیا۔ آخر میں میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا لیکن اس نے کہا۔ "میرے پاس اس کا علاج بھی ہے۔"

کھانے کے بعد شاکر نے خاص قسم کا قہوہ پیش کیا جس سے بڑی عجیب سی مہک اُٹھ رہی تھی۔ لیکن اس نے کام دکھایا اور قہوہ ختم ہوتے ہوتے پیٹ کی گرانی بھی ختم ہو گئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے معمول سے بھی کم کھایا ہے۔ "کرنل صاحب میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے واقعی میری مدد کی ہے۔"

"ایک زخمی آدمی کی معمولی سی دیکھ بھال اور دو وقت کا کھانا کوئی مدد تو نہیں ہوتی۔"

"بات مرہم پٹی یا دو وقت کے کھانے کی نہیں ہے بات اس ضرورت کی ہے جو صرف آپ نے پوری کی ہے اور ہمیں یہاں کہیں سے ایسی مدد نہیں مل سکتی تھی۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میرا قیدی کس حالت میں ہے؟"

"اس کا بخار اُتر گیا ہے اور زخم کی تکلیف بھی قابلِ برداشت ہو گی۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے سفر کر سکتا ہے اس کے بعد اس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو جائے گی۔"

"بس چند گھنٹوں کا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد میں اسے آزاد کر دوں گا۔"

کرنل عبدالرحمن ہوش میں تھا اور سچ مچ بہتر حالت میں تھا۔ کرنل ضیاالدین نے گولی نکال کر اچھی طرح پٹی کی تھی۔ جدید قسم کی سلنگ سے اس کا بازو اس طرح لٹکا دیا تھا کہ اسے چلنے پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے میں دشواری نہ ہو۔ کرنل ضیاالدین سے مل کر اور اجازت لے کر جب میں کرنل کو لیے باہر آیا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ کوٹھی سے نکل کر میں نے وین کا رُخ واپس اسی طرف موڑا جہاں سے ہم آئے تھے۔ عین ممکن تھا وہاں دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں لیکن یہ خطرہ مجھے روکنے کے لیے ناکافی تھا۔ راستے میں کرنل نے بھی ممکن حد تک مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں بھڑوں کا چھتا چھیڑنے جا رہا ہوں اور مجھے بھارتیوں سے پنگا لینے سے گریز کرنا چاہیے۔

"تم بھول رہے وہ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

''اگر کوئی زہریلا سانپ یا آدم خور شیر تمہارے پیچھے لگ جائے تو بھاگو گے یا اس سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرو گے۔''

''عام آدمی ہوگا تو اس کے لیے بھاگنے میں ہی عافیت ہے لیکن تم جانتے ہو میں عام آدمی نہیں ہوں۔ میں دشمن سے چھپ نہیں سکتا اور سکون سے بیٹھ بھی نہیں سکتا.... اس لیے اگر کوئی دشمن سامنے آئے تو کیوں نہ میں اس کا پھن کچل دوں۔ صرف اس بنیاد پر پیچھے ہٹ جانا میرا طریقہ نہیں ہے کہ دشمن کی دشمنی میں شدت نہ آجائے۔''

کرنل مایوس ہوگیا۔ ''تم نہیں مانو گے۔''

''بالکل نہیں اس لیے اس معاملے میں شٹ اپ۔'' میں نے کہا۔ ''دوسری کوئی بات کرو مثلاً یہ کہ بھارتیوں سے تمہاری اتنی ہوا کیوں خراب ہو رہی ہے جب کہ ایک طرح سے تم ان کے آقاؤں میں سے ہو۔''

''ہم کبھی تھے۔'' کرنل نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہیں نہیں معلوم انہوں نے آقا تبدیل کر لیے ہیں۔''

''اس کے باوجود تم لوگ بھی ان سے پُرانے تعلقات پوری طرح نبھا رہے ہو۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''آج بھی روسی اسلحے کا سب سے بڑا خریدار بھارت ہے۔''

''میں اب فری لانسر ہوں اور ان لوگوں کو جواب دہ ہوں، جو میری خدمات حاصل کرتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے تم ان کو جواب دینے کی زحمت سے بچ جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''یا تو وہ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے یا پھر میں مارا جاؤں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر وہ مارے گئے تب بھی مجھ سے پوچھا جائے گا۔ کیونکہ تمہیں ان کے حوالے کرنا میری ذمّے داری ہے۔''

''تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے حوالے کر دیا تھا اب آگے کیا ہوا اور میں کس طرح نکل گیا تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''ایک دفعہ میں عذر کر کے بچ گیا تھا لیکن دوسری بار وہ مشکوک ہو جائیں گے۔''

''ہوتے دو تمہاری بلا سے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''بھاڑ میں جائیں بھارتی اور تم....''

نصف گھنٹے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک سے کچھ فاصلے پر وہ جھونپڑی تھی جس میں مجھے اور فتح خان کو لایا گیا تھا۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ''اب یہاں سے تم میری رہنمائی کرو گے۔''

''اور اگر میں نہ کروں تو....؟''

میں نے پستول نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''اس صورت میں، میں تمہاری لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا فیصلے کے لیے تمہارے پاس ایک منٹ ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا وہ سمجھ گیا کہ میں وہی کروں گا جو کہہ رہا ہوں۔ ''میں تیار ہوں۔''

میں نے پستول ہٹا لیا۔ ''اب بتاؤ کہاں چلنا ہے؟''

''اسی سڑک پر آگے جانا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''پھر دائیں طرف ایک کچی سڑک پر مڑنا ہے۔''

''کچی سڑک یہاں سے کتنی دور ہوگی؟''

''تقریباً دو کلومیٹر۔''

''اس کے بعد کتنا جانا ہے؟''

''دو کلومیٹر اور جانا ہے۔''

میں نے وین آگے بڑھا دی۔ ''بھارتی کب تک وہاں پہنچیں گے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں تم کو لے کر مجھے بارہ بجے وہاں پہنچنا تھا۔'' اس نے بتایا۔ میں نے اس کچی سڑک سے پہلے ہی وین ایک جگہ دیکھ کر سڑک سے اُتار لی اور جھاڑیوں میں گھسا دی۔ کرنل چونکا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''خاموش رہو۔'' میں غرّایا۔

وین یہیں روک کر میں کرنل کے ساتھ نیچے اُتر آیا۔ کچھ اور جھاڑیاں ڈالنے سے وین مکمل طور پر کیموفلاج ہوگئی تھی۔ کرنل خاموشی سے ایک طرف کھڑا یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس طرح اس مقام تک نہیں پہنچنا چاہتا تھا جیسے کرنل مجھے لے جاتا۔ میں بھارتیوں کی بے خبری میں وہاں تک جانا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ کیا میرا اس طرح جانا حماقت تو نہیں ہے۔ پتا نہیں بھارتیوں نے پہلی ہزیمت کے بعد مجھے وہاں لے جانے کے لیے کیا انتظامات کر رکھے ہوں؟ اس بار وہ مجھے زمینی راستے سے لے جاتے اور اس میں زیادہ محتاط رہنا پڑتا۔ مگر پھر میں نے احتیاط کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ مجھے پہلے بھی اللہ پر بھروسا تھا اور اب بھی میں اسی کے بھروسے پُرانے دشمنوں سے نمٹنے جا رہا تھا جو صرف میرے نہیں میرے ملک کے بھی دشمن تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تم چند کلومیٹرز کا سفر پیدل کر سکتے ہو اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ کسی قسم کی دھوکا دہی کی صورت میں میرا اوّلین نشانہ تم ہو گے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں کوئی حماقت نہیں کروں گا۔''

ہم نے سڑک پر پیدل مارچ شروع کی تو کرنل نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''شہباز تم حماقت کر رہے ہو وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم مجھے بتانے کی زحمت نہ کرو ابھی کل تک تم بھی بہت خطرناک تھے اور اب تم ایک بے بس قیدی ہو۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے غالباً خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

دس منٹ بعد ہم اس کچے راستے تک پہنچ گئے تھے لیکن یہاں سے میں نے اس پر سفر کرنے کے بجائے ذرا آگے نکل کر درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان چلنے کو ترجیح دی تھی۔ اگر کوئی اس راستے کی نگرانی کر رہا تھا تو اسے ہماری آمد کا علم نہیں ہوتا لیکن میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا۔ وہ لوگ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں نگرانی کے دس طریقے آتے تھے جس طرح میں نے متبادل راستہ اختیار کیا تھا اسی طرح وہ بھی سوچ سکتے تھے اور اس متبادل راستے کی نگرانی کر سکتے تھے۔ مگر مفروضہ خطرے کی بنیاد پر میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم اس جگہ کے قریب تھے جہاں... بہ قول کرنل کے میری حوالگی عمل میں آنا تھی۔ جیسے ہی کرنل نے اس جگہ کی نشان دہی کی میں نے وہ کیا جو سوچا ہوا تھا۔ میں نے پستول کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ زمین پر لڑھکنے لگا۔ میں نے اسے تھام کر آرام سے نیچے لٹا دیا اور آہستہ سے کہا۔ ''اب تم آرام کرو باقی میں خود دیکھ لوں گا۔''

کرنل کو ایسی جگہ لٹا کر جہاں اسے آسانی سے نہ دیکھا جا سکے میں درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جہاں بھارتیوں کو آنا تھا یا آچکے تھے۔ یہ دو پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا درہ تھا۔ میں زمین پر لیٹ گیا جو برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ آسمان پر چاند موجود تھا اور اس کی ہلکی روشنی میں کھلی جگہیں صاف دکھائی دے رہی تھیں جب کہ درختوں تلے بھی کسی کی حرکت محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس لیے میں نے لیٹ جانا مناسب سمجھا۔ میرے پاس ایک عدد شارٹ گن اور دو عدد پستول تھے لیکن کھلی جگہ دو بدو مقابلے کے لیے یہ تینوں ہتھیار ناکافی تھے۔ ان کے بجائے اگر ایک سیمی آٹو میٹک رائفل ہوتی تو وہ کہیں زیادہ کارآمد ہو سکتی تھی۔ بہرحال، مجھے بھارتیوں سے مقابلہ تو کرنا تھا۔ اگر میں انہیں بے خبری میں نشانہ بناتا تو یہ ہتھیار بھی بُرے نہیں تھے۔

زمین پر لیٹنے سے ٹھنڈ تیزی سے میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ جیکٹ گرم تھی لیکن اتنی گرم نہیں تھی مجھے زمین سے آتی ٹھنڈ سے محفوظ رکھتی۔ مجبوراً میں اٹھا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ یہ پوزیشن بہتر تھی اس میں میرا اوپری جسم زمین سے نہیں لگ رہا تھا البتہ پاؤں ٹھٹھر رہے تھے۔ میں نے شارٹ گن سینے پر رکھی ہوئی تھی اور پستول بائیں ہاتھ میں تھا میں کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وقت سست روی سے گزر رہا تھا شاید ایک بج چکا تھا اور ابھی تک کسی کی آمد کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ اگر بھارتی پہلے سے آگئے تھے اور کہیں چھپے ہوئے انتظار کر رہے تھے تو ان کی استقامت قابلِ تعریف تھی کیونکہ ایک گھنٹے میں میرا بُرا حال ہوگیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر چہل قدمی شروع کر دوں اور اپنے جسم کے اکڑ جانے والے رگ پٹھے کھولوں۔ دو بجے تک میں دل ہی دل میں ان لوگوں کو گالیاں دے رہا تھا جو نہ جانے کہاں مر گئے تھے۔

اچانک کہیں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی پرندہ بولا ہو۔ حالانکہ اس سے پہلے کوئی پرندہ نہیں بول رہا تھا۔ ماحول مکمل طور پر خاموش تھا۔ فوراً ہی کہیں پاس سے دوسرا پرندہ بولا۔ اس کے بعد تیسرے پرندے نے بھی آواز نکالنا ضروری سمجھا۔ اتنے تواتر سے اور سوچ سمجھ کر پرندے آواز نہیں نکالتے ہیں جب تک ان کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ نصف رات کو کوئی مسئلہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پرندے اپنے تمام معمولات دن میں نمٹا لیتے ہیں سوائے الو کے۔ اگر وہ الو کی آواز نکالتے تو شاید میں دھوکا کھا جاتا۔ یہ انسان ہی تھے جو پرندوں کی آوازیں نکال کر پیغام رسانی کر رہے تھے۔ میں چوکنا ہوگیا۔ دشمن کہیں آس پاس ہی تھا وہ ان اشاروں کی مدد سے ایک دوسرے کو پیغام دے رہے تھے۔ کیا انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا یا یہ پوچھ رہے تھے کہ ہمارا مطلوبہ شکار ابھی تک کیوں نہیں آیا ہے؟ میں جہاں بیٹھا تھا وہیں درختوں کے درمیان گھس گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ رات میں نگرانی کرنے کے لیے سب سے

موثر چیز نائٹ ویژن دوربین ہے اور یہ اب عام ملنے لگی ہے تو کیا ان لوگوں کے پاس نہیں ہوگی؟

میں ممکنہ حد تک تنوں کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ نائٹ ویژن اصل میں انفرا ریڈ روشنی کو دیکھ لیتی ہے جو کسی جسم کی حرارت کی وجہ سے خارج ہوتی ہے۔ انسانی جسم درخت یا چٹان سے زیادہ حرارت خارج کرتے ہیں اس لیے وہ الگ سے اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کسی آڑ میں ہونے سے کسی حد تک تحفظ ہو جاتا ہے لیکن طاقتور نائٹ ویژن دیوار کے پیچھے بھی دکھا سکتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ان لوگوں کے پاس نائٹ ویژن نہ ہو ورنہ میں بہت آرام سے نظر آجاتا۔ ویسے مجھے امید کم ہی تھی کہ ان لوگوں کے پاس نائٹ ویژن نہیں ہوگی اگر مجھے پہلے اس چیز کا خیال آجاتا تو میں اس طرح یہاں کا رُخ نہ کرتا بلکہ کچے راستے کے اس حصے پر ان لوگوں کا انتظار کرتا جو پکی سڑک کی طرف جاتا تھا یہاں سے مایوس ہو کر وہ اسی طرف سے کہیں جاتے۔ اس علاقے کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ یہاں آنے جانے کے لیے وہی پکی سڑک استعمال ہوتی ہے کیونکہ آگے تو مزید اونچے اور ناقابلِ گزر قسم کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

جیسے ہی یہ خیال آیا میں نے پیچھے کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ اس خیال پر تو اب بھی عمل کیا جا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے اگر میں اب تک بھارتیوں کی نظر میں آنے سے بچا رہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آگے بھی بچ سکتا ہوں۔ اس لیے میرا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ میں اندازے سے اس مقام تک آیا جہاں کرنل کو چھوڑ کر گیا تھا اور جب میں نے اسے ان درختوں کے درمیان تلاش کیا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ کس وقت ہوش میں آگیا تھا اور موقع پاتے ہی وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے غفلت برتی تھی اسے صرف بے ہوش کر دینا کافی سمجھا تھا اگر میں اسے باندھ کر جاتا تو اس کا باپ بھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کرنل پر لعنت بھیجی وہ اس قابل نہیں تھا کہ یہاں رک کر مجھ پر قابو کی سوچتا اس نے یقیناً موقع ملتے ایسی دوڑ لگائی ہوگی کہ دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا ہوگا۔

میں اب اس جگہ سے دور نکل آیا تھا اس لیے بے دھڑک چل رہا تھا لیکن ساتھ ہی میرے کان عقب پر لگے تھے اگر کوئی میرا پیچھا کرتا تو یقیناً کچھ نہ کچھ آہٹیں تو ہوتیں جیسے میرے چلنے سے ہو رہی تھیں۔ میں چلتے چلتے یک دم رک کر سنتا تھا۔ اگر کوئی پیچھے ہوتا تو وہ اپنی رفتار یک دم نہیں توڑ سکتا تھا اور مجھے اس کی آہٹ مل جاتی لیکن پکی سڑک تک آتے آتے مجھے ایسی کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ سڑک تک آکر میں نے اس مقام کا جائزہ لیا جہاں کچی اور پکی سڑکیں آپس میں مل رہی تھیں اگر بھارتی اسی طرف سے واپسی کا راستہ اختیار کرتے تو میں انہیں روک سکتا تھا۔ صرف روک ہی نہیں سکتا تھا بلکہ جہنم رسید بھی کر سکتا تھا اس مقصد کے لیے میں نے پکی سڑک کے بائیں طرف ایک اونچی جگہ چن لی۔ یہاں دو چٹانوں کے درمیان پیالے نما جگہ قدرتی مورچے کا کام دیتی یہاں سے میں دونوں راستوں پر نظر رکھ سکتا تھا بلکہ حملہ کرنے کے لیے یہ جگہ بھی بہترین تھی۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ابھی صبح ہونے میں خاصا وقت تھا۔ سردی کی شدت بڑھ گئی تھی اور صبح روشنی ہونے تک اس کی شدت برقرار رہتی۔ میں چٹانوں کے درمیان گھس کر بیٹھ گیا۔ اوپر چند گھنے درخت تھے اس لیے چاندنی میں بھی مورچہ تاریک تھا البتہ راستے بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ اچانک کچے راستے کی طرف سے کسی کی حرکت محسوس ہوئی۔ کوئی درختوں کے درمیان چل رہا تھا لیکن وہ تھوڑا سا چلتا اور پھر رک جاتا۔ اس کی موجودگی کا پتا اس کے قدموں کی چاپ نے دیا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا' میں نے نظر جما کر دیکھا اور پھر اسے پہچان لیا وہ کرنل تھا۔ اس کا ایک جھولتا بازو اس کی شناخت تھا۔ پھر وہ خالی ہاتھ تھا جب کہ بھارتی لازمی مسلح ہوتے۔ کرنل ابھی تک یہیں تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ بھاگ نکلا تھا۔ شکر ہے مجھے اندازے کی اس غلطی کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑا اور نہ وہ کہیں ایک عدد ڈنڈا لیے گھات میں ہوتا اور پاس سے گزرتے ہی میرے سر پر رسید کرتا تو اُلٹی ہو جاتیں سب تدبیریں۔

کرنل بہت چالاک تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں یہ خیال ہوگا کہ میں یہیں کہیں آس پاس گھات لگائے بیٹھا ہوں اور جیسے ہی وہ پکی سڑک کی طرف جائے گا میری نظروں میں آجائے گا۔ یہی خیال اسے سڑک پار کرنے سے روک رہا تھا۔ اگر وہ اُلٹی طرف جا کر پکی سڑک پر نکلتا تب بھی اسے وین کی طرف جانے کے لیے اسی سمت سے گزرنا پڑتا اور وہ میری نظروں میں آجاتا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر وہ وین والی سمت گیا تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس علاقے میں یہ وین ہی واحد چیز تھی جو مجھے یہاں سے باہر لے جا سکتی تھی ورنہ اس موسم میں ان پہاڑوں پر بھٹکنے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ بالآخر وہ حرکت میں آیا اور درختوں کے نیچے ہی ڈھلان کے ساتھ ساتھ پکی سڑک کے دوسری طرف جانے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کرنل نے عقل سے کام لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے وین کی طرف جانے کی کوشش کی تو اس کا امکان تھا کہ میری نظروں میں آجائے گا اور میں اسے وین لے جانے کی اجازت نہیں دوں گا اس لیے اس نے متبادل راستہ اختیار کیا۔ وہ الٹی طرف چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں بھارتیوں کی گھات میں ہوں اور اگر میں نے اسے دیکھ بھی لیا تو ہنگامے کے ڈر سے اسے چھیڑنے سے گریز کروں گا۔ وہ جیو اور جینے دو کے فارمولے پر عمل کر رہا تھا۔ میں اس کی توقع پر پورا اُترا اور اسے جانے دیا۔ اس چکر میں تین بج گئے تھے اور اب تک بھارتی دکھائی نہیں دیے تھے۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں بھارتی کسی اور طرف سے تو نہیں آئے تھے اور اب اسی سمت نکل گئے ہوں گے۔ مجھے اس علاقے کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں احمق بن کر یہیں بیٹھا رہ جاتا۔ بہر حال' یہ ایک چانس تھا۔ جو میں نے لیا تھا اگر بھارتی میرے ہاتھ نہیں آتے تو میں بھی کون سا ان کے ہاتھ آگیا تھا اس لیے حساب برابر ہو جاتا۔

چار بجے یک دم ہی آسمان پر بادل چھانے لگے اور یہ خاصے خطرناک قسم کے بادل تھے۔ چاند چھپ گیا اور ماحول تاریک ہو گیا۔ بس ایک ہلکا سا روشنی کا احساس باقی رہ گیا تھا۔ بادلوں کی آمد کے ساتھ ہی ہلکی سرد ہوا چلنے لگی۔ مشکل سے آدھے گھنٹے بعد یہ ہوا قیامت خیز ہو چکی تھی اور آسمان سے برف کے ٹکڑے آڑے ترچھے گر رہے تھے اس لیے یہ براہِ راست آنکھوں اور منہ میں گھسے چلے آرہے تھے۔ یہ ایک نئی آفت تھی جو اچانک ہی نازل ہو گئی تھی۔ اس علاقے میں موسم کی یہ اچانک تبدیلی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر اس نے میرے عزائم کو کمزور کر دیا تھا۔ اُڑتی برف نے ماحول کو تقریباً اندھا کر دیا تھا اور تیز ہوا کے مقابل آنکھیں کھلی رکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ طوفان آنے کے آدھے گھنٹے کے اندر میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اگر میں کچھ دیر یہاں رکتا تو سردی سے اکڑ کر مر جاتا۔ اس طوفان میں کھلی جگہ ایک گھنٹا گزارنا خودکشی کے مترادف ہو سکتا تھا۔ میرے جسم پر کپڑے بھی اتنے گرم نہیں تھے۔

میں اُتر کر نیچے کچے راستے تک آیا۔ اسی لمحے پیچھے سے بجلی سی چمکی میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک گاڑی تھی جو کچے راستے پر اسی طرف چلی آرہی تھی اور روشنی اس کی طاقتور ہیڈ لائٹس کی تھی۔ میں پلٹ کر بھاگا۔ گاڑی مشکل سے سو گز دور تھی اور اس کا امکان بھی تھا کہ اس میں سوار افراد نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ مورچے والی چٹانوں تک جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں دو برابر اگے بڑے تنوں والے درختوں کے پیچھے آگیا۔ ان کے تنے مجھے تحفظ دے سکتے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ آنے والے کون تھے؟ اگر وہ بھارتی تھے تب میں ان کو روکنے کی کوشش کرتا مگر یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ گاڑی میں کون تھا اور میں یہ جانے بغیر فائر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا میرے ہاتھ سے کسی بے گناہ کا خون ہو جاتا اور یہ مجھے گوارہ نہیں تھا۔

ابھی میں اس کشمکش میں تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں کہ وہ گاڑی وہیں آکر رکی جہاں ایک منٹ پہلے میں تھا اور اس کے چاروں دروازے یک دم کھلے اور ان سے بیک وقت چار افراد نیچے اُترے۔ ان میں سے جو دو دوسری طرف تھے انہوں نے وہیں گاڑی کے پیچھے مورچہ سنبھال لیا اور دو اس طرف تھے انہوں نے اوپر ڈھلان کی طرف خودکار رائفلیں تان لیں۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی یہ بھارتی تھے اور میری تلاش میں تھے۔ شامت کے مارے میں خود نیچے پہنچ گیا اور عین اسی وقت گاڑی کی روشنی میں نظر بھی آگیا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا اور وہ مجھے واپس ڈھلان کی طرف جاتے ہوئے بھی تاڑ لیا تھا۔ انہوں نے کمانڈوز والی حکمت عملی اپنائی تھی۔ دو آگے تھے اور دو ان کو پیچھے سے تحفظ دے رہے تھے۔

اگر وہ اوپر آجاتے تو میرے لیے مقابلے کی گنجائش کم ہو جاتی اور اس صورت میں مجھے ہتھیار ڈالنے پڑتے یا مرنا پڑتا۔ دونوں باتیں مجھے منظور نہیں تھیں اس لیے میں نے فوری مقابلے کا فیصلہ کیا اور پہلے ذرا پیچھے اور محتاط انداز میں چلنے والے شخص کا نشانہ لیا۔ تیس گز کے فاصلے سے شارٹ گن کا نشانہ خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دھماکے کے ساتھ ہی شارٹ گن کا رُخ دوسرے شخص کی طرف کر کے گولی چلائی۔ اتنی دیر میں وہ ہوشیار ہو کر ایک درخت کے عقب میں چھلانگ لگا رہا تھا لیکن وہ ہوا میں تھا۔ گولی نے اس کی ٹانگ کو گھٹنے سے ذرا اوپر تقریباً کاٹ دیا تھا۔ اس نے کرب ناک چیخ ماری جو طوفان اور شارٹ گن کے دھماکے میں دب کر رہ گئی تھی۔ دشمن دس سیکنڈ میں اپنی آدھی سپاہ سے

محروم ہوگیا تھا۔
نیچے بیک اپ کے لیے موجود دونوں افراد نے درختوں کی طرف فائرنگ شروع کر دی تھی اور انہوں نے شارٹ گن سے نکلنے والے اولین شعلے سے میری لوکیشن کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس لیے دوسرا فائر میں نے بہت خطرہ مول لے کر کیا تھا۔ میرے آس پاس گولیاں برس رہی تھیں اور میں انہیں نظر انداز کر کے دوسرے کو نشانہ بنا رہا تھا۔ دوسرا شاٹ چلاتے ہی میں تنے کی آڑ میں ہوگیا اور پھر لیٹ کر رینگتا ہوا دوسرے تنے کی آڑ میں چلا گیا۔ اس دوران میرے ہاتھ شارٹ گن کے خالی ہو جانے والے خانوں کو لوڈ کر رہے تھے۔ دوسرا آدمی جو نشانہ بنا تھا وہ ڈھلان پر پڑا چلّا رہا تھا۔ مگر نیچے والوں کو اس کے بجائے میری فکر تھی۔ میں نے دو آدمی مار کر آدھی جنگ جیت لی تھی اور اب وہ جارحیت چھوڑ کر دفاعی پوزیشن پر اُتر آئے تھے۔
ان کے پاس خودکار رائفلیں تھیں اور وہ بے دریغ ان کا استعمال کر رہے تھے۔ گولیاں اتنے تواتر سے تنوں پر برس رہی تھیں کہ مجھے سر نکالنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ ویسے ان کا زیادہ زور اس تنے پر تھا جس کے پیچھے میں نہیں تھا۔ بالآخر ایک کی رائفل کا میگزین ختم ہوا اور وہ اسے تبدیل کرنے لگا۔ دوسرا دوسرے تنے پر فائر کر رہا تھا۔ میں نے شارٹ گن نکال کر جیپ کے بونٹ پر فائر کیا۔ جو ونڈ شیلڈ پر لگا اور وہ بکھر گئی۔ دوسرا فائر میں نے جیپ کے اندر کیا وہ اتنا بوکھلائے کہ نیچے جھک گئے اس لیے اگلا فائر میں نے اطمینان سے کیا اور جیپ کا اگلا پہیہ برسٹ کر دیا۔ اس کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔ دوسرے فائر سے اس طرف کا پچھلا پہیہ بھی اُڑا دیا۔ شاید اس کے پیچھے شخص کو بھی چوٹ آئی تھی کیونکہ اس نے بے ساختہ پنجابی میں گالی دی تھی اور لہجہ لاہوری تھا۔
''سردار اپنی زبان قابو میں رکھو۔'' دوسرے نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔
''وٹا تیرے منہ تے لگدا تے میں پچھدا۔'' سردار نے بلبلا کر کہا۔ شاید گولی زمین سے لگی تو کوئی پتھر اُڑ کر اس کے منہ سے جا لگا تھا۔
''وشال مارا گیا ہے۔'' پہلے نے کہا۔ ''گوتم زخمی ہے۔''
''اپنی فکر کرو۔'' سردار جی غصے سے بولے۔
مجھے حیرت ہوئی کہ بھارتیوں نے پچھلی ہزیمت اور میرے ٹریک ریکارڈ سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ انہوں نے اس بار بھی صرف چار آدمی بھیج دیے تھے۔ ان میں سے دو تو فوراً مارے گئے تھے اور دو ابھی دفاعی پوزیشن میں تھے۔ لیکن وہ مدد کے لیے ایس او ایس دے سکتے تھے۔ میں نے جیپ کے اگلے والے حصے پر مزید کئی فائر کیے کہ اگر اس میں کوئی ریڈیو ہو تو وہ ناکارہ ہو جائے۔ دوسرے وہ جیپ میں گھسنے کی ہمت نہ کریں۔ انہوں نے میگزین ری لوڈ کر لیے تھے اور اب دوبارہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔ لیکن یہ ان کی چالاکی تھی۔ وہ فائر کر کے مجھے دبکے رہنے پر مجبور کر رہے تھے تاکہ میں ان کی اگلی حکمت عملی نہ بھانپ سکوں۔ وہ دستی بم پھینکنے جا رہے تھے۔ مجھے تو اس کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا اور وہ میرے پاس گرا لیکن ڈھلان ہونے کی وجہ سے لڑھکتا ہوا تنوں سے ذرا آگے گیا اور پھر پھٹا۔ وہ مجھ سے مشکل سے چار گز دور ہوگا۔
دھماکے نے میرے کان سن کر دیے تھے اور کچھ دیر مجھے کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ صرف کان ہی نہیں بلکہ اعصاب بھی سن ہو گئے تھے۔ البتہ تنے نے مجھے بم کے اُڑتے ٹکڑوں سے بچا لیا تھا ورنہ میں اُدھڑ کر رہ جاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سن سی کیفیت میں کتنی دیر گزری لیکن اچانک ہی میری چھٹی حس نے چونکایا اور میں نے بے ساختہ پستول نکالتے ہوئے نیچے کی طرف اندھا دھند فائرنگ کی۔ میں نے خود سامنے آنے سے گریز کیا تھا اور میرا مقصد کسی کو نشانہ بنانے سے زیادہ انہیں یہ بتانا تھا کہ میں زندہ ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے نمٹ سکوں۔ دستی بم پھینکتے ہی انہوں نے اوپر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ قدرت ایک بار پھر مجھ پر مہربان ثابت ہوئی۔ میری چلائی ہوئی اندھا دھند گولیاں نشانے پر لگیں ان میں سے سردار جی چلّائے اور اس نے اپنی پنجابی میں بے اختیار کچھ کہا لیکن جو مجھے صاف سنائی نہیں دیا لیکن ظاہر ہے میری مذمت میں تھا۔
دوسرا یقیناً جنوبی ہند سے تعلق رکھتا تھا، اس کا لہجہ بتاتا تھا۔ وہ بدحواسی میں واپس بھاگا اور جب تک میں اُٹھ کر اسے نشانہ بنانے کی کوشش کرتا وہ واپس جیپ کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوبارہ مورچہ سنبھال کر میری طرف کوئی دستی بم ارسال کرتا میں نے موقع غنیمت جان کر جگہ بدل لی اور دوڑ کر ایک اور تنے کے پیچھے چلا آیا۔ ڈھلان پر ابھی تک دستی بم کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور پھر برف کے ذرات اُڑ رہے تھے۔ ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، اس لیے مجھے امید تھی کہ میں نہ تو اسے درخت کے پیچھے جاتا دکھائی دیا ہوں گا اور نہ ہی اس نے میری آہٹ سنی ہوگی۔
تاریکی میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ تیسرا آدمی کہاں گرا تھا اور وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ شروع میں جیپ کی لائٹس آن تھیں اور ان کے انعکاس سے تھوڑا بہت نظر آ رہا تھا لیکن جب میں نے جیپ پر گولیاں برسائیں تو اس کی لائٹس بھی بند ہو گئی تھیں۔ تیسرا بندہ کہاں گرا تھا زندہ تھا یا مر گیا تھا اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ بچنے والا واحد دشمن جیپ کے پیچھے پناہ گزین تھا۔ اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ بھارتیوں نے اپنا قاتل دستہ بھیجا تھا تاکہ مجھے دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔ یہ چاروں افراد اپنے انداز سے تربیت یافتہ قاتل لگ رہے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کا واسطہ مجھ سے پڑ گیا تھا اور مجھے اس قسم کے قاتلوں سے نمٹنے اور انہیں جہنم رسید کرنے کا وسیع تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ انہوں نے برسوں لگا کر جو کچھ تربیت گاہوں میں سیکھا تھا میں نے اس سے زیادہ چند مہینوں میں عملی میدان میں حاصل کر لیا تھا۔
بڑے سائز کی جیپ کے پیچھے اس کا اندازہ کرنا دشوار تھا کہ چوتھا فرد کہاں ہے۔ اسے سامنے لانا بھی مشکل تھا اس لیے میں نے روایتی طریقہ استعمال کیا۔ میں نے ایک عدد پتھر تلاش کیا اور پھر اسے جیپ کی طرف اُچھال دیا۔ ٹن کی آواز کے ساتھ وہ بونٹ پر گرا۔ چوتھے کمانڈو نے بھڑک کر جگہ بدلی اور مجھے اس کا ہیولا سا دکھائی دیا تھا لیکن یہ نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا تھا اس نے فائر کرنے سے گریز کیا۔ میں نے اسی طریقے کو ذرا موثر انداز میں استعمال کرنے کا سوچا۔ ڈھلان پر پتھروں کی کمی نہیں تھی بلکہ کچھ زیادتی تھی اور اکثر پتھر خاصے بڑے تھے جن میں اپنے مطلب کا پتھر تلاش کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ بہرحال میں نے کسی طرح دو درجن کے قریب پتھر جمع کر لیے اور اس کے بعد تیزی سے انہیں جیپ کی پیچھے ارسال کرنے لگا۔ سامنے سے مارنے کے بجائے میں انہیں اس طرح اُچھال رہا تھا وہ اوپر جانے کے بعد وہ سیدھے گریں اسی طرح میں جیپ کے عقب میں چھپے دشمن کو پریشان کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا کہ کوئی پتھر عین اس کے سر پر لینڈ کرے۔ لیکن دو تین پتھر اس کے آس پاس بھی گرتے تو وہ بدحواس ہو سکتا تھا اور کوئی ایسی حرکت کرتا جس سے وہ سامنے آ جاتا۔
میرے عمل کا فوری ردِعمل سامنے آیا۔ اکثر پتھر جیپ پر گرے اور کچھ اس کے پاس گرے۔ ایک اسے لگا بھی تھا کیونکہ اس نے آہستہ سے بے ساختہ شٹ کہا تھا۔ میں نے سن لیا تھا چند پتھر اور اُچھالے تو اس نے اچانک جیپ کے پیچھے سے نکل کر اوپر کی طرف ایک برسٹ مارا۔ اس نے ان ہی دونوں تنوں کا نشانہ لیا جہاں میں پہلے تھا اوپر سے آتے پتھروں سے یہ اندازہ کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ انہیں کہاں سے پھینکا جا رہا ہے۔ وہ جیپ کے بائیں طرف تھے اس لیے وہ جیپ کے دائیں طرف سے نکلا تھا اور اسے خبر نہیں تھی کہ میں اب دائیں طرف تھا اور وہ میرے سامنے ہی تھا۔ لیکن اس نے اتنی پھرتی سے برسٹ مارا اور واپس جیپ کی آڑ میں چلا گیا کہ میں کچھ نہیں کر سکا تھا۔
میں سارے ہی پتھر پھینک چکا تھا اس لیے میں نے دوبارہ پتھر جمع کیے اور اس بار پوری حکمت عملی کو ذہن میں دُہرایا کہ کس موقع پر مجھے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ایک ہی چانس ہوتا اور امکان یہ تھا کہ اس کے بعد مجھے چانس نہیں ملتا۔ فائر کرتے ہی وہ میری پناہ گاہ سے واقف ہو جاتا۔ یہ بڑا لیکن ایک ہی تنا تھا اور مجھے دو تنوں جتنا تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔ اگر وہ بچ جاتا تو ٹرائی ٹرائی اگین کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ دستی بم ارسال کرتا اور مجھے فوت کر دیتا۔ اس بار میں نے زیادہ تیزی سے پتھر اُچھالنے شروع کیے تھے اور اُلٹے ہاتھ سے شارٹ گن بغل کے ساتھ لگائے نشانہ لینے کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا۔ کوئی ایک درجن پتھر اُچھالنے کے بعد مجھے جیپ کے ساتھ حرکت محسوس ہوئی اور میرا دایاں ہاتھ تیزی سے ٹریگر پر آیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا اور اس نے برسٹ مارنا شروع کیا میں نے فائر کر دیا۔ شارٹ گن گرجی اور وہ اُلٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔
میں نہیں جانتا تھا کہ اسے گولی کہاں لگی تھی؟ وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا؟ میں اُٹھ کر تیزی سے ڈھلان کے متوازی بھاگا میں نے نیچے کی طرف جانے سے گریز کیا تھا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر میں کچی سڑک پر اُترا۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران میں دو مرتبہ گرتے گرتے بچا تھا۔ مگر اللہ نے خیر کی ورنہ ہڈی پسلی ایک ہو سکتی تھی اور میں بھی دشمنوں کے ساتھ یہیں لمبا لیٹ جاتا۔ سڑک سے ہوتے ہوئے میں کچے راستے پر آیا اور جیپ کی طرف بڑھا میری نظر بیک وقت ڈھلان اور جیپ کی طرف تھی چوتھا دشمن یقیناً جیپ کے پیچھے تھا اگر وہ بچ گیا تھا تب بھی زخمی ضرور ہوا تھا۔ مجھے ڈھلان پر کوئی سرگرمی نہیں دکھائی دی۔ اس لیے میں دبے قدموں جیپ کی طرف بڑھا۔ تب مجھے پہلی بار آواز سنائی دی۔

"ایم ون.... ڈو یو ریڈمی.... ایم ون...."

بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا وہ شدید تکلیف میں ہے۔ میں نے جیپ کے کنارے سے جھانکا۔ وہ جیپ سے ٹیک لگائے اور دونوں پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر دوسری طرف تھا جہاں سے اسے خدشہ تھا کہ میں نہ آجاؤں لیکن میں مخالف سمت سے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا واکی ٹاکی تھا لیکن اس کی رینج یقیناً اتنی تھی کہ وہ اپنے بیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر موسم کی خرابی آڑے آرہی تھی۔ میں دبے قدموں اس تک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتا میں نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔

"بس اب مزید کوئی حرکت مت کرنا۔"

وہ ساکت ہوگیا۔ میں نے پہلے اس کے ہاتھ سے واکی ٹاکی اُچک لیا اور اسے بند کر کے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا پھر لات مار کر اس کی رائفل کو دور کر دیا۔ اس کے لباس میں کوئی دوسرا ہتھیار ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے زخم کی پروا کیے بغیر اچانک اسے اوندھے منہ لٹا دیا ایک پیر اس کے پشت پر رکھتے ہوئے اس کی اوپر سے لے کر نیچے تک تفصیلی تلاشی لی۔ گولی اس کے دائیں پہلو کو ادھیڑ گئی تھی۔ وہ زخمی تھا لیکن اسے قریب المرگ نہیں کہہ سکتے تھے البتہ جب میں نے اسے لٹایا تو اس نے خاصا شور مچایا تھا اور اپنی مادری بھاشا یعنی اڑم گڑم بگڑم والی زبان میں مجھے گالیاں بھی دی تھیں۔ اس کے پاس سے ایک عدد پستول ایک بڑا خنجر، دو عدد پستول کے میگزین اور دو رائفل کے میگزین برآمد ہوئے۔ میں نے انہیں اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ اسے سیدھا کیا تو وہ یوں جھول رہا تھا جیسے بے ہوش ہونے والا ہو لیکن جب میں نے پستول کی نال اس کے زخم پر رکھ کر دبائی تو وہ چلاّ اُٹھا تھا اور بالکل ہوش میں آگیا۔

"تم کون سی زبان سمجھتے ہو؟" میں نے انگریزی میں پوچھا۔ "یا وہ زبان جو جانور سمجھتے ہیں۔"

"شہباز۔" اس نے انگریزی میں تکلیف زدہ لہجے کے ساتھ کہا۔ "تم بچو گے نہیں ہمارے اور ساتھی بھی ہیں ہم چار کو مار کر تم یہ مت سمجھنا کہ بچ گئے ہو۔"

"مجھے ایسی خوش فہمی کبھی نہیں رہی۔ جب میری موت کا وقت آئے گا تو مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ورنہ تمہاری ساری فوج مل کر بھی مجھے نہیں مار سکے گی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم کسے کال کر رہے تھے؟"

"اپنے ساتھیوں کو۔"

"وہ کہاں ہیں یہاں تمہارا بیس کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم اور یہاں ہمارا کوئی بیس نہیں ہے۔"

میں نے پستول اس کے ٹخنے پر رکھ کر فائر کر دیا۔ اسے مجھ سے اس سلوک کی توقع نہیں تھی اس لیے تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا اور پستول اس کے دوسرے پاؤں کے ٹخنے پر رکھ دیا۔ اس نے سر جیپ کی باڈی پر مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم مجھے مار دو۔"

لیکن جب میں نے اس کے دوسرے ٹخنے میں بھی سوراخ کیا تو اس کی یادداشت بحال ہوگئی اور اس نے رک رک تقریباً روتے ہوئے بتایا کہ وہ اس علاقے میں ملک مقیم کے پاس رکے تھے۔ وہ یہاں ان کا ایجنٹ تھا اور انہیں تمام سہولیات مہیا کرتا تھا۔ وہ سب سرحد پار سے آئے تھے اور افغانستان کے ایک شمالی شہر میں بھارت کے قونصلیٹ سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ یہ بتاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ اس کے مزید کتنے ساتھی یہاں موجود ہیں۔ یہ ہچکچاہٹ گھٹنے پر لگنے والی گولی نے دور کر دی اور اس نے دھاڑیں مار کر روتے اور مجھے کوستے ہوئے بتایا کہ ایسے ہی دو دستے اور بھی ہیں اور وہ کہیں آس پاس موجود ہیں۔ گویا ایک درجن بھارتی کمانڈوز میری خاطر یہاں آئے تھے اور ان میں سے ایک تہائی نرکھ میں جا چکے تھے۔ ایک تہائی یوں کہ میں نے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مزید کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو میں نے اس کے سر میں گولی مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ویسے بھی سخت اذیت میں تھا اور کچھ دیر میں مر جاتا۔

میں نے جیپ کی تلاشی اور اس میں سے ہتھیاروں کے ایمونیشن کے ساتھ کھانے پینے کا سامان اور کچھ ٹارچیں بھی ملی تھیں۔ میں نے ایک ٹارچ روشن کی اور باقی تین کا معائنہ کیا۔ جس کی ٹانگ پر شارٹ گن کی گولی لگی تھی وہ زندہ تھا اور بے ہوش تھا۔ باقی دو مر چکے تھے۔ میں نے بے ہوش کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے صرف پستول اور خنجر نکلا تھا۔ پہلے میں اسے مارنے والا تھا لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اسے کرنل ضیاالدین کے توسط سے خفیہ اداروں کے سپرد کر دوں تو وہ ان سے بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ یہ ارادہ کرتے ہی میں نے پہلے اس کی زخمی ٹانگ پر کس کر اس کے جوتے کا فیتہ باندھ دیا تا کہ خون رک جائے اور پھر فوری طور پروین لینے روانہ ہوگیا۔

راستے میں، میں نے واکی ٹاکی کا جائزہ لیا اسے آن کیا لیکن اس سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ خود میں نے کسی کو پکارنے سے گریز کیا اور اسے دوبارہ آف کر کے رکھ لیا۔ نصف کلومیٹر کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا اور اس جگہ پہنچا جہاں وین چھپائی تھی۔ جھاڑیاں ہٹا کر میں نے وین باہر نکلی اور واپس آیا۔ بے ہوش کمانڈو کو وین کے عقبی حصے میں ڈالا۔ پھر اس کے تین ساتھیوں کی لاشیں اور اسلحہ بھی وین میں ڈالا۔ یہ سب بھی ایک طرح کا ثبوت تھا۔ صرف جیپ وہاں رہ گئی تھی۔ میں نے احتیاطاً اس کا نمبر بھی نوٹ کر لیا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ یہ نمبر نقلی ہوگا۔ روانہ ہونے سے پہلے مجھے ایک خیال آیا۔ وین میں ڈیزل کم رہ گیا تھا اور یہ جیپ بھی ڈیزل والی لگتی تھی۔ مجھے ابھی طویل سفر کرنا تھا اس لیے میں نے وین میں موجود ڈیزل سے بھرے جیری کین وین کے ٹینک میں اُنڈیلے اور جیپ کے ٹینک سے پائپ لگا کر ان جیری کین کو دوبارہ بھر لیا۔ جیپ کا ٹینک خاصا بڑا تھا اور پورا بھرا ہوا تھا۔ وین کا ٹینک اور جیری کین بھر جانے کے بعد بھی جیپ کے ٹینک میں ڈیزل موجود رہا تھا۔

میں نے بچ جانے والے ڈیزل کا متبادل استعمال تلاش کر لیا۔ ایک سوتی رسّی جو جیپ میں موجود تھے پہلے اسے ٹینک میں ڈال کر ڈیزل سے اچھی طرح تر کیا اور پھر اسے کھینچ کر دور تک لایا۔ وین میں بیٹھ کر میں نے اسے لائٹر سے آگ دکھائی اور پھر وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ابھی میں پکی سڑک پر کچھ دور گیا تھا کہ عقب میں دھماکہ ہوا۔ جیپ کا ٹینک پھٹ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ پیچھے سے بھارتی یا ان کے مقامی ایجنٹ پہنچ گئے تو وہ ٹائر برسٹ ہونے کے باوجود جیپ کو لے جا سکتے تھے اس لیے میں نے اسے سرے سے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ خاصی دیر بعد مجھے سکون کا سانس لینے کا موقع ملا تھا اور جب میں نے گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ روشنی ہونے والی تھی۔ مجھے روشنی ہونے سے پہلے کرنل ضیاالدین کی کوٹھی تک پہنچ جانا تھا۔

اس ہلکے برفانی طوفان نے ماحول کو پھر سے سفیدی کی چادر اوڑھا دی تھی۔ ہوا کی شدت میں کمی آگئی تھی اور شاید چند گھنٹوں میں طوفان تھم جاتا۔ مجھے ونڈ اسکرین صاف رکھنے کے لیے وائپر مستقل چلانے پڑ رہے تھے، اس کے باوجود دس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے وین کی رفتار بہت کم رکھی تھی۔ سات بجے برف باری رک گئی اور روشنی بھی بہتر ہوئی تو میں نے رفتار میں اضافہ کیا تھا۔ مگر یہ بھی نارمل رفتار سے آدھی تھی۔ تازہ برف نے سڑک پر پھسلن پیدا کر دی تھی اور تیز رفتاری پر وین بے قابو بھی ہو سکتی تھی کوشش کے باوجود میں روشنی ہونے سے پہلے کرنل ضیاالدین کی کوٹھی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ جب میں وہاں داخل ہوا تو آسمان سے بادل چھٹ رہے تھے اور اوپر دھوپ نظر آنے لگی تھی۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے کرنل... ضیاالدین یقیناً جاگ گیا ہوگا۔

اس بار بھی کرنل خود نمودار ہوا تھا مگر اس نے گاؤن کے بجائے مکمل گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں وین سے اُترا تو وہ پہلے ہی برآمدے کی سیڑھیاں اُتر چکا تھا۔ "ویل شہباز ملک تم پھر آگئے۔"

"کرنل مجبوری تھی...." میں نے معذرت کی تمہید باندھی۔

"نو نو۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے، اس گھر میں تمہیں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ میرا مطلب ہے تم پھر کسی مشکل میں پڑ گئے ہو؟"

"جی جناب۔" میں نے کہا۔ "یہ مشکل پہلے سے کہیں زیادہ بڑی اور بھاری ہے۔"

میں نے اسے وین کا عقبی حصہ کھول کر دکھایا۔ لاشوں اور زخمی کو دیکھتے ہی وہ سنجیدہ ہوگیا۔ "یہ کون ہیں؟"

"ان کے حلیے بتا رہے ہیں کہ یہ کمانڈوز ہیں ویسے ان کا تعلق بھارت سے ہے۔"

کرنل ضیاالدین چونک گیا تھا۔ "بھارت سے؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں، پہلے اس زخمی کو دیکھنا ہے، یہ زندہ رہا تو اس خطے میں بھارتی سرگرمیوں کے بارے میں بہت سے اہم انکشافات کر سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں اس علاقے میں مزید بھارتی گروپ موجود ہیں۔"

کرنل سمجھ گیا تھا، اس نے فوراً شاکر کو طلب کیا اور اسے زخمی کو اندر لے جانے کی ہدایت کی۔ وہ اسے اُٹھا کر لے گیا تھا۔ میں نے کرنل کو اسلحہ بھی دکھایا۔ "میں نہیں جانتا کہ ملک کے خفیہ رکھوالوں سے کس طرح رابطہ کیا جا سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ یہ کیس آرمی انٹیلی جنس یا ایسے ہی کسی ادارے کا ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو میرے ساتھ آؤ۔"

کرنل نے کوٹھی میں طبّی امداد کے لیے ایک چھوٹا سا کمرا بنا رکھا تھا جس میں تمام سہولتیں تھیں۔ اتنی دیر میں شاکر

نے زخمی کے کپڑے اُتار دیے تھے اور اب وہ صرف انڈر ویئر میں تھا۔ کرنل نے پہلے اس کا معائنہ کیا اور تصدیق کی۔ ”یہ ہندو ہے۔“

شارٹ گن کی گولی نے اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے تقریباً کاٹ دی تھی۔ کرنل نے ٹانگ کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”اسے کاٹنا ہوگا لیکن میں یہ کام نہیں کرسکتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، بس اسے اس وقت تک زندہ رہنا چاہیے جب تک یہ یہاں موجود ٹھکانوں اور دوسرے بھارتی تخریب کاروں کے بارے میں معلومات نہیں دیتا۔“

”تم فکر مت کرو، وہ لوگ کسی کو مرنے نہیں دیتے ہیں اور اپنے مطلب کی معلومات وہ آدمی کی کھوپڑی سے نکلوا لیتے ہیں۔“ کرنل ضیاالدین نے کہا۔ اس نے زخم سی کر اوپر سے بینڈیج کر دی پھر اسے چند انجکشن دیے۔ ”تم تھکے ہوئے ہو بہتر ہوگا کچھ دیر آرام کرلو۔“

”کرنل میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں دوسرے میں کسی اتھارٹی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا یوں سمجھ لیں کہ میں نے یہ سارے لوگ آپ کے سپرد کردیے ہیں۔ آگے آپ جانیں۔“

”لیکن نوجوان مجھے معلومات تو درکار ہوں گی۔“

ہم کرنل کی اسٹڈی میں آئے۔ شاکر کافی اور کوکیز لے آیا تھا۔ باقاعدہ ناشتے کے بارے میں اس نے اطلاع دی کہ وہ ٹھیک نو بجے میز پر ہوگا۔ میں نے کافی اور کوکیز سے انصاف کرتے ہوئے کرنل کو بتایا کہ کس طرح ان لوگوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی اور خود مارے گئے۔ اسے تعجب ہوا تھا۔ ”بھارتی تمہارے دشمن کیوں ہورہے ہیں؟“

”کیونکہ وہ اس ملک کے دشمن ہیں اور اس ملک میں بسنے والے ہر محبِ وطن پاکستانی کے دشمن ہیں۔“ میں نے گول مول انداز میں کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کا سدِباب کرنے والے ادارے ان سے بے خبر ہیں۔“

”ایسا مت کہو وہ بالکل بے خبر نہیں ہیں۔“ کرنل نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

”یہ یہاں اپنے مقامی ایجنٹ اور غدار ملک مقیم کے پاس مقیم تھے۔ ایسے ہی کم سے کم آٹھ بھارتی کمانڈوز مزید ہیں جو میری تلاش میں ہیں۔“

کرنل نے میری بات سنی اس نے دوبارہ میرے بارے میں سوال نہیں کیا تھا وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں اس معاملے کو ہینڈل کرلوں گا۔“

”یہاں فون خراب ہے اور رابطے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔“

”شاکر ناشتا تیار کر کے گاڑی میں جائے گا۔ کوئی دس کلومیٹرز دور ایک فوجی چوکی ہے وہاں اطلاع کردے گا۔“

”یہ کام جتنی جلدی ہوجائے اچھا ہے۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”کہیں تاخیر سے دوسرے بھارتی اور غدار فرار نہ ہوجائیں۔“

”میرا خیال ہے انہیں زیادہ مہلت نہیں ملے گی۔“ کرنل نے اعتماد سے کہا۔

مجھے خیال آیا۔ ”تب بہتر ہوگا کہ آپ شاکر کو صرف اطلاع کے لیے مت بھیجیں بلکہ لاشوں اور زخمی کے ساتھ بھیجیں تاکہ آرمی انٹیلی جنس فوری حرکت میں آجائے۔“

”یہ خیال اچھا ہے لیکن اس صورت میں مجھے خود جانا ہوگا۔“ کرنل نے سر ہلایا۔ ”پھر معاملہ شاکر کے بس کا نہیں رہے گا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لاشیں اور زخمی دیکھ کر وہ زیادہ تیزی سے حرکت میں آئیں گے۔ میں نے ناشتا کرلیا ہے۔“

”آپ وین میں لے جائیں کیونکہ لاشوں اور زخمی کو اسلحے سمیت کسی دوسری گاڑی میں منتقل ہونے میں وقت لگے گا یہ وین بھی ان لوگوں کی ہے اور اس کے علاوہ ایک جیپ بھی ہے جسے میں نے آگ لگا کر تباہ کردیا ہے۔“

میں نے کرنل کو تمام ضروری معلومات فراہم کیں۔ اس نے علاقے کے نقشے کی مدد سے سمجھ لیا تھا کہ بھارتیوں کی جیپ کہاں جلی ہوئی موجود تھی۔ میں نے وین کی چابی اس کے سپرد کردی اور وہ فوری طور پر روانہ ہوگیا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس ویرانے میں مجھے کرنل ضیاالدین جیسا مددگار مل گیا تھا۔ اس کے توسط سے میں اپنے ملک کے کام بھی آسکا تھا۔ کرنل کی روانگی کے کچھ دیر بعد شاکر نے ناشتا لگا دیا تھا۔ کافی اور کوکیز نے کسی حد تک میری بھوک مٹا دی تھی اور رہی سہی کسر اس ناشتے نے پوری کردی۔ اب مجھے شدت سے کچھ دیر کی نیند کی خواہش محسوس ہورہی تھی۔

شاکر مجھے گیسٹ روم میں لے آیا جہاں میں کل شام کو بھی رکا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے تھے۔ گرم پانی سے غسل کر کے میں نے وہی کپڑے پہنے اور بستر پر گرا تو پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ اچانک ہی کسی نے مجھے بری طرح جھنجوڑا اور میں نے خطرے کا احساس کرتے ہی اسے دبوچ لیا۔

جھنجوڑنے والا تیز لہجے میں بولا۔ ”شہباز صاحب، یہ میں ہوں۔ جلدی اُٹھیے باہر خطرہ ہے۔“

وہ شاکر تھا میں اُٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر فکر کے آثار تھے میں نے خفگی سے کہا۔ ”شاکر یہ کیا حرکت ہے اگر میں انجانے میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو؟“

”مجبوری ہے جناب۔“ اس نے کہا۔ ”کرنل صاحب کو گئے ہوئے کئی گھنٹے ہوچکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن مجھے اس طرح جھنجوڑ کر اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کوٹھی کے باہر دو گاڑیاں آرکی ہیں اور کم سے کم نصف درجن افراد ان سے نکل کر کوٹھی کے گرد پھیل رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ویسا ہی لباس پہنے ہوئے ہیں جیسا یہاں آنے والے زخمی نے پہنا ہوا تھا۔“

”میرے خدا۔“ میں نے کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں یہاں محفوظ ہوں اور بھارتی یا ان کے مقامی ساتھی اس جگہ میرا سراغ نہیں لگا سکیں گے لیکن اگر شاکر کا بیان درست تھا تو بھارتی یہاں آن پہنچے تھے۔ اُٹھ کر تیزی سے جوتے پہنے اور پھر جیکٹ پہنی۔ شارٹ گن اور پستول لیتے ہوئے میں باہر کی طرف لپکا تھا کہ شاکر نے مجھے روک لیا۔

”اِدھر نہیں میرے ساتھ آئیں۔“

وہ مجھے کوٹھی کے اوپری حصے میں ایک ایسے کمرے میں لایا جس کے چاروں طرف کھڑکیاں تھیں اور شیشوں کے پار سے ہر طرف دیکھا جاسکتا تھا۔ خاص طور سے سامنے کا حصہ واضح تھا۔ لیکن نچلا حصہ اتنا دور تھا کہ خالی آنکھوں سے صاف دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ شاکر نے مجھے ایک عدد دوربین لا دی میں نے دوربین سے دیکھا تو درختوں کے درمیان مجھے ایک آدمی فوراً ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ ایک آڑ میں چھپا ہوا تھا اور اس کی رائفل کی نال صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دو منٹ کے اندر میں ایسے تین عدد مزید مسلح افراد نظر آنے لگے تھے۔ جبکہ شاکر کا کہنا تھا کہ دو گاڑیوں سے کم سے کم چھ افراد اُترے تھے۔ بہرحال وہ چار ہوں یا چھ یا اس سے زیادہ ہوں۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ بھارتیوں کا وہی گروپ تھا جو میری تلاش میں یہاں آیا تھا۔ کسی طرح سے وہ میری بو سونگھتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے شاکر سے پوچھا۔

”کرنل صاحب کو گئے ہوئے کتنی دیر ہوگئی ہے۔“

”چار گھنٹے ہوگئے ہیں اب ایک بج رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”شہباز صاحب یہ کون لوگ ہیں۔“

”اس زخمی کے ساتھی جنہیں میں یہاں لایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ بھارتی ہیں اور میری تلاش میں یہاں آئے ہیں۔“

یک لخت شاکر کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ اس نے جھرجھری لی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ یہ تبدیلی لفظ بھارتی پر آئی تھی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں یہ انڈین ہیں؟“

”سو فیصد۔“ میں نے کہا۔ ”یہ نیک نیت سے نہیں آئے ہیں۔ ایسا کرو تم کہیں چھپ جاؤ میں ان سے نمٹتا ہوں۔“

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے جناب۔“ وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ”خدا نے برسوں بعد میری دعا قبول کی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے دوربین سے معائنہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا دعا کی تھی تم نے....؟“

”میں فوج میں بھرتی کی خواہش لے کر کرنل صاحب کے پاس آیا تھا۔ یہ اکہتر کے بعد کی بات ہے۔ ہر سچے پاکستانی کی طرح میں بھی انڈیا کے خلاف بھرا ہوا تھا۔ کچھ کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔ فوج میں آیا تو کرنل صاحب جو اس وقت لیفٹننٹ تھے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ بعد میں جب بڑے افسر بنے تو اردلی کرلیا پھر کرنل صاحب کے ساتھ ہی عمر گزر گئی تھی۔ پہلے کرنل صاحب ریٹائرڈ ہوئے وہ یہاں آگئے۔ چند سال بعد میں بھی پنشن لے کر ان کے پاس آ گیا۔ فوج میں اٹھائیس برس تک تڑپتا رہا کہ محاذ پر جانے کا موقع ملے لیکن نصیب میں نہیں تھا۔ سیاچن پر جنگ ہوئی۔ میں نے اپنا نام دیا لیکن ایک پاؤں میں معمولی سی کمزوری کی وجہ سے مجھے ریجکٹ کردیا گیا۔“ شاکر موقع کی مناسبت سے جلدی جلدی بتا رہا تھا۔

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ”ٹھیک ہے اب تم کیا کرو گے؟“

”میں ان سے لڑوں گا جی اور ہوسکا تو انہیں مار دوں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم نہیں جانتے یہ پیشہ ور کمانڈوز ہیں۔ تم صرف ایک سپاہی رہے ہو اور وہ بھی زیادہ تر سروس میں۔“

”لیکن میرے اندر جذبہ تو ہے۔“ شاکر نے کہا۔ ”پھر آپ اکیلے کیسے لڑیں گے؟ میں آپ کی طرح تو

نہیں لڑسکتا لیکن آپ کا ساتھ ضرور دے سکتا ہوں۔"

میں نے اس ساٹھ باسٹھ سال کے بوڑھے سپاہی کے لیے دل میں احترام محسوس کیا تھا۔ وہ ریٹائر ہوا تھا لیکن اس کے اندر کا سپاہی ریٹائر نہیں ہوا تھا۔ وہ آج بھی اپنے وطن کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟"

"جی کرنل صاحب کی رائفل ہے۔ وہ میری تحویل میں ہوتی ہے میں یہاں کا گارڈ بھی ہوں۔"

"بس تو رائفل نکال لاؤ جب تک میں طے کرتا ہوں کہ تم نے کیا کرنا ہے۔"

شاکر جوش و جذبے سے روانہ ہوا تھا۔ اس دوران میں سامنے کا سارا حصہ دوربین سے کھنگال لیا تھا۔ یہاں چار بھارتی کمانڈوز تھے باقی یقیناً کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف ہوں گے۔ وہ چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیر رہے تھے تاکہ فرار کی کوئی راہ مسدود نہ رہ جائے۔ اچانک مجھے اپنے پاس موجود واکی ٹاکی کا خیال آیا۔ وہ جیکٹ میں تھا۔ اسے نکال کر میں نے اس کا والیم کم کیا اور پھر اسے آن کر دیا۔ فوراً ہی اس سے آواز اُبھری۔

"ون اور ٹو تم کہاں ہو؟"

"ہم پیچھے پہنچ رہے ہیں۔" ون یا ٹو کی طرف سے جواب آیا۔

"فور اور سکس۔" اسی آدمی نے پوچھا۔

"ہم اپنی پوزیشن پر آگئے ہیں۔"

میں ان کی گفتگو سنتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں شاکر آگیا اور اس نے دلچسپی سے واکی ٹاکی دیکھا۔ "یہ کہاں سے ملا جناب؟"

"انہی لوگوں سے جنہیں میں ساتھ لایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی تک تو یہ پتا چلا ہے کہ باہر چھ سے سات افراد موجود ہیں۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"فی الحال تو تم کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں سے کوٹھی کے عقبی حصے پر نظر رکھ سکو۔ وہ وہاں سے بھی آسکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا اور اگر کوئی کوٹھی میں آنے کی کوشش کرے تب؟"

"تب تم وہی کرنا جو ایک سپاہی اپنی سرزمین پر حملہ کرنے والے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔"

شاکر کے پاس بائیس بور کی کسی قدر پرانی لیکن بہترین رائفل تھی۔ میں نے اسے لے کر دیکھا اور پھر اس سے کہا۔ "یہ مجھے دیدو، تم شارٹ گن لے جاؤ۔ پاس سے جنگ کے لیے یہ بہترین ہتھیار ہے لیکن یاد رکھنا تمہاری اوّلین ترجیح دشمن کو پیچھے سے کوٹھی میں آنے سے روکنا ہے۔ اس لیے بغیر جوش کے بالکل ٹھنڈے دماغ کے ساتھ دفاع کرنا۔"

"یس سر۔" اس نے سلیوٹ مار کر کہا۔ رائفل کی گولیوں کا ڈبا مجھے تھمایا اور شارٹ گن اور اس کی اضافی گولیاں لے کر نیچے کہیں چلا گیا۔ وہ آتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہونے کے تمام دروازے بھی بند کر آیا تھا۔ کرنل کی کوٹھی چھوٹی اور دو منزلہ تھی لیکن ساتھ ہی سب سے اوپر یہ اضافی کمرا بھی تھا اور اس کی ساخت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے خاص طور سے آس پاس کے نظارے کے لیے بنایا گیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر دوربین سے سامنے والوں کا جائزہ لیا وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر انہوں نے کوٹھی کا محاصرہ کرنے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ اس سے مجھے حکمت عملی تیار کرنے کا موقع مل گیا تھا اور میں نے ان کی پوزیشنیں بھی جان لی تھیں۔

اُدھر شاکر عقبی حصے کا کامیاب دفاع کر لیتا تو میں سامنے سے آنے والے حملہ آوروں سے نمٹ سکتا تھا۔ میرے لیے شارٹ گن مسئلہ تھی وہ اتنی دور تک مار نہیں کر سکتی تھی لیکن اس رائفل کی مار خاصی زیادہ تھی۔ شاید وہ اسی لیے اتنی بے فکری سے سامنے پھیل رہے تھے کہ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس دور مار ہتھیار نہیں ہیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ انہیں اس کوٹھی کا پتا کیسے چلا؟ اور دوسرے کرنل نے اگر آرمی کی چوکی تک رسائی حاصل کر لی تھی تو اسے اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔ وہ کہاں تھا؟ ان دونوں سوالوں کے جواب ممکنہ طور پر آپس میں ملے ہوئے تھے۔ کرنل اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا اور ان لوگوں کے ہاتھ آگیا تھا اور انہوں نے اس سے معلوم کر لیا تھا کہ میں اس کی کوٹھی میں موجود تھا۔ اگر کرنل ان کے ہاتھ آگیا تھا تو اس کی سلامتی مشکوک تھی۔

وہ چاروں ابھی تک کوٹھی سے باہر ڈھلان پر واقع جنگل میں تھے اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوں تو میں کارروائی کروں۔ بہ ظاہر ان کی حکمت عملی یہی تھی کہ سامنے سے حملہ کریں لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ انہوں نے دھوکا دیا ہو، انہیں اتنا تو علم ہوگا کہ ان کی پہلی

پارٹی جو میرے لیے روانہ کی گئی تھی ماری گئی تھی اور رابطے کا ذریعہ واکی ٹاکی میرے ہاتھ لگ گیا تھا اس لیے وہ دھوکا دینے کے لیے اسے استعمال کر سکتے تھے۔ میں سامنے کی طرف سے ان کا منتظر رہتا اور وہ پیچھے سے حملہ کر دیتے۔ یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا کہ عقبی سمت سے شارٹ گن کے پے در پے دھماکے ہوئے اور پھر کسی نے مسلسل برسٹ مارا۔ کوئی دردناک آواز میں چلّایا تھا۔ بھارتیوں نے پیچھے سے گھسنے کی کوشش کی تھی اور شاکر نے انہیں روکنے کی۔ پتا نہیں دونوں میں سے کون کامیاب ہوا تھا۔ خودکار ہتھیار یقیناً بھارتیوں کے پاس تھے۔

اس وقت مجھے شدت سے افسوس ہونے لگا کہ میں نے لاشوں کے ساتھ ہتھیار کیوں بھیج دیے۔ وہ کسی اور کے کام نہیں آتے لیکن اس وقت میرے پاس ہوتے تو میں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا۔ اس وقت مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ بھارتی اس جگہ کا سراغ لگا کر یہاں بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ میرے پاس وہی دو ہتھیار تھے جو میں نے کرنل سے حاصل کیے تھے یعنی شارٹ گن اور پستول۔ جیسے ہی عقبی سمت حملہ ہوا۔ سامنے موجود بھارتی کمانڈوز بھی تیزی سے حرکت میں آئے۔ یقیناً انہیں علم تھا کہ کوٹھی میں سوائے دو افراد کے اور کوئی نہیں ہے اور دو افراد انہیں دو سے زیادہ سمتوں سے نہیں روک سکتے تھے وہ چاروں طرف سے حملہ کر سکتے تھے اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

اب وقت ضایع کرنا بے کار تھا میں نے کھڑکی کا شیشہ ہٹایا اور باہر سب سے آگے نظر آنے والے بھارتی کا نشانہ لیا۔ وہ کوئی سو گز دور تھا اور میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی اس کے بائیں شانے میں لگی اور وہ گھوم کر گرا لیکن فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنا بازو جھٹک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے جیکٹ تلے بلٹ پروف پہن رکھا تھا۔ گولی سے اسے دھچکا لگا تھا لیکن زخم نہیں آیا تھا اس بار میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا وہ یقیناً غیر محتاط شخص تھا جب ایک بار اسے گولی لگ چکی تھی تو اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا وہ بدستور سامنے کھڑا رہا اور اسی وجہ سے فوت ہو گیا۔ گولی اس کے سر کے اوپری حصے میں لگی اور وہ گر گیا۔ اس دوران.... نیچے سے اس کمرے کی طرف بیک وقت کئی خودکار رائفلوں نے منہ کھول دیے تھے۔ پہلے ہی حملے میں اس طرف کے سارے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ اب میں آرام سے دیکھ کر ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کئی تھے دو فائر کرتے تھے اور ایک آگے بڑھتا تھا پھر وہ کور دیتا اور پیچھے والے آگے آتے تھے۔ اس طرح وہ نہایت منظم طریقے سے آگے آرہے تھے اور انہوں نے اب تک مجھے دوبارہ فائر کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ کوٹھی کی حد میں داخل ہو چکے تھے اور کسی لمحے بھی اندر آنے والے تھے۔

میں اس طرح اوپر بیٹھ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے فوری فیصلہ کیا اور نیچے اُتر گیا۔ پہلی منزل پر آتے ہی میں نے چلّا کر شاکر کو آواز دی۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں.... پیچھے ہوں۔" اس نے اگرچہ لہجہ سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں سمجھ گیا کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ گراؤنڈ فلور پر پچھلی طرف تھا اور اس نے چھوٹی نشست گاہ میں مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ لیکن اس کا بایاں پہلو خون سے تر ہو رہا تھا میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ کیا ہوا شاکر؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "کچھ نہیں شہباز صاحب سپاہی کو میدان جنگ میں زخم تو لگتے ہیں۔ یہ بھی معمولی سا زخم ہے۔"

لیکن زخم معمولی نہیں تھا دل سے ذرا نیچے دو سوراخ تھے ان سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے میز پوش اتار کر اس کی ایک پٹی پھاڑی اور باقی میز پوش گدی کی طرح بنا کر زخم پر رکھ کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ فی الحال میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔ "شاکر شاید ان لوگوں نے کرنل صاحب کو بھی قابو کر لیا تھا اور ان ہی سے یہاں کا پتا حاصل کیا ہے۔"

اس کا چہرہ مزید زرد ہو گیا تھا۔ "اس کا مطلب ہے کرنل صاحب اب زندہ نہیں ہیں۔"

میں نے اس سے نظریں چرائیں۔ "امکان تو یہی ہے۔"

اس نے سرد آہ بھری۔ "تب شاکر بھی زندہ رہ کر کیا کرے گا؟"

"ایسا مت کہو کرنل کی اپنی زندگی تھی اور تمہاری اپنی...."

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ نہیں جانتے، میں اور کرنل صاحب الگ الگ نہیں ہیں۔"

"پیچھے کیا ہوا؟"

"دو اندر آرہے تھے۔ میں نے دونوں کو گرا دیا۔ ایک فوراً مر گیا تھا لیکن دوسرے نے گرنے سے پہلے...." اس نے بات اُدھوری چھوڑ کر اپنے زخموں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو میں چونک گیا اس میں ایک اسٹک گرنیڈ دبا ہوا تھا۔ اس کی چابی نکال دو تو یہ دھماکے سے پھٹ

جاتا تھا اور یہ خاصا پُرانا لیکن نہایت تباہ کن فوجی ہتھیار تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”اسٹک گرنیڈ۔“ وہ بولا۔ ”اپنی پوری فوجی زندگی میں شاکر نے ایک ہی بار قانون توڑا۔ میں نے یہ گرنیڈ چُرایا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا پھر یہ میرے ساتھ رہا۔ تیس سال سے یہ میرے پاس ہے۔“

مجھے تشویش ہونے لگی۔ ”شاکر تمہارا ارادہ کیا ہے؟“

اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ”شہباز صاحب آپ پیچھے کی طرف سے نکل جاؤ وہ اندر آنے والے ہیں۔“

”تم میرے ساتھ چلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں چل سکوں ویسے بھی میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ آپ جائیں آپ اکیلے آرام سے نکل سکتے ہیں۔ یہ شارٹ گن لے جائیں اب یہ میرے لیے بیکار ہے اور اگر کسی بھارتی کی خودکار رائفل مل جائے تو زیادہ اچھا رہے گا۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن شاکر کا انداز بتا رہا تھا اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں کسی نے برسٹ مار کر داخلی دروازے کا لاک توڑ دیا۔ شاکر نے مجھے دھکا دیا۔ ”جلدی کرو.... نکل جاؤ.... وہ آنے والے ہیں۔“

”میں کس راستے سے جاؤں؟“

”یہ باتھ روم ہے اس کے روشن دان سے نکل سکتے ہو۔“ شاکر نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر دبایا اور پھر تیزی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ اگر بھارتی یہاں آجاتے تو مجھے نکلنے کا موقع بھی مشکل سے ملتا۔ وہ زیادہ تعداد میں تھے اور پوری طرح چوکنا تھے۔ باتھ روم کا روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا اور میں کوشش کرتا تو اس سے نکل سکتا تھا۔ شارٹ گن کا بٹ مار کر روشن دان کا شیشہ توڑ دیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں پہلے اپنا ہتھیار باہر پھینکتا تو نہتا ہو جاتا دشمن آجاتا اور نہایت آرام سے مجھے مار دیتا۔ اگر باہر منتظر ہوتا تو اس کے لیے اور بھی آسانی ہو جاتی۔ ہتھیاروں کے ساتھ میں روشن دان سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اسی لمحے مجھے نشست گاہ کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی۔ یہ بھارتی تھے جو چلّا چلّا کر شاکر سے ہتھیار ڈالنے کو کہہ رہے تھے اور وہ بتا رہا تھا کہ وہ نہتا ہے۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے تیزی سے ٹب میں لیٹتے ہوئے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے اسی لمحے خوفناک دھماکہ ہوا تھا۔

واش روم کی نشست گاہ کے ساتھ والی دیوار اندر گری اور دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ یہ بم کا زہریلا دھواں تھا جس میں ملبے کی دھول مٹی بھی شامل ہوگئی تھی۔ میں نے نشست گاہ میں جھانکا۔ وطن کا سپاہی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وطن کی مٹی میں مل گیا تھا اور اس کے دھوکے میں آنے والے تین بھارتی بُری حالت میں پڑے تھے۔ وہ مر چکے تھے یا مرنے والے تھے۔ نشست گاہ کی عقبی دیوار بھی گر گئی تھی۔ میں نے ایک بھارتی کی خودکار رائفل اُٹھائی اور باہر آگیا کرنل کی بائیس بور کی رائفل میں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔ شاکر کی خواہش پوری ہوگئی۔ وہ ساری عمر ملک کے دشمنوں سے لڑنے کی حسرت کرتا رہا اور اسے آخر میں یہ اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ اکیلے شاکر نے شہادت سے پہلے پانچ بھارتی کمانڈوز کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

میں باہر آتے ہی زمین پر گر گیا اور دیوار کی جڑ کے ساتھ سرکنے لگا۔ مجھے خطرہ تھا کہ باہر کچھ نہ کچھ بھارتی ہوں گے۔ انہوں نے عقبی حصہ کور کرنے کے لیے صرف دو آدمی نہیں بھیجے ہوں گے۔ دیوار کے سوراخ سے دھوئیں کے ساتھ دھول بھی باہر نکل رہی تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ کسی نے مجھے باہر آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ دیوار کے ساتھ گلاب کی سوکھ جانے والی جھاڑیاں لگی تھیں اور آنے والی بہاریں ان پر گلاب آئیں لیکن شاید ان گلابوں کو دیکھنے کے لیے خود کرنل نہ ہو۔ شاکر تو جاچکا تھا۔ میں نے ذہن جھٹکا۔ اس موقع پر جب چاروں طرف جان کے دشمن گھوم رہے ہوں، قنوطی سوچوں میں اُلجھنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

احتیاط بہتر ثابت ہوئی اور مخالف سمت سے ایک بھارتی نمودار ہوا۔ اس کی نظر سوراخ پر تھی اور مجھے اس نے تاخیر سے دیکھا۔ اس سے پہلے وہ میرا نشانہ لیتا میں نے اس کے چہرے کا نشانہ لے کر برسٹ مارا اور اس کا سر تقریباً غائب ہو گیا۔ اس کی سر بریدہ لاش زمین پر گری۔

میری رائفل کا میگزین خالی ہونے والا تھا۔ میں نے دوڑ کر مارے جانے والے کی جیکٹ سے اس کی رائفل کے میگزین نکالے اور پیچھے کی طرف درختوں میں گھس گیا۔ کوٹھی کا باغ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ احاطے کی چھوٹی سی دیوار پھلانگتے ہی مجھے ان دونوں بھارتیوں کی لاشیں دکھائی دیں جو شاکر کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کرنل کا معمولی سا نظر آنے والا بوڑھا ملازم ایسا دلیر ثابت ہوگا۔ میں نے حساب لگایا میری معلومات کے مطابق میرے لیے آنے والے بھارتیوں کی تعداد ایک درجن تھی اور ان میں سے دس مارے گئے تھے۔ باقی دو کو یقیناً اپنی فکر زیادہ ہو گی۔ پھر اتنا دھوم دھڑکا ہو چکا تھا اس لیے آس پاس اس کی خبر پھیلی ہوگی۔ وہ میرے پیچھے آنے کے بجائے بھاگنے کی فکر میں ہوں گے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ وہ آخری آدمی تک اپنے مشن کی تکمیل کی کوشش کر سکتے تھے۔ وہ عام فوجی نہیں تھے بلکہ ایلیٹ فورس کا حصہ تھے۔ ان کے لیے جان سے زیادہ اہم ان کا مشن ہوتا ہے۔ اس لیے میرا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ کرنل اور شاکر دونوں نے اپنی جان قربان کر دی تھی لیکن وہ بھارتی کمانڈو کو آرمی تک پہنچانے میں ناکام رہے تھے۔ مگر انہوں نے بھارتیوں کا مشن بھی کامیاب ہونے نہیں دیا تھا۔ خاص طور سے شاکر کے بارے میں میں کہہ سکتا تھا کہ اللہ کے بعد میری زندگی بچنے کا سبب وہی تھا ورنہ بھارتی مجھے بے خبری میں یا اکیلا پا کر مار چکے ہوتے۔ میں درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ میں زیادہ بڑا چکر کاٹ رہا تھا تاکہ نیچے بھارتی ہوں تب بھی ان سے مڈبھیڑ کا امکان کم سے کم ہو۔ میں کوئی پندرہ منٹ بعد نیچے سڑک پر نکلا اور جیسے ہی سڑک پر نکلا دوسری طرف سے دو عدد آرمی جیپیں نمودار ہوئیں۔ ایک مسلح آدمی کو سڑک پر پا کر ان کے بریک لگ گئے اور پھر مسلح فوجیوں نے باہر کود کر میری طرف اپنی گنیں تان لی تھیں۔ ان میں ایک کیپٹن بھی تھا۔

”خبردار اپنے ہتھیار پھینک دو۔“

میں نے جلدی سے شارٹ گن اور رائفل زمین پر گرا دی اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ دو سپاہیوں نے میری تلاشی لی۔ کیپٹن اور دوسرے فوجی بھی پاس آگئے تھے۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔ ”میرا نام شہباز ملک ہے اور میں کرنل ضیاالدین کا مہمان ہوں۔“

کیپٹن نوجوان تھا لیکن آنکھوں اور چہرے سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ ”تم کرنل کے مہمان ہو۔“ اس نے کہا اور رائفل کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارے پاس بھارتی ساختہ رائفل ہے۔“

”تم بے شک مجھے اپنی تحویل میں رکھو لیکن کرنل کی کوٹھی میں اس وقت بھی کم سے کم دو زندہ بھارتی کمانڈوز موجود ہیں۔“

کیپٹن چونکا۔ ”کچھ مارے بھی گئے ہیں؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”کم سے کم چھ مارے گئے ہیں اور افسوس ناک خبر یہ ہے کہ کرنل کا اردلی شاکر شہید ہو گیا ہے۔“

کیپٹن کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میری بات پر کسی قدر یقین آگیا تھا لیکن اس نے میرے ہاتھ پشت پر بندھوا کر ایک جیپ میں سوار کر دیا تھا۔ میرے اوپر ایک سپاہی لگا کر باقی پارٹی کرنل کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ پوری طرح مسلح اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ مجھے پوچھنے کا موقع نہیں ملا کہ آرمی کو کیسے پتا چلا کہ کرنل کی کوٹھی میں کچھ ہوا ہے۔ یہ سوال میں نے سپاہی سے کیا۔ اس نے مجھے گھرک دیا۔

”چپ کر کے بیٹھو۔“

”بھائی میں بھی پاکستانی ہوں آج ہی پانچ انڈین میرے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ میں کرنل ضیاالدین کا مہمان بھی ہوں۔“

میرے یہ کارنامے سن کر سپاہی کسی قدر نرم پڑ گیا اس نے کہا۔ ”کرنل صاحب زخمی حالت میں چوکی تک پہنچے تھے؟“

”کرنل صاحب زندہ ہیں۔“ میں نے خوشی سے کہا۔ ”ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ اکیلے اور پیدل تھے بہت زخمی تھے ہمت کر کے کسی طرح چوکی تک پہنچ گئے۔“

یہ سن کر میری خوشی کافور ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ کرنل صاحب زخمی اور مردہ بھارتیوں کو لے کر آرمی چوکی تک پہنچ گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کی راستے میں بھارتیوں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی اور انہوں نے اپنے آدمی واپس حاصل کر لیے تھے۔ جھڑپ میں کرنل صاحب زخمی ہوئے تھے لیکن کسی طرح بچ کر چوکی تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ کیپٹن کے ساتھ کل آٹھ سپاہی تھے جن میں سے ایک میرے ساتھ تھا باقی آٹھ افراد مشکل میں پڑ جاتے اگر کوٹھی میں موجود تمام بھارتی زندہ ہوتے مگر اب کیپٹن کے لیے رسمی کارروائی باقی رہ گئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہاں مزید کمک پہنچ گئی تھی۔ اس بار آنے والے انٹیلی جنس سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ظاہر ہے معاملات میں، میں بھی شامل تھا۔ مجھے جیپ سے اُتار کر ایک بڑی جیپ میں بٹھایا گیا لیکن میرے ہاتھ کھول دیے تھے اس

کا مطلب تھا کہ اب میں مشکوک نہیں رہا تھا لیکن فی الحال مجھے جانے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی تھی۔

بڑی جیپ میں منتقلی کے دس منٹ بعد ایک کسی قدر بھاری جسامت کا شخص اندر آیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”مسٹر شہباز ملک.... تم مجھے میجر آدم کہہ سکتے ہو۔“

وہ سادہ لباس میں تھا اور لازمی بات تھی اس کا نام بھی اصلی نہیں تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا بندہ تھا اور اپنی شناخت ظاہر نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے واقف ہے۔ کم سے کم نام سے زیادہ ہی واقف تھا۔ میں نے پہلا سوال اپنے حیثیت کے بارے میں کیا۔ ”کیا میں سرکاری تحویل میں ہوں؟“

”نہیں دوست تم ہمارے مہمان ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہاری وجہ سے ہم بہت اہم جاسوسوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔“

”یہ جاسوس نہیں انڈین کمانڈوز ہیں۔“ میں نے تصحیح کی۔

”یہ درست ہے، یہ تمہیں مارنے آئے تھے؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”بھارتی حکومت میرے درپے ہو رہی ہے۔“

میجر آدم کے پاس میرے لیے یقیناً بہت سارے سوالات تھے لیکن ابھی ہم باہر تھے اور اسے بہت سارے معاملات نمٹانا تھے۔ وہ وہاں مصروف ہو گیا اور میں گاڑی میں بیٹھا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شام تیزی سے اُتر رہی تھی۔ مزید آدھے گھنٹے بعد معاملات کو سول حکام کے حوالے کر کے میجر آدم واپس آیا اور ہم لوگ یہاں سے روانہ ہوئے۔ میں کرنل کی حالت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن میجر آدم کو بھی فی الحال کچھ نہیں معلوم تھا اس نے مجھے تسلی دی۔ ”ہیڈ کوارٹر پہنچ کر پتا چل جائے گا۔“

میں نے اسے شاکر کے بارے میں بتایا تو وہ بھی متاثر نظر آنے لگا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ روانگی کے کچھ دیر بعد تاریکی چھانے لگی تھی اور جب ہم ایک پھیلی ہوئی دو منزلہ عمارت تک پہنچے تو رات مسلط ہو چکی تھی۔ یہ شاید کسی آرمی تنصیب کا کوئی حصہ تھا جو انٹیلی جنس والوں کو دیا ہوا تھا۔ مجھے ایک سادہ لیکن صاف ستھرے اور آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اندر درجہ حرارت بھی معتدل تھا۔ مجھے کمرے تک پہنچانے والے نے شائستہ لہجے میں بتا دیا کہ میں قیدی نہیں تھا لیکن مجھے بلا وجہ کمرے سے نکلنے سے گریز کرنا ہوگا کسی بھی ضرورت کے لیے کمرے میں انٹر کام موجود تھا۔ میں ایک بٹن دبا کر بات کر سکتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے کافی طلب کی اور پھر میجر آدم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے بتایا گیا کہ کافی دس منٹ میں آجائے گی اور وہاں میجر آدم نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔

لیکن کافی کے ساتھ میجر خود آ گیا۔ ”تم نے مجھ سے ملاقات کی بات کی تھی۔“

”ہاں مگر یہاں تو کوئی میجر آدم نہیں ہے۔“

”ہم سب آدم ہیں۔“ اس نے شرمندہ ہوئے بغیر فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اور میجر صرف میں ہوں اس لیے میجر آدم ہوں۔“

میں نے کافی کا سِپ لیا۔ ”میجر تم لوگ کتنی دیر میں اپنی تحقیق مکمل کر لو گے اور مجھے جانے کی اجازت مل جائے گی؟“

”اس میں شاید ایک مہینا لگ جائے گا۔“ اس نے کہا تو میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ لیکن وہ مکمل سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”میجر تم سنجیدہ ہو، ہماری پولیس بھی ایک رات میں سب معلوم کر لیتی ہے جسے آگے بھی جواب دینا ہوتا ہے اور تمہیں تو کہیں جواب دہی بھی نہیں کرنی ہوتی ہے۔“

”اسی لیے ہمیں زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”ہم پر ویسے بھی الزام لگانا بہت آسان اور فیشن بن گیا ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”میں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”دیکھو میں نے تمہاری مدد کی ہے۔ بھارتیوں کا یہ گروپ نہ جانے کب سے یہاں سرگرم عمل تھا۔“

”تم نے خود کو بچایا ہے۔“ اس نے چالاکی سے کہا۔

”ہاں، پہلی بار بچایا تھا لیکن دوسری بار میں نے خود پنگا لیا، میں برداشت نہیں کر سکا کہ پاک سرزمین پر بھارتی یوں دندناتے پھریں اور میں جانتے بوجھتے آنکھیں بند کر لوں ورنہ میں اب تک اسلام آباد جا چکا ہوتا۔ تم لوگ اچھا صلہ دے رہے ہو۔“

وہ مستعد ہو گیا۔ ”سوری میں مذاق کر رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ دو زندہ بھارتی لگے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ جاری ہے۔“

”کرنل نے تمہیں ملک مقیم کے بارے میں بتایا ہوگا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اسی کے ڈیرے پر چھاپے سے ہمیں پتا چلا کہ بھارتی کرنل کی کوٹھی کی طرف گئے ہیں وہاں سے ہم نے کئی مقامی غدار پکڑے ہیں۔ اسلحہ اور غیر ملکی کرنسی بھی بڑی مقدار میں نکلی ہے۔“

”میرے خیال میں تمہیں بھارتی روپیا یا ڈالرز کہتے ہوئے ہچکچانا نہیں چاہیے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”ملک کا ہر شخص جانتا ہے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور اس میں کون کون ملوث ہے۔“

میجر آدم نے سرد آہ بھری۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہماری مجبوریاں شدید نوعیت کی ہیں۔ بہر حال، جو ہمارے ہاتھ آجائے ہم اسے چھوڑتے نہیں ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے ملک کے لوگوں کو بہت قربانیاں دینی پڑ رہی ہیں لیکن کوئی ملک قربانی دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔“

”مگر قربانی ہمیشہ نچلے درجے کے لوگوں کی کیوں لی جاتی ہے؟“

”کیونکہ اوپر والے اس قابل نہیں ہیں کہ اللہ ان سے قربانی لے۔“ میجر آدم نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی کہ میں خود کو لاجواب محسوس کرنے لگا۔ اس لیے میں نے بات بدل دی۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”تم آزاد ہو زیادہ سے زیادہ کل صبح تک یہاں سے جا سکو گے۔“

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ”ٹھیک ہے کل صبح ہی سہی لیکن کیا میں یہاں سے اپنے دوستوں کو کال کر سکتا ہوں، وہ میری خیریت کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔“

اس نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے کافی پی لو پھر چلتے ہیں۔“

میری کافی ختم ہونے والی تھی۔ میں نے مگ خالی کر کے تپائی پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ میجر آدم مجھے ایک کمرے میں لایا جو بہ ظاہر کنٹرول روم لگ رہا تھا۔ اس نے ایک فون اٹھا کر مجھ سے نمبر اور نام پوچھا۔ میں نے عبداللہ کا نام اور اس کی کوٹھی کا نمبر بتا دیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور رابطہ ہونے پر عبداللہ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی چند لمحے بعد عبداللہ لائن پر تھا۔ میجر نے اس سے کہا۔ ”مسٹر شہباز ملک تم سے بات کرنا چاہیں گے۔“

اس نے ریسیور ہاتھ سے دبا کر میری طرف دیکھا۔ ”تم یہاں کے معاملات کے بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے۔“

میں نے سر ہلایا تو اس نے ریسیور مجھے دے دیا۔ ”شہباز صاحب۔“ عبداللہ کہہ رہا تھا۔

”عبداللہ۔“ میں نے مشکل سے کہا۔ ”تم کیسے ہو باقی سب کیسے ہیں۔“

”ہم ٹھیک ہیں لیکن آپ کہاں ہیں ہم سب بہت پریشان ہیں وسیم اور ایاز آپ کی تلاش میں ناردرن ایریا جا رہے ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں، یار انہیں روک لو۔ میں انشاءاللہ کل تک پہنچ جاؤں گا۔“

”آپ نے پہلے بھی یہی کہا تھا۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”پہلے دشمنوں کی تحویل میں تھا لیکن اب دوستوں کی تحویل میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو میں کل آجاؤں گا یا دیر ہوئی تب بھی تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

اس دوران میں وسیم بھی آ گیا تھا میں نے اس سے کچھ دیر بات کی اور اسے تسلی دی۔ ڈھکے چھپے انداز میں وہاں کے معاملات کے بارے میں پوچھا تو اس نے گول مول سے انداز میں جواب دیا۔ ”یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے، ہم نے کئی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ آپ آئیں تو آپ کے سامنے رکھتے ہیں لیکن اب آپ کا آنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”میں جلد آؤں گا اور سنو اس لائن سے زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا ہوں، باقی سب کو میری خیریت کی اطلاع کر دینا۔“ میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میجر نے مجھ سے ریسیور لے لیا۔

”تھینکس۔“ اس نے کمرے سے باہر آ کر کہا۔

”کس بات کا؟“

”تم نے وعدے کے مطابق یہاں کے معاملات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یو نو یہاں لائن پر چیک ہوتا ہے اور ہم ایک حد سے زیادہ کال نہیں کر سکتے کیونکہ لائنیں محدود ہیں اور ان پر بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔“

میں نے اب تک میجر آدم کو بھارتیوں کی پہلی کوشش کے بارے میں نہیں بتایا تھا جس میں ایک ہیلی کاپٹر اور دو بھارتی کام آئے تھے ان کی لاشیں اور چوپر کا ملبہ پاکستان کی حدود میں موجود تھا۔ پہلے میرا ارادہ زبان بند رکھنے کا تھا لیکن مجھے خیال آیا کہ بھارتیوں نے اس بارے میں پھوٹ دیا تو میجر آدم کو بجا طور پر شک ہو جائے گا کہ میں نے ان سے یہ

بات کیوں چھپائی؟ ممکن ہے اس سے میری کل صبح روانگی خطرے میں پڑ جائے۔ دوسری طرف بتانے میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ اس بارے میں بھی انکوائری شروع ہو جائے اور مجھے تب تک کے لیے یہاں روک لیا جائے یا معاملہ اوپر کی سطح تک چلا جائے اور معاملات نمٹنے تک میری رہائی ملتوی کردی جائے۔ دوسرا خطرہ ہلکی نوعیت کا تھا اس میں تاخیر ہو سکتی تھی لیکن ان لوگوں کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے میجر آدم کو بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہم کمرے میں واپس آئے تو میجر نے میرے تاثرات سے بھانپ لیا۔

''کیا بات ہے تم پریشان لگ رہے ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ایک بات کا میں نے ابھی تک ذکر نہیں کیا۔''

''بھارتیوں سے متعلق ہے؟''

''ہاں.... انہوں نے مجھے پہلے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے کہا پھر فتح خان اور کرنل کو واضح طور پر درمیان میں لائے بغیر میں نے تمام واقعات سچائی کے ساتھ بیان کردیے تھے۔ میجر غور سے سن رہا تھا۔ اس نے درمیان میں سوالات نہیں کیے تھے لیکن جب میں نے بات مکمل کی تو اس نے سوالات شروع کیے اور تب مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔ اس نے پوچھا کہ میں نے دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود بھارتیوں پر کس طرح سے قابو پالیا میں کرنل زریسکی اور فتح خان کے گٹھ جوڑ اور چالاکی کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا جو انہوں نے مجھے بچانے کے لیے کی تھی۔ فتح خان کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا اور کرنل زریسکی کا ذکر ایک ناواقف شخص کے طور پر کیا تھا جسے میں نے پہلی بار دیکھا ہو لیکن میجر نے میرے بیان میں کمزوری تلاش کر لی تھی اور اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود میں نے دو بھارتیوں پر قابو پالیا تھا۔

میں نے دوبارہ کرنل والے کیبن میں واپسی کی بات بھی گول کر دی تھی ورنہ مجھے اس کے مزید کئی سوالات کا جواب دینا پڑتا۔ میں نے اپنا بیان یہاں تک محدود رکھا تھا کہ جہاں چوپر کریش ہوا وہاں سے میں نے ایک وین چرائی اور بھاگ نکلا مگر راستے میں مجھ سے بھارتی ٹکرا گئے جو میری تلاش میں تھے۔ میں علاقے سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بھٹک رہا تھا اور انہوں نے مجھے گھیر لیا اس کے بعد جو ہوا وہ میں نے جوں کا توں بیان کر دیا تھا۔ اب میجر آدم یقین نہیں کر رہا تھا تو یہ اس کی مرضی تھی۔ میں نے زندہ اور مردہ بھارتی ان کے حوالے کر دیے تھے اور وہ ان سے سچائی اگلوا سکتے تھے۔ بہر حال میں مجرم نہیں تھا جس سے وہ بہر صورت سچائی اگلوانے کا اختیار رکھتا تھا۔

میجر نے میرا بیان ریکارڈ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کمرے میں ہونے والی ہر بات ریکارڈ ہو رہی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد مجھے رات کا کھانا مہیا کر دیا گیا اور یہ اچھے معیار کا لذیذ کھانا تھا جس میں مقدار کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ کھانا کھا کر میں بہت دن بعد بے فکری کی نیند سویا تھا۔ میں نے میجر آدم سے درخواست کی تھی کہ مجھے کرنل ضیاالدین کی حالت سے باخبر کیا جائے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے اس تک ان کے بارے میں کوئی اطلاع آئے گی وہ مجھے بتائے گا۔ کرنل ضیاالدین کو نزدیک ترین سی ایم ایچ منتقل کر دیا گیا تھا۔ اسے پیٹ اور ران پر دو گولیاں لگی تھیں اور وہ اس حالت میں بھی بھارتیوں کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ قابلِ تعریف تھا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ شیر بوڑھا ہونے کے باوجود شیر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جسم کمزور ہوتا ہے لیکن اسے حملہ کرنے کے گر آتے ہیں۔

میں رات نو بجے سویا تھا اور صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا واش روم تھا۔ میں نے گرم پانی کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غسل کیا اور پھر انٹرکام پر کافی اور ناشتا طلب کیا۔ سات بجے میں نے میجر آدم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ابھی دفتر میں نہیں ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ اس کے آتے ہی میری درخواست اس تک پہنچا دی جائے۔ میرے پاس صبر سے انتظار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن اس دن مجھے پتا چلا کہ دشمن کی قید سے زیادہ دوستوں کی تحویل میں وقت گزارنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ جب آپ اپنی مرضی کرنے کے لیے آزاد نہیں ہوتے اور اپنی مرضی بھی کرنا چاہتے ہو۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے اپنی جگہ اٹک کر رہ گئی تھیں آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

میں نے وقت گزاری کے لیے اپنا آزمودہ نسخہ آزمایا۔ دس بجے میں نے ورزش کی اور بارہ بجے دوبارہ کھانا طلب کیا۔ ایک بجے جب میں دفتر میں موجود کسی اور آفیسر سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا تو میجر آدم آ گیا۔ اس

نے آتے ہی معذرت کی۔ ''سوری یار تمہارے چکر میں دیر ہو گئی۔''

''میرے چکر میں....؟'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''میں تو یہاں بندھا بیٹھا ہوں۔''

''بھائی تمہاری رپورٹ بھی تو کرنی تھی۔'' اس نے ملائمت سے کہا۔ ''میں اپنی صوابدید پر تمہیں اپنی تحویل میں لے سکتا ہوں لیکن اپنی صوابدید پر چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کے لیے مجھے اتھارٹیز کے سامنے تمہارا سارا کیس رکھنا پڑا اور کئی گھنٹے تک ان سے سر کھپانا پڑا تب کہیں جا کر تمہاری گلو خلاصی کے آرڈر حاصل کیے۔ ویسے اب مجھے پتا چلا کہ تمہاری تو بہت لمبی چوڑی فائل ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں تمہارے بہت سارے کارنامے درج ہیں۔''

''وہ کارنامے جو پولیس کی ایف آئی آرز میں لکھے گئے ہیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''وہ بھی ہیں لیکن ہماری توجہ کا مرکز وہ کارنامے ہیں جو تم نے انڈیا میں سرانجام دیے تھے اور اس کے بعد تم چین میں بھی رہے ہو۔''

''یہ درست ہے۔''

میجر آدم کچھ سوچنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ ''پچھلے دنوں چینی حکام کی جانب سے پاکستانی حکام کو ایک درخواست موصول ہوئی کہ ان کا ایک نہایت کانفیڈینشل بریف کیس پاکستان میں کہیں موجود ہے اور پاکستانی حکام اس کی تلاش میں ہماری مدد کریں۔''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم پر اس سلسلے میں کوئی الزام نہیں ہے لیکن چینیوں نے ہمیں کچھ تصاویر دی ہیں۔ کچھ افراد بھارت کی طرف سے سرحد عبور کر کے غیر قانونی طور پر چین میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک لڑکی کو چینی حکام کی تحویل میں دیا تھا۔ بعد میں ان افراد کو چین میں ایک اور جگہ منتقل کیا جا رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر بھارت کی طرف سے فائر کیے جانے والے میزائل کا نشانہ بن گیا۔ اس حادثے میں چین کے کئی فوجی اور ٹاپ فوجی آفیشلز مارے گئے۔ لیکن جن افراد کو منتقل کیا جا رہا تھا ان کی لاشیں کہیں نہیں ملی تھیں۔ اسی پرواز میں وہ بریف کیس بھی تھا جو غائب پایا گیا۔ چوپر کے ملبے کے آس پاس اس کا بھی کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔''

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے میں نے دل کڑا کر کے پوچھ لیا۔ ''میجر آدم تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟''

''کیونکہ ہمیں جو تصاویر دی گئی تھیں ان میں سے ایک تصویر تمہاری بھی تھی۔''

''میں کبھی چینی حکام کی تحویل میں نہیں رہا۔'' میں نے فوراً انکار کر دیا۔ ''اس شخص کی صورت مجھ سے ملتی ہوگی۔''

میجر بہ غور مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''میں نے بھی وہ تصویر دیکھی ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ شخص تم سے حیرت انگیز حد تک ملتا ہے لیکن وہ تم نہیں ہو۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''اس اعتماد کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے میں واپس جانے کے لیے بے تاب ہوں۔''

''تم جا سکتے ہو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں کسی ایسے شخص کا پتا اور فون نمبر دینا ہوگا جس کی مدد سے ہم بہ وقت ضرورت تم سے رابطہ کر سکیں۔''

''میں نے جس نمبر پر کال کی تھی اور عبداللہ نامی شخص سے بات کی تھی یہی میرا رابطہ کار ہوگا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

میجر آدم واضح طور پر میرا فیور کر رہا تھا۔ ورنہ یہ بات تو سامنے کی تھی کہ چینی حکام نے جو تصویر دی تھی وہ میری ہی تھی۔ یہ اونچے درجے کے سفارتی معاملات تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ چینی حکام نے کس نوعیت کی درخواست کی تھی اور پاکستانی حکام نے اس پر کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا۔ اگر یہ ردِعمل چینی مطالبے کے مطابق ہوتا تو میری اتنی آسانی سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ شاید کوئی سفارتی ڈیڈ لاک تھا۔ میجر مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''ایک گاڑی تمہیں سوات میں ایک گیسٹ ہاؤس تک پہنچائے گی۔ وہاں تم رات کو قیام کرو گے اور کل صبح یہی گاڑی تمہیں اسلام آباد پہنچا دے گی۔''

''پکڑے جانے والے بھارتیوں کا کیا ہوا؟''

''یہ معاملہ اوپر تک چلا گیا ہے اور ہمیں اس بارے میں علم نہیں ہے۔''

''کرنل کی حالت کیسی ہے؟''

''بہتر ہے، آپریشن کر کے گولیاں نکال دی گئی ہیں۔ اسے صحت یاب ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''اسے شاکر کے بارے میں علم ہے؟''

''ہاں، وہ بہت شور کر رہا تھا اس لیے مجبوراً اسے بتانا پڑا۔''

"مجھے افسوس ہے بہر حال، یہ ایسی بات نہیں تھی کہ کرنل سے چھپائی جا سکتی۔ شاکر شہید ہوا ہے مجھے امید ہے کرنل اس صدمے کو برداشت کر لے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میجر آدم کھڑا ہو گیا۔ "تم نے کھانا کھالیا؟"

"ہاں میں کھا چکا ہوں۔"

ہم باہر آئے، پارکنگ میں ایک چھوٹی دو سیٹوں والی ملٹری جیپ موجود تھی۔ ایک وردی پوش ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔ "یہ ثاقب حسن ہے۔ تم اس میں جاؤ گے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا اگر مجھے خود سے جانا پڑتا تو میں خالی ہاتھ تھا۔ کرنل اور فتح خان سے میں نے صرف اسلحہ لیا تھا اور مالِ غنیمت میں ان دونوں کا مال چھوڑ دیا تھا حالانکہ دونوں کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ ثاقب حسن نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "سر آپ فکر نہ کریں اسلام آباد تک کوئی پریشانی نہیں ہوگی سارا راستہ میرا دیکھا بھالا ہے۔"

"کیا ہم نان اسٹاپ نہیں جا سکتے؟"

"نہیں اسٹاپ طے ہے۔" میجر آدم نے کہا۔ "اسے سوات میں رپورٹ کرنی ہے۔"

"تب ٹھیک ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔

میجر آدم نے مجھے سینے سے لگایا۔ "اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور دشمنوں کے عزائم ناکام بنائے۔"

"تم جیسے پُرخلوص لوگ ہوں اور ان کی دعائیں ہوں تو آدمی کامیاب ہی رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر زندگی رہی اور موقع آیا تو ہم پھر ملیں گے۔"

"انشااللہ۔" اس نے کہا تو میں اچک کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"یہ تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔" میجر آدم نے ایک چھوٹا سا شاپر پکڑا دیا۔ "کھانے کا سامان اور کافی کا تھرماس بھی ساتھ ہے ضرورت پڑے تو ثاقب سے کہہ دینا۔"

"شکریہ دوست۔" میں نے کہا اور شاپر لے لیا۔ میں نے پوچھا نہیں کہ اس میں کیا تھا۔ جب جیپ پارکنگ سے نکل کر سڑک پر آئی تو میں نے سیٹ پیچھے کر لی اور سر ٹکا کر اونگھنے لگا۔ ثاقب اس دشوار پہاڑی علاقے میں بھی اتنی ہموار ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ میں سویا ہوا تھا کہ

ثاقب نے جیپ روک دی۔ ہلکے سے دھچکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ "کیا ہوا ثاقب کیوں رک گئے ہو؟"

"انجن گرم ہو گیا ہے اسے آرام دے رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا اور نیچے اُتر آیا میں بھی نیچے آگیا۔ جیپ سڑک کے کنارے ایک آبشار سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ ثاقب حسن کین لے کر گیا اور اس میں تازہ پانی بھر لایا۔ اس نے ریڈی ایٹر میں سرد پانی ڈالا۔ میں نے آبشار تک جا کر یہ سرد پانی پیا اس کے بعد ثاقب نے ہاٹ پاٹ سے سینڈوچز اور تازہ بیک کیے ہوئے کیک پیس نکالے اور کافی کے ساتھ سرو کیے۔ سردی تھی اور پانی کی قربت میں زیادہ سردی تھی لیکن ہم اسے انجوائے کر رہے تھے۔ سوات کی طرف جاتے ہوئے موسم بہتر ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے ثاقب سے پوچھا۔

"آج تاریخ کیا ہے؟"

اس نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ "تین مارچ ہے سر۔"

گویا مجھے غائب ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ میں سوچ سکتا تھا کہ میرے پیاروں اور چاہنے والوں پر کیا گزری ہوگی میری اس گم شدگی کے دوران۔ میں سوات کے آرمی گیسٹ ہاؤس سے کال کر کے ان لوگوں سے بات کر سکتا تھا۔ کافی نے ہمیں تازہ دم کر دیا تھا اور سرد پانی نے جیپ کے انجن کو ٹھنڈا ٹھار کر دیا تھا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کا سفر مزید تھا۔ سڑک بہت اچھی نہیں تھی لیکن بہت خراب بھی نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ ثاقب حسن بہت اچھا ڈرائیور تھا اور ملٹری جیپ بہترین حالت میں تھی اس لیے اس سفر کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور ساڑھے سات بجے ہم آرمی گیسٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت کے اندر موجود تھے۔ ثاقب حسن نے ریسیپشن پر ایک کاغذ پیش کیا جس کے بعد مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

ایک وردی پوش ویٹر نے مجھے اس صاف ستھرے اور سجے ہوئے کمرے میں پہنچایا جو میرے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈنر ٹائم آٹھ سے دس تک ہوتا ہے اگر میں میس میں نہ کھانا چاہوں تو کمرے میں بھی سرو ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "میں ساڑھے آٹھ بجے کمرے میں کھانا پسند کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ کالز کرنی ہیں۔"

"ایکسٹینشن موجود ہے آپ آپریٹر سے کہہ کر کہیں بھی کال ملوا سکتے ہیں۔" ویٹر نے بتایا اور رخصت ہو گیا۔ مجھے ٹپ نہ دینے کی ندامت محسوس ہوئی۔ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو میں اسے ٹپ میں دیتا اور اس نے بھی ایسا ظاہر نہیں کیا جیسے وہ ٹپ کے انتظار میں تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس شاپر کا خیال آیا جو میجر آدم نے دیا تھا۔ اس میں کوئی کپڑے جیسی چیز تھی میں نے اسے کھولا تو اندر سے ایک نیوی بلو پتلون اور رائل بلو کلر کی فل سلیو جرسی برآمد ہوئی تھی۔ یہ یہاں کے موسم کے لحاظ سے نہیں تھی لیکن اسلام آباد میں یہ یقیناً کام آتی۔ میں نے جرسی اٹھائی تو اس کی تہہ سے ایک چھوٹا سا لفافہ باہر گرا میں نے اسے کھولا تو اندر پانچ ہزار روپے مالیت کے پانچ نوٹ تھے۔ ایک چھوٹا سا نوٹ بھی تھا۔

"ایک دوست اور بھائی کی طرف سے خلوص کے ساتھ۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ اللہ کا احسان تھا کہ اس نے مجھے بنا چاہے اتنے اچھے اور پُرخلوص دوست عطا کیے تھے۔ کمرے میں چھوٹا سا اور سادہ فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے اسے اُٹھا کر صفر دبایا تو فوراً آپریٹر کی آواز آئی۔ "یس مے آئی ہیلپ یو سر۔"

"پلیز مجھے کچھ کالز کرنی ہیں۔"

"فرسٹ نمبر پلیز سر۔"

میں نے اسے پہلا نمبر سویرا کا دیا۔ یہ موبائل نمبر تھا۔ آپریٹر نے کال ملائی اور پھر کمرے میں ٹرانسفر کر دی۔ سویرا نے ہیلو کہا تو میرا دل دھڑ کا تھا۔

"کون بات کر رہا ہے؟"

"بوجھو تو جانیں....." میں نے جان بوجھ کر ذرا بھاری آواز میں کہا۔

"آپ.... آپ شہباز ہیں۔" وہ بے تاب ہو گئی۔

"تم نے پہچان لیا۔"

"ہاں آپ کہاں غائب ہو گئے تھے سب اتنا پریشان تھے۔ میں صبح شام عبداللہ بھائی کو کال کر رہی تھی۔"

"تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا کہ میں مشکل میں پڑ گیا تھا لیکن اب میں آزاد ہوں۔"

"آپ کو دشمن لے گئے تھے؟"

"ہاں فتح خان اور کچھ دوسرے دشمنوں کی قید میں تھا لیکن اللہ کی مہربانی سے اب آزاد ہوں اور اللہ نے چاہا تو کل تک اسلام آباد پہنچ جاؤں گا یہ بتاؤ تم کیسی ہو؟"

یک دم اس کی آواز بھیگ گئی۔ "آپ کے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں۔"

"میری جان..... یہ جدائی بس چند دن....."

"مجھے جھوٹی تسلی نہ دیں، میں صبر سے انتظار کر رہی ہوں، مجھے صبر ہی کرنے دیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے لیکن مجھے پوری امید ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔"

کچھ دیر سویرا سے بات کی پھر ماں جی آگئیں ان سے بات کی۔ بابا کو سلام دینے کو کہا۔ وہ حویلی کے پیچھے والی زمین ہموار کرا رہے تھے اور اسی سلسلے میں باہر تھے۔ پھر میں نے وسیم کا موبائل نمبر ملوایا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہو گیا۔ اس نے شکوہ کیا۔ "آپ نے کہا تھا آج آجائیں گے؟"

"ہاں یار، بس کچھ مسئلے ہو گئے تھے بہر حال، اب میں راستے میں ہوں اور اللہ نے چاہا تو کل تک تم لوگوں کے پاس ہوں گا۔"

"آپ کہاں ہیں.... یہ لائن محفوظ ہے؟"

"میں آرمی گیسٹ ہاؤس سوات میں ہوں اور یہاں کی لائن کے بارے میں تم خود سوچ سکتے ہو کتنی محفوظ ہوگی۔"

وسیم سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات کھل کر نہیں کرنی ہے۔ اس نے گول مول انداز میں کہا۔ "آپ کی عدم موجودگی میں یہاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ایک تو بیوٹی پارلر والی ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔"

میں سمجھ گیا وہ کال گرل ثمینہ کی بات کر رہا تھا جو نادر کے پاس جاتی رہتی تھی۔ "یہ تو اچھی خبر ہے اپنے بنّے میاں کا کیا حال ہے، سنا ہے بے چارے وہیل چیئر پر آگئے ہیں؟"

"ان کے بارے میں بتا رہا تھا ان کے لیے اسپتال میں الگ کمرا حاصل کر لیا ہے آپ آجائیں تو ان کو شفٹ کر دیا جائے۔"

"باقی سب کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے مانی اور بیتو بہت یاد کرتے ہیں اپنے سفیر بھائی نے دونوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔"

"وہ دونوں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے ہیں؟" میں ہنسا۔ "اپنے پیر صاحب اور خان صاحب کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"پیر صاحب کا آپ کو پتا ہے، خان صاحب منظرِ عام سے غائب ہیں، لیکن وہ خان صاحب کی محرم راز خاتون پھر یہیں دیکھی گئی ہیں۔"

وہ شہلا کا ذکر کر رہا تھا۔ ”کس نے دیکھا تھا؟“

”عبداللہ نے..... سگنل پر اتفاق سے دیکھ لیا وہ مخالف لائن میں تھی اس کا سگنل جلد کھل گیا تھا۔ خیر عبداللہ نے گاڑی نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اب اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔“

”وسیم یہ بہت ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کسی بڑے چکر میں ہے اور خان صاحب سے اس کا گٹھ جوڑ بہت آگے جا چکا ہے۔ وہ دونوں مجھ سے کچھ چھپانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔“

”آپ کے آنے تک اس کا سراغ لگ جائے گا۔“ وسیم نے کہا۔

وسیم سے بات کر کے میں نے سفیر کو کال کی۔ اس کا نمبر یاد نہیں تھا اس لیے وسیم سے لے لیا۔ سفیر نے مجھے گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ اب میں واپس آیا تو وہ مونا کو لے کر کہیں غائب ہو جائے گا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو اکیلا جائے گا مونا نہیں جائے گی۔“

وہ مزید بھنا گیا تھا۔ ”ہاں تمہاری چمچی جو ہے۔“

”بیٹے تم نے بہت حرام خوری کر لی ہے تیار ہو جاؤ کام کے لیے کل مابدولت تشریف لا رہے ہیں۔“

”پھر کہیں اچانک غائب ہو جانے کے لیے۔“ اس نے طنز کیا۔

”غائب ہو کر بھی میں کام ہی کرتا ہوں تم کیا کرتے ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”دونوں بچے کہاں ہیں؟“

”کمپیوٹر سے لگے رہتے ہیں۔ مانی نے بیتو کو بھی بہت تیز کر دیا ہے۔ دونوں سارا دن نہ جانے کہاں کہاں سے کھانے کی چیزیں منگاتے ہیں اور اسٹڈی میں بیٹھ کر کھا جاتے ہیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ”بل مجھے ادا کرنا پڑتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں یار بچے ہیں کھائیں پییں گے نہیں تو کیا کریں گے۔“ میں نے کہا۔

سویرا اور دوسرے لوگوں سے بات کر کے مجھے وہ سکون ملا تھا جس سے میں ایک ہفتے سے نا آشنا تھا۔ کمرے میں ٹی وی بھی تھا۔ میں نے مزید وقت گزاری کے لیے ٹی وی آن کر لیا۔ ساڑھے آٹھ بجے وہی ویٹر آیا تھا اس نے کھانے کا آرڈر لیا اور چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا حالانکہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ طویل سفر میں ذرا بھی گرد مٹی نہیں پڑی تھی اور میں سر سے پاؤں تک صاف ستھرا تھا۔ پھر بھی کھانے سے پہلے عادت کے مطابق منہ ہاتھ دھو لیا۔

کھانے کے بعد میں نے چائے منگوائی۔ اس بار جب ویٹر برتن لینے آیا تو میں نے اسے پانچ سو ٹپ پیش کی اور خوش ہو کر گیا تھا۔ میں ٹی وی دیکھتے ہوئے چینل گھما رہا تھا کہ ایک جگہ رک گیا۔ اس انگریزی چینل سے ایشیا کے بارے میں ایک سیاسی تجزیہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اس میں اس خطے میں جاری بڑی طاقتوں کے درمیان گریٹ گیم پر بات ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے اس بریف کیس کا خیال آیا جو میں چین سے ساتھ لایا تھا اور اس میں چین کے فوجی راز تھے لیکن یہ بریف کیس شہلا کے پاس تھا۔ سوچتے ہوئے اچانک ہی ایک خیال نے مجھے اُچھل پڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

خیال یہ تھا کہ کہیں فتح خان اور شہلا اس بریف کیس کے چکر میں تو نہیں تھے اور یہ بات مجھ سے چھپا رہے تھے۔ تبھی فتح خان نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے اس معاملے کا پتا چل گیا تو میں لازمی اس میں ٹانگ اڑاؤں گا اور وہ اس میں میری مداخلت برداشت نہیں کرے گا اور اسی وجہ سے فتح خان زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے مجھے قتل کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ وہ ناکام رہا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچتا جا رہا تھا میرا یقین پختہ ہو رہا تھا کہ معاملہ بریف کیس کا ہی تھا اور فتح خان اس سے بہت بڑا مالی فائدہ اُٹھانے کی فکر میں تھا۔ یقیناً بریف کیس اور اس کے راز نہایت قیمتی تھے۔ چین کی مخالف کوئی بھی قوت اس کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو سکتی تھی۔ فتح خان کو یہ راہ شاید کرنل زریسکی نے سجائی ہو گی وہ خود اسی میدان کا کھلاڑی تھا۔

پھر فتح خان کا بھارتیوں سے گٹھ جوڑ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا وہ بریف کیس کا سودا بھارتیوں سے کر رہا تھا لیکن اس کی کہیں زیادہ قیمت امریکی دے سکتے تھے۔ یہ بات فتح خان بھی سمجھتا تھا لیکن وہ از خود سودا کرنے کا اہل نہیں تھا اس نے کرنل یا پھر ڈیوڈ شا کو آگے کیا ہوگا۔ بریف کیس شہلا کے پاس تھا اور وہ بھی اس سودے میں شامل تھی۔ سوچتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر چینل تبدیل کرتا جا رہا تھا اچانک ایک مقامی نیوز چینل لگ گیا اور اس پر ہیڈ لائن چل رہی تھی۔

”اسلام آباد کے رہائشی علاقے میں ایک کوٹھی میں بم دھماکہ۔“

پھر ٹی وی پر کوٹھی کی تصویر آئی اور میں اُچھل پڑا تھا۔

جاری ہے

بیت بازی

(نوشین، جھنگ کا جواب)

مظفر علی خان..........لاہور
وہ تو کچھ ہو ہی گئی تم سے محبت ورنہ
ہم وہ خود سر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

واصف علی..........مظفر گڑھ
وہ اس کی گفتگو کلیاں چٹکنے کی صدا جیسے
یہ نرمی اس کے لہجے میں ہمارے پیار سے آئی

عصمت جہاں..........لاہور
وہ دن بھی ہو کہ کڑی دوپہر میں آنکھوں کے
اداس دشت میں تجھ کو برہنہ پا دیکھوں

(تحسین فاروقی، احمد پور سیال کا جواب)

سعید احمد چاند..........کراچی
نہ تھی ہم میں اتنی کشش کہ تم کو یاد رہ جاتے
نہیں کوئی شکوہ ہم کو تمہارے بھول جانے کا

ظفر معراج..........لڈن، وہاڑی
نیند آئے تو اچانک تری آہٹ سن لوں
جاگ اٹھوں تو بدن سے تیری خوشبو آئے

(ناصر اسلم، راولپنڈی کا جواب)

محمد نعیم اختر..........ڈی آئی خان
مذہب والوں کو یہ حسرت کب دنیا سے کفر مٹے گا
میں تو بس اتنا سوچ رہا ہوں کب انساں انسان بنے گا

منیر الحسن..........جیکب آباد
مجھے دردِ دل وہاں لے گیا
جہاں در کھلے تھے طلسمات کے

کاشف انیس..........دریا پار بھکر
مجھ سے محبت بھی ہے اس کو لیکن یہ دستور ہے اس کا
غیر سے ملتا ہے ہنس ہنس کر مجھ سے ہی شرماتا ہے

(سعدیہ شکیل، میر پور خاص کا جواب)

محمد سعید قاسمی..........ڈلوال
کتنے موسم تھے جو دے کر مجھے طعنے گزرے
تم تو کہتے تھے کہ اک سال میں آجاؤں گا

ابرار الحق..........لاہور
کنارے پر یہ رونق ریت کی جھنکار سے آئی
کشش رکھتا نہیں اب پھول میرے واسطے کوئی

شمع محسن..........لاڑکانہ
کل ویرانی صحرا کی
آج میرے گھر ہے مہمان

فہیم گلریز خان..........کوٹ ادو
کہاں کا بادباں پتوار کس کے ناخدا کیسا
کہ ہر سیلاب سے گرداب سے ساحل نکلتے ہیں

انجم فراز..........حیدر آباد
کیسی خواہش تھی کہ جی اٹھی ہجوم یاس میں
کیا شعلہ تھا کہ جو برفاب میں زندہ رہا

نثار فاروق..........لاڑکانہ
کس درجہ حسیں تھا مرے ماحول کا غم بھی
میں بھول گیا آپ کا انداز ستم بھی

محسن حسن..........سکھر
کیوں اڑ رہی ہیں وقت کے رخ پر ہوائیاں
کیا کائنات میں کوئی رنگت نہیں رہی

محبوب علی خان..........فیصل آباد
کیا ہوئیں روایتیں اب ہیں کیوں شکایتیں
عشق نامراد سے حسن بے ثبات کو

نصرت جاوید..........چنیوٹ
کبھی کہا کہ یہاں جان جلتی ہے اپنی
تو پوچھتے ہیں بھلا جان کیسے جلتی ہے

(ثمر فیروز، فیصل آباد کا جواب)

اکبر حسین..........کوٹ سیداں
اس سے ملنے سے پہلے میرا کوئی ذوق نہیں تھا
یوں محفلوں میں پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا

نازش ممتاز..........سرگودھا
انہیں اس دور میں دعویٰ ہے مسیحائی کا
ہم جنہیں دور ہی سے دیکھ کے بیمار ہوئے

ذکا احسن چغتائی..........کراچی
اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

منظر فہیم.........لاہور
ایک لمحے کو توجہ نہیں حاصل اس کی
اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے
کاظم قریشی.........حیدر آباد
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے
زینت جہاں.........چنیوٹ
آئے ہیں جسے شہر بدر کرکے یہ ناداں
وہ شعلہ لب رنگ یہیں ہے میرے دل میں

خان زادہ ناصر.........حیدر آباد
آ دیکھ میرے سینے میں ہے دل ہی دل تمام
اور وہ بھی تیرے شور و شغب سے بھرا ہوا

نجمہ اسفند یار.........ہری پور
انہیں بھی آج کچھ تڑپا گئے ہیں
مری پلکوں پہ دو آنسو مچل کے
ماہ نور رفیق.........کراچی
اس طرح میں طاقِ ہجراں میں جلا ہوں رات بھر
بکھرا بکھرا سا گھر آنگن میں دھواں دن بھر رہا

سندس رفیق.........کراچی
آنکھیں بیر بہوٹی جیسی دل کو لالہ زار کیا
اس غم رت نے کس چاہ سے میرا ہار سنگھار کیا
نعمان فرحت.........ملیر
اللہ رکھے عمر ہے جتنی بھی مری
بجلی سے لگیں گزرتے یہ ماہ وسال

(دعا زہرا، فیصل آباد کا جواب)
محمد سعید قاسمی.........ڈلوال، چکوال
یہ تیرے رستوں سے کانٹے چنتے مری تو پوریں ہی چھد گئیں
کبھی تو میرے نصیب کی زلف اپنے ہاتھوں سنوار تو بھی

(فیروز حسن، فیصل آباد کا جواب)
مرزا فرحال بیگ.........حیدر آباد
اچھی گزر رہی ہے دل خود کفیل ہے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے
سلطان خان.........لالہ موسیٰ
الجھ کے چلتی ہے تارِ حیات سے ہر سانس
دم گزشتہ کا غم ہے دم نفس میں بھی

(واصف چنگاری، جیکب آباد کا جواب)
خالد یوسفی.........لیہ
قید میں بھی تھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں مگر کچھ رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا
تنویر رفیق.........کراچی
آنا نہ میری قبر پہ ہمراہِ رقیباں
مردے کو مسلمان جلایا نہیں کرتے
(اقرا بانو ناگوری، کراچی کا جواب)
حبیب الرحمٰن.........گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ
یہ عدل و انصاف پہ موقوف نہیں ہے بانو
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے
ناصر سلطان.........جھنگ صدر
یاد آئے ہیں تم کو ہم شاید
پھیکا پھیکا ہے رنگ کاجل کا
فصاحت اللہ.........ڈی آئی خان
آنکھوں میں دھند سی ہے گزرے کل کی
دل پر اس کی یاد کی ہر دم دستک
(نوشین ملک، مظفر گڑھ کا جواب)
حافظ محمد مغیث.........جھنگ
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
نسرین صدف.........کراچی
آج کوئی پتھروں کے مول بھی لیتا نہیں
ورنہ محسن ہم بھی کل تک بے بہا ہیروں میں تھے
(ابوذر حسن، لندن کا جواب)
تنویر رفیق.........کراچی
یاد کرکے تو میرے پیار کو روتا ہوگا
چاند جب جب تیرے آنگن میں اترتا ہوگا
(ارباز گل، پشاور کا جواب)
ایم افضل کھرل.........عظیم والا ننکانہ صاحب
شجر تب ہی لگانا جب زمین پر رکھ لو
ہر اک مٹی کی فطرت میں وفاداری نہیں ہوتی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 83

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماهنامه سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماهنامه پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 ستمبر 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1914ء میں امروہہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ 1931ء میں ماہنامہ حیات کے ایڈیٹر نامزد ہوئے۔ 1943ء میں روزنامہ جنگ دہلی سے وابستہ ہوئے مگر بعد میں استعفیٰ دے دیا مگر قیام پاکستان کے بعد جب روزنامہ جنگ کراچی سے نکلنے لگا تو اکتوبر 1947ء میں کراچی آ کر دوبارہ جنگ سے وابستہ ہو گئے۔ روحانیت سے خاص شغف تھا۔ قطعات نگاری میں خاصہ نام پیدا کیا۔

علمی آزمائش 81 کا جواب

جگر مرادآبادی 1893ء میں بمقام بنارس پیدا ہوئے (چند ایک تذکرہ نگاروں نے جائے ولادت مرادآباد اور سن 1890ء بھی لکھا ہے) اور 9 ستمبر 1960ء کو بمقام گونڈہ انتقال فرمایا۔ اردو کے مقبول شعرا میں شمار ہوئے۔ شعلۂ طور اور آتش گل کے علاوہ بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہوئے اور اشعار زبان زد عام کہلائے۔

انعام یافتگان

1 فہیم شاہ، پشاور.... 2 تقی کاظمی، کوئٹہ.... 3 نواز علی، حیدرآباد

4 نصرت افروز، لاہور... 5 نثار اختر، جھنگ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: کلیم اللہ فہمی، رجب علی میرزا، تنویر حسین زیدی، وجیہہ الحسن، خلش مضطر، محمد خواجہ (کورنگی) مہوش رفیق (لانڈھی) سید عزیز الدین، بابر توفیق، فرزانہ پروین، ذوالفقار احمد خان، انصار حسین، نگار صہبائی، کہکشاں تسنیم، عنایت مسیح، علی احمد، منور علی شاہ، فہیم احمد فہیم، ناصر افروز، نور احمد، بختاور شاہ، عارفہ سلطان، ابرار احمد، کاوش اختر، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، ملک سرفراز گوندل۔ لاہور سے: منظر علی خان، اسلم بیگ، برق ضیائی، عقیل سندھو، خالد علی، احمد بشیر بٹ، فہیم مرزا، نعمان اشرف،

...الحسن، عدنان صدیقی، نصیر بٹ نصیر، عروج ارم، تابش عطاری، زبیر اسلم، نعمان بٹ، ہما جبیں، ابرار حیدر، احمد علی مشرقی، سید ...الحسن، ناصر حسین، ارشاد علی، حمیرا خاتون، نازش خان، ابرار احمد، انعام الحق، نثار اختر، احمد علی، نعمان اشرف، ملک جاوید، نیاز ...، پروین ضیا، اکرام صدیقی، گل زیبا، حدیقہ اشرف، ارباز خان، ناصر حسین سید۔ اسلام آباد سے: خضر حیات عباسی، سعید اختر، ...، ردا امتیاز، انور یوسف زئی، نیلوفر شاہین، شاہین اشفاق، شہناز فیضی، بشیر فاروقی، محمد شہزاد۔ راولپنڈی سے: صفدر شیرازی، ...فتح باب، کائنات بانو، زبیر شاہ اشرفی، فتح الاسلام خان، نرجس علی، ڈاکٹر سعادت علی خان، ڈاکٹر غلام یاسین، خاقان خان، زاہد عباسی، بخت خان، سید محمد تقی، تنویر الحسن، نسرین اشرف، زویا بخاری، شیراز ملک۔ ملتان سے: قدوس بخش، زینب چوہان، ...جہاں، عائشہ جوکھیو، ناصر رند، مہوش، زرولی خان ڈائیور، عزادار حسین، توفیق سلطان، اشرف علی شیروانی، زبیر شاہ، نگار سلطانہ ...بشیر، فہد اللہ، ملک نوروز، مینا سوز، زاہد سلطان، ندا یونس، بیگم احمد دین، احمد ملتانی، مناف سید، فضل الحق، جمیل ملک، بہادر خان، کوکب جہاں، فہیم اللہ فاروقی، خالد ڈار، جنید ارشد، محمد معین چشتی، محمد طاہر اقبال، فدا محمد، افضل میو، ثاقب حسن، خالد احسن، فاروق تمنا، رفیع محسن، خالد حسرت، کہکشاں نور، ارباب حسن، زینت بنت عاصم، خالد کنور، ذیشان فاروقی، انیس خالد۔ جہلم سے: شناور ترمذی، عثمان علی شاہ، نذر کلیم چغتائی، سرفراز حسین زیدی، صدر الدین، اقبال حسن سید، ارباز خان اچکزئی، کمال احسن کمال، ملک شفاعت، نوشین خان، کلام الحسن، زبیر بٹ، صاحب زادہ نعمان ترمذی، امتیاز۔ چکوال سے: امتیاز احسن، محمد سعید ہاشمی، عنایت علی سید، ناصر غنی، اقبال حمیدی، نوشابہ صفدر ملک، اقبال خان، فہیم حسن۔ کوئٹہ سے: فیض اللہ خان، ارباز خان، نذر خان، ...گل سید پوری، ممتاز حسن ملک، تقی چنگیزی، راؤ رشید، ضمیر اچکزئی، نگار بٹ، نصرت چنگیزی، خاقان اعوان، صالح بشیر۔ سرگودھا سے: سید عباس علی رضوی، احباب خان، زوار حسین زیدی، حیات خان، نادر شاہ، فصیح الزمان، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، خضر حیات، طلیق الحق، حیات خان۔ شجاع آباد سے: نسرین زیدی، عباس علی، نوازش حسن۔ حیدرآباد سے: رانا مل چوکھال اسراتی، نصیر بھٹو، ممتاز خان، نظر علی بھٹو، نواز عثمان آبادی، تہمینہ سلطان، عبدالقیوم حسن خان، انوار علی زبیری، کاشان دولتانہ، مرزا افرحال بیگ، طٰہ یاسین۔ ساہیوال سے: فدا حسین، دردانہ سلطان، نصیر انصاری، زیب عثمانی، ممتاز فخر، امجد سروش، نوازش حسن۔ حاصل پور سے: اختر عباس، خالد بن ماجد، سلطان فتح محمد، مہوش ملک، زبیدہ سلطان فتح محمد، شیخ فخر الدین۔ ڈی آئی خان سے: گل شیر میو، عباس فدا حسین، نعمت خان، فرحت اللہ شیرازی، سیماب عائشہ، نواز بھٹی۔ ڈی جی خان سے: محمد سہیل، طاہر الدین، فرحانہ اختر، تقی ...صدیقی، محمد حسن ایس ایس، ڈاکٹر ایس اے اختر۔ بہاولپور سے: میثم حسن، فہیم شیخ، شمیم ونو، نازش کریم، سید نجم الدین احمد۔ بہاولنگر سے: نصرت احسن، معین الحسن، نادر خان، نوازش حسن، بیگم اختر ملک۔ میرپور خاص سے: نوازش علی نوازش، دھیر دل، ...ابرار صدیقی، ضوریز اختر۔ مظفر گڑھ سے: رانا محمد سجاد۔ جہانیاں سے: زبیر خان، صالح احمد، خضر حیات، رفیق احمد، وزیر حسن، خوش بخت خان۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید، نعمت اللہ، زہیر پیرانی، مفتی نعیم سلطانی۔ حسن ابدال سے: کرم الٰہی، سید محمد رضا، توفیق۔ چھوٹالہ سے افضل: فلک شاہ، ثنا احمد۔ پاک پتن سے: سدرہ شفق۔ جھنگ سے: اقبال حسن، زویا رفیق، ملک سرفراز، عجب گل، احباب زیدی۔ سکھر سے: نعمان شیخ۔ پشاور سے: نسیم نیازی، دردانہ شاہ، محمود اچکزئی، نوید فہیم، جمال شاہ، ضیا الحق، شمیم فاروقی، نسیم فردوس، جویریہ بشیر نواز، اطہر نواز، جویریہ میر نواز۔ لیہ سے: خالد یوسفی۔ اوکاڑہ سے: راجا احسن، اظہر الدین، فہیم اللہ خان، سید احسن محمود، ندرت خان، ملک صفدر۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، مہ جبین ملک، نرجس زیدی، اسلام الدین، نصیر اجتہادی، ام حبیبہ، فراست اللہ، ناصر خان، جاوید محمود ملک، فیض الحسن۔ اٹک سے: زبیر اللہ خان، ثنا جبران، حمید اللہ۔ حافظ آباد سے: خالد جاوید، محمد حیات۔ دینہ سے: محمد خلیل چودھری۔ نواب شاہ سے: عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے: نوید انصاری، سنجیدہ احمد۔ میرپور، آزاد کشمیر سے: کاشف حسین، نصرت رند۔ میانوالی سے: نوشین احمد، فاروق حسن۔ بھکر سے: غازی شاہ، کاظم شاہ۔ ٹنڈو آدم سے: فاطمہ عباسی، ناصر بگھیو، خالد خان چوٹالہ۔ کمالیہ سے: ناصر ملک، نصرت فاروق۔ لیہ سے: راجا ابرار، ملک صفدر۔ گولارچی سے: حیات خان۔ نارووال سے: انعام احسن، سید محمد احسن۔ ایبٹ آباد سے: میاں احسن، جاوید خالد، نصرت ملک۔ مردان سے: شفیق احمد، محمد کامل۔ تربیلہ ڈیم سے: سلیم درانی، خلیق انجم، شفاعت حسن۔ رحیم یار خان سے: محمد احسن ضیا۔ واہ کینٹ سے: محمد رفیق خان۔ چھچھ برہ زئی سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی۔

بیرون ممالک سے: احسن فاروقی (العین، یو اے ای) نصیر خان ناصری (جدہ، سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان) رباب زیدی (جرمنی)

☆☆☆

انسان

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
میں نے اس سے پہلے کبھی کہانی نہیں لکھی۔ پہلی بار لکھ رہی ہوں بالکل سچی۔ تمام واقعات سچے ہیں اور میں اس کی گواہ ہوں۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جسے ہر گھر تک پہنچنا چاہیے تاکہ لوگ عبرت حاصل کرسکیں۔

جمیلہ یوسف
(لاہور)

انسان اپنی زندگی کے حالات سے تو واقف ہوتا ہی ہے لیکن کبھی کبھی دوسروں پر گزرنے والے واقعات بھی ہمارے علم میں آتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ایسی پیشہ ورانہ مصروفیتوں سے وابستہ ہوتے ہیں کہ انہیں عام افراد سے کہیں زیادہ دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ مثلاً جیسے ڈاکٹر، وکیل، پولیس آفیسر وغیرہ۔ نرسوں کا پیشہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ انہیں زیادہ نہ سہی تو کبھی کبھی ایسی داستانوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے جو اپنی جگہ دلچسپ وسبق آموز ہونے کے علاوہ عبرت آمیز اور حیرت انگیز بھی ہوتی ہیں۔

میرا نام جمیلہ ہے، میں ایک سند یافتہ نرس ہوں اور پچھلے پچیس تیس سال سے اس پیشے سے وابستہ ہوں، مجھے بھی کبھی غیر ارادی اور کبھی ارادی طور پر دوسروں کے حالات جاننے کا موقع ملتا رہا ہے۔ سرگزشت میں سچ بیانیوں کے سلسلے کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ مشاہدے میں آئے ہوئے ایسے بہت سے واقعات ہیں جنہیں قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے تحریر کیا جاسکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اپنے پیشے کی وجہ سے جو حالات میرے علم میں آئے انہیں ایک پیشہ ورانہ راز کی حیثیت حاصل ہے اور اخلاقاً میں انہیں متعلقہ افراد کی اجازت اور علم کے بغیر تحریر نہیں کرسکتی اور یہ کام انتہائی مشکل ہے۔ زندگی کے سردوگرم میں اکثر کہانیوں کے کردار خدا جانے کس مقام پر اور کس حال میں ہوں گے، ان کا پتا معلوم کرنا، ان سے رابطہ قائم کرنا اور پھر اجازت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو داستان میں لکھنے جارہی ہوں، حسنِ اتفاق سے اس کے مرکزی کرداروں سے نہ صرف میری واقفیت براہِ راست رہی ہے بلکہ ان سے اب بھی تعلقات کا تسلسل کسی نہ کسی انداز میں چل رہا ہے اس لیے مجھے ان سے اجازت لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر سچی کہانی کی طرح اس میں بھی چند مصلحتوں اور دوراندیشی کے خیال سے نام ومقامات میں جزوی تبدیلی ناگزیر تھی۔

حقیقت میں یہ دو سہیلیوں کی داستانِ حیات ہے جنہیں حالات کے چکر اور تقدیر کی ستم ظریفی نے ایک دوسرے کی زندگی میں اس طرح الجھادیا تھا کہ ایک کو دوسری سے الگ کرکے کسی ایک کی کہانی بھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے ایک کا نام کوثر تھا اور دوسری کا طاہرہ۔ بچپن اور لڑکپن کے

زمانے سے نوجوانی کے ابتدائی دور تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ ایک ساتھ ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی مگر پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے وقتی طور پر دونوں کو الگ کردیا۔ طاہرہ کے والدین دوسرے شہر میں منتقل ہوگئے جس کی وجہ سے ان کے درمیان صرف مراسلت کا سلسلہ ہی قائم رہ سکا لیکن اس دوری کے باوجود وہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ ایک دوسرے کے حالات سے بخوبی آگاہ رہیں۔

کوثر ایک غریب خاندان کی لڑکی تھی۔ والد کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ اس کی ماں نے زمانے کے نشیب وفراز میں بڑے عزم اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ محنت مزدوری کرکے بھی اپنی بیٹی کو ضروری تعلیم سے آراستہ کیا۔ بیٹی نے بھی ماں کا خیال رکھنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ جب تک زیرِ تعلیم رہی، بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر ماں کا بوجھ ہلکا کیا اور جب بی اے پاس کرلیا تو ملازمت کے لیے دوڑ دھوپ شروع کردی۔ وقت بدل رہا تھا۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا جب لڑکیاں صرف نرسنگ تعلیم اور میڈیکل کے شعبوں میں جاتی تھیں۔ بینکوں، سرکاری دفتروں اور ان کی پیروی میں پرائیویٹ اداروں نے بھی لڑکیوں کو ملازمت دینا شروع کردی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت بھی اور اب بھی جبکہ خواتین کی کافی تعداد ہر قسم کے شعبوں میں نظر آتی ہے، لڑکیوں کو ملازم رکھنے میں صرف ایک جاب پُر کرنے کی خواہش کارفرما نہیں ہوتی بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس میں صنفِ نازک کے قرب کی آرزو بھی شامل ہوتی ہے۔ بلکہ بعض دفاتر میں تو لڑکیوں ...... اور

صرف خوبصورت لڑکیوں کو رکھا ہی اس لیے جاتا ہے کہ مالک یا منیجر کو موقع مل جائے تو وہ ایک پنتھ اور دو کاج پر کامیابی سے عمل کرسکیں۔ دفتر کا کام جیسا کچھ بھی ہو لیکن ان کی حسرتیں اور آرزوئیں مکمل طور پر پوری ہوتی رہیں۔ اب یہ پھر ایک اور بات ہے کہ لڑکیاں بھی کافی ہوشیار ہوگئی ہیں، وہ اس قسم کے پھندوں میں صرف اس وقت آتی ہیں جب انہیں اپنے مستقبل کے خوشگوار اور پرتعیش ہونے کا یقین ہوجاتا ہے ورنہ یا تو بہت محتاط رہتی ہیں یا بڑھتی ہوئی جسارتوں پر ایک تھپڑ رسید کر کے دفتر سے نکل آتی ہیں۔

معمولی سی کوشش کے بعد کوثر کو ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ملازمت اسٹینو ٹائپسٹ کی تھی جبکہ کوثر کو تھوڑی بہت ٹائپنگ تو آتی تھی مگر شارٹ ہینڈ کی الف بے سے بھی ناآشنا تھی۔ اگر اسے کچھ دنیا اور اس کے لوگوں کا تجربہ ہوتا تو یہی بات اسے چونکانے کے لیے کافی تھی مگر وہ ایک سیدھی سادی، ہر ایک پر اعتبار کرنے والی لڑکی تھی۔ ملازمت ملنے کی خوشی میں اس نے اس نکتے پر غور ہی نہیں کیا کہ امیدواروں کی طویل لائن میں جن میں تجربہ کار اسٹینو ٹائپسٹ ہی نہیں کچھ اسٹینوگرافر بھی شامل تھے، آخر اسے کیوں منتخب کیا گیا جبکہ اس کی ٹائپنگ کی رفتار اوسط سے زیادہ غلطیوں کے ساتھ اٹھارہ الفاظ فی منٹ تھی اور شارٹ ہینڈ تو اسے بالکل آتی ہی نہیں تھی۔ خود اسے ملازمت ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی اس لیے اس کی حیرت اور اگر ذہن میں کوئی شبہ پیدا ہوا تو اسے دور کرنے کے لیے منیجر صاحب نے جو انٹرویو لے رہے تھے، اسے بتایا کہ وہ ملازمتوں کے سلسلے میں خواتین کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں اس لیے اسے اس شرط کے ساتھ ملازمت دی جارہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ کی مدت میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی مطلوبہ صلاحیت حاصل کرلے۔

کوثر نے اس دن سے محنت شروع کردی۔ ٹائپنگ کی رفتار بڑھانے کی سہولت اسے دفتر کی مشینوں پر حاصل تھی۔ سردست اسے ٹائپ کا معمولی سا کام دیا جارہا تھا اور اسے اجازت تھی کہ وہ چاہے تو تمام وقت اپنی اسپیڈ بڑھانے میں استعمال کرسکتی ہے۔ شارٹ ہینڈ کے لیے کوثر نے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا اور اس قدر لگن اور محنت کے ساتھ پڑھنا شروع کیا کہ تین ماہ میں کورس مکمل کر کے اسپیڈ کلاس میں آگئی۔

کمپنی کا نام مقبول ٹریڈنگ کارپوریشن تھا اور بنیادی طور پر اس کا بزنس کمیشن ایجنٹ کا تھا جو کئی قسم کی اشیا کی تھوک خرید وفروخت میں صنعت کار اور خریدار کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتی تھی۔ کمپنی کے مالک مقبول احمد صاحب بہت ایماندار، مخلص اور خوش اخلاق انسان تھے۔ دنیا میں کم وبیش بالکل تنہا۔ والدین کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ جانے کے بعد انہوں نے اپنی ذاتی جدوجہد سے تقریباً تیس سال میں یہ مقام حاصل کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال سے بھی زیادہ تھی مگر ابھی تک انہوں نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس موضوع سے انہیں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ وہ جو کچھ اپنے بزنس میں کماتے تھے اس کا بہت ہی کم حصہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے۔ بزنس کو بڑھانے اور مستحکم رکھنے کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت ہوتی تھی، اس سے جو کچھ بھی بچتا تھا، سارا کا سارا رفاہی کاموں پر خرچ کردیا کرتے تھے۔ اپنے ایک دور کے عزیز یاور کو انہوں نے منیجر بھی زیادہ تر اس خیال سے ملازم رکھا تھا کہ وہ بی اے پاس کرنے کے بعد ایک مدت سے بیکار تھا جبکہ ایک خاصے بڑے کنبے کی ذمے داری اس کے کاندھوں پر تھی۔ ملازمت کے وقت یاور بالکل ہی نااہل اور اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ مقبول صاحب نے خود ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھ کر اس کی تربیت کی تھی اور چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک محنت کر کے اسے اس قابل کیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اپنے فرائض سرانجام دینے لگا تھا۔

مقبول ٹریڈنگ کارپوریشن کا کل عملہ پندرہ افراد پر مشتمل تھا جس میں ایک اکاؤنٹنٹ اور دو اکاؤنٹس کلرک کے علاوہ مزید چار جنرل ڈیوٹی کلرک۔ ایک اسٹینوگرافر، تین ٹائپسٹ، ایک ٹیلی فون آپریٹر اور دو چپراسی شامل تھے۔ شاہد سینئر اکاؤنٹس کلرک تھا۔ بہت محنتی، قابل اور سمجھ دار۔ وہ ملازمت کے ساتھ پرائیویٹ طور پر ایم کام کی تیاری بھی کررہا تھا اور اپنے فرائض سے اس کی لگن کو دیکھتے ہوئے مقبول صاحب نے اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ جب موجودہ اکاؤنٹنٹ صاحب ریٹائر ہوں گے تو وہ کسی نئے آدمی کو ملازم رکھنے کے بجائے یہ منصب شاہد کے سپرد کردیں گے۔

مقبول صاحب زیادہ تر اپنے آفس میں بیٹھے رہتے تھے۔ اس لیے آفس سے باہر، غیر پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے سلسلے میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں، اس سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر دفتر کے دوسرے عملے کی آنکھیں تو بند نہیں تھیں۔ وہ دیکھتے رہتے تھے کہ منیجر یاور کی رنگین مزاجی

کیا کیا گل کھلاتی رہتی ہے۔ پہلے دفتر میں مسز عباسی تھیں جن کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ شارٹ ہینڈ سے متعلق تمام کام خواہ وہ مقبول صاحب کی جانب سے ہو یا منیجر یاور کی جانب سے، وہی انجام دیتی تھیں۔ یاور نے ان کی موجودگی کو جواز بناتے ہوئے اپنی نظرباز طبیعت کی تسکین کے لیے پہلے ایک لڑکی کو ٹائپسٹ رکھا اور پھر دوسرے ٹائپسٹ کو بھی اس عذر کی آڑ میں برطرف کیا کہ وہ اس کی جگہ ایک اسٹینو ٹائپسٹ رکھنا چاہتا ہے اور وہ جگہ ایک حسین لڑکی کو دے دی لیکن وہ کوئی شریف اور غیرت دار لڑکی تھی کہ یاور کی دست درازیوں سے جب کسی اور طرح نہ بچ سکی تو ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی جگہ دوسری آئی تو اسے بھی یاور اپنی راہ پر نہیں لاسکا اور اس پر چراغ پا ہو کر اس نے اسے خود ہی برطرف کردیا۔

تیسری لڑکی کوثر تھی۔ پہلی دونوں سے زیادہ خوبصورت، اس لیے یاور اس کے سلسلے میں کافی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ جن دنوں کوثر کو ملازم رکھا گیا وہ کمپنی میں حسابات کی کلوزنگ کا زمانہ تھا۔ پے در پے اکاؤنٹ کے اسٹیٹمنٹ ٹائپ ہورہے تھے اسی سلسلے میں شاہد کا رابطہ کوثر سے شروع ہوا۔ جو غیر محسوس طور پر رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی ذاتی پسندیدگی اور اس کے بعد چاہت میں تبدیل ہوگیا۔ تعلقات نے یہ نوعیت اختیار کی تو شاہد نے کوثر کو منیجر یاور کی طرف سے محتاط رہنے کی ہدایت کی لیکن اس وقت تک یاور نے کوثر کے ساتھ کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اس کی بدنیتی کو ظاہر کرتی اس لیے کوثر نے شاہد کی تاکید کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی ادھر یاور کو اس بات کا انتظار تھا کہ کوثر شارٹ ہینڈ سیکھ لے، اس کی کچھ اسپیڈ بھی ہوجائے تاکہ وہ ڈکٹیشن دینے کے بہانے اپنے آفس میں بلاسکے جہاں وہ جتنی دیر بھی مصروف رکھنا چاہے کسی کو شبہے میں مبتلا کیے بغیر رکھ سکے اور ان ہی تنہائیوں کی ملاقاتوں میں وہ رفتہ رفتہ اپنا دام ہم رنگ زمین بچھا کر کوثر پر قابو پانے کی کوشش کرے۔

کوثر کے شارٹ ہینڈ کا کورس پاس کرتے ہی یاور نے اس کی تنخواہ دگنی کردی اور اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اسے ذرا ذرا سی بات کے لیے اپنے آفس میں بلانے لگا۔ اپنی بے تکلفانہ چکنی چپڑی باتوں سے اور پھر گاہے گاہے چھوٹے موٹے تحائف پیش کر کے اسے پرچانے کی کوشش کرنے لگا۔ کوثر نے ایک حد تک اس کی بے تکلفی کو برداشت کیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ منیجر ہے، اس کی ناراضگی کہیں ملازمت نہ ختم کردے، اس کے تحائف بھی چاروناچار قبول کرتی رہی۔ قدرتی طور پر یاور کو کوثر کی خاموشی سے حوصلہ ملا اور اس نے برملا اظہار محبت کا فیصلہ کرلیا۔

ایک دن اس نے کچھ ضروری خطوط ڈکٹیٹ اور ٹائپ کرنے کے بہانے کوثر کو دفتری اوقات کے بعد روک لیا۔ دفتر کا دوسرا عملہ چلا گیا تو اس نے چپراسیوں کو بھی چھٹی دے دی کہ وہ خود ہی آفس بند کردے گا۔ مقبول صاحب سب سے پہلے آتے تھے اور سب کے بعد ہی جاتے تھے۔ سب کے بعد میں جانے.... کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دفتر اپنی موجودگی میں بند کرایا کرتے تھے بلکہ صرف اتنا ہی تھا کہ وہ ساڑھے پانچ بجے اپنے آفس سے نکلتے تھے جب عموماً چپراسیوں کے علاوہ سارا عملہ جاچکا ہوتا تھا۔ ظاہر تھا کہ کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا تھا کہ عملے کو اوور ٹائم کے لیے روک لیا جاتا تھا ایسی صورت میں مقبول احمد اوور ٹائم ختم ہونے کا انتظار نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے تقریباً مقررہ وقت پر اٹھ جاتے تھے۔

مگر اس دن یاور کی قسمت یاور نہیں تھی۔ جب ساڑھے پانچ بجے کے بعد بھی مقبول صاحب اپنے آفس سے برآمد نہیں ہوئے تو اس نے پہلو پر پہلو بدلنا شروع کردیا... مگر اس سے پہلے کہ وہ خود مقبول صاحب سے انٹرکام پر بات کر کے اس تاخیر کی وجہ دریافت کرتا، مقبول صاحب کا فون آگیا۔

"یاور!" مقبول صاحب نے کہا "چپراسیوں سے کہو کہ وہ بازار سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آئیں اور چائے تیار کرلیں۔"

یاور کا دل دھک سے ہوگیا۔ اس حکم کا صاف مطلب تھا کہ کوئی بزنس پارٹی ملاقات کے لیے آرہی ہے۔

"کیا کوئی بزنس میٹنگ ہے؟" یاور نے پھر بھی پوچھ لیا۔

"ہاں، گوجرانوالہ سے ایک پارٹی بجلی کے پنکھوں اور سلائی کی مشینوں کے سلسلے میں بات کرنے آئی ہے، میں نے اسے چھ بجے کا ٹائم دیا تھا۔"

"مگر...... چپراسی تو چلے گئے۔" مجبوراً یاور کو بتانا پڑا۔

"کیا...... وہ اتنی جلدی کیسے جاسکتے ہیں؟"

"میں نے انہیں چھٹی دے دی تھی۔"

"کیوں؟"

"آج مجھے کچھ اوور ٹائم بیٹھنا تھا۔" یاور نے کوثر کا نام نہیں لیا "اس لیے سوچا کہ انہیں روکنے سے کیا فائدہ،

میں خود آفس بند کردوں گا۔"
"تو پھر اب تم انتظام کرو۔" مقبول احمد نے ناراضگی سے کہا "بازار سے کچھ پھل' مٹھائی وغیرہ خریدو اور برابر کے ہوٹل میں چار افراد کے لیے اسپیشل چائے کا آرڈر دے دو۔ اور آیندہ ایسی حماقت مت کرنا۔ جب تک میں آفس میں موجود ہوں، تمہیں اوور ٹائم کرنا ہو یا کسی کو چھٹی دینا ہو، میرے علم میں لائے بغیر اپنے طور پر کوئی فیصلہ مت کرو۔"
"یس سر!" اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔
مقبول صاحب سے بات کر کے اس نے انٹرکام پر کوثر سے کہا کہ وہ گھر جاسکتی ہے۔ آج ایک ضروری بزنس میٹنگ کی وجہ سے اوور ٹائم نہیں ہوگا۔ یوں کوثر اس روز ایک بڑی مصیبت سے بال بال بچ گئی۔ مقبول صاحب یاور کو صرف اس حد تک بزنس کے معاملات میں شامل کرتے تھے جس حد تک ضروری سمجھتے تھے۔ اس دن کی میٹنگ میں یاور کی شمولیت انہوں نے ضروری نہیں سمجھی۔ ہر چند وہ چائے ناشتے کے انتظام کے لیے باہر موجود تھا مگر اسے اندر نہیں بلایا گیا۔ البتہ اس میٹنگ میں کیے جانے والے فیصلے کے نتیجے میں یاور کو دوسرے دن ہی پارٹی کے ساتھ گوجرانوالہ جانا پڑا۔ جہاں اسے کچھ ضروری مصروفیات کے باعث تین ہفتے قیام کرنا پڑا۔

☆☆☆

شاہد اور کوثر دینی، اخلاقی اور معاشرتی حدود سے نکل کر کوئی بات کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے کوثر کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد شاہد نے اپنی والدہ کو پیام لے کر کوثر کے گھر بھیج دیا۔ رشتے میں کوئی خرابی یا خامی نہیں تھی۔ کوثر کی والدہ نے ہفتہ دس دن کے غور و فکر کے بعد رشتہ منظور کرلیا۔ شاہد کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے والد اگرچہ حیات تھے مگر ریٹائر ہونے کے بعد عموماً بیمار رہتے تھے۔ دو بڑی بہنیں تھیں جن کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ مکان اپنا ذاتی تھا۔ اگرچہ گزر اوقات کا ذریعہ صرف شاہد کی تنخواہ تھی لیکن افراد کم ہونے کی وجہ سے خاصی فراغت سے گزربسر ہو جاتی تھی۔ دونوں طرف کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں منگنی کی سادہ سی تقریب منعقد کرلی گئی اور شادی کے بارے میں طے ہوا کہ جب شاہد ایم کام کرلے گا، دفتر میں اس کا عہدہ اور تنخواہ بڑھ جائے گی تب شادی کی کوئی مناسب تاریخ مقرر کرلی جائے گی۔
کوثر کی منگنی کی خبر آفس تک پہنچی تو سب نے اسے مبارک باد دی۔ مقبول صاحب نے سونے کا ایک لاکٹ بہ طور تحفہ بھی دیا۔ عملے کے کئی افراد کو تجسس تھا کہ یاور جب گوجرانوالہ سے واپس آئے گا اور اسے کوثر کی منگنی کی خبر ملے گی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ یہ کوئی کہنے والی بات نہیں تھی کہ دفتر میں سب ہی نے کوثر کی ملازمت کو اسی رنگ میں دیکھا تھا جو واقعی یاور کی نیت تھی اور وہ جلد یا بدیر اس کے استعفیٰ دے کر جانے یا نکالے جانے کی خبر سننے کے منتظر تھے کیونکہ کوثر کی طبیعت اور اس کے مزاج کو جاننے کے بعد کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ یاور کی بدنیتی کا شکار ہونا قبول کرلے گی۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت تھی کہ چار ماہ گزرنے کے باوجود کوثر بہ دستور اپنی جگہ کام کررہی تھی جبکہ دو پچھلی لڑکیوں کو دو ماہ سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں یاور کی پلاننگ کا کیا علم ہوسکتا تھا اس لیے وہ بڑے متعجب تھے کہ اتنا وقت گزرنے کے باوجود یاور نے اس .... اپائنٹمنٹ سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔
یاور واپس آیا تو منگنی کا ذکر پرانا ہوچکا تھا۔ پھر آفس میں اس قسم کی باتوں کا چرچا خاص طور سے لڑکیوں کی ذات سے متعلق ہونے کی وجہ سے زیادہ ہوا بھی نہیں کرتا اور کسی کو اس معاملے سے اتنی دلچسپی بھی نہیں تھی کہ یاور کا ردعمل دیکھنے کے لیے خاص طور سے اس کا ذکر کرتا چنانچہ یاور اس ہونے والی تبدیلی سے پیچ و تاب کھانے سے بچا رہا لیکن اس کی نیت اور اس کا منصوبہ اپنی جگہ برقرار تھا۔
اس نے پھر ایک دن کوثر کو اوور ٹائم کے لیے روک لیا اور اس روز اتنی احتیاط کی کہ کچھ روزمرہ کے خطوط ڈکٹیٹ کرا کے ٹائپ کرنے کے لیے بھی دے دیے۔ اپنے اندازے سے اس نے اتنا کام دیا تھا کہ کوثر چھ بجے سے قبل اسے ختم نہیں کرسکتی تھی۔ آفس کا عملہ پانچ بجے تک چلا گیا۔ مقبول صاحب بھی اپنے معمول کے مطابق ساڑھے پانچ بجے اٹھ گئے۔ ان کے جاتے ہی یاور نے چپراسیوں کو بھی رخصت کردیا۔
پونے چھ بجے اس نے کوثر کو اپنے آفس میں بلایا کہ ایک دو خط اور باقی ہیں انہیں بھی لکھ لے۔ کوثر شارٹ ہینڈ نوٹ بک اور پنسل لیے یاور کے آفس میں داخل ہوئی۔ یاور نے خط لکھوانے کے بہانے اظہار محبت شروع کردیا۔ کوثر نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن جب یاور اپنی کرسی سے اٹھ کر دست درازی پر اتر آیا تو کوثر بھی غصے سے کھڑی ہوگئی۔
"میں آپ کی عزت کرتی ہوں یاور صاحب!" اس

نے کہا "ایسی اوچھی حرکتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں لیکن اگر کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دور کرلیں۔ میری منگنی شاہد سے ہوچکی ہے اور جلد ہی ہماری شادی ہو جائے گی۔ میں بات بڑھانا نہیں چاہتی اس لیے گھر جارہی ہوں۔ باقی خطوط کل آ کر ٹائپ کردوں گی لیکن آیندہ کے لیے آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں، ضرورت پڑی تو میں آپ کو پولیس اور عدالت تک لے جاسکتی ہوں۔"
"شاہد سے تمہاری صرف منگنی ہی ہوئی ہے نا!" یاور نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے جواب دیا "شادی بھی ہو جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر سہاگ رات آج اس دفتر میں منائی جائے گی۔ تم جانتی ہو کہ ہمارا آفس تیسری منزل پر ہے اور پانچ بجے تک بلڈنگ میں واقع تمام دفاتر بند ہو جاتے ہیں اس لیے تم گلا پھاڑ پھاڑ کر بھی چیخو گی تو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ رہی پولیس اور عدالت کی بات تو ذرا پریکٹیکل ہو جانے دو پھر میں دیکھوں گا کہ تم کون سا چہرہ لے کر قانون کو آواز دو گی۔ میرے لیے بھی یہ ایک دلچسپ تجربہ ہوگا۔"
یاور نے کوثر پر قابو پانے کے لیے اس پر حملہ کردیا۔ کوثر ادھر ادھر بھاگ کر آفس کی چیزیں اٹھا اٹھا کر یاور پر پھینکتے ہوئے خود کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر تابہ کے آخر یاور نے اسے پکڑ لیا۔ کوثر نے غصے میں اس کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔ یاور نے جو پہلے ہی بے حد اشتعال میں آیا ہوا تھا، جوابی طور پر اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ گھونسا اس نے اس قوت سے مارا تھا کہ کوثر کا سر بڑے زور کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا۔ کوثر کو چکر سا آیا۔ وہ گرنے لگی تھی مگر پھر خود کو سنبھالنے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئی۔ یاور اس کے تعاقب میں دوڑا۔ کوثر ایک کرسی پر گر پڑی اور تقریباً بے ہوش سی ہوگئی۔
یاور نے فاتحانہ انداز میں قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایکدم سے بیرونی آفس کا دروازہ کھلا اور مقبول صاحب اندر داخل ہوئے۔ وہ چند ضروری کاغذات اپنے آفس میں ہی چھوڑ گئے تھے، انہیں لینے آئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر میں صورت حال کا جائزہ لیا اور سمجھ بھی گئے کہ یہ کیا ہورہا ہے؟
"یاور!" وہ کڑک کر بولے "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس حد تک گر جاؤ گے، یہ سب کیا ہے؟"
"کچھ نہیں، میں نے کچھ ضروری خطوط ٹائپ کرانے کے لیے مس کوثر کو روک لیا تھا۔" یاور نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔
"اور یہ خطوط تم زبان کے بجائے ہاتھوں سے ڈکٹیٹ کرا رہے تھے، کیوں؟" مقبول صاحب نے کہا "کوثر کے منہ سے خون کیوں نکل رہا ہے؟"
"یہ میں بتاتی ہوں۔" کوثر نے ہوش میں آنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا "منیجر صاحب نے میری عزت پر حملہ کر کے مجھے برباد کرنا چاہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو عین وقت پر بھیج دیا ورنہ شاید میں برباد ہو جاتی، ثبوت درکار ہو تو منیجر صاحب کے دفتر میں جا کر دیکھ لیں۔ وہ ساری داستان خود بیان کررہا ہے۔"
"مجھے جتنی تصدیق درکار تھی، وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔" مقبول صاحب نے جواب دیا اور یاور سے مخاطب ہو کر بولے "تم جیسے ذلیل آدمی کے لیے اس دفتر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں اسی وقت برطرف کرتا ہوں۔ کل آفس آ کر اپنے واجبات کا حساب کرلینا۔"
"مس کوثر!" یاور نے زہریلے لہجے میں جیسے مقبول صاحب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تم سردست میرے ہاتھ سے بچ گئیں...... مگر تم نے مجھے اپنا دشمن بنالیا ہے اور یقین رکھو کہ یہ دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ میں اندھیرے کے تیر کی طرح ایسے وقت اپنا انتقام لوں گا جب تمہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔"
اور ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ آفس سے باہر نکل گیا۔
کوثر ایک بار پھر نیم بے ہوشی میں مبتلا ہوگئی تھی۔ مقبول صاحب نے اس کی حالت دیکھی اور فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر کے آفس بلایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ضروری دوائیں اور ایک انجکشن دیا۔ منہ کا زخم کوئی ایسا تشویشناک نہیں تھا۔ صرف ہونٹ تھوڑا سا پھٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے لیے دوا لکھ دی۔ پندرہ بیس منٹ میں کوثر کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اطمینان دلا کر چلے گئے لیکن نہ کوثر کو اس بات کا احساس تھا اور نہ ڈاکٹر صاحب نے ہی اپنے معائنے میں کچھ غور کیا کہ دیوار سے سر ٹکرانے کے نتیجے میں اس کے جو اندرونی چوٹ آ گئی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے اور کیا وہ آیندہ پریشان کن ثابت ہوسکتی ہے یا نہیں۔ کوثر کے سر میں چوٹ کی وجہ سے درد ہورہا تھا جسے اس نے بھی سر ٹکرانے کا نتیجہ خیال رکھتے ہوئے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔
ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد مقبول صاحب نے واقعے کی مختصر تفصیل پوچھی۔

”میرا خیال ہے۔“ وہ بولے ”کہ تم اس بات کو یہیں ختم کردو تو زیادہ بہتر ہے۔“

”ظاہر ہے کہ میں بھی اسے بڑھانا نہیں چاہتی۔“ کوثر نے جواب دیا ”میرا پولیس میں رپورٹ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ مقبول صاحب نے نرمی سے کہا ”بلکہ میرا مشورہ ہے کہ تم گھر پر اپنی والدہ وغیرہ سے، دفتر میں اپنے ساتھیوں سے اور خاص طور پر شاہد سے اس حادثے کا کوئی تذکرہ مت کرنا۔ اول اس لیے کہ اس نوعیت کا واقعہ جب لوگوں کے علم میں آئے گا تو ہر فرد اپنی سوچ کے اعتبار سے نتیجہ نکالے گا اور پھر اس کے حوالے سے وہ کیا کچھ کہتا سنتا ہے، اس کے بارے میں کوئی اچھی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ تمہارا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے لیکن دوسروں کے کہنے میں آ کر یا از خود شاہد اس میں کوئی ایسا مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کرے جو تمہارے باہمی تعلقات پر ابھی یا آگے چل کر اپنے مضر اثرات مرتب کرے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔“

”لیکن یہ بات چھپی بھی کیسے رہ سکتی ہے۔ کم سے کم چپراسیوں کو ضرور معلوم ہے کہ میں اوورٹائم کر رہی ہوں۔“ کوثر نے جواب دیا ”کل جب میں آفس آؤں گی اور وہ میری حالت دیکھیں گے تو خوامخواہ چہ میگوئیاں کریں گے۔ پھر اس کے ساتھ یاور کی برطرفی کی خبر بھی عام ہوگی، آپ خود سوچیں کہ لوگ کیا اندازہ لگائیں گے۔“

”درست ہے مگر اس کا آسان علاج یہ ہے کہ تم ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔“ مقبول صاحب نے جواب دیا ”یوں بھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ رہی یاور کو برطرف کرنے کی بات تو میں کوئی جواز تلاش کرلوں گا، خود وہ بھی نہیں چاہے گا کہ اصل واقعہ کسی کے علم میں آئے۔“

”مگر شاہد...... “ کوثر نے کہا ”وہ تو مجھے چھٹی پر پا کر میری خیریت معلوم کرنے گھر آسکتے ہیں۔“

”اسے تم کسی بھی بہانے سے مطمئن کردینا۔ مثلاً کہ بس سے اترتے یا چڑھتے ہوئے چوٹ لگ گئی یا کسی مسافر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی چیز نے تمہارا ہونٹ زخمی کردیا۔ بہر حال میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کہیں یہ بات بلاوجہ تمہاری آئندہ خوشیوں کو متاثر نہ کرے اور اب آؤ میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔ کہو تو خود تمہاری والدہ سے بھی کہہ دوں کہ دفتر میں تم نیچے اترتے ہوئے سیڑھی پر پیر پھسل جانے کی وجہ سے جنگلے سے ٹکرا گئی تھیں۔“

☆☆☆

کوثر نے مقبول صاحب کے مشورے پر عمل کیا اور یہی عذر بیان کیا کہ اس کا پیر سیڑھی سے پھسل گیا تھا۔ یاور دوسرے دن دفتر نہیں آیا بلکہ وہ مسلسل دو ہفتے غائب رہا۔ مقبول صاحب کو موقع مل گیا، انہوں نے بغیر اطلاع یا کسی چھٹی کی درخواست دیے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنے کے عذر کی آڑ میں یاور کو برطرف کردیا۔ پھر ایک دن یاور خاموشی سے دفتر آ کر اپنا حساب کتاب بھی صاف کر گیا اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ وقتی طور پر ایک بری گھڑی آئی تھی اور کچھ زیادہ نقصان پہنچائے بغیر گزر گئی۔

لیکن کوثر کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے اور خراب ہوتی گئی۔ اس کے سر میں مسلسل درد رہنے لگا۔ بھوک مر گئی۔ طبیعت میں ہر وقت متلی کا سا احساس رہتا تھا جو اسے کچھ کھانے پینے نہیں دیتا تھا۔ مقبول صاحب تیسرے چوتھے دن کوثر کی عیادت کے لیے جارہے تھے۔ ان کے علم میں یہ باتیں آئیں تو انہوں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر شریف سے مشورہ کیا جو.... کافی بڑا اور جدید طرز کا اسپتال کامیابی سے چلارہے تھے۔

ڈاکٹر شریف نے کوثر کو مکمل چیک اپ کے لیے اسپتال بلایا۔ توجہ سے اس کی پوری بات سنی۔ سر کے اس حصے کا جو بائیں جانب کنپٹی اور سر کے پچھلے حصے کے درمیان واقع تھا، بہ غور معائنہ کیا۔ مختلف ٹیسٹ بھی کیے اور پھر ایک دن مقبول صاحب اور کوثر دونوں کو اپنے آفس بلایا۔

”میں نہ ہی آپ لوگوں کو بلاوجہ خوفزدہ کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا ”اور نہ حقائق کے بارے میں کوئی بات چھپانا مناسب سمجھتا ہوں۔ کوثر کے سر میں دیوار سے لگنے والی اندرونی چوٹ کافی تشویشناک ہے۔ سر کی ہڈی چٹخ گئی ہے اور اس کے اردگرد انجماد خون بھی ہوگیا ہے جس کے نتیجے میں یہ بھی امکان ہے کہ رفتہ رفتہ کوثر اپاہج ہوجائے یا اس کی بینائی اور گویائی کو نقصان پہنچے۔ سر کے جو ایکسرے لیے گئے ہیں، ان سے اس امر کا پورا خطرہ موجود ہے۔“

فطری طور پر کوثر یہ سن کر پریشان ہوگئی۔

”پھر کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟“ مقبول صاحب نے فکرمندی سے پوچھا۔

”علاج دو طرح سے ممکن ہے۔“ ڈاکٹر شریف نے جواب دیا ”اول یہ کہ دواؤں کے ذریعے انجمادِ خون ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور سر کی ہڈی فطری طور پر رفتہ رفتہ ٹھیک ہوجائے لیکن اس صورت میں کامیابی کی امید کافی کم ہے۔ دوسری صورت آپریشن ہے۔ مگر یہ آپریشن بھی انتہائی نازک اور مشکل ہوگا اور اس پر خرچ بھی بہت زیادہ آئے گا۔“

”آپ خرچ کی پروانہ کریں۔“ مقبول صاحب نے بلاتامل کہا ”اس کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔“

”لیکن مجھے منظور نہیں ہے۔“ کوثر نے جواب دیا ”آپ کے احسانات پہلے بہت زیادہ ہیں۔ میں آپ کو مزید زیر بار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب آپ دوائی علاج بتائیں، وہ میرے وسائل کی حد میں ہوا تو میں اسے جاری رکھوں گی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو اس میں احسان کی کیا بات ہے؟“ مقبول صاحب بولے۔

”ہے کیوں نہیں، آخر میں کس استحقاق کی بنیاد پر اسے قبول کرسکتی ہوں؟“

”تم میری کمپنی میں ملازم ہو اور کمپنی اپنے ملازمین کو طبی سہولتیں دینے کی پابند ہے۔“

”ہاں مگر ایک خاص حد تک۔“ کوثر نے جواب دیا ”میں اپنے لیے کوئی ایسی رعایت نہیں چاہتی جو دوسرے ملازمین کو حاصل نہیں یا انہیں نہیں دی جاسکتی۔“

”دوسرے ملازمین کے اور تمہارے معاملے میں بہت فرق ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس صورت حال کی ذمے داری بالواسطہ مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ یاور میرا دور کا رشتے دار ہے اور اس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔“

”مگر لوگ تو یہ بات نہیں جانتے، اس کے علاوہ میری عزت نفس بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں اپنے حق سے زیادہ آپ سے طلب کروں۔“

مقبول صاحب نے کوثر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ مجبوراً یہی طے کیا گیا کہ دوائی علاج شروع کردیا جائے۔ شاید اس سے کام بن جائے لیکن ڈاکٹر شریف نے آگاہ کردیا کہ علاج تو شروع کیا جاسکتا ہے لیکن ناکامی کی صورت میں بعد میں آپریشن کا فیصلہ اور زیادہ نازک اور خطرناک ہوجائے گا اور یہ عین ممکن ہے کہ دوائی علاج کے دوران، جس کے نتائج زیادہ سے زیادہ ایک دو ماہ میں ظاہر ہوجانا چاہئیں، کوثر کسی اعتبار سے معذور یا اپاہج ہوجائے۔ کوثر یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھی اس لیے مجبوراً مقبول صاحب کو بھی خاموش ہوجانا پڑا۔

☆☆☆

علاج تو شروع ہوگیا۔ ابتدائی طور پر کچھ فائدہ بھی ہوا لیکن کوثر کے سر کا درد پوری طرح ختم نہیں ہوسکا۔ اسے گاہے بہ گاہے چکر بھی آنے لگے۔ مقبول صاحب دیکھ رہے تھے کہ اپنی بیماری کے علاوہ بھی کوئی اور بات کوثر کو پریشان کررہی ہے اور اس بات کا ذکر ایک دن خود کوثر نے ہی مقبول صاحب سے کردیا۔

”شاہد کے فائنل امتحان عنقریب ہونے والے ہیں۔“ اس نے کہا ”قوی امید ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوجائیں گے جس کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کی طرف سے شادی کے لیے زور ڈالا جاسکتا ہے لیکن جب یہ شادی طے ہوئی تھی تب کے اور اب کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ کا طرز عمل ایک شفیق مہربان دوست کا سا رہا ہے اسی سے ہمت پا کر میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟“

”میری دلی خواہش جاننا چاہتی ہو تو وہ اب بھی یہی ہے کہ تم آپریشن کرالو۔“ مقبول صاحب نے نرمی سے کہا ”خدا نے چاہا تو آپریشن ضرور کامیاب ہوگا جس کے بعد تمہارے لیے کوئی مسئلہ پریشان کن نہیں رہے گا۔“

”وہ موضوع مت چھیڑیے جس پر میں کوئی مفاہمت نہیں کرسکتی۔ اپنی زندگی کی قیمت پر بھی نہیں۔“

”پھر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”ڈاکٹر شریف کے بقول میں ایک دو ماہ کے اندر یا تو اپاہج یا معذور ہوجاؤں گی یا میری زندگی ختم ہوجائے گی۔“ کوثر بڑے حوصلے کے ساتھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کررہی تھی ”مدت کا اندازہ غلط بھی ہوجائے تب بھی معذوری اور موت کا خطرہ بہر حال لاحق ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میں شاہد کی زندگی میں خوشی اور مسرت کے بجائے آزمائش اور امتحان بن کر جاؤں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں شاہد سے شادی نہیں کروں گی۔“

”جب فیصلہ کرلیا ہے تو مجھ سے کسی مشورے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟“ مقبول صاحب نے افسردگی سے کہا۔

”شاہد اس فیصلے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔“ کوثر نے اپنی بات جاری رکھی ”وہ مجھے اس کی وجہ بتانے پر مجبور کریں گے اور شاید میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں ان کے

آج سے پون صدی پہلے ایک مورخ نے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کہا تھا کہ ''اصلی دقت تاریخوں کے تعین میں ہوتی ہے۔ تاریخ کی عمارت Chronology کے ڈھانچے پر کھڑی ہونی چاہیے اور بغیر اس کے تاریخ نامکمل ہے۔'' اگرچہ یہ بات ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کہی گئی تھی لیکن اس کا اطلاق نہ صرف برعظیم کے زمانہ قبل از تاریخ پر بلکہ پوری دنیا کے اس دور پر ہوتا ہے۔ برصغیر میں یہ مشکل تو اب بھی موجود ہے اور وادیٔ سندھ سے برآمد شدہ شواہد اور اس کی تاریخوں پر کوئی حتمی روشنی نہیں ڈالتے۔ آثار قدیمہ کا طریق کار Stratograpgy جس سے کھدائی کے وقت مختلف سطحوں سے تاریخوں کا یا زمانوں کا اندازہ لگاتے ہیں یہ تو ضرور بتا سکتا ہے کہ کون سی آبادی پہلے تھی اور کون سی اس کے بعد۔ دیگر واقعاتی شہادتیں مثلاً ظروف ان کے رنگ، بناوٹ، ان کے نقش و نگار، ان کے اسلوب وغیرہ کا کسی دوسرے مقام سے برآمدہ سامان سے تقابل بھی اس طریق کار میں کافی معاون ثابت ہوسکتا ہے لیکن حتمی تاریخ کا فیصلہ آخر کار ریڈیو کاربن 14 کے ٹیسٹ سے ہی کیا جاسکتا ہے مگر اس طریق کار میں بھی کئی فنی مجبوریاں ہیں۔ ڈیڑھ سو سے دو سو سال کا ادھر ادھر ہو جانا اس طریق کار میں ایک معمولی سی بات ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ازمنہ قدیم میں ریڈیو کاربن کا عمل یکساں نہیں رہا۔ اس طریقہ کار سے جو ہمیں پتا چلا ہے وہ محض اس حد تک ہے کہ ہم ایک اضافی Chronology مرتب کرسکیں اور یہ طریقہ

اصرار کے مقابلے میں ٹھہر سکوں۔ وجہ بتاؤں گی تو وہ خود کو میری قسمت میں شامل کرنے پر زور دیں گے جو میں ہرگز نہیں چاہتی اس لیے انہیں خاموش کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ خود مجھ سے شادی نہ کرنا چاہیں۔''

''ایسا کس طرح ممکن ہوگا؟''

''اس طرح کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔''

''اور اس کی کیا صورت ہوگی؟''

''یہ کہ میں انہیں یقین دلا دوں کہ میں کسی اور کو پسند کرنے لگی ہوں اور اسی سلسلے میں مجھے آپ کا مشورہ درکار ہے۔''

''میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''آپ یاور سے رابطہ قائم کرکے اس سے کہیں کہ اگر وہ مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے تو مجھ سے شادی کرلے۔'' کوثر نے بڑے حوصلے سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' مقبول صاحب حیرت زدہ رہ گئے ''تم یاور سے شادی کروگی؟''

''مجبوری ہے۔ مجھے تو بہرحال مرنا ہے یا ساری زندگی اپاہج بن کر گزارنا ہے۔'' کوثر نے جواب دیا ''یاور نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، آخر اسے اس کی کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔'' مقبول صاحب نے کہا ''یاور کھلونوں سے کھیلنے کا عادی ہے۔ وہ اپنے پیروں میں کوئی مستقل زنجیر نہیں باندھ سکتا اور بالفرض وہ آمادہ ہو بھی جائے تو جیسے ہی تمہاری حالت نازک ہوگی، وہ تمہیں ایک ناگوار بوجھ کی طرح اپنے سر سے اتار پھینکے گا، طلاق دے دے گا۔''

''مجھے سب کچھ منظور ہے۔ میں مرجاؤں یا وہ مجھے بوجھ سمجھ کر پھینک دے، میرا مقصد تو حاصل ہو جائے گا۔ شاہد کی زندگی تو میرے منحوس اثرات سے آزاد ہو جائے گی۔ وہ کسی اور سے شادی کرکے اپنا مستقبل تو سنوار لے گا۔''

''مجھے اس امر پر شبہ ہے کہ تم سے مایوس ہونے کے بعد اسے زندگی سے کوئی دلچسپی باقی رہ جائے گی۔''

''وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے سر، شاہد بھی رفتہ رفتہ ایک بے وفا کو فراموش کردے گا۔''

''تمام فیصلے تو تم نے خود ہی کرلیے ہیں اب تم مجھ سے اپنے فیصلوں پر عمل کرنے میں تعاون چاہتی ہو پھر اسے مشورے کا نام کیوں دے رہی ہو۔ مشورہ تو اسے کہتے ہیں کہ مجھے بھی اپنے خیال کا اظہار کرنے دو۔''

''مجھے آپ سے مشورہ بھی چاہیے۔'' کوثر نے کہا، اب وہ قدرے پرسکون ہوچکی تھی ''یاور کے معاملے میں، میں تذبذب میں مبتلا ہوں۔ آپ کی طرح مجھے بھی یہ اندیشہ ہے کہ وہ شادی پر آمادہ نہیں ہوگا۔ آپ سے مشورے کی ضرورت اسی صورت میں پیش آئی ہے کہ اگر یاور انکار کردے تب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''سچ پوچھو تو میں اس سلسلے میں یاور سے بات کرنے کا ہی مخالف ہوں۔''

''تب پھر میں کیا کروں کہ شاہد مجھ سے نفرت کرنے

کار دو واقعات کے مابین قرب یا بعد کو بتانے سے قاصر ہے۔ چنانچہ تمام تر کوششوں کے باوجود وادیٔ سندھ کے نہ آغاز کا پتا چلتا ہے اور نہ ہی انجام کا۔ جو ہے وہ قیاس پر مبنی ہے۔ یہ صورت حال ہڑپہ، موہنجو داڑو، کالی بنگن، لوتھل، کوتھل وغیرہ مقامات پر ماہرین کو پیش آئی ہے اور یہ مسئلہ جہاں تھا، آج تک وہیں ہے۔

آریاؤں کی ہندوستان میں آمد کے بارے میں بھی یہی دقتیں ہمارے سامنے ہیں۔ 1500 ق م یا 1200 ق م ایسی تاریخیں ہیں جو مورخوں نے محض سہولت کی خاطر وضع کرلی ہیں۔ آریاؤں نے رگ وید کے علاوہ اور کوئی دوسری شہادت پیچھے نہیں چھوڑی۔ زینر کے خیال میں آریاؤں کی برعظیم میں آمد کا زمانہ 4 ہزار ق م سے ایک ہزار ق م تک ہوسکتا ہے۔ نراد چوہدری کہتا ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آریا یہاں کب آئے۔ رالف ٹرنر بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہم صرف قیاس سے ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ 2300 ق م کے قریب انہوں نے جنوب کی طرف حرکت کی اور باختر پہنچے جہاں سے ان کی ایک شاخ جھیل ارمیا کی طرف نکل گئی اور دوسری ہندوکش کو عبور کرکے برعظیم میں داخل ہوگئی۔ ٹائبن بی بھی آریاؤں کی آمد کے بارے میں انہی محققین کا ہم خیال ہے۔

تلاش: اے جے صدیقی، کراچی

لگیں اور مجھ سے شادی کا خیال چھوڑ دیں؟''

مقبول صاحب دیر تک خاموش کچھ سوچتے رہے۔

''تم اپنی وجہ سے شاہد کی زندگی کو آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتیں نا؟'' آخر انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''اور اس کے لیے تم اپنے انکار کو کافی نہ سمجھتے ہوئے یہ چاہتی ہو کہ کوئی ایسا قدم اٹھاؤ جس سے وہ تمہیں بے وفا سمجھے اور نفرت کرنے لگے نا؟''

''جی ہاں۔''

''ایک بار پھر سوچ لو، یہ تمہارا حتمی اور آخری فیصلہ ہے؟''

''میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔''

''اس صورت میں، میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھتا ہوں۔'' مقبول صاحب نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا ''لیکن اس سے پہلے یہ وضاحت کردوں کہ میری جانب سے یہ تجویز کسی بدنیتی یا موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش پر مبنی نہیں ہے۔ میں پورے خلوص نیت اور تمہاری خواہش کے احترام میں ایسا کررہا ہوں۔''

''آپ کی تجویز کیا ہے؟''

''میں زندگی کے اس دور میں داخل ہوچکا ہوں جہاں کسی ہمسفر کی موجودگی یا غیر موجودگی کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہ جاتی۔'' مقبول صاحب بے حد سنجیدہ لہجے میں بول رہے تھے ''اس لیے تم اسے مسترد کردو یا منظور کرلو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا البتہ ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تم چاہو تو مجھ سے شادی کرسکتی ہو۔ یہ شادی ہر اعتبار سے رسمی ہوگی، اس کا واحد مقصد شاہد کو تم سے مایوس کرنا ہوگا۔ دنیا کی نظروں میں شوہر اور بیوی ہونے کے باوجود ہم اندرونی طور پر صرف اچھے دوست ہوں گے اور تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی کہ تم جب چاہو اس ظاہری رشتے کو ختم کردو۔ میرا خیال ہے کہ خود کو کسی مزید پریشانی میں مبتلا کیے بغیر تم صرف اسی طرح شاہد کی زندگی سے نکل سکتی ہو۔''

کوثر نے چونک کر مقبول صاحب کی طرف دیکھا لیکن ان کے چہرے پر کوئی غیر مخلصانہ تاثر نہ پاتے ہوئے اپنی نظریں نیچی کرلیں۔ مقبول صاحب اپنی بات ختم کرچکے تو وہ کافی دیر تک اس تجویز کے مختلف پہلوؤں اور امکانات کا جائزہ لیتی رہی۔

''آپ واقعی ایک بہت ہی اچھے انسان ہیں۔'' آخر اس نے جواب دیا ''مجھے آپ کی تجویز منظور ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس تعلق کے حوالے سے آپ مجھے آپریشن کے لیے مجبور کرکے ایک گراں خرچ سے زیر بار نہیں کریں گے۔''

''آخر تم خود اپنی اس قدر دشمن کیوں بن گئی ہو؟'' مقبول صاحب نے کہا ''تمہیں پورا یقین ہوچکا ہے کہ خدانخواستہ یا تو تم معذور ہو جاؤ گی یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی، اس صورت میں تم اپنے بہی خواہوں کو یہ اختیار کیوں نہیں دیتیں کہ وہ تمہیں بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کرلیں۔''

''میں اگر اپنے علاج و معالجے کے اخراجات اٹھانے

کے قابل ہوتی تو ضرور ایسا کرتی لیکن اپنی تنگدستی کی صورت میں نہ جانے کیوں میرا دل اور ضمیر اس پر آمادہ نہیں ہوگا کہ کوئی اور یہ بوجھ اٹھائے اور پھر یا تو ناکامی اس کا مقدر بنے یا زندگی بھر کے لیے میری خودداری اس احسان کے عوض فروخت ہوجائے۔“

”خیر یہ بعد کی بات ہے، اس پر ضرورت محسوس ہوئی تو بات کرلیں گے مگر یقین رکھو کہ میں تمہیں کبھی کسی بھی کام کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔“

”آپ یہ وعدہ کرتے ہیں تو پھر مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔“ کوثر نے جواب دیا۔

☆☆☆

کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کوثر نے اپنی والدہ کو کس طرح اپنے فیصلے کی تائید کرنے پر آمادہ کیا لیکن مقبول صاحب سے اس گفتگو کے ایک ہفتے بعد شاہد کی طرف سے منگنی میں دی ہوئی انگوٹھی اور جوڑا واپس کرکے گویا بالواسطہ منگنی توڑنے کا اعلان کردیا گیا۔ شاہد نے کوثر سے بات کی تو کوثر نے بالکل سپاٹ لہجے کے ساتھ جواب دیا کہ وہ کسی تفصیلی گفتگو یا وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ بات صرف اتنی ہے کہ دوبارہ غور کرنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ شاہد سے شادی نہیں کرسکتی اس لیے اس موضوع پر مزید گفتگو بیکار...... اور ایک دوسرے کا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگی۔

شاہد پھر بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ایسی نوعیت کی پیش آئی ہے جس نے دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی کوثر کو اس فیصلے پر مجبور کردیا ہے اس لیے مزید اصرار کرنے اور بضد ہونے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ کچھ دن انتظار کرے اور پھر کوثر سے دوبارہ بات کرے لیکن دوبارہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ دوسرے ہفتے بغیر کسی پیشگی اطلاع اور اعلان کے مقبول صاحب اور کوثر کی شادی ہوگئی اور شاہد کو بجا طور پر یہ شک کرنے کا موقع ملا کہ کوثر کے انکار کے پس منظر میں اصل وجہ یہی تھی کہ اسے مقبول صاحب نے پروپوز کیا تھا اور کوثر نے ایک عام لڑکی کی طرح پیار ومحبت کو دولت اور عیش و آرام پر قربان کرتے ہوئے مقبول صاحب سے شادی کرلی۔

شادی کے دوسرے دن ہی اس نے مقبول صاحب کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

☆☆☆

تقدیر بھی کبھی کبھی ایسے انقلابات لے آتی ہے کہ اسے ستم ظریفی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ شاہد کی والدہ کے ایک ہی بھائی تھے جو اپنی نوجوانی کے دنوں میں کسی بات پر اپنے والد سے شدید اختلاف کے باعث گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تب سے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کررہے ہیں؟ یہاں تک کہ والدین اور عزیز واقارب تو ان کی زندگی کے بارے میں بھی مایوس ہوچکے تھے۔ شاہد نے مقبول ٹریڈنگ کمپنی کی سروس چھوڑ کر دوسری جگہ ملازمت کی تلاش شروع کی لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہورہی تھی۔ ایک دو جگہ آمادگی کا اظہار تو کیا گیا لیکن تنخواہ اتنی کم بتائی گئی کہ شاہد اسے قبول نہیں کرسکا۔ اس دوران اس نے ایم کام فائنل بھی پاس کرلیا لیکن پھر بھی اس کو حسب خواہش سروس نہیں مل رہی تھی کہ اچانک تقریباً چالیس سال کے بعد افریقا سے وکلا کی ایک فرم کا خط اسے موصول ہوا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے ماموں سید محمود حسین بہت بیمار ہیں اور نیروبی کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ وہ فوری طور پر اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر شاہد آمادہ ہو تو سفر کے جملہ انتظامات ایک ہفتے میں کیے جاسکتے ہیں۔

اس خط نے ناقابل بیان خوشی کے ساتھ ہی شاہد کے والدین کو ایک تجسس میں بھی مبتلا کردیا۔ چالیس برس کے بعد بھائی نے بہن کو یاد کیا تھا۔ شاہد کی والدہ کی بے تابی اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ وہ بھی شاہد کے ساتھ ہی افریقا جانا چاہتی تھیں مگر وکلا کی فرم صرف شاہد کے اخراجات کی ذمے داری لینے کو تیار تھی بلکہ اس کی جانب سے یہ عندیہ بھی ملا تھا کہ محمود حسین صاحب صرف اس سے ملنا چاہتے ہیں چنانچہ شاہد ہی نیروبی گیا۔ اپنی والدہ کی اس تاکید کے ساتھ کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ یا تو ماموں کو وطن لانے کی کوشش کرے یا ان سے کہے کہ وہ اپنی بہن کو بھی کم سے کم ملاقات کے لیے ہی افریقا بلالیں۔

محمود حسین صرف بسترِ علالت پر نہیں بلکہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور انہیں مشینی آلات کی مدد سے زندہ رکھا جارہا تھا۔ اتفاق سے جس دن شاہد نیروبی پہنچا اس دن محمود صاحب کی کیفیت نسبتاً بہت بہتر تھی جسے بجھتے چراغ کا آخری سنبھالا بھی کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بھانجے کو سینے سے لگایا، سر سے پیر تک بہ غور دیکھا پھر ان کے اور شاہد کے درمیان جو باتیں ہوئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ گھر سے نکل کر ایک تاجر کے ہمراہ افریقا چلے آئے تھے۔ جہاں چند برس انہوں نے اس تاجر کی

ملازمت میں گزارے۔ وہ تاجر ان سے اس قدر خوش ہوا کہ اپنی بیٹی کی شادی ان کے ساتھ کردی اور اس کی موت کے بعد اس کا تمام بزنس جو بیشتر ہاتھی دانت کی تجارت پر مشتمل تھا، محمود صاحب کی ملکیت میں آگیا۔ بدقسمتی سے محمود صاحب کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انہوں نے بہت علاج کیے اور اسی علاج کے سلسلے میں کسی ٹوٹکے پر عمل کرنے سے ان کی بیوی کی جان پر بن گئی اور بالآخر ایک سال بیمار رہ کر وہ چل بسیں۔ محمود صاحب نے دوسری شادی نہیں کی اور اب جب خود ان کی زندگی کی گنی چنی سانسیں رہ گئیں تب انہوں نے .... اپنے آدمی بھیج کر اپنے عزیز واقارب کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اس کے نتیجے میں انہیں رپورٹ دی گئی کہ ان کی اکلوتی بہن کا اکلوتا بیٹا شاہد موجود ہے اور بہت ذہین، محنتی، تعلیم یافتہ اور سمجھ دار نوجوان ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے قانونی مشیر کے ذریعے شاہد کو نیروبی بلایا ہے اور اب جبکہ وہ آگیا ہے اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئے ہیں، وہ اسے اپنا وارث قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ شاہد کی مرضی پر ہوگا کہ وہ افریقا میں رہ کر ان کے بزنس کو جاری رکھے یا اسے فروخت کرکے تمام دولت پاکستان لے جائے اور وہاں کوئی کاروبار کرلے۔ شاہد نے واپس جانے کو ترجیح دی۔ محمود صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسرے دن وصیت نامہ تیار ہوگیا اور چونکہ شاہد بزنس ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے محمود صاحب نے اپنی وصیت میں اپنے پرانے ساتھیوں اور کمپنی کے ورکرز کو بھی انعامات سے نوازا۔

تیسرے دن محمود صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں نیروبی میں ہی ان کی بیوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شاہد کو بزنس فروخت کرنے کے سلسلے میں مزید ٹھہرنا پڑا۔ اس کام میں محمود صاحب کے قانونی مشیر نے بہت مدد کی ایک ماہ کے اندر تمام بزنس اور محمود صاحب کی افریقا میں موجود تمام جائداد کا سودا ہوگیا۔ شاہد وطن واپس لوٹا تو تقدیر کے انقلاب نے اسے لکھ پتی نہیں بلکہ کروڑ پتی بنادیا تھا۔

☆☆☆

شاہد نے اس دولت کو بڑی سوجھ بوجھ سے مختلف کاروبار میں لگادیا۔ اس کے فیصلے درست بھی ثابت ہوئے اور تمام ہی بزنس منافع بخش انداز میں چلنے لگے لیکن خود شاہد میں ذہنی طور پر ایک تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ کوثر کے طرز عمل نے اسے پوری صنفِ نازک کے خلاف کردیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عورت صرف دولت پرست ہوتی ہے۔ کسی بھی حسین سے حسین لڑکی کو دولت سے خریدا اور دل بھر جانے پر ناکارہ کھلونے کی طرح مسترد کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اس راستے پر پوری بے باکی سے چلنے کی کوشش کی لیکن اس کی فطری بلند اخلاقی اور پاکیزہ کردار نے اسے انتہائی حدود کو پار کرنے سے باز رکھا اور اس نے کوثر کی روش سے پیدا ہونے والے غم و غصے کی آگ کو صرف اس انداز میں بجھانے پر اکتفا کیا کہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنی دولت کی چمک دمک سے رجھانے کے بعد جب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتی تھیں تو انہیں انتہائی ذلت آمیز برتاؤ کے ساتھ ٹھکرا کر گھر سے نکال دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

ان ہی دنوں کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ کوثر کی سہیلی طاہرہ کے والدین ایک بار پھر اپنے آبائی شہر واپس آگئے۔ کوثر اور طاہرہ کی خط وکتابت تو کبھی مستقل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ دو چار ماہ کے وقفے سے دونوں کے خطوط ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر رسمی انداز کے خطوط ہوتے تھے جس میں بس ایک

ٹیپو سلطان کو موسیقی سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ وہ فنِ موسیقی سے بھی واقف تھے۔ اس کمالِ فن کے باعث ان کی سرپرستی میں فنِ موسیقی پر ایک کتاب 1199 ہجری میں لکھی گئی اس کا نام ”مفرح القلوب“ ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کے نو نسخے موجود تھے۔ اس کے مصنف عباداللہ ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ایک فارسی دیباچہ بھی ہے جس میں اس امر کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ٹیپو سلطان کے حسبِ خواہش یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اس میں موسیقی کے قواعد وضوابط کے ساتھ راگ اور راگنیوں اور نغموں کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر راگ کے تحت غزلوں کو لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے دیباچہ میں اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ ”مفرح القلوب“ کی تصنیف کیوں کرائی گئی ہے۔ دیباچہ کا مختصر ترجمہ درج ذیل ہے۔

”چونکہ دین اور دنیا جسم وجان لازم وملزوم ہیں۔ اسی طرح حرب اور ضرب بھی ایک دوسرے کے ساتھ جزولاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حرب یعنی لڑائی کے متعلق ایک کتاب مرتب ہوچکی ہے اس لیے اب ضرب یعنی موسیقی کے متعلق یہ کتاب مرتب کی جاتی ہے۔“

اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

دوسرے کی خیر و عافیت کا تذکرہ ہی ہوتا تھا۔ طاہرہ جب واپس آ کر تفصیلی طور پر کوثر سے ملی تو اسے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ اب وہ مسز مقبول بن چکی ہے۔ وہ شاہد اور کوثر کی محبت سے واقف تھی۔ اس لیے اسے فطری طور پر اس انقلاب سے دکھ ہوا۔ کوثر نے ابھی تک اسے نہ اپنی بیماری کے بارے میں کچھ لکھا تھا اور نہ اپنی شادی کے بارے میں۔ اس لیے فطری طور پر طاہرہ کا پہلا تاثر بھی یہی تھا کہ کوثر نے شاہد کو صرف اس لیے مسترد کر دیا کہ وہ غریب تھا اور مقبول صاحب سے، ان کی عمر زیادہ ہونے کے باوجود صرف اس لیے شادی کی کہ وہ دولت مند تھے اور کوثر کو دنیا کی تمام راحتیں اور آسائشیں مہیا کر سکتے تھے۔

''مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔'' وہ بولی۔

''کیسی؟'' کوثر نے دانستہ انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''کہ تم شاہد کے ساتھ شادی کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دو گی کہ وہ فی الحال تمہیں بنگلا، کار، زیورات' قیمتی ملبوسات اور ایک بڑا بینک بیلنس نہیں دے سکتا تھا۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ میں نے مقبول صاحب سے دولت کے لالچ میں شادی کی ہے؟''

''ظاہر ہے ورنہ شاہد کو ٹھکرانے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''شکر ہے کہ تم...... میری بچپن کی سہیلی جب ایسا سمجھ سکتی ہو تو شاہد کی سوچ بھی مختلف نہیں ہو گی۔''

''کیا کہا تم نے؟'' طاہرہ نے چونک کر کوثر کی طرف دیکھا ''تم اس پر شکر ادا کر رہی ہو؟''

''کیونکہ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ شاہد مجھ سے نفرت کرنے لگے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ اس صورت کے علاوہ اسے ایک زندہ لاش کے ساتھ شادی کرنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔''

''زندہ لاش...... کون تم...... کیا ہوا ہے تمہیں؟'' طاہرہ نے اضطراب سے پوچھا۔

اور جواب میں کوثر نے اسے پوری روداد سنا دی۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' طاہرہ یہ سب کچھ سن کر بے تاب ہو گئی۔

''سر میں بہ دستور درد رہتا ہے۔ علاج جاری ہے مگر ڈاکٹروں کے خیال میں صرف آپریشن ہی اس کا علاج ہے۔''

''اور تم آپریشن کرانا نہیں چاہتیں۔ تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''تم اسے میرا پاگل پن کہہ سکتی ہو۔''

''بلاشبہ تم پاگل ہی ہو۔'' طاہرہ نے کہا ''اچھا مقبول صاحب کا رویہ کیسا ہے؟''

''وہ حرف بہ حرف اپنے وعدے کی پابندی کر رہے ہیں۔ ہم دونوں الگ بیڈ روم میں سوتے ہیں۔ سچ یہ ہے طاہرہ کہ ابھی تک میری نظروں سے مقبول صاحب جیسا پاک باطن آدمی نہیں گزرا۔ اگر میں نے شاہد سے محبت نہ کی ہوتی اور یہ بیماری مجھے لاحق نہ ہوتی تو ان کی رفاقت کو زندگی کا بہترین انعام جانتی۔''

☆☆☆

طاہرہ نے شاہد کا صرف تذکرہ ہی سنا تھا۔ کبھی اسے دیکھا نہیں تھا۔ ایک سہ پہر وہ کچھ شاپنگ کے بعد ٹیکسی میں اپنے گھر واپس جا رہی تھی اچانک ٹیکسی کا انجن بند ہو گیا اور ڈرائیور کی تمام تر کوشش کے باوجود پھر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ طاہرہ نے ٹیکسی سے اتر کر کسی دوسری سواری کی تلاش کی مگر سڑک نسبتاً سنسان تھی، نصف گھنٹا انتظار کے بعد بھی کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر نہیں آئی تب اس نے کسی سے لفٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک پڑھی لکھی، آزاد خیال لڑکی تھی، ایک ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے لفٹ لینے کے سلسلے میں اس کے ذہن میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی... پھر جس شہر سے وہ آئی تھی اور جس سوسائٹی میں اب تک رہی تھی، وہاں یہ ایسی کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی۔ اس لیے بغیر کچھ زیادہ سوچے گزرنے والی کاروں سے لفٹ مانگنے کا مخصوص اشارہ آزمانا شروع کر دیا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ جو کار اس کے اشارے کے جواب میں رکی اسے شاہد ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے بڑی شرافت کے ساتھ طاہرہ کو اس کے گھر تک چھوڑ دیا۔ اس اتفاقی ملاقات کے بعد وہ ایک دو بار مزید کبھی بازار میں اور کبھی کسی پبلک تفریحی مقام پر ملے۔ شاہد کو ایک اور شکار ہاتھ آتا نظر آیا۔ اس نے ان ملاقاتوں کو دانستہ بنانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ طاہرہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگی۔ شاہد کا طریقہ تھا کہ جن لڑکیوں سے اسے کوثر کا انتقام لینا ہوتا تھا انہیں ہمیشہ اپنے نام کا دوسرا جز حمید بتاتا تھا۔ یہی نام اس نے طاہرہ کو بھی بتایا۔

جلد ہی شاہد طاہرہ کو اپنے اس بنگلے تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو اس نے خاص اسی مقصد سے خریدا تھا۔ طاہرہ دو تین بار گئی اور بغیر کسی غیر معمولی بات کے واپس بھی آ گئی جس سے فطری طور پر شاہد کی ذات پر اس کا اعتماد بڑھ گیا پھر ایک دن... بلکہ ایک شام شاہد نے اپنی

آخری چال چلی۔ طاہرہ بھی جذبات کی رو میں بہنے لگی۔ لیکن اسے اتنا ہوش باقی تھا کہ جب شاہد نے اس کے ملبوس پر ہاتھ ڈالا تو وہ الگ ہو گئی۔ یہ شاہد کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسے ہر موقعے پر وہ لڑکی کے سامنے زیورات اور نوٹوں کی گڈیوں کے ڈھیر لگا دیا کرتا تھا اور جب لڑکی دولت کے چندھیا دینے والے لالچ میں آ کر قدم بڑھانے کے لیے آمادہ ہو جاتی تھی تب وہ اسے کم و بیش نیم عریاں کیفیت میں طوائف، ذلیل اور آوارہ کے خطابات دے کر بنگلے سے دھکے دے کر نکال دیا کرتا تھا۔ اس نے طاہرہ کے چاروں طرف بھی جگمگاتے زیورات اور نوٹوں کے بنڈلوں کے ڈھیر لگا دیے... مگر طاہرہ بہت مختلف لڑکی تھی۔

''تم نے آج میرے اعتماد کو وہ ٹھیس پہنچائی ہے کہ اب شاید میں دوبارہ کبھی کسی مرد پر اعتبار نہ کر سکوں۔'' اس نے زیورات اور نوٹوں کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے کہا۔

''اعتماد کو ٹھیس پہنچانے میں تو تمہاری صنف کا بھی جواب نہیں۔'' شاہد نے تلخ لہجے میں جواب دیا ''تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر تم یہ سب کچھ قبول کر لیتیں تو میں سچ مچ حد سے گزر جاتا۔ جیسے ہی تمہاری طرف سے آمادگی کا اظہار ہوتا میں تمہیں ٹھوکریں مار کر بنگلے سے نکال دیتا۔''

''میں یقین نہیں کر سکتی۔''

''مجھے تمہارے یقین کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''مگر تم یہ سب کچھ کس لیے کرتے ہو؟''

''اس لیے کہ تم جیسی ایک لڑکی نے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ اس نے محبت مجھ سے کی اور شادی دولت سے کر لی کیونکہ تب میں غریب تھا۔''

''اب جبکہ میں اس تعلق کی نوعیت سے واقف ہو چکی ہوں تو مجھے اس لڑکی کے بارے میں بھی بتا دو۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔'' شاہد نے ایک گہری سانس لی ''تم پہلی لڑکی ہو جس نے نہ صرف دولت کو ٹھکرا دیا بلکہ سچ پوچھو تو میرا دل تمہارے ساتھ وہ سلوک کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھا جو میں اب تک دوسری لڑکیوں کے ساتھ کرتا رہا ہوں... مگر جو گزر چکا وہ گزر چکا۔ اسے دہرانے سے اپنے زخم تازہ کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں اپنے سلوک پر شرمندہ ہوں۔ تم واپس جا سکتی ہو۔''

''مجھے یہ سن کر دکھ ہوا کہ کسی لڑکی نے تمہاری محبت کو دولت کے لیے ٹھکرا دیا۔'' طاہرہ نرم لہجے میں بولی ''لیکن جس حد تک بھی میں تمہیں سمجھ سکی ہوں، مجھے تم ایسے نوجوان معلوم نہیں ہوتے جو کسی ایک کی زیادتی کا انتقام دوسرے بے قصور افراد سے لے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ اس طرح تم نے خود کو اس لڑکی کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر اس نے برا کیا تھا تو کیا جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ کوئی اچھی بات ہے؟''

''سچ کہا تم نے۔ میں غصے کے اندھے پن میں بہک گیا تھا۔'' شاہد نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''تب پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ آیندہ تم اپنا یہ طرزِ عمل ترک کر دو گے۔''

''تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود بھی اپنے دل میں یہی فیصلہ کر چکا تھا۔'' شاہد نے جواب دیا۔

☆☆☆

طاہرہ اس رات گھر واپس پہنچی تو اس کے دل میں شاہد کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ محبت، ہمدردی اور غمگساری پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کے بعد بھی ایک دوسرے سے ملتے رہے اور دن بہ دن ان کی باہمی پسندیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ شاہد نے، جو آیندہ کبھی کسی بھی لڑکی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، ایک شام طاہرہ سے اپنی چاہت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے شادی کی پیشکش کر دی جو طاہرہ نے کسی قدر شرماتے ہوئے منظور کر لی۔

☆☆☆

کوثر کی بیماری کو ایک دو نہیں چھ ماہ گزر چکے تھے اور حیرت انگیز طور پر اس کی حالت دن بہ دن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ مقبول صاحب کو معلوم نہیں تھا لیکن کوثر نے شادی کے بعد سے دوائی علاج بھی ختم کر دیا تھا۔ دوائیں بازار سے خریدی ضرور جا رہی تھیں مگر وہ استعمال ہونے کے بجائے کوثر کی الماری کے ایک خانے میں جمع ہو رہی تھیں۔ اس حرکت سے کوثر کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ اپنے انجام کو قریب سے قریب تر لے آئے تاکہ اسے اپنی جذباتی کیفیت سے جلد از جلد نجات حاصل ہو جائے لیکن معاملہ اس کے برعکس ثابت ہوا۔ اس کی حالت ڈاکٹر شریف کے اندیشوں کے برخلاف ہر گزرتے دن کے ساتھ بہتر ہو رہی تھی۔

مقبول صاحب نے اس صورتِ حال کو رحمت الٰہی کا سبب جانا اور ایک بار پھر کوثر کو ڈاکٹر شریف کے اسپتال لے گئے تاکہ نہ صرف اس کی اچھی صحت کے بارے میں بتایا جائے بلکہ مکمل چیک اپ کر کے یہ اطمینان بھی حاصل کر لیا جائے کہ کوثر اپنی خطرناک بیماری سے بچ نکلی ہے۔ ڈاکٹر شریف نے حیرت کے ساتھ تمام احوال سنا۔ ایک مرتبہ پھر تمام ٹیسٹ اور ایکسریز لیے گئے اور جب رپورٹیں سامنے آئیں تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کوثر کو سرے سے کوئی

بیماری ہی نہیں تھی۔ اس کے سر میں چوٹ ضرور لگی تھی مگر سر کی ہڈی سلامت تھی۔ سر کا درد، بھوک کی کمی، چکر آنا، متلی جیسی کیفیت۔ دماغ کے خلیوں کو چوٹ پہنچنے کی علامات تھیں جنہیں یا تو خود قدرت نے یا ابتدائی دوائی علاج نے صحت پذیر کردیا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ سوال پیدا ہوا کہ پھر اس وقت کے ٹیسٹ کیوں غلط رپورٹ تک پہنچے۔ ڈاکٹر شریف نے لیبارٹری کے ریکارڈ کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور تب یہ انکشاف ہوا کہ جن دنوں کوثر کے ٹیسٹ ہورہے تھے ان ہی دنوں لیبارٹری میں ایک دوسرے ڈاکٹر کی مریضہ کے بھی ٹیسٹ کیے جارہے تھے۔ دونوں کیس اپنی علامات کے اعتبار سے یکساں تھے اس لیے ان کے جو بھی ٹیسٹ لیے گئے، وہ ایک دوسرے میں مل گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مریضہ کی رپورٹیں ڈاکٹر شریف کو بھیج دی گئیں اور کوثر کی رپورٹیں اس دوسری مریضہ کی رپورٹوں کے بطور اس کے ڈاکٹر کو روانہ کردی گئیں۔ یہ ایک سنگین غلطی تھی۔ ڈاکٹر شریف نے فوراً دوسرے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے حالات معلوم کیے، معلوم ہوا کہ دوسری مریضہ کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی اس لیے ڈاکٹر نے رپورٹوں کے برخلاف فوری طور پر مریضہ کا آپریشن کر کے اس کی جان بچالی۔ ڈاکٹر شریف نے اطمینان کی سانس لی کہ ان کے اسپتال کی لیبارٹری کی غلطی نے کوئی سنگین صورت اختیار نہیں کی۔ انہوں نے بے پروائی برتنے کے الزام میں لیبارٹری انچارج کو برطرف کردیا اور مقبول صاحب کو یہ خوش خبری سنادی کہ کوثر کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا انہیں اس پر افسوس ہے۔ وہ ایک دوسری مریضہ کی رپورٹیں تھیں جن کی بنیاد پر انہوں نے اپنے خدشات ظاہر کیے تھے۔

فطری طور پر یہ خوش خبری سن کر کوثر کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ وہ اب تک دانستہ شاہد کے حالات جاننے سے گریز کرتی رہی تھی اور مقبول صاحب نے بھی کبھی اس کے سامنے شاہد کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اب یہ معلوم کر کے کہ اس کی صحت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے کوثر کے دل میں یہ امید جاگ اٹھی کہ اگر وہ شاہد سے تمام واقعات بیان کردے تو وہ اسے ضرور معاف کردے گا۔ اس نے مقبول صاحب سے کہا کہ وہ شاہد سے ملنا چاہتی ہے۔ مقبول صاحب اس کے خیالات و جذبات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کوثر کو یہ بھی بتادیا کہ اس دوران شاہد کی زندگی خود ایک انقلاب سے دوچار ہوچکی ہے، اس کے ماموں اپنا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کروڑوں کی دولت شاہد کے نام چھوڑ گئے ہیں اور اب شاہد وہ غریب اور تنگدست شاہد نہیں رہا بلکہ شہر کا ایک کامیاب بزنس مین اور متمول فرد بن چکا ہے۔

☆☆☆

مقبول صاحب نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ شاہد نے اپنے والدین کو ایک الگ بنگلے میں رکھا ہے اور خود تنہا ایک دوسرے بنگلے میں رہتا ہے۔ یوں وہ صبح شام والدین سے ملنے آتا جاتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسی بنگلے میں رہ بھی جاتا ہے مگر اس کا زیادہ تر قیام اپنے دوسرے بنگلے میں ہوتا ہے۔ مقبول صاحب کے نزدیک یہ ایک فطری بات تھی کہ شاہد جس جذباتی صدمے سے گزرا تھا اس کے بعد وہ تنہائی پسند ہوجائے اس لیے انہوں نے اس معلومات پر کوئی حیرت ظاہر نہیں کی اور کوثر کو دوسرے بنگلے کا پتا بتادیا۔ کوثر خود بھی اکیلے جانا چاہتی تھی اور مقبول صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ بات بگڑنے کے اندیشے کے پیشِ نظر اس کے ساتھ نہ جائیں۔

چنانچہ ایک شام کوثر شاہد کے بنگلے پر جا پہنچی۔ باہر کوئی چوکیدار یا ملازم نہیں تھا اس لیے وہ کار سے اتر کر سیدھی بنگلے کے اندر داخل ہوتی چلی گئی... مگر وہاں اس کی نظروں نے جو منظر دیکھا اور جو باتیں سنیں انہیں اس کی بعید ترین توقع بھی نہیں تھی۔ شاہد اور طاہرہ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی عنقریب ہونے والی شادی کے انتظامات پر گفتگو کررہے تھے۔ کوثر نے ان کی اتنی باتیں سن لیں جن سے اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ شاہد اس سے مایوس ہوچکا تھا۔ تقدیر نے اس کی ملاقات طاہرہ سے کرادی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور اب شادی کرنے والے ہیں۔ وہ جس طرح آئی تھی، اسی طرح خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔

مقبول صاحب نے اسے افسردہ اور مایوس واپس آتے دیکھا۔ وجہ پوچھی، کوثر کے لیے حقیقت چھپانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ بتادیا اور یہ بھی کہا کہ طاہرہ اس کی عزیز ترین سہیلی ہے، وہ اس کے راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ تقدیر اپنا فیصلہ دے چکی ہے اور اسے اس فیصلے سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔

مگر مقبول صاحب کو کوثر کے اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کے نزدیک کوثر شاہد کو خوش رکھنے کی کوشش میں ضرورت سے زیادہ قربانیاں دے چکی تھی۔ وہ کوثر کو بتائے بغیر طاہرہ سے ملے۔

"سنا ہے تم شاہد سے شادی کررہی ہو؟"

"آپ نے غلط سنا ہے۔ میں اپنی پیاری سہیلی کی محبت کو کیسے لوٹ سکتی ہوں؟" طاہرہ نے جواب دیا "میں شادی ضرور کررہی ہوں مگر ان صاحب کا نام شاہد نہیں حمید ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ شاہد کا پورا نام شاہد حمید ہے۔" مقبول صاحب نے جواب دیا۔

اور پھر کوثر کی صحت یابی سے لے کر اس کے شاہد کے بنگلے پر جانے اور وہاں شاہد کو طاہرہ سے باتیں کرتے دیکھ کر واپس آنے کی تمام روداد سنادی۔

"خدا کی قسم مقبول صاحب!" طاہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "جو کچھ ہوا وہ غلط فہمی میں ہوا۔ آپ ابھی میرے ساتھ شاہد کے پاس چلیں، ہم دونوں انہیں بتائیں گے کہ کوثر ان کی چاہت میں کن کن اذیتوں سے گزر چکی ہے۔ میں دانستہ کوثر کے راستے میں آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میں خود شاہد کو مجبور کروں گی کہ ان تمام حالات میں کوثر کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی شادی بھی ایک دکھاوا ہے اس لیے اب دو بچھڑے ہوئے دلوں کو مل ہی جانا چاہیے۔"

مقبول صاحب اور طاہرہ اسی وقت شاہد کے بنگلے پر پہنچے اور کوثر کو دفتر میں پیش آنے والے واقعے سے لے کر اس کی طبیعت کی خرابی، ڈاکٹر شریف کی پیش گوئی، موت یا اپاہج پن کے خطرے کو دیکھتے ہوئے کوثر کے شاہد کی زندگی سے نکل جانے کے فیصلے اور پھر شاہد اس سے نفرت کرنے لگے اس لیے مقبول صاحب سے دکھاوے کی شادی... پھر چھ سات ماہ گزرنے کے باوجود کوثر کی طبیعت بہتر ہونے، اس کے دوبارہ چیک اپ کے لیے ڈاکٹر شریف کے پاس جانے اور وہاں یہ انکشاف ہونے تک کہ کوثر کو کبھی کوئی ایسی بیماری لاحق ہی نہیں تھی، تمام داستان سنادی۔

"آپ پر افضل ترین حق کوثر کا ہے۔" طاہرہ نے آخر میں کہا "غلط فہمی میں ہم نے ایک دوسرے سے جو وعدے کیے تھے۔ میں آپ کو ان سے آزاد کرتی ہوں اور ویسے بھی ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کے سامنے آنے کے بعد میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔ اب آپ خواہ کوثر کو معاف کریں یا نہ کریں، آج سے میرے اور آپ کے راستے جدا ہورہے ہیں۔"

"کوثر کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شاہد نے بھیگی آنکھوں سے جواب دیا "اس نے کوئی غلطی، کوئی گناہ نہیں کیا۔ ناسمجھ تو میں تھا کہ اس کی محبت کا اندازہ ہی نہیں کرسکا۔ اگر کوثر مجھے معاف کرسکے تو میں اس کی رفاقت کو زندگی کا سب سے بڑا انعام سمجھوں گا۔"

معاملات کے اس خوش اسلوبی سے طے ہونے پر سب ہی بے حد خوش و مطمئن تھے۔ اسی وقت کوثر کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے روانہ ہوگئے کہ بالآخر اس کی آزمائش تمام ہوئی۔ اس کی چاہت جیت گئی اور اب ایک خوشگوار زندگی اس کا انتظار کررہی ہے۔

☆☆☆

لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ طاہرہ شاہد کو کوثر کی داستان سنا رہی تھی، مقبول صاحب کے بنگلے میں ایک نیا المیہ وقوع پذیر ہوچکا تھا۔ یاور اپنی بے عزتی کو بھولا نہیں تھا۔ وہ کمپنی سے نکالے جانے کے بعد سے اب تک انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ کوثر اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی جس نے اسے اس بری طرح شکست دی تھی کہ وہ آج تک اس کے اثرات سے نجات نہیں پاسکا تھا۔ مقبول ٹریڈنگ کارپوریشن سے برطرف کیے جانے کے بعد سے اب تک اسے کوئی ملازمت نہیں ملی تھی اور نوبت فاقہ کشی تک پہنچنے والی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب اسے کوثر سے بدلہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اس شام کے اندھیرے میں تیزاب کے ایک بھرے ہوئے ٹن کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوا۔ کوثر کو اپنے کمرے میں تنہا پایا اور اس سے پہلے کہ کوثر اس کی آمد سے باخبر ہوکر اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرسکے، سارا کا سارا تیزاب اس پر الٹ دیا۔

کوثر کی چیخوں کو سن کر بنگلے کے ملازم اس کے کمرے کی طرف لپکے اور بھاگتے ہوئے یاور کو اس کی تمام تر جدوجہد کے باوجود فرار ہونے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ایک ملازمہ نے کوثر کی حالت دیکھی اور فوراً ڈاکٹر شریف کے اسپتال فون کردیا۔ ڈاکٹر شریف خود ایمبولینس کے ساتھ بنگلے پر پہنچے اور کوثر کو اسی وقت اسپتال لے گئے۔ تب تک ایک دوسرے فون کے نتیجے میں پولیس بھی آگئی تھی جس نے یاور کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کر کے حوالات پہنچادیا۔

شاہد، طاہرہ اور مقبول صاحب بنگلے پر پہنچے تو انہیں اس المناک واقعے کا علم ہوا اور وہ فوراً ڈاکٹر شریف کے اسپتال روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

ان دنوں مجھے ڈاکٹر شریف کے اسپتال میں انچارج نرس کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے صرف ایک ہی ہفتہ گزرا تھا۔ میں نے کوثر کو ایمبولینس سے اتار کر ایمرجنسی روم میں لے..... جاتے دیکھا۔ تیزاب سے اس کا سارا جسم

اس بری طرح جل گیا تھا کہ پہچانی نہیں جارہی تھی لیکن ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد جب میں نے طاہرہ کو مقبول صاحب اور شاہد کے ساتھ آتے دیکھا تو اسے فوراً پہچان لیا۔

کوثر اور طاہرہ دونوں ہی میٹرک تک میری کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ ہمارے درمیان گہری دوستی تو نہیں تھی مگر ایسے سطحی تعلقات بھی نہ تھے کہ ایک دوسرے کو فراموش کردیا ہوتا۔ میٹرک کے بعد طاہرہ اپنے والدین کے ساتھ دوسرے شہر منتقل ہوگئی۔ کوثر نے کالج جوائن کرلیا اور میں نے اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہوکر نرسنگ ٹریننگ کورس میں داخلہ لے لیا۔ کوثر سے کچھ دنوں تک ملاقاتیں رہیں مگر پھر حالات نے ہمیں ایک دوسرے سے بالکل جدا کردیا۔ میں نے کورس پاس کیا تو ملازمت کے سلسلے میں کئی برس دوسرے شہروں میں رہی پھر کوشش کرکے اپنے ہی شہر کے ایک اسپتال میں درخواست دی جو حسنِ اتفاق سے منظور ہوگئی یوں میں تو واپس آگئی مگر طاہرہ اور کوثر سے جو رابطہ منقطع ہوا تھا وہ پھر قائم نہ ہوسکا۔ اب جو میں نے طاہرہ کو آتے دیکھا تو اسے پہچان کر تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا مگر وہ اس وقت دوسری ہی شکل میں تھی۔ اس وقت تو اس نے صرف اتنا ہی بتایا کہ ایک شخص نے انتقاماً کوثر پر تیزاب ڈال دیا ہے۔

کوثر اس بری طرح جل گئی تھی کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ڈاکٹر شریف نے نہ صرف خود بلکہ شہر کے دوسرے اچھے ڈاکٹروں سے مشورہ بھی کیا لیکن تیزاب کھال کو جلا کر ہڈیوں تک پہنچ چکا تھا۔ دو راتیں اور ایک دن تک کوثر کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر وہ غریب جاں بر نہ ہوسکی اور تیسری شام کا سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بھی گل ہوگیا۔ اس دوران طاہرہ کا بیشتر وقت اسپتال میں ہی گزرا اور جو حالات میں نے اوپر بیان کیے ہیں وہ میں نے طاہرہ ہی کی زبانی پوری تفصیل سے سنے تھے۔

فطری طور پر کوثر کی اس انداز میں موت سے سب ہی کو گہرا صدمہ تھا۔ جب بہ ظاہر تمام حالات اس کے حق میں سازگار ہوگئے تھے تو تقدیر نے ایک دوسرے انداز میں اس کی زندگی کی مہلت ختم کردی... اور یوں وہ بے چاری محروم ہی دنیا سے رخصت ہوگئی۔

تدفین کے وقت کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ شاہد کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اسے کوثر سے معافی مانگنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ مقبول صاحب اور طاہرہ کے غم میں یہ پہلو زیادہ نمایاں تھا کہ ان کی تمام تر کوششیں ایثار اور قربانی کے باوجود وہ شاہد اور کوثر کو ایک کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

مگر زندگی اسی نشیب و فراز، اسی مدوجزر کا نام ہے اور آدمی پر قدرت کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ اس کے جذباتی زخم، خواہ وہ کتنے ہی گہرے ہوں، مندمل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاہد کئی مہینوں تک اپنے آپ سے غافل رہا۔ طاہرہ کے آنسو بار بار بہتے رہے۔ مقبول صاحب اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے نظر آنے لگے مگر پھر رفتہ رفتہ سب ہی کو صبر آگیا۔

دو سال گزرنے کے بعد مقبول صاحب ہی نے تحریک شروع کی کہ اب زندگی کے تقاضوں سے زیادہ دیر تک انجان نہیں رہنا چاہیے اور اگر کسی طرح کوثر کی روح سے رابطہ قائم ہوسکے تو اس کی بھی یہی آرزو ہوگی کہ اس کی مایوسی اور محرومی کو جواز بنا کر شاہد اور طاہرہ ایک دوسرے کی زندگی کو عذاب نہ بنائیں۔ بات معقول تھی پھر بھی ابتدا میں شاہد اور طاہرہ دونوں کو یہ احساس ستاتا رہا کہ کہیں یہ اقدام کوثر کی قربانی کا مذاق اڑانے کے مترادف نہ ہو لیکن جب سب ہی نے انہیں سمجھایا۔ حد یہ کہ کوثر کی والدہ نے بھی اس تجویز کی تائید کی (انہیں مقبول صاحب اپنے گھر لے گئے تھے اور وہ ان دنوں انہی کے ساتھ رہ رہی تھیں) تب بالآخر شاہد اور طاہرہ بھی آمادہ ہوگئے اور یوں کوثر کے انتقال کے تقریباً ڈھائی سال بعد ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

یاور کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی جو اس کے ظلم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ جب وہ یوم حساب منصف حقیقی کے سامنے پیش ہوگا تو وہاں اسے اپنے گناہ عظیم کی ٹھیک ٹھاک سزا مل کر رہے گی۔

ان واقعات کو کئی برس بیت چکے ہیں مگر ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے اور اپنے پھول جیسے بچوں کے ساتھ ایک بہت ہی خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے باوجود شاہد اور طاہرہ اب بھی کوثر کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کرتے ہیں اور ہر سال اس کی برسی کے دن فاتحہ خوانی کے علاوہ اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں آج بھی اس کی یاد اسی شدت کے ساتھ موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ رہے گی۔

گلاب

محترمہ مدیرِاعلیٰ
سلامِ تہنیت!
راوی: خوشبو
تحریر: غلام قادر

میں کوئی رائٹر تو ہوں نہیں مگر مجھے بہت شوق ہے کہ میری روداد زندگی عوام کے سامنے آئے۔ جو مجھ پر گزری ہے اس سے دیگر احباب سبق حاصل کریں۔ رائٹر نہ ہونے کی وجہ سے میں اس انداز میں اپنی سرگزشت بیان نہیں کرپارہا ہوں جو عام قاری کو پسند آئے۔ اس لیے میری التجا ہے کہ کسی بڑے رائٹر سے اسے دوبارہ لکھوالیں۔

خوشبو
(لاہور)

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ گلاب کو کسی نام سے بھی پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سے طوائف کو کسی نام سے بھی پکارلیں وہ طوائف ہی رہتی ہے۔ یہ بات آج نہیں اس وقت میری سمجھ میں آگئی تھی جب اور کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی اور کیوں نہ آتی، جتنی نسلوں کی کہانی میری ماں کو یاد تھی وہ سب طوائف ہی تھیں۔ میری نانی کی ماں، اس کی ماں اور اس کی ماں سب طوائفیں ہی تھیں۔

اس وقت جب بہت چھوٹی چھوٹی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، تب سے مجھے یہ سمجھایا جانے لگا تھا کہ میں کون ہوں اور بڑے ہوکر مجھے کیا کرنا تھا؟ پھر جب ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات نظر آنے لگے تو سب کی امیدیں مجھ سے وابستہ ہونے لگی تھیں۔ خود میری بھی خواہش یہ ہونے لگی تھی کہ میں ان کی امیدوں سے بڑھ کر کوئی کام کر دکھاؤں اور اسی دھن نے مجھے ہر کام میں مہارت حاصل کرنے پر اُکسایا تھا۔ یہاں تک کہ میں وہ کام بھی بڑے شوق سے کرتی تھی جس کا مقصد ماں سمیت کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، صرف ایک نانی تھیں جن کا اصرار تھا کہ مجھے پڑھائی جاری رکھنی چاہیے۔

نانی نے کسی ادارے سے مارکیٹنگ کی ڈگری نہیں لی تھی لیکن اپنے کاروبار کو وہ بہت اچھی طرح چلا رہی تھیں۔ یوں بھی ہمارے لوگوں میں وہ خوش نصیب ترین خاتون سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی خوش نصیبی یہ ضرور تھی کہ قدرت نے انہیں چھ بیٹیاں دی تھیں لیکن ان بیٹیوں سے جس انداز میں انہوں نے فائدہ اُٹھایا تھا، وہ ان کی اپنی منصوبہ بندی تھی البتہ ایک بیٹی ان کی توقعات پر پوری نہیں اُتری تھی لیکن پھر نانی نے بھی اس کا نام اپنی زندگی سے یوں خارج کر دیا جیسے اس نام سے وہ کبھی واقف ہی نہ ہوں۔

شمائلہ خالہ کے بارے میں جو تھوڑی بہت باتیں ہمارے کانوں تک پہنچی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ اپنے کام میں بہت ماہر تھیں کہ اچانک انہوں نے ایک ٹیکسی والے سے شادی کر لی، جو انہوں نے بیٹیوں کو لانے لے جانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔

اپنی شادی کی خبر خالہ نے نانی کو فون پر اس دھمکی کے ساتھ دی تھی کہ ان کی تلاش نہ کی جائے کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ان کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔

نانی نے اس دھمکی پر توجہ دینے کے بجائے پوری شدت سے خالہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں کوئی نشان نہیں مل سکا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ خالہ اور ان کے شوہر دبئی چلے گئے تھے۔ نانی نے کوشش کی کہ وہ دبئی میں بھی انہیں تلاش کروا سکیں لیکن اس میں بھی انہیں کامیابی نہیں ہو سکی تھی، تھک ہار کر نانی نے خالہ سے وابستہ ورق اپنی کتاب سے پھاڑا اور اپنی پوری توجہ دوسری لڑکیوں کی جانب مبذول کر دی۔

کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن اچھا کاروباری وہی ہوتا ہے جو نقصان سے سبق سیکھ کر آئندہ وہ غلطی نہ دُہرائے اور نانی نے یہی کیا کہ اپنی پہلی غلطی انہوں نے نہیں دُہرائی، اب وہ بیٹیوں سمیت کسی پر بھی بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن میرے معاملے میں وہ قدرے مختلف تھیں۔ مجھ میں انہیں کچھ ایسا نظر آیا تھا کہ وہ اپنے بہت سے اصول بھولنے کے لیے تیار ہوگئی تھیں۔

یہ میری پیدائش سے بھی پہلے کی بات تھی کہ نانی اپنے پُرانے محلّے سے اُٹھ کر اس علاقے میں آچکی تھیں جو تھا تو شرفا کا علاقہ ہی لیکن جہاں پڑوسی کے بارے میں جاننا اتنا ہی بُرا سمجھا جاتا تھا جتنا کسی زمانے میں شرفا کے گھر میں کسی لڑکی کا گنگنانا۔

نانی کی کامیابیوں کو ایک فقرے میں بیان کرنا مقصود ہو تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ آنے والے وقت کو بھانپ لیتی تھیں۔ جو کام نانی نے سب سے پہلے کیا اس محلّے کے بہت سے لوگوں نے بعد میں کیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ ان علاقوں میں اُٹھ آئے، ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو نانی کے راستے پر اس طرح چلے کہ انہوں نے اپنے اوپر آرٹسٹ، فنکار اور ماڈل کے سائن بورڈ آویزاں کر لیے اور اپنے کاروبار کو ایک نیا انداز دیا۔

میرے مقابلے میں نانی میری ماں کو پسند نہیں کرتی تھی، شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی کے ابتدائی دنوں میں ان سے وہی غلطی ہوئی تھی جو خالہ نے کی تھی لیکن نانی انہیں واپس لانے میں کامیاب رہی تھیں۔ نانی میری ماں کی واپسی کو اپنی کامیاب حکمت عملی گردانتی تھیں تو والدہ اسے اپنا غلط انتخاب سمجھتی تھیں۔

"تیرا باپ بھی ان ایک فیصد لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنی عزت کی حفاظت کے لیے جان بھی دینے کو اعزاز سمجھتے ہیں، ماں کبھی کبھی اپنی قسمت کو بُرا بھلا کہتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔

میری والدہ کی واپسی کو برسوں تک یاد کیا جاتا رہا تھا۔ نانی کی اس کامیابی کو لوگ میری اُٹھان دیکھ کر دوبارہ سے یاد کرنے لگے تھے۔ عام طور پر اس گفتگو کا اختتام نانی کے اس فقرے پر ہوتا تھا جو نانی میری جانب دیکھ کر بڑے فخریہ انداز میں کہتی تھیں کہ "تم دیکھنا میری خوشبو اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دے گی۔"

نانی نے جو کچھ سوچا تھا، میں بالکل ویسی ہی ثابت ہوئی۔ میرے اپنے لوگوں میں میری کامیابیوں کے ڈنکے

اس طرح بجتے ہیں کہ بزرگ اپنی بیٹیوں کو یہ دعا دیتے ہیں کہ خدا تمہارے گھر میں بھی خوشبو جیسی بیٹی پیدا کرے۔"

میری عمر زیادہ نہیں ہے لیکن جب کسی کی بیٹی پر عشق کا بھوت سوار ہونے لگتا ہے تو وہ مجھے بلوا بھیجتے ہیں اور میں اس بیمار عشق کو نانی کے الفاظوں میں سمجھاتی ہوں "کنول کیچڑ میں ہی کھلتا ہے اور وہیں اچھا لگتا ہے۔ اسے صاف پانی میں رکھو گے تو پانی تو گندا ہوگا ہی، کنول بھی مرجھا جائے گا۔"

میں جب یہ کہہ رہی ہوتی ہوں تو میرے ذہن کے اسکرین پر ایک چہرہ اُبھرتا ہے۔ وہ چہرہ جس نے نانی کی ہر ٹریننگ کو خاک میں ملنے سے اپنے ایک فقرے سے بچا لیا تھا۔

یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب مجھے ایک روز ٹی وی پر پیغام ملا کہ شمائلہ نامی کوئی خاتون مجھ سے بات کرنے کی خواہش مند ہے۔"

وہ نام ایسا نہیں تھا کہ میں نظر انداز کر سکتی، ورنہ اس طرح کے پیغامات تو ملتے ہی رہتے تھے اگرچہ اس وقت میری شہرت بالکل ابتدائی سیڑھیوں پر تھی۔

میں نے ان نمبروں پر ڈائل کیا تو دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی اور اس ایک لفظ "ہیلو" کے ساتھ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ وہ خالہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

"خالہ، میں خوشبو ہوں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا اور دوسری جانب سے ایک ٹھنڈی آہ کی آواز آئی تھی جیسے کسی کو میری آواز سن کر خوشی ہونے کے بجائے افسوس ہوا ہو۔

"کتنے عرصے بعد میرے کانوں نے کسی اپنے کی آواز سنی ہے۔" ان کی آواز آئی تھی۔

"آپ کب واپس آئیں؟" میں نے سوال کیا۔

"بیوہ ہوئے ساڑھے تین سال ہوگئے اور یہاں تین سال سے ہوں۔" انہوں نے میرے کئی سوالوں کے جواب سوال کیے بغیر دے دیے تھے۔

"آپ تین سال سے یہاں ہیں تو......" میں نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے وہ لفظ ہی نہیں مل سکے تھے کہ میں اپنا سوال مکمل کر سکتی۔

"میں اب بھی رابطہ نہ کرتی اگر مجھے تم میں جبین کی صورت نظر نہیں آتی۔" انہوں نے کہا اور میں ہنس دی تھی۔

"مجھ سے اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا تھا۔

"کیسی ہے جبین؟" انہوں نے سوال کیا۔

"کیا سب کچھ فون پر ہی معلوم کریں گی؟" میں نے سوال کیا اور ان کی جانب کچھ دیر خاموشی رہی۔

"ملنے میں ہم دونوں کے لیے مشکلات ہو سکتی ہیں۔" ایک مختصر سے...... وقفے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔

"میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔" میں نے کہا اور وہ ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔

"میں ایسا کرتی ہوں کہ صبح کالج جانے کے بجائے آپ کی طرف آجاتی ہوں۔" ان کی خاموشی کا وقفہ بڑھ رہا تھا کہ میں نے تجویز دی۔

"چلو ٹھیک ہے۔" انہوں نے رضامندی ظاہر کی اور میں خوش ہوگئی۔

خالہ نے اپنا پتا سمجھایا اور میں نے ان کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا کہ اگر کہیں راستہ بھٹک جاؤں تو دوبارہ سے فون کر کے سمجھ لوں لیکن اس کا موقع نہیں آیا۔ خالہ نے وہ سب کچھ اس طرح سے سمجھایا تھا کہ میں آسانی کے ساتھ ان کے فلیٹ تک پہنچ گئی۔

وہ فلیٹ میں اکیلی تھیں، انہوں نے مجھے گلے لگایا، میرے ماتھے پر بوسہ بھی دیا لیکن مجھے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ کچھ نروس ہیں اور کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی یہ پریشانی ظاہر بھی کر دی تھی۔

"میں نے اطہر اور ظفر دونوں کو نہیں بتایا کہ تم آرہی ہو۔" انہوں نے کہا تھا۔

"تو کیا وہ ناراض ہوتے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"پتا نہیں۔" ان کا جواب تھا۔

اس روز زیادہ تر وہی بولتی رہی تھیں۔ اپنے بارے میں، اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں اور اپنے تینوں بیٹوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ خوش ہیں لیکن وہ مجھے ابتدا میں ہی کچھ بیمار محسوس ہوئی تھیں۔ پھر جب میرے آنے سے کچھ دیر قبل انہوں نے دوائیاں کھائیں تو مجھے ان کی بیماری کی تصدیق بھی ہوگئی۔ وہ مجھے اپنی والدہ کی طرح کی مریض دکھائی دی تھیں جو کئی برس سے سکون آور گولیاں کھا رہی تھیں۔

"ان کے جانے کے بعد سے میری طبیعت خراب

رہنے لگی ہے۔'' گولیاں کھانے سے قبل انہوں نے بتایا تھا۔

میں پانچ گھنٹے ان کے ساتھ رہی ان کے شوہر اور بیٹوں کے بارے میں سنتی رہی۔ اپنی والدہ، نانی، خالہ اور کزنز کے بارے میں بتاتی بھی رہی، لیکن وہ ایک سوال نہیں کرسکی جو سوال کرنے میں ان کے پاس گئی تھی کہ ''ہر طرح کے عیش اور آرام پر انہوں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو کیوں ترجیح دی؟''

وہ سوال کرنے کی تو میں ہمت نہیں کرسکی تھی لیکن مجھے وہ افسوس اور پچھتاوا بھی نظر نہیں آیا تھا جسے دیکھنے میں وہاں گئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں شکایتیں نہیں تھیں، انہیں شکایتیں تھیں لیکن ان کی نوعیت وہ نہیں تھی جو نانی کو میری والدہ اور خالاؤں اور کزنز سے تھیں۔

ان کی شکایت تھی تو یہ کہ ان کے بیٹے ان کی بات نہیں مانتے ہیں، بڑا بیٹا مظہر جو امریکا میں تھا، وہ ہر مہینے پیسے بھیج دیتا ہے لیکن خود نہیں آتا۔

''مجھے اس عمر میں پیسوں کا کیا کرنا ہے، مجھے تو بچے چاہئیں جو اس نے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی شکایت کی تھی۔

اسی طرح کی شکایتیں انہیں اپنے باقی دونوں بیٹوں سے بھی تھیں کہ میں ان سے کہتی ہوں کہ شادی کرلو لیکن دونوں ہی میری بات ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

ان کے گھر سے واپسی پر میں ان کا تقابل نانی اور اپنے ماحول کی باقی عورتوں سے کرتی رہی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے احساس ہوا تھا کہ اس کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے جہاں میں آباد ہوں اور حقیقت یہ تھی کہ یہ نئی دنیا مجھے زیادہ دلچسپ دکھائی دی تھی۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ اسی جاگنے کی کیفیت کے دوران بہت سے ایسے سوال بھی میرے ذہن میں آئے تھے جن کے کوئی جواب میرے پاس نہیں تھے۔ ایک سوال جو بار بار میرے ذہن میں سر اُٹھا تا رہا تھا، یہ تھا کہ ''کیا شمائلہ خالہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھیں یا اس شخص نے انہیں تبدیل کردیا ہے جس سے انہوں نے شادی کی تھی؟'' پھر اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اُبھرا تھا کہ کیا میری اپنی ماں بھی ان دنوں ایسی ہی ہوگئی ہوں گی جب وہ میرے باپ کے ساتھ ہوں گی؟

رات دیر تک جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح میری آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی لیکن یہ دیر بھی میرے اپنے حساب سے تھی۔ گھر کے باقی افراد اس وقت بھی سو رہے تھے۔ صرف میری اپنی ماں تھیں جو جاگ رہی تھیں۔ وہ کم خوابی کی مریض تھیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ میں اپنی چائے لے کر ان کے پاس ہی چلی آئی تھی۔

''آج ہماری بیٹی کو ہماری یاد کیسے آگئی؟'' انہوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھتے دیکھ کر کہا تھا۔ ان کے لہجے میں نہ شکوہ تھا نہ شکایت۔ ایک حسرت تھی جو شاید غیر اختیاری طور پر ان کے لہجے میں اُتر آئی تھی۔ ''آپ مصروف ہی اتنا رہتی ہیں۔'' ان کی شکایت کے جواب میں میرے ہونٹوں سے نکل گیا تھا اور انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

''بس چندا، اب چند دنوں کی مصروفیات اور ہیں پھر ہماری طرف کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔'' انہوں نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''یہ جو ڈھلتی عمر کو روکنے کی کوششیں ہیں، یہ اب کچھ ہی دن اور کام کریں گی اس کے بعد تو اس کوچے کی دیرینہ روایات کے مطابق یا تو کونا آباد کرلیں گے یا پھر تمہارے ساتھ نتھی ہوجائیں گے۔'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

''آپ ہر وقت مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں؟'' میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا اور وہ ہنس دی تھیں لیکن ان کی ہنسی بھی عجیب سی ہنسی تھی۔ اس میں نہ خوشی کا تاثر تھا نہ طنز کی جھلک تھی۔

''تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو۔'' انہوں نے اپنی بے چارگی بھری ہنسی کو روکتے ہوئے کہا تھا۔

میرا ایک ایک خواب میری آنکھوں کے سامنے بکھر رہا ہو اور میں مایوس بھی نہ ہوں۔'' اس بار انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''تمہارا نام خوشبو تجویز کرتے ہوئے تمہارے باپ نے کب سوچا تھا کہ تم ہر رات ایک نئے بستر پر ایک نئے انداز سے بکھر جاؤ گی۔'' انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''آپ اب تک ماضی میں زندہ ہیں۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا اور وہ سسک پڑیں۔

''میں ماضی میں کب زندہ ہوں میری جان، ماضی

مجھے زندہ نہیں رہنے دیتا۔'' انہوں نے کہا اور میں حیرت سے ان کا چہرہ تکنے لگی تھی۔ وقت اور حالات نے ان کے ساتھ بہت ظلم کیے تھے لیکن وہ اب بھی لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھیں۔

میں ان سے جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی وہ ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے کہہ نہیں پارہی تھی لیکن پھر خود انہوں نے ہی موضوع کا رُخ اس جانب کردیا۔

''کاش میں اس کی باتوں میں نہ آتی اور شمائلہ کی طرح کسی ایسے شخص کا انتخاب کرتی جو مجھے اس عذاب خانے سے ہمیشہ کے لیے دور لے جاتا۔'' انہوں نے کہا اور اس بار میں خود کو بولنے سے نہ روک سکی۔

''آخر آپ اسے بھول کیوں نہیں جاتیں؟'' میں نے تلخ انداز میں کہا اور ایک بار پھر ان کے ہونٹوں پر وہی بے معنی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

''میں ہر صبح اسے بھول جاتی ہوں میری جان!'' انہوں نے اسی بے معنی مسکراہٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا تھا لیکن یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھیں جیسے میری آنکھوں میں پیوست کردی تھیں۔

''میں اسے یاد نہیں کرتی ہوں بس وہ خود ہی سے اس وقت میرے پاس آجاتا ہے جب کوئی بھی ہاتھ مجھے اپنی بانہوں میں لینے کے لیے بڑھتا ہے۔'' انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہنس دی تھیں۔ ان کی نہ وہ ہنسی نارمل ہنسی تھی اور نہ ان کے ہنسنے کا انداز نارمل تھا۔ ایک عجیب سا گھنونا پن ان کی ہنسی اور ہنسنے کے انداز میں موجود تھا۔

''اس عمر میں آجانے کے باوجود پتا ہے لوگ میرے اتنے دیوانے کیوں ہیں؟'' انہوں نے اپنی ہنسی کو بریک لگا کر سوال کیا لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکتی، انہوں نے خود ہی جواب دینا شروع کردیا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ میں تنہائی میں جس سے بھی ملتی ہوں، ایک والہانہ انداز میں ملتی ہوں لیکن میں تو کسی سے نہیں ملتی میں تو ہر بار اسی کی بانہوں میں ہوتی ہوں جس پر اپنی محبتیں نچھاور کرنا میرا فرض بنتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''آپ کی چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے۔'' میں نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے کہا۔

''تم ابھی یہ باتیں نہیں سمجھو گی۔ میں بھی نہیں سمجھی تھی لیکن پھر......'' وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر ایک بار پھر مسکرانے

لگی تھیں۔ جیسے کسی چیز کا تصور کر کے خوش ہو رہی ہوں۔

''ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی ڈالی پر اُگنے والے دو پھولوں میں سے ایک سہرے میں سجتا ہے اور ایک قبر کی زینت بنتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں لیکن ان کا لہجہ ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے شمائلہ خالہ اتنی خوش نہ ہوں جتنا آپ سمجھتی ہیں؟'' میں نے آہستگی سے کہا اور انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر ہنستی چلی گئیں۔

اب کی بار ان کی ہنسی کا مجنونانہ انداز پچھلی بار سے کہیں زیادہ تھا۔ اتنا زیادہ کہ وہ اسی طرح ہنستے ہوئے اُٹھی تھیں اور ہنستے ہوئے ہی وہاں سے چل دی تھیں۔

وہ تو وہاں سے چلی گئیں لیکن مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میری ماں اس... حد تک پہنچ گئی ہیں جس کے آگے پاگل پن شروع ہوجاتا ہے۔ میں نے اسی وقت سوچا تھا کہ میں نانی سے اس ضمن میں بات کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ ان سے کس طرح بات کرنی ہے۔

میں گھر سے کالج جانے کے لیے نکلی تھی لیکن ابھی میں راستے میں ہی تھی کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی تھی لیکن کال کسی نئے نمبر سے کی جارہی تھی۔ میں عام طور پر اس طرح کی کالز وصول نہیں کرتی تھی لیکن وہ کال میں نے ریسیو کرلی۔

''میں ظفر بول رہا ہوں اور مجھے خوشبو سے بات کرنی ہے۔'' دوسری جانب سے میرے ہیلو کہتے ہی کہا گیا۔

''ظفر یعنی شمائلہ خالہ کے صاحب زادے۔'' میں نے سوال کیا اور فوراً ہی اس نے اس کی تصدیق کی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' میں نے اسی انداز میں بات کی تھی جس میں وہ کر رہا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں اگر آپ کے پاس وقت ہو۔'' اس نے کہا تھا۔

وہ مہذب انداز میں بات کر رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا یہ مہذب انداز تبدیل بھی ہوسکتا ہے۔ شمائلہ خالہ سے گفتگو کے دوران مجھے یہی تاثر ملا تھا کہ ان کے مرحوم شوہر اور بیٹے خالہ کے رشتے داروں سے کوئی بھی واسطہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے کہا اور ساتھ ہی توقع کر رہی تھی کہ وہ مہذب لہجے میں کوئی سخت بات کہہ دے گا۔

''کیا آج دوپہر کا کھانا ہم سب کے ساتھ کھا سکتی ہیں؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا تھا۔

''کوئی خاص بات؟'' میں وہ سوال کرنے پر اس لیے مجبور ہوگئی تھی کہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھ سے یہ کہہ بھی سکتا ہے۔

''کل میں امی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔'' اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ ''دراصل ہر پندرہ دن بعد ان کا ڈاکٹر سے معائنہ ہوتا ہے اور کل وہی دن تھا اور ڈاکٹر نے ان میں بہت بہتری پائی تھی اور اس کی وجہ ان کے نزدیک آپ کی کل ہمارے ہاں آمد تھی۔'' ظفر نے مختصر الفاظ میں بہت کچھ بتادیا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا کچھ دیر ان کے ساتھ گزارنا ان کے لیے اتنا اہم ہوجائے گا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''میرے والد صاحب مرحوم اور پھر ان کے بعد ہم ان کے خاندان والوں سے ملنے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی ہدایت یہی ہے کہ ہمیں اپنے رویّوں میں تبدیلی کرنی ہوگی۔ اگر ہمیں اپنی والدہ کی زندگی عزیز ہے۔'' وہ فون پر کہتا رہا تھا اور میں خاموشی سے سنتی رہی تھی۔

اسے جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن میں نے وہ کچھ نہیں کہا جو میں کہنا چاہتی تھی۔ صرف کہا تو اتنا کہ ''میں پہنچ جاؤں گی۔''

میں ٹھیک وقت پر پہنچی تھی لیکن خالہ نے شکایت کی کہ میں دیر سے آئی ہوں۔

ان کے دونوں بیٹے بھی میرے منتظر تھے۔ دونوں ہی ابتدا میں کچھ کھنچے کھنچے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ کھلنے لگے اور کھانا ختم ہونے تک ہم خاصے گھل مل گئے تھے۔

''آپ نے ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا کھایا اب بیٹے کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے بھی پیجیے گا۔'' اظہر نے برتن سمیٹتے ہوئے اعلان کیا۔

''اور چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی کھانے کا تمام اچھا تاثر آپ کے ذہن سے رفو چکر ہوجائے گا۔'' ظفر نے فوراً ٹکڑا لگایا تھا۔

''آپ بھائی کی باتوں میں بالکل نہ آنا کزن، یہ ہمیشہ مجھ سے جلتا ہے۔'' اظہر نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''وہ کیوں جلے گا تجھ سے؟'' خالہ جو اب تک مسکرا رہی تھیں، ظفر کی حمایت میں بول پڑی تھیں۔

''کیونکہ وہ میرے مقابلے میں کالا ہے۔'' اظہر نے ظفر کے دبتے ہوئے رنگ پر تبصرہ کیا۔

''اگر اچھی چائے بنانے کے لیے رنگ کا صاف ہونا ہی شرط ہے تو پھر سب سے اچھی چائے خوشبو کو آنی چاہیے جبکہ ایسا نہیں ہے۔'' ظفر نے میری جانب رُخ کیے بغیر بھائی سے کہا تھا۔

''آپ کو کسی کی کمزوریوں کا یوں اعلان نہیں کرنا چاہیے بھائی! آخر وہ ہماری مہمان ہیں۔'' اظہر نے فوراً ہی میری حمایت کی۔

''لیکن مجھے چائے بنانا آتی ہے اور میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں۔'' میں نے اظہر سے کہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے اس طرح ہنسنا شروع کردیا جیسے میں نے انہیں کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے بہت اچھی چائے بنانی آتی ہے۔'' میں نے پُرزور انداز میں دوبارہ کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کردیا تھا۔

''خوشبو، ان کی باتوں میں مت آنا۔'' خالہ نے مجھے مخاطب کیا تو میں حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

''یہ شریر تمہیں اپنی باتوں میں اُلجھا کر تم سے چائے بنوانا چاہ رہے ہیں۔'' خالہ نے کہا اور وہ دونوں جو خالہ کی آواز کے ساتھ ہی چپ ہوگئے تھے، ایک بار پھر ہنسنے لگے تھے۔

''بھائی، امی بھی کتنی ہوشیار ہیں۔'' اظہر نے ظفر سے کہا اور وہ دونوں مسکرانے لگے۔

''آخر ماں کس کی ہیں؟'' ظفر نے اپنے کالر کو اونچا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو کس خوبصورتی سے انہوں نے ہمیں بُری چائے پینے سے بچالیا۔'' اظہر نے کہا۔

''اور اپنی بھانجی کی کمزوری ہم پر ظاہر بھی نہیں ہونے دی۔'' ظفر نے اسی انداز میں جواب دیا اور دونوں ایک بار پھر ہنسنے لگے تھے۔

''میں ابھی آپ دونوں کی غلط فہمی دور کردیتی ہوں۔'' میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''ایک منٹ کزن!'' اظہر نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''ہم نے یقین کرلیا کہ آپ بہت اچھی چائے بنالیتی ہیں۔ اب پلیز آپ تشریف رکھیں۔'' میں اس کے روکنے پر رک گئی تو اس نے کہا تھا۔

''دیکھیں، ہم کھانا تو بُرا کھا سکتے ہیں لیکن چائے کے بارے میں ایسا ہونا ذرا مشکل ہے۔'' ظفر نے بھائی کی بات کو آگے بڑھایا۔

''آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا کہ میں صرف چائے ہی نہیں، کھانا بھی بہت اچھا پکالیتی ہوں۔'' میں نے جزبز ہونے کے انداز میں ظفر سے کہا اور وہ مسکرانے لگا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں ہے؟'' اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا جو ایک معنی خیزی اپنے اندر سموئے اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

''مجھے تو اس پر بھی یقین ہے کہ اگر چاند خان اور سورج خان آج کے دور میں زندہ ہوتے تو ایک میریٹ کے اور دوسرے آواری کے چیف کک ہوتے۔'' اس نے کہا اور مجھے واقعی غصہ آگیا۔

''کیا جانتے ہیں آپ چاند خان اور سورج خان کے بارے میں؟'' میں نے غصّہ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''یہی کہ ایک چاند خان تھے اور دوسرے سورج خان تھے۔'' ظفر نے جواب میں کہا لیکن اس کی مسکراہٹ یہ کہتے ہوئے کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔

''بھائی کا مطلب یہ ہے کزن کہ اگر آپ اچھا کھانا پکالیتی ہیں تو وہ دونوں تو بہت بڑے فنکار تھے، انہیں تو فائیو اسٹار ہوٹل کا ہیڈ کک ہونا چاہیے۔'' اظہر نے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا اور دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرائے تھے۔

''میں آپ دونوں کی باقی کی کائیں کائیں کچن سے واپسی پر سنوں گی۔'' میں نے کچن کی جانب قدم اُٹھایا ہی تھا کہ اظہر کی چیختی ہوئی آواز مجھے سنائی دی تھی۔

''بھائی، کزن نے تمہیں کالا کوا کہا۔'' اور میرے اُٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''میں نے سن لیا ہے یار، لیکن کیا کرسکتا ہوں۔'' ظفر کی حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''میں نے ایسا کب کہا؟'' میں نے اظہر پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو آپ نے کہا کہ کائیں کائیں۔'' اظہر نے فوراً ہی مجھے یاد دلانے والے انداز میں کہا تھا۔

''وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔'' میں نے ٹپٹا کر ظفر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن میرا مخاطب اظہر ہی تھا۔

''اگر ایسے ہی کہنا تھا تو آپ ٹائیں ٹائیں فش بھی کہہ سکتی تھیں۔'' اس نے میری بات کو رد کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''ویسے کزن، یوں کسی کی شکل صورت کا مذاق اُڑانا ٹھیک نہیں ہے۔'' اظہر نے ظفر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''غلط کہہ رہے ہیں، میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔'' میں نے اس بار ظفر کو مخاطب کیا تھا اور اس نے سر اُٹھا کر مغموم نظروں سے میری جانب دیکھا تھا۔

''کوئی بات نہیں محترمہ خوشبو صاحبہ!'' ظفر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''بچپن سے لے کر آج تک لوگ مجھے اسی طرح کے ناموں سے یاد کرتے رہے ہیں، آپ نے بھی کرلیا تو کیا ہوگیا۔'' ظفر نے رندھی ہوئی آواز میں اپنا فقرہ مکمل ہی کیا تھا کہ خالہ نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جمائی۔

''تو بیٹھ بیٹی!'' انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''اور تم جا کر چائے بناؤ۔'' انہوں نے اظہر کی جانب دیکھ کر کہا۔

''امی اگر وہ......'' اظہر نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن خالہ نے اسے روک دیا۔

''اب تم دونوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ بھی نہیں کہے گا۔'' انہوں نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ''اپنی نوٹنکی سے میری بچی کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔'' انہوں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا اور وہ دونوں میری جانب دیکھ کر مسکراتے رہے۔

''چلو سوری کہو دونوں اس سے۔'' خالہ نے ایک نیا حکم جاری کیا جس کی بچوں نے فوری طور پر تکمیل بھی کردی۔

''سوری کزن!'' اس نے میرے سامنے جاپانی انداز میں جھکتے ہوئے کہا تھا لیکن ظفر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ میری نظریں غیر ارادی طور پر اس کی جانب اُٹھیں تو اس نے نظریں ملتے ہی کہا ''کائیں!'' اور ہم سب ہنس پڑے تھے۔

خالہ کے منع کرنے کے باوجود چائے میں نے ہی بنائی تھی جس کی تعریف ان دونوں نے بھی کی لیکن اس طرح کہ تعریفی جملوں کے درمیان وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ''مہمان ہیں، مہمان کے لیے جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

میں وہاں سے نکلی تو میرے کانوں میں دور تک ظفر کے وہ الفاظ گونجتے رہے تھے جو اس نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہے تھے ''آپ کی آمد سے امی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس آگئی ہے۔ اور ہم چاہیں گے کہ ہماری امی اکثر مسکراتی رہیں۔''

''میں گھر پہنچی تو ہمیشہ کی طرح ہر ایک اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ سورج کے غروب ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا اور شام ہونے والی تھی۔ میں نے پہلے سوچا کہ نانی سے اپنی ماں کے بارے میں بات کروں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ نانی دوپہر سے کہیں گئی ہوئی ہیں تو میں اپنے کمرے میں آگئی۔

وہ رات میری زندگی کی عجیب رات تھی۔ میں سونا چاہتی تھی لیکن سو نہیں پا رہی تھی۔ خالہ کے گھر پر گزارا ہوا وقت ایک فلم کی طرح بار بار نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں ہمیشہ کے لیے اس ماحول کا حصہ بن جاؤں؟'' میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت سوچا تھا اور اس کے ساتھ ہی ظفر کا تصور میرے ذہن میں اُبھرا تھا اور پھر میں دیر تک اس کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔

اس رات، میں جو کچھ سوچتی رہی تھی وہ ان تمام اسباق سے مختلف تھا لیکن مجھے اس کا ہوش ہی کب رہا تھا کہ میں ان باتوں پر غور کرتی۔ میرے پورے وجود میں اس سوچ کے ساتھ ہی ایک سنسنی سی پھیلنے لگی تھی اور وہ سنسنی ایسی ہی تھی کہ مجھ پر نشہ سا ہونے لگا تھا۔

جو کچھ میں سوچ رہی تھی اس کے مطابق میری راہ میں کچھ ایسی مشکلات نہیں تھیں۔ خالہ کے بیٹے اپنی ماں کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور وہ اپنی ماں کی خواہش کو یقیناً رد نہیں کرتے۔

میں اس کے اگلے روز بھی خالہ کے گھر گئی تھی لیکن زیادہ دیر نہیں رکی تھی۔ نانی سمیت کسی کو بھی میں کسی شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی البتہ میں نے شناختی کارڈ بنوانے کا کام شروع کردیا۔

ظفر سے میری ملاقات، پہلی ملاقات کے دس روز بعد

ہوئی لیکن وہ ملاقات بھی یوں ہی سرسری سی تھی کیونکہ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد چند باتیں کرنے کے بعد وہ دفتر کے کام سے اسلام آباد چلا گیا تھا۔

خالہ اور اس کے گھر والوں سے ملتے ہوئے مجھے پانچ ماہ ہوئے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ نانی نے ایک بہت بڑی مرغی پھانس لی ہے اور وہ دن قریب آ گیا ہے جس کا وہ انتظار کر رہی تھیں۔ میں ابھی اس کشمکش میں تھی کہ خالہ سے یہ بات کروں یا نہیں کہ نانی نے مجھے بتایا کہ ''مجھے دس روز کے لیے دبئی جانا ہے۔''

''مگر نانی میرے امتحان......؟'' میں نے کہا۔

''واپس آ کر دے لینا امتحان!'' نانی نے یوں کہا تھا جیسے یہ کوئی اہم بات ہی نہ ہو۔ ''ویسے بھی امتحان پاس کر کے تجھے کون سی کلرکی کرنی ہے؟'' نانی نے اپنا جواب مکمل کیا۔

نانی اس روز رسم کی ادائیگی کا دن طے کر رہی تھیں جب دو دن کے ناغے کے بعد میں خالہ کے گھر پہنچی تھی جہاں ظفر اکیلا تھا۔ خالہ کے بارے اس نے بتایا کہ وہ اسپتال میں ہیں جہاں وہ رات رکا تھا اور اب اظہر وہاں ہے۔

''معمولی درجے کا ہارٹ اٹیک تھا لیکن اب وہ خطرے سے مکمل باہر ہیں۔'' ظفر نے میری پریشانی دیکھ کر مجھے تسلی دی تھی اور تب ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں براہ راست ظفر سے ہی بات کر لوں۔

میں نے اسے نانی کی منصوبہ بندی کے بارے میں بتایا جسے اس نے پورے سکون کے ساتھ سنا لیکن سکون کے ساتھ سننے کے بعد اس نے سوال کیا ''میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ مجھے اس جہنم میں جانے سے بچا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شاید تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں تم سے شادی کر کے تمہیں اس آگ میں جلنے سے بچا سکتا ہوں؟'' اس نے سوال کیا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی۔

''تم بہت اچھی ہو خوشبو اتنی اچھی، اتنی خوبصورت، اتنی سلیقہ مند کہ میں تمہارے لیے کسی بھی طاقت سے ٹکرا جاتا لیکن......'' اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑا اور جیسے میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی تھی۔

''تمہیں بچانے کے لیے میں خود تو ہر آگ میں جھلس سکتا ہوں لیکن تمہیں بچانے کے لیے میں اپنی آئندہ نسلوں کو اس جہنم میں نہیں دھکیل سکتا جس میں میری زندگی بسر ہو رہی ہے۔'' اس نے تلخ انداز میں کہا تھا۔

''میں اپنی پیشانی سے وہ داغ مٹا نہیں سکا ہوں کہ میں ایک طوائف کا بیٹا ہوں۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

''میرے بہت سے ملنے والے ایسے ہیں جنہوں نے یہ حقیقت جاننے کے بعد مجھ سے راہ و رسم رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔'' وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا تھا۔

''مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے والی میری یاد میں آنسو بہانے والی کو بھی جب یہ معلوم ہوا کہ میری ماں کون تھی تو اس نے دوبارہ مجھے منہ لگانا پسند نہیں کیا تھا۔'' اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا فقرہ مکمل کیا تھا۔

''ظفر......!'' میں کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

''اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے میں مجھے بھی بڑی مشکل ہوئی تھی خوشبو، لیکن چاہنے کے باوجود ہم دونوں ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ میں اپنی نسل کو اس عذاب میں نہیں جھونک سکتا جس سے میں خود گزر رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکتی رہی تھی۔

''تم میں ہر وہ خوبی موجود ہے، جس کے خواب کوئی بھی شخص اپنی شریکِ زندگی کے لیے دیکھتا ہے لیکن......'' ظفر نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''لیکن یہ کہ تم میرے باپ سے بھی زیادہ بزدل ہو۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

اس کے بعد میں وہاں رکی نہیں اور تب سے اب تک اپنی نانی کے احکامات پر چل رہی ہوں۔ وہ جیسا کہتی ہیں، میں ویسا ہی کرتی ہوں اور ویسا ہی کرتی رہوں گی، شاید اس وقت تک جب تک میری زندگی میں وہ شخص نہ آ جائے جو میرے باپ اور ظفر کی طرح بزدل نہ ہو یا پھر جب تک معاشرے کا یہ خوف ذہنوں پر نہ ہو کہ طوائف کی اولاد کو شرفا میں بھی طوائف کے حوالے سے پہچانا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا گناہ اتنا بڑا ہے کہ خدا تو ہماری توبہ قبول کر لیتا ہے لیکن اس کے بندے نہیں کرتے۔

* *

وہی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

امید ہے بخیریت ہوں گی۔ میں صاف صاف بتادوں کہ مجھے کہانیاں لکھنے یا پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تو میرے سالے صاحب کی فرمائش ہے کہ میں اپنی روداد کہانی کی طرز پر لکھ کر آپ کو بھیجوں جسے پڑھ کر لوگ عبرت حاصل کریں۔ میں نے تمام باتیں لکھ دی ہیں اسے کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوالیں۔

ظفری
(ملتان)

مجھے شادی کے نام سے نفرت تھی۔ اتنی نفرت کہ ایک روز کھانے کی میز پر ممی نے میری شادی کا ذکر چھیڑا تو مجھے ایک ابکائی آ گئی۔ جو کچھ کھا چکا تھا سب باہر آ گیا۔

اتنی شدید نفرت کا ایک وسیع پس منظر تھا۔

میں جوان بھی تھا اور امیر ترین گھرانے کا فرد بھی۔ میں اگر بتادوں کہ میرا تعلق کس گھرانے سے ہے تو لوگوں کے ہوش اُڑ جائیں۔ ان گھرانوں میں جتنی آزادیاں میسر ہوتی ہیں، وہ سب مجھے حاصل تھیں۔ گھر میں ہونے والی

مخلوط پارٹیاں آئے دن کا معمول تھیں۔ ان میں شریک ہونے والی لڑکیاں پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں گرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ کتنی ہی لڑکیاں تھیں جو میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے بے چین رہتی تھیں۔ میں بھی ایک ستارے سے دوسرے ستارے کی طرف خوش دلی سے بڑھ رہا تھا۔ گھر میں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا بلکہ ممی تو میری اس مقبولیت پر پھولے نہیں سماتی تھیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی مجھے بھی روکنے ٹوکنے والا ہو لیکن یہاں تو ہر بُری بات کو تہذیب کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔

میری اس خواہش نے کہ کوئی مجھے ٹوکے، اپنے لیے ایک اور راستے کا انتخاب کرلیا۔ یہ راستہ کوئی نیا نہیں تھا لیکن اس لیے نیا تھا کہ میں اب تک اس راستے پر نہیں چلا تھا۔ گھر میں شراب نوشی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ محفلوں میں جام پر جام لنڈھائے جاتے تھے۔ شراب ہر وقت گھر میں موجود رہتی تھی۔ اس دن گھر میں کوئی نہیں تھا کہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ملازم کو آواز دی۔

''الماری سے شراب کی بوتل لے آؤ۔''

''کون سی سرکار؟''

''کوئی سی بھی۔''

''مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کون سی پینی چاہیے۔ مجھے تو شراب سے مطلب تھا۔ ملازم گیا اور جو بوتل اسے سامنے نظر آئی، اُٹھا کر لے آیا۔

''بے وقوف آدمی! گلاس اور برف کیا تمہارا باپ لے کر آئے گا۔''

''سرکار، میں سمجھا آپ کو یہ بوتل کہیں پہنچانی ہے۔ آپ تو پیتے نہیں ہیں۔''

''اب پینے لگا ہوں، گلاس لے کر آؤ۔''

وہ گلاس اور برف لے کر آ گیا مگر اس کی آنکھوں میں حیرانی کی چمک ابھی تک باقی تھی۔ وہ محفلوں میں ساقی گری کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کتنی برف کتنا پانی ملایا جائے۔ اس نے گلاس تیار کر کے میری طرف بڑھا دیا۔

میں پہلی مرتبہ پی رہا تھا لیکن اتنے غصے میں تھا کہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا۔ اس نے میرے اشارے پر دوسرا گلاس بنا دیا۔ گھونٹ گھونٹ کر کے میں نے وہ گلاس بھی خالی کر دیا۔

جب تیسرا گلاس خالی کر چکا تو اس نے خبر دی کہ ممی آ گئی ہیں۔ وہ ڈرا ہوا تھا کہ ممی نے سن لیا تو نہ جانے کیا ہنگامہ کھڑا کر دیں۔ میں اس کی بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اب تو باہر جا اور موقع دیکھ کر ممی کے کانوں میں یہ بات ڈال دے کہ میں اندر بیٹھا شراب پی رہا ہوں۔''

''سرکار، اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ شراب میں نے آپ کو نکال کر دی تھی تو میری شامت آ جائے گی۔''

''یہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس کس کی شامت آتی ہے، جا...... جا کر بتا دے۔''

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ بتا بھی دیا کہ میں شراب پی رہا ہوں۔ میں انتظار کرتا رہا کہ اب وہ دندناتی ہوئی اندر داخل ہوں گی لیکن وہ نہیں آئیں۔ میرا نشہ گہرا ہوگیا تھا۔ میں وہیں صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ پھر مجھے اپنی سدھ نہیں رہی۔

میں رات بھر اسی صوفے پر پڑا رہا۔ کسی نے آ کر پوچھا تک نہیں یا اگر کوئی آیا ہو تو اُٹھانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ مجھے خبر نہیں۔ میری آنکھ تو اس وقت کھلی جب گھر میں سب ناشتا کر چکے تھے۔ ڈیڈی آفس چلے گئے تھے۔ ممی اپنے دوستوں کے ساتھ فون پر مشغول تھیں۔ میں باہر آیا تو وہ فون رکھ کر میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''ظفری ڈارلنگ! آج کیا بات ہے، بہت سوئے؟''

''جی ممی، آج کچھ زیادہ ہی سویا۔''

''یہی ہوتا ہے۔ جوانی میں نیند کچھ زیادہ ہی آتی ہے۔''

''ممی، مجھے آپ سے سوری کرنی ہے۔''

''کس بات کی سوری بیٹا!''

''وہ کیا ہے ممی، کل آپ نہیں تھیں تو میں نے شراب کو ہاتھ لگا لیا۔''

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی نہ جانے کیا بات ہوگئی جو سوری کر رہے ہو؟''

''آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں۔''

''یہ تم کیسی دقیانوسی... باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تو خوشی ہے کہ تم ہماری سوسائٹی میں ایڈجسٹ کرنے کے لائق ہوگئے۔ مجھے تو فکر ہونے لگی تھی کہ تم سگریٹ تک نہیں پیتے۔'' انہوں نے کہا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ ''میں ذرا باہر جا رہی ہوں، اپنا خیال رکھنا۔''

میں انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، ممی کو میرے شراب پینے پر ذرا بھی اعتراض نہیں ہوا بلکہ ایک طرح سے خوشی ہوئی کہ میں ان کی سوسائٹی میں ایڈجسٹ کرنے کے لائق ہوگیا۔ ان کے جاتے ہی میں پھر خود سے انتقام لینے لگا۔

شراب اور شباب کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ میری بےچین مزاجی نے اثر دکھانا شروع کیا۔ وہ لڑکیاں جن سے میری دوستی تھی، میرے ایک اشارے پر میرے بستر کی زینت بننے کو تیار ہوگئیں۔ یہ آزادی پرست مغربی تہذیب کی دلدادہ فخر سمجھتی تھیں کہ انہوں نے میرے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔ ان لڑکیوں میں سے بہت سی ایسی تھیں جو میرے علاوہ بھی بوائے فرینڈز رکھتی تھیں۔ بعض خود بتاتی تھیں، بعض کے بارے میں دوسری لڑکیوں نے بتایا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال راسخ ہوتا جا رہا تھا کہ ہر لڑکی بے وفا ہوتی ہے۔ ایک سے زیادہ بوائے فرینڈ رکھتی ہے۔ چاہے وہ بتائے چاہے نہ بتائے۔ کوئی بھی ایسی نہیں جس سے شادی کی جا سکے۔ یہ پھول بستر کے لیے ہوتے ہیں گھر کے لیے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ناشتے کی میز پر میری شادی کا ذکر چھڑا تو مجھے اُبکائی آ گئی۔ مجھے وہ لڑکیاں یاد آ گئیں جو میری دوست رہ چکی تھیں۔ جو لڑکی میری دوست نہیں رہی کسی اور کی دوست رہ چکی ہوگی۔ ایسی کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی جسے بیوی بنایا جائے۔

ممی اور ڈیڈی یہ سمجھتے رہے کہ میں اسی طرح شادی سے بھاگ رہا ہوں جس طرح بہت سے نوجوان ذمے داری سے بچنے کے لیے بھاگتے ہیں۔ ممی پیچھے پڑی رہیں لیکن میں انکار کرتا رہا آخر ایک دن بالکل واضح طور پر کہہ دیا کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ آئندہ اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔

یہ اعلان میں نے جلد بازی میں نہیں کیا تھا۔ پوری ایک رات سوچنے کے بعد کیا تھا۔ اب میری سوچوں میں لڑکیاں ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی مائیں بھی تھیں۔ میں نے ان لڑکیوں کی ماؤں کو دیکھا تھا جو اپنی بیٹیوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں۔ میں اگر کسی دوست لڑکی کو آدھی رات کے وقت ان کے گھر چھوڑنے جاتا تھا تو میرا والہانہ استقبال کیا جاتا تھا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ اتنی رات گئے تم دونوں کہاں سے آ رہے ہو۔ میں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا تھا کہ ممی کسی ایسی ہی لڑکی سے میرا رشتہ کریں گی۔ اس سے بہتر ہے شادی کی ہی نہ جائے۔ یہی سوچ کر میں نے شادی نہ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

ممی بھی کچھ دنوں کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں کبھی کبھی سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن پھر بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی شاید اسی امید میں تھیں کہ جب لڑکیوں سے میرا دل بھر جائے گا تو میں شادی پر تیار ہو جاؤں گا۔

میں نشے میں ایسا ڈوبا تھا کہ شراب ہر وقت کی ساتھی بن گئی تھی۔ شراب اسی وقت تک اچھی لگتی ہے جب تک اس سے غیریت کا تعلق رکھا جائے۔ اسے ساتھ بنا لیا جائے تو وہ کسی کا ساتھ نہیں دیتی یا پھر یوں کہا جائے کہ اپنے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہنے دیتی۔ میں نے بھی ہر طرف سے منہ موڑ کر شراب کو اپنا لیا۔ جب میں دن رات شراب میں ڈوبا رہنے لگا تو میری کوٹھی میں خطرے کے الارم بجنے لگے۔ جب بھنور سامنے ہو تو ماہر تیراک بھی اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی حال میرے گھر والوں کا ہوا۔ یہ لوگ شراب کو محفلوں تک محدود رکھے ہوئے تھے۔ میری جوانی نے دن اور رات کی تمیز مٹا دی تو فکر لاحق ہوئی۔ گھر سے شراب کی بوتلیں ہٹا دی گئیں۔ طرح طرح کے لوگ سمجھانے کے لیے آنے لگے۔ سب کے مشورے یہی تھے کہ شراب پیو لیکن طریقے سے۔ مجھ پر کسی کی باتوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ اپنے گرد گھیرا تنگ ہوتا ہوا دیکھ کر اپنا شراب خانہ باہر کھول لیا۔ میرا ایک دوست تھا جس کے گھر میں بار روم تھا۔ میں وہاں جا کر پینے لگا۔

اسی نہج پر چلتے ہوئے کئی سال ہوگئے۔ میرے باپ کو میری حرکتوں کا دکھ اتنا تھا کہ دل کا مرض لگا بیٹھے، ایک روز ہارٹ اٹیک ہوا اور ان کا انتقال ہوگیا۔

میری حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اب ان کے وسیع کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ چاہے قہقہوں میں فرق ہو لیکن آنسو غریب اور امیر سب کے ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ خاندان کے لوگ جمع ہوئے اور کوٹھی آہوں اور سسکیوں سے بھر گئی۔

یہ طوفان تھما تو مجھے ہوش آیا۔ میرے سوا ڈیڈی کا کاروبار سنبھالنے والا کون تھا۔ مجھے آگے بڑھنا پڑا اور میں ایک ہی رات میں ظفر سے سیٹھ ظفر بن گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی امید خود مجھے بھی نہیں

تھی۔ میری زندگی میں ایک ناقابلِ بیان ٹھہراؤ آ گیا۔ صبح دفتر چلا جاتا، شام کو واپس آتا۔ کچھ دیر آرام کرتا اور پھر کسی دوست کو بلا لیتا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا اور رات کو جلدی سو جاتا۔ سٹرڈے نائٹ کو البتہ رات گئے تک ہلا گلا رہتا۔ طرح طرح کے دوست ہوتے اور شراب کے دور چلتے۔ ایسی محفلوں پر ممی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ممی کو میری سنبھلتی ہوئی حالت کا احساس ہوا تو ایک مرتبہ پھر انہیں میری شادی کی فکر ہوئی۔ اب وہ اتنی ٹوٹ گئی تھیں کہ مجھے بھی انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔

"آپ کس سے میری شادی کرانا چاہتی ہیں؟"

"جس سے تم کہو۔"

"میری کوئی پسند نہیں۔"

"پھر تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ نے کسی خاندان کے بارے میں سوچ رکھا ہے تو مجھے نام بتایئے۔"

"سیٹھ ابراہیم کی بیٹی کیسی رہے گی؟"

"آپ کو تو معلوم ہے وہ میری دوست رہ چکی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ شادی سے پہلے سب ہی دوست ہوتے ہیں۔"

"جب وہ میری دوست رہ چکی ہے تو کوئی اور بھی اس کا دوست رہا ہوگا۔"

"کیسی دقیانوسی باتیں کرنے لگے ہو۔ کیا لڑکیوں کے بوائے فرینڈز نہیں ہوتے؟"

"آپ اسے میری بیوی بنا رہی ہیں یا جہیز میں بوائے فرینڈز کی فہرست طلب کر رہی ہیں۔"

جب انہوں نے دیکھا کہ میرے تیور بدل رہے ہیں تو انہوں نے گھبرا کر ایک اور لڑکی کا نام میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ کئی لڑکیوں کے نام لیے۔ کوئی میری دوست رہ چکی تھی، کوئی کسی اور کی دوست تھی۔ جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اس کے لیے میں نے تصور کر لیا کہ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بوائے فرینڈ ہوگا۔

دراصل میں نے اپنے اردگرد جو ماحول دیکھا تھا، جو تجربات مجھے ہوئے تھے، اس نے میرے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ ہر لڑکی بے وفا ہوتی ہے۔ ہر لڑکی کو میں اپنے آئینے میں دیکھنے لگا تھا۔ میں سوچتا تھا، اس دنیا میں کیا میں اکیلا مرد ہوں جو لڑکی میری بیوی بن کر آئے گی، یہ کیا ضمانت ہے کہ اسے کوئی مرد نہ ملا ہو۔ کوئی کسی کو بتاتا ہے۔ جو لڑکیاں میری دوست رہ چکی ہیں۔ کیا ان کے شوہروں کو کبھی معلوم ہو سکے گا کہ میرے ان سے کیا مراسم رہ چکے ہیں۔ میں ایسا دھوکا کیوں کھاؤں۔

میں جانتا ہوں میری یہ سوچ درست نہیں تھی لیکن اس وقت مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میرے اندر کیسی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے۔ میں شک کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اس بیماری کا علاج تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے صبح اُٹھتے ہی ایک مرتبہ پھر ممی سے کہہ دیا کہ وہ میری شادی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ وہ مایوس تو ہوئی ہوں گی لیکن کیا کر سکتی تھیں۔

والد صاحب کا خوف درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ میں شراب کی محفلیں گھر پر سجانے لگا۔ ایسی ہی ایک محفل میں میری ملاقات اختر نامی ایک شخص سے ہوئی۔ اختر ایک دوست کی معرفت سے اس محفل میں آیا تھا۔ یہ شخص میری دنیا سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے نقوش نہایت تیکھے تھے۔ لمبے لمبے بال تھے جو اس کے کاندھوں پر جھول رہے تھے۔ اس کے جسم پر قیمتی لباس بھی نہیں تھا۔ اپنے حلیے سے کوئی خبطی شاعر نظر آ رہا تھا۔ میں اس سے مل کر قطعی خوشی نہیں ہوا تھا لیکن جب ترنگ میں آ کر اس نے بولنا شروع کیا تو پوری محفل محوِ حیرت تھی۔ ایسی اعلیٰ درجے کی انگریزی بول رہا تھا کہ انگریز بھی رشک کریں۔ اردو بولنے پر آیا تو لکھنو اور دہلی کو مات کر کے رکھ دیا۔ محفل میں شراب کی اقسام کا ذکر آیا تو اس نے وہ وہ اقسام گنوا ڈالیں کہ جن کے نام بھی ہم میں سے کسی نے نہیں سنے تھے۔

اس کا بے پناہ مطالعہ دیکھ کر مجھے اس کے بارے میں جاننے کی فکر ہوئی۔ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے؟ یہ سب باتیں کسی کے تعارف کے لیے بہت ہوتی ہیں۔

میں نے اس دوست سے اس کے بارے میں پوچھا جو اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ بھی اس کے بارے میں اتنا ہی لاعلم ہے جتنا میں۔

"بھائی، یہی تو وہ معمّا ہے جسے جاننے کے لیے میں اسے اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتا بھی نہیں ہے۔ کسی کو اس کا ذریعہ آمدنی بھی نہیں معلوم۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ علم کا ایک سمندر ہے۔ دنیا کے ہر مسئلے پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور خوب کرتا ہے۔ کبھی اس کے بارے

میں پوچھو بھی تو ہنس کر کہتا ہے، آم کھاؤ پیڑ کیوں گنتے ہو۔ کسی ایک جگہ ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ چند روز کسی دوست کے گھر چند روز کسی دوست کے گھر۔ کبھی کبھی ایسا غائب ہو جاتا ہے کہ مہینوں ڈھونڈو تو نظر نہیں آتا۔ بڑا دلچسپ کردار ہے۔ مجھے اس کی ذات میں اتنی دلچسپی ہوئی کہ اسے دوسرے روز پھر آنے کی دعوت دے دی۔ میرے دوست نے کہا بھی کہ اسے منہ مت لگاؤ، چپک ہی تو جائے گا۔ مجھے چپکانا ہی تو تھا۔

دوسرے دن وہ میرے گھر چلا آیا۔ اب شاید اس نے گھر دیکھ لیا تھا کہ اکیلا ہی چلا آیا تھا۔

"اب میں دس پندرہ دن یہیں گزاروں گا تمہارے ساتھ۔" اس نے کہا۔ گویا وہ واقعی چپک گیا تھا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی لیکن ایک شرط پر رہنا ہوگا۔ تم دن میں شراب نہیں پیو گے۔ رات میں پیو گے اور وہ بھی میرے ساتھ۔"

"دن میں تو میں پیتا ہی نہیں۔ دن کے وقت کتابیں پڑھتا ہوں۔"

"کتابیں تو میرے گھر میں ہیں ہی نہیں۔"

"وہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں، یہ دیکھو۔" اس نے کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ کی زپ کھولی اور چار کتابیں اس میں سے نکل آئیں۔

میں مطمئن ہو گیا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں اس کے لیے ایک کمرا نکالنا کون سا مشکل تھا۔ میں نے ایک نوکر سے بھی کہہ دیا کہ وہ مہمان کے کمرے کے قریب رہے اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔ یہ ہدایات دینے کے بعد میں اس کے ساتھ پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی کہ شاید نشے کی حالت میں وہ سچ اُگل دے لیکن وہ بڑا ہی پکا نکلا۔ اپنی ذات کے بارے میں اس نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے کا لطف آ گیا۔ انسانی نفسیات کے بارے میں بات ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے نفسیات کا کوئی پروفیسر مجھ سے مخاطب ہے۔ تاریخ کا ذکر نکل آیا تو ایسے ایسے حوالے دے ڈالے کہ اس کے حافظے پر مجھے رشک آنے لگا۔

"یار، تم کہیں پروفیسر کیوں نہیں ہو جاتے۔"

"اس لیے کہ میرے پاس ڈگری نہیں ہے۔ جو کچھ میں بول رہا ہوں وہ تو آپ جیسے لوگوں کے پاس بیٹھ کر سیکھا ہے۔"

یہ پہلی بات تھی جو اس نے اپنے بارے میں بتائی تھی۔

ہم دونوں جب بہت پی چکے، بہت بول چکے تو اسے میں اس کے کمرے میں چھوڑ آیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن میں دفتر چلا گیا۔ ملازم کو ہدایت کر گیا کہ وہ اس کا خیال رکھیں۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

شام کو جب میں گھر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ممی کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ وہ باتونی شخص تھا۔ ایک ہی دن میں اس نے ممی کو شیشے میں اُتار لیا تھا۔ یہ وقت ممی کے کلب جانے کا ہوتا تھا لیکن غالباً وہ اس کی باتوں میں مشغول ہو کر کلب بھی نہیں گئی تھیں۔

"ممی، آج آپ کلب نہیں گئیں؟"

"میرا کلب تو آج یہیں ہو گیا۔ تمہارے یہ دوست ایسی دلچسپ گفتگو کرتے ہیں کہ بس۔"

"کیوں صاحب، ممی پر بھی جادو کر دیا؟" میں نے اختر سے کہا۔

"بھائی اپنا تو ایسا ہی ہے۔ نوکری کرتے ہیں تو کھانے کو ملتا ہے۔"

"چلو، اب ممی کی جان چھوڑو۔ ہماری نوکری کرو۔"

"ہاں بھائی، کھانے کے بعد پینا بھی تو پڑتا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس دن کے بعد سے ممی اس کے گیت گا رہی تھیں۔ اس کی انگریزی دانی سے تو بہت ہی متاثر تھیں لیکن میری طرح وہ بھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھیں کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے اپنے بارے میں اس نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ ممی کا اپنا خیال تھا کہ وہ کسی دولت مند گھرانے کا فرد ہے جو کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے نکل آیا ہے۔ دراصل ممی کی پرابلم یہ تھی کہ وہ جس کو اچھی انگریزی بولتے ہوئے دیکھتی تھیں، اس کا تعلق کسی دولت مند گھرانے سے جوڑ دیتی تھیں۔ انہیں یہ کہنا گوارا نہیں تھا فلاں کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شرافت سے مراد ان کے نزدیک دولت مند گھرانا ہوتا تھا۔

ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ اختر نے غالباً ممی کے کہنے پر مجھ سے میری شادی کی بات چھیڑ دی۔

"یار ظفر، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے میری شادی کی کیا سوجھ گئی؟"
"تمہیں شاید معلوم نہیں۔ میں اور علوم کی طرح ستاروں کا علم بھی رکھتا ہوں۔ میں نے آج تمہارا زائچہ بنایا تھا۔ اس زائچے سے معلوم ہوا، تم اگر شادی کر لو تو بہت ترقی کرو گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ملک کے صدر یا وزیراعظم بن جاؤ۔"
"ابے یہ بھی کوئی عہدے ہیں۔ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔"
"چار دن کی چاندنی میں عمر بھر کی چاندی ہو جاتی ہے۔"
"چلو، میں مان بھی لوں تو مجھ شرابی سے شادی کرے گا کون؟"
"شرابی تو غریب لوگ ہوتے ہیں۔ آپ تو اعلیٰ سوسائٹی کے نمایندہ ہیں۔ اگر تم اسے بُرا سمجھتے ہو تو چھوڑ دو لیکن شادی کرنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔"
"اختر، اگر تم سنجیدہ ہو ہی گئے ہو تو یہ بتاؤ تم لڑکیوں کے بارے میں جانتے کتنا ہو؟"
"یہ پوچھو میں انسانوں کے بارے میں کتنا جانتا ہوں۔ لڑکیاں بھی تو انسان ہی ہوتی ہیں۔ جس طرح سب انسان اچھے نہیں ہوتے اسی طرح سب لڑکیاں بھی اچھی نہیں ہوتیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ لڑکیوں میں بُرائی کا تناسب مردوں کی بہ نسبت کم ہوتا ہے۔"
"تم کتابی باتیں کر رہے ہو۔ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں لڑکیاں جلد بہک جاتی ہیں۔ ان کی فطرت میں چاہے جانے کا جذبہ ہے۔ وہ ہمیشہ شائق رہتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ چاہنے والے ہوں۔"
"تم اپنے تجربے کی خود تردید کر رہے ہو۔ اگر ایک عورت چار چاہنے والے رکھتی ہے تو ایک عورت خراب ہوئی، چار مرد خراب ہوئے۔ ایک اور چار کا تناسب نکل آیا۔"
"میں کمی یا زیادتی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جو بیوی مجھے ملے گی کیا مجھ سے پہلے اس کے چار چاہنے والے نہیں رہ چکے ہوں گے۔ کیا مردوں کے اس معاشرے میں اسے کوئی مرد نہیں ملا ہو گا؟"
"تمہارا مسئلہ یہ ہے ظفری کہ جو لڑکیاں تمہیں ملیں تم نے ساری دنیا کی لڑکیوں کو ویسا ہی سمجھ لیا۔ یہ تمہاری سوچ کی خرابی ہے، لڑکیوں میں کوئی خرابی نہیں۔ تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آم کے پیڑ میں بھی امرود آئیں گے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جس تہذیب کی پروردہ لڑکیاں تمہارے تجربے میں آئی ہیں، اس سے مختلف تہذیب کی لڑکیاں ویسی نہیں ہوں گی۔ تم اپنی تہذیب سے مختلف کسی تہذیب میں شادی کر لو۔ جن لوگوں کو آپ لوگ دقیانوسی کہتے ہو۔ وہاں شادی کر لو، وہاں بوائے فرینڈز کی وبا نہیں ملے گی۔"
"وہ لڑکی ہمارے ماحول میں رہے گی کیسے؟"
"اگر آپ اس سے وہ کچھ نہیں چاہیں گے جس سے آپ بھاگ رہے ہیں تو ضرور ایڈجسٹ کر لے گی۔ بس یہ خیال رہے کہ وہ پڑھی لکھی ہو۔"
اختر سے میری یہ بحث کوئی ایک دو دن نہیں ہوئی تھی، کئی دن تک وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر ایک دن میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔
"میں یا ممی کسی غریب گھرانے کو جانتے تک نہیں پھر کس طرح لڑکی ڈھونڈی جائے گی۔"
میرا خیال تھا کہ میری طرح وہ بھی یہی کہے گا کہ جان پہچان تو اس کی بھی نہیں ہے۔
"یہ مشکل میں حل کیے دیتا ہوں۔ ایک متوسط درجے کے گھرانے کو میں جانتا ہوں۔ مجھ سے پتا لو اور اپنی ممی کو لے کر چلے جاؤ۔ لڑکی دیکھ لو، اگر پسند آ جائے تو رشتہ ڈال دینا۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ لڑکی کیسی ہے لیکن ان لوگوں کی شرافت کی گواہی میں دیتا ہوں۔"
"پتے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بھی تو ساتھ چلو گے، آخر دوست ہو میرے۔ تم چلو گے تو ہماری سفارش بھی ہو جائے گی۔"
"میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا بلکہ میرا نام بھی نہ لینا۔ بنتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔"
"کمال ہے! تم انہیں جانتے بھی ہو اور وہاں جانے سے گریز بھی کر رہے ہو۔"
"بس یار، ایسا ہی ہے۔ وہ لوگ مجھے کسی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ مجھے اچھا نہ سمجھیں لیکن میں تو ان کا بھلا ہی چاہوں گا۔ اچھا ہے ان کی بیٹی کا رشتہ ہو جائے۔"
مجھے پہلی مرتبہ اس کا کردار مشکوک لگا تھا لیکن اس وقت اس پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے تو اس وقت ممی کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ غریب کے نام سے چڑتی تھیں اور یہاں غریب گھرانے کی بہو لانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ایک لحاظ سے میں خوش بھی ہو رہا تھا کہ انکار ہو گا تو ممی کی جانب سے ہو گا۔ اختر کی نظروں میں، میں تو سرخرو ہو جاؤں گا۔

میں نے ہمت کر کے ممی سے بات کی اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انہیں یہ گلہ تھا کہ میں دولت مند گھرانے کی لڑکیوں کو چھوڑ کر کسی غریب گھر میں شادی کے لیے تیار ہو گیا ہوں۔ وہ مجھے طعنہ دے رہی تھی کہ بزنس مین گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ وہ تو دولت مند گھر میں، اپنے سے بڑے گھرانے میں شادی کرتا ہے تا کہ کاروبار میں اور وسعت ہو۔ اس میں ممی کا قصور نہیں تھا۔ ہماری کمیونٹی میں سب اسی طرح سوچتے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کبھی تیار نہ ہوتیں لیکن وہ دیکھ رہی تھیں کہ میں بڑی مشکل سے تو تیار ہوا ہوں۔ وہ بھی تیار ہو گئیں۔ میں نے اختر سے ایڈریس لیا اور اس ایڈریس پر پہنچ گیا۔
کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ یہاں کے اکثر گھروں پر نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی ایک جگہ پارک کی اور نمبر پڑھتا ہوا اس مکان تک پہنچ گیا جہاں کا ایڈریس اختر نے مجھے دیا تھا۔
دروازے پر کال بیل موجود تھی۔ اس کے جواب میں ایک صاحب باہر آئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہی وہ صاحب ہیں لیکن پھر بھی پوچھنا ضروری تھا۔
"ہمیں سید انور علی سے ملنا تھا۔"
"جی فرمائیے، میں ہی انور علی ہوں۔"
"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "کیا ہم اندر آ سکتے ہیں تا کہ بیٹھ کر اطمینان سے باتیں ہوں۔"
"ضرور، ضرور...... تشریف لائیے۔"
انہوں نے مجھے اور ممی کو لے جا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا جو یقیناً ان کا ڈرائنگ روم تھا۔ کمرا نہایت صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ پڑا تھا دوسری جانب تخت بچھا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو کرسیاں پڑی تھیں۔
"معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" انور صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آج پہلی مرتبہ تو ہم مل رہے ہیں۔ اب مل گئے ہیں تو جان پہچان بھی ہو جائے گی۔"
"زحمت کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟"
"یہ میں نہیں، میری والدہ بتائیں گی۔ ایسی باتیں ان کے منہ سے اچھی لگتی ہیں۔ میری موجودگی مجبوری ہے کیونکہ والدہ کو لانے والا کوئی اور تھا نہیں۔ مجھے امید ہے اسے آپ میری گستاخی تصور نہیں کریں گے۔"
"صاحب زادے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ٹھہریئے، میں اپنی زوجہ کو بھی یہیں بلوا لوں۔ عورتیں عورتوں سے بات کریں تو اچھا لگتا ہے۔"
وہ گئے اور اپنی بیوی کو بلا کر لے آئے۔
"بہن، میں ذرا کچن میں مصروف تھی۔ آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی۔"
"زحمت کیسی، اتنی دیر ہم بھائی صاحب سے باتیں کرتے رہے۔"
"یہ بولتے کہاں ہیں۔ آپ ہی کو بولنا پڑا ہو گا۔"
"بہن، پہلے میں اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔ یہ میرا بیٹا ہے ظفر، ظفر انڈسٹریز کا نام آپ نے سنا ہو گا اور بھی کئی کاروبار ہیں۔ میرے شوہر کے انتقال کے بعد اب یہی تمام کاروبار کا مالک ہے۔ آپ کے دروازے پر میں اس لیے آئی ہوں کہ اب مجھے ظفر کی شادی کی فکر ہے۔"
"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"
"بہن، اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔ کیا اپنا گھر نہیں دکھاؤ گی؟"
"ہمارا گھر ہے ہی کتنا بڑا۔ دو کمروں کا مکان آپ کے لائق نہیں۔ پھر بھی آیئے میں آپ کو گھر دکھاؤں۔"
ممی اُٹھ کر ان کے ساتھ چلی گئیں۔ گھر دیکھنے کا تو بہانہ تھا دراصل ممی یہ چاہتی تھیں کہ اندر جا کر لڑکی کو بھی دیکھ لیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اندر آئیں تو ممی کے چہرے پر اطمینان تھا۔
انہوں نے بیٹھتے ہی کہا "بہن، مجھے آپ کی بیٹی عدیلہ بہت پسند آئی ہے۔ اب میں یہ چاہوں گی کہ آج کی یہ ملاقات رشتہ داری میں تبدیل ہو جائے۔"
انور علی نے نہایت معقول بات کی "وہ تو ٹھیک ہے، جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں لیکن آپ نے جو اپنا تعارف کرایا ہے اس کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کا ہمارا کوئی جوڑ نہیں۔ رشتہ برابر والوں میں ہی اچھا لگتا ہے۔ ہم آپ کا ساتھ کتنی دیر دے سکیں گے؟"
"بھائی صاحب، یہ نہ کہیے۔ انسان، انسان سب برابر ہوتے ہیں۔"
"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو یہ کہہ رہی ہیں ورنہ ایسا

ہے نہیں۔ دولت اور امارت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے برابر والوں میں لڑکی ڈھونڈنی چاہیے۔''

اب میری باری تھی کہ معاملے کو سنبھالوں ''انور صاحب! میں جس سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہوں، وہاں بے جا آزادی ہے جبکہ میں اور میری ممی اس آزادی کے خلاف ہیں۔ اسی لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''بیٹا، بہت نیک خیالات ہیں تمہارے لیکن میری بیٹی تو وہاں جا کر اجنبی ہو جائے گی۔ وہ کیسے ایڈجسٹ کرے گی۔ پھر آپ ہی کو شکایت ہوگی۔''

''بھائی صاحب، جلدی نہیں ہے آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں ایک بات چھوڑے جا رہی ہوں، قبولیت بخشنا آپ کا کام ہے۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔ ہم ضرور غور کریں گے۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی آپ کو ہمارا پتا کس نے دیا؟''

''ہیں ایک صاحب جو ایسے نیک کام کرتے رہتے ہیں۔'' میں جلدی سے بول پڑا کہ کہیں ممی بھانڈا ہی نہ پھوڑ دیں۔

''پھر میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گی۔'' ممی نے کہا۔

''ضرور، ضرور۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ ممی جس خوش دلی سے آئی تھیں، اس خوشی سے اُٹھی نہیں تھیں۔ اس کا اظہار انہوں نے راستے میں کر بھی دیا۔

''ظفری ڈارلنگ! تم نے دیکھ لیا ان غریبوں کے دماغ کتنے خراب ہوتے ہیں۔ اتنے اچھے رشتے پر بھی فرما رہے ہیں کہ غور کریں گے۔ یہ تو سراسر ہماری بے عزتی ہے۔''

''ممی، ہم ان کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ ہمیں جاننے کے لیے انہیں کچھ وقت تو درکار ہوگا۔ وہ اگر وقت مانگ رہے ہیں تو ٹھیک مانگ رہے ہیں۔''

''اب مجھ سے دوبارہ آنے کو مت کہنا۔ بیٹی دینا ہو دیں، ورنہ منع کر دیں۔''

''انہوں نے کہہ تو دیا۔ وہ خود انفارم کریں گے۔ فون نمبر انہیں میں دے آیا ہوں۔''

ممی تو خفا تھیں لیکن میں ان لوگوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں نے اب تک مخلوط محفلیں دیکھی تھیں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں تو اس کا خوب ہی مظاہرہ ہوتا تھا۔ ماں باپ لڑکیوں کو خود پیش کرتے تھے۔ انہیں تنہائی دیتے تھے کہ وہ آپس میں خود بات چیت کر لیں۔ ایک یہ ماں باپ ہیں کہ لڑکی کی جھلک تک نہیں دیکھنے دی۔

بڑوں کے درمیان بات ہو گئی تھی۔ اب جواب کا انتظار تھا۔

اختر سے بات ہوئی تو اس نے بھی کہا کہ انور صاحب بہت خوددار آدمی ہیں۔ اتنی آسانی سے نہیں مانیں گے لیکن مان جائیں گے۔ اپنی بیٹی کا بھلا کون نہیں چاہتا؟

میں سمجھ رہا تھا انور علی بہت جلد رابطہ کریں گے۔ اتنے اچھے رشتے کو کون ٹھکراتا ہے لیکن میری توقع کے برخلاف بہت دن لگ گئے۔ میں نے خوشامد درآمد کر کے ممی کو پھر بھیجا۔ معلوم ہوا وہ لوگ گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب مجھے بھی اُلجھن ہونے لگی تھی۔ گھر کا کیا دیکھنا، شادی کے بعد دیکھ لیتے۔ اب کچھ وقت اس میں گزر جائے گا لیکن کیا کرتا، انہیں دعوت دے دی۔

وہ گھر دیکھ کر چلے گئے، پھر غائب ہو گئے۔ میں نے پھر ممی کو بھیجا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ لوگ شادی پر تیار ہو گئے اور شادی کی تاریخ دے دی۔

میں اختر کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے گھر پہنچا تو معلوم ہوا وہ سیلانی کتابیں اُٹھا کر کہیں جا چکا ہے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے، کسی دوست کے گھر گیا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا، اس کے کون کون سے دوست ہیں۔ میں نے سب کے گھر کے چکر لگائے اور وہ ایک جگہ مل گیا۔

''یار، تم تو بتائے بغیر ہی چلے آئے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔''

''اب تمہاری ضرورت تھی تو تم یہاں چلے آئے۔''

''مجھے معلوم ہے کس وقت کہاں رہنا چاہیے۔ کبھی کوئی افتاد پڑی تو ضرور آؤں گا تم سے مدد لینے۔''

''شادی میں تو آؤ گے؟''

''اس شہر میں ہوا تو ضرور آؤں گا۔ ایک میرے نہ آنے سے کیا فرق پڑے گا۔ بس اتنی گزارش ہے۔ انور علی کی بیٹی کو کبھی کوئی تکلیف مت دینا۔ انور علی بہت اچھے آدمی ہیں، انہیں بہت دکھ ہوگا۔''

''یار، اگر وہ اتنے اچھے آدمی ہیں تو تم نے ان سے ملنا جلنا کیوں بند کر دیا؟''

''ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔''

وہ بتانا نہیں چاہتا تھا تو میں کیوں زور دیتا؟

شادی کے بعد میں نے پہلی مرتبہ عدیلہ کو دیکھا تو میرا ... فیل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ حسن صرف دولت مند گھرانوں میں ہوتا ہے لیکن عدیلہ کو دیکھ کر یہ خیال ہی باطل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حسن کی شگفتگی بھی تھی اور پاکیزگی کی چمک بھی۔ میرا سینہ فخر سے بلند ہو گیا۔ اب میں اپنے ہم ...نسبوں سے کہہ سکتا تھا، عدیلہ کے پاس دولت نہ سہی حسن کی دولت تو ہے۔

حسن تو ظاہری چیز ہے جس کا اندازہ مجھے دیکھتے ہی ہو گیا تھا لیکن سیرت میں بھی وہ بے مثال ثابت ہوئی۔ اس نے اپنی خدمت گزاری سے میرا ہی نہیں ممی کا دل بھی جیت لیا۔ میں نے ممی اور ڈیڈی کا تعلق بھی دیکھا تھا۔ ممی کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈیڈی کی ضروریات کیا ہیں اور انہیں کس طرح پورا کرنا ہے۔ ہمارے گھروں میں ہوتا یہی ہے کہ سارے کام نوکروں پر چھوڑ دیے جاتے ہیں لیکن عدیلہ میرے سارے کام خود ہی کرتی تھی۔

اس کی خدمت گزاری ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے ہر وقت کی ساتھی شراب کو بھی چھوڑ دیا۔ بس یہ خیال آتا تھا کہ جو عورت میری اتنی خدمت کر رہی ہے اس سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔

چھ مہینے اس طرح گزر گئے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ عدیلہ بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی غریب گھر سے آئی ہے۔ میرے دوستوں سے ملتی ضرور تھی لیکن ایک خاص حد میں رہتے ہوئے۔ بزنس پارٹیاں ہوتی تھیں، ان میں بھی اس طرح شریک ہوتی کہ سب سے منفرد نظر آتی۔

اس بے بہا دولت کو دیکھ کر اختر کے لیے میرے دل میں شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے تھے لیکن وہ تھا کہ کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھتا ہی نہیں تھا۔ جہاں آخری بار ملاقات ہوئی تھی وہ اس گھر کو بھی چھوڑ گیا تھا۔ میں نے بہت سے دوست کھوئے تھے لیکن اختر کی بات اور تھی۔

ایک دن میں اس دوست کے گھر پہنچا جس کی معرفت اختر سے میری ملاقات ہوئی تھی کہ اس سے اختر کے بارے میں کچھ پوچھوں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اختر تو اس طرح غائب ہو گیا ہے جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔ مہینے ہو گئے اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔ کسی دوست کے گھر پر بھی نہیں۔ کہیں لمبا ہی چلا گیا ہے۔

اتنا اچھا دوست کھو دینے پر مجھے افسوس تھا۔

میرا دوسرا خیال بھی غلط ثابت ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری دنیا میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی لیکن اس نے صرف چھ مہینے میں خود کو میرے ماحول میں ڈھال لیا تھا لیکن اعتدال کے ساتھ۔

میری شخصیت کا مثبت پہلو صرف چھ مہینے برقرار رہ سکا۔ اس کے بعد میرے اندر چھپے ہوئے وہ خیالات سر اُٹھانے لگے جو شادی سے پہلے میرے ذہن میں پختہ ہو چکے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا ماضی کے نقش مٹ چکے ہیں لیکن اچانک ایک دن مجھ پر دورہ سا پڑا۔ میرے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ عدیلہ اتنی خوبصورت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کسی مرد نے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا ہو۔ شک کی جو بیماری میرے ذہن میں پلتی رہی تھی اچانک حملہ آور ہوئی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں سوچ رہا تھا، ہو سکتا ہے یہ اب بھی چھپ چھپ کر اس آدمی سے ملتی ہو۔ اسی لیے تو بار بار میکے جانے کے لیے کہتی ہے۔ ٹیلی فون پر باتیں بھی کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے شادی سے پہلے کا کوئی دوست ہو جس سے اب بھی عدیلہ کا رابطہ ہو۔ میں گھبرا کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ دور ہوئی تو شک بھی دور ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ اس معصوم پر کیسے کیسے الزام لگا رہا ہوں۔ کچھ دیر کو آرام مل گیا لیکن جب وہ میرے سامنے آئی تو پھر یہی خیالات آنے لگے۔

اب یہی معمول بن گیا تھا۔ وہ نظروں سے دور ہوتی تو میرے خیالات قابو میں رہتے لیکن جیسے ہی وہ سامنے آتی تو بیماری مجھ پر حملہ آور ہو جاتی۔ میں سوچنے لگتا، یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو کسی نے چاہا نہ ہو۔ کئی مرتبہ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس سے پوچھ کر دیکھوں لیکن خود ہی اپنے ارادے کی نفی بھی کر دی۔ میرے پوچھنے پر وہ کیا بتا دے گی؟ اُلٹا یہ ہوگا کہ مزید احتیاط برتنے لگے گی۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی اور وہ کسی سے ملتی رہے گی۔

میں شک کی آگ میں اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ اپنی زندگی کو میں نے خود ہی جہنم بنا لیا تھا۔ اس جہنم سے نکلنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ اس کا بس ایک ہی علاج تھا کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ آنکھوں سے دیکھ لوں۔ میں کسی جاسوس کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ باہر نکلتی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا۔ وہ فون کرتی تو چھپ کر اس کی باتیں سنتا۔ ایک روز تو حد ہو گئی۔ وہ میکے گئی تو میں بھی اچانک پہنچ گیا کہ دیکھوں اس کے گھر میں کون آیا ہوا ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے بھی عدیلہ کی چالاکی قرار دیا۔ وہ اتنی سیدھی نہیں ہے۔ اسے کسی سے ملنا... ہوگا تو باہر جا کر ملتی ہوگی۔ میں ایسا محل تعمیر کر رہا تھا جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اکیلے میں اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا تھا لیکن عدیلہ کو دیکھتے ہی بے بس ہو جاتا تھا۔

کہتے ہیں انسان جو ڈھونڈتا ہے اسے وہی ملتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں ایک روز عدیلہ کو لینے کے لیے اس کے گھر گیا تو عدیلہ موجود نہیں تھی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کی والدہ سے کہہ دیا کہ میں کچھ دیر بعد ڈرائیور کو بھیج دوں گا وہ اس کے ساتھ آ جائے۔ میں باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھا۔ ابھی گلی کے موڑ تک آیا تھا کہ میں نے ایک ٹیکسی میں عدیلہ کو دیکھا۔ اس ٹیکسی میں ایک لڑکا اور سید انور علی بھی تھے۔ میرے شک نے فوراً سر اُٹھایا۔ اس کا مطلب ہے انور علی بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہ لڑکا کون تھا، عدیلہ جس کے ساتھ گئی تھی۔ ہے کیسی عیّار، باپ کو ساتھ لے کر گئی تھی کہ کسی کو شک نہ ہو۔ میں ایسے کئی باپ دیکھ چکا تھا جن کی موجودگی میں ان کی بیٹیاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ سیر سپاٹے کیا کرتی تھیں۔ میری آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ مجھے ضروری کام سے جانا تھا لیکن میں سیدھا گھر چلا گیا۔ شام تک عدیلہ بھی آ گئی۔ اسے خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں کس عذاب سے گزر رہا ہوں۔ وہ ہنستی ہوئی داخل ہوئی مگر میں نے اسے رُلا دیا۔ اسے دیکھتے ہی اس بے ہودگی سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا کہ وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''چوری پکڑی گئی تو بولنا بھول گئیں۔ بتاتیں کیوں نہیں کون تھا وہ؟''

''کیا بولوں، میں تو آپ کی ذہنیت پر افسوس کر رہی ہوں۔ ابو بھی تو میرے ساتھ تھے پھر وہ لڑکا میرے خاندان ہی کا کوئی ہوگا۔''

''تو یہ کہو، ابو کی نگرانی میں ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟''

''خبردار! میرے ابو کے لیے ایک لفظ بھی مت کہنا۔''

''اور اس لڑکے کے بارے میں؟''

''وہ میرے چچا کا بیٹا تھا۔ ہم لوگ اسپتال گئے تھے چچا کو دیکھنے۔''

''تمہاری امی تو کہہ رہی تھیں تم اپنے ابو کے ساتھ ان کے کسی دوست کے گھر گئی ہو؟''

''اب میں اپنے خاندانی جھگڑوں کے بارے میں کیا بتاؤں۔ چچا سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اگر امی کو بتا کر آتے تو وہ مجھے یا ابو کو جانے نہیں دیتیں۔ اس لیے ان سے بہانہ کرنا پڑا تھا۔''

''خوب کہانی گھڑی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا ماڈرن لڑکیاں ہی آوارہ ہوتی ہیں، تم لوگ تو ان سے بھی بڑھ کر ہو۔ اب تک مجھے دھوکا دیتی رہیں اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

وہ بے چاری کیا کرتی۔ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ میں نے اسے بھی اس کا ڈراما سمجھا اور بُرا بھلا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس دن کے بعد سے میرے اور اس کے درمیان سرد جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ مجھ سے بولنے کی کوشش بھی کرتی تو میں نفرت سے منہ پھیر لیتا۔

شک کرنے والا اپنی آگ میں خود جلتا ہے۔ میرا حال بھی یہی تھا۔ چند ہی روز میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ میں شراب چھوڑ چکا تھا لیکن عدیلہ سے دور ہوتے ہی شراب کے قریب چلا گیا۔ شراب کا نشہ میرے شک کو دوبالا کرتا رہتا تھا۔ غصہ عدیلہ پر اُترتا تھا۔ اب میں نے اس پر ہاتھ بھی اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی کب تک خاموش رہتی۔ اب اس نے بھی لڑنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی سمجھانے والا ہوتا تو شاید اس آگ پر پانی چھڑکا جا سکتا تھا مگر یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ ممی تو اور آگ پر تیل ڈالتی رہتی تھیں۔ وہ سارا ملبا مجھ پر ڈال رہی تھیں۔ بار بار کہتی تھیں، اور گھسو غریبوں میں جا کر۔

پانی جب ایک طرف بہنے لگے تو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ یہی حال شک کی بیماری کا ہے۔ یہ فطرت واقعات خود سامنے لانے لگتی ہے اور چونکہ شکی طبیعت ان باتوں کی وضاحت نہیں مانگتی اس لیے جو حقیقت نہیں ہوتی وہی حقیقت نظر آتی ہے۔

ایک دن میں گھر آیا تو بیڈ روم میں رکھی ایش ٹرے میں بجھا ہوا سگریٹ دیکھ کر میرے شک نے سر اُٹھایا۔ میں تو گھر میں تھا نہیں پھر یہ سگریٹ کہاں سے آ گیا اور یہ وہ برانڈ بھی نہیں جو میں پیتا ہوں۔ میں نے سگریٹ کے اس ٹکڑے کو جیب میں ڈال لیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں عدیلہ سے پوچھتا لیکن میرے دل میں تو چور تھا۔ میں نے فرض کر لیا کہ اس کا کوئی چاہنے والا ہوگا جو میرے پیچھے آیا اور بیڈ روم تک چلا آیا۔ ہو سکتا ہے وہی کزن ہو یا کوئی اور۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون تھا؟ میں نے ممی سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ دن بھر سے گھر پر نہیں تھیں۔ شک اور تقویت پکڑ گیا۔ عدیلہ نے اس تنہائی سے فائدہ اُٹھایا ہوگا اور فون کر کے اسے بلایا ہوگا۔ میں خود ہی تانے بانے بُنتا چلا گیا۔ پھر نوکروں سے معلومات کیں، ایک نوکر نے آنے والے کو دیکھا تھا۔ اس نے نام بتایا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔

''سرکار، وہ جو آپ کے دوست اختر صاحب تھے، وہ آئے تھے۔''

یہ نام سنتے ہی ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اختر نے اپنی محبوبہ میرے حوالے کی ہے۔ اسی لیے وہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو میرا نام نہ بتانا کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ وہ خود تو شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے عدیلہ کو یہاں بھیج دیا کہ چھپ چھپ کر ملتا رہے گا۔ اگر اسے آنا ہی تھا تو میری موجودگی میں آتا اور پھر میرے بیڈ روم میں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ ساری شہادتیں عدیلہ کے خلاف جا رہی تھیں۔ ایک شہادت رہ گئی تھی جو خود اس نے اپنے خلاف کر لی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کون آیا تھا تو وہ نہ جانے کیوں انکار کر بیٹھی۔

''کوئی بھی نہیں...... کوئی بھی تو نہیں آیا تھا۔ کون آئے گا اور وہ بھی بیڈ روم میں؟'' اس کا اُکھڑا ہوا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

''کیا اختر نام کا آدمی تمہارے پاس نہیں آیا تھا۔ بتا مکّار، تو اسے کب سے جانتی ہے؟''

''بچپن سے جانتی ہوں کیونکہ وہ میرا بھائی ہے۔''

''چلتر عورتیں جب پکڑی جاتی ہیں تو اسی طرح بھائی بنانے پر اُتر آتی ہیں۔ یہ کیسا بھائی ہے جو نہ تمہارے گھر میں تھا نہ تمہاری شادی میں۔''

''اس لیے کہ ابو نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔''

''مجھے جھوٹی کہانیوں سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہارا بھائی ہوتا تو مجھ سے ملتا۔''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں کچھ نہ بتاؤں۔ وہ اچانک انکشاف کرے گا۔''

''بے غیرت عورت! رشتوں کو بھی بدنام کرتی ہے۔ پہلے کزن کے ساتھ گھومتی رہی اب اسے بھائی بنا لیا۔ بہت ہو چکی۔ اب میں تمہارے جھانسے میں آنے والا نہیں اور اسے بھی دیکھ لوں گا جس نے مجھے تمہارے گھر بھیجا تھا کہ تم یہاں چلی آؤ اور وہ میری دولت پر عیش کرتا رہے۔''

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن میرا ہاتھ اُٹھ گیا۔ میں نے اسے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔ شور سن کر ممی بھی آ گئیں۔

''کیوں پولیس کیس بناتے ہو۔ ایسی عورت سے چھٹکارا حاصل کرو۔ طلاق دو اور گھر سے روانہ کردو۔''

ہم دونوں اسے بے ہوش چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے۔ دوسرے کمرے میں آتے ہی میں نے بوتل اُٹھالی اور اتنی پی کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ کب رات آئی، کب صبح ہوگئی۔ میری آنکھ کھلی تو عدیلہ میرے پیروں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

''آپ یقین کریں، اختر میرا سگا بھائی ہے۔ ابھی مجھے لے کر ابو کے پاس چلیں اور ان سے پوچھ لیں۔ اب تو ان کی ابو سے صلح بھی ہوگئی ہے۔ اب کچھ نہیں چھپائیں گے۔''

''تمہاری طرح وہ بھی ایک نمبر کے جھوٹے ہوں گے۔ وہی کہیں گے جو تم کہہ رہی ہو۔ تم اسی وقت اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں وکیل کے پاس جاتا ہوں، طلاق کے کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔''

''خدا کے لیے ظفری! میرا گلا گھونٹ دو مگر مجھے طلاق مت دو۔ میرے ابو میری موت برداشت کرلیں گے، یہ برداشت نہیں کریں گے کہ تم مجھے طلاق دو۔''

''میں تمہارا گلا گھونٹ کر اپنے ہاتھ گندے کیوں کروں؟ اپنا سامان اُٹھاؤ اور ڈرائیور کے ساتھ اپنے گھر چلی جاؤ۔ طلاق نامہ تمہیں مل جائے گا۔''

میں اُٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا اور پھر تیار ہوکر باہر نکل گیا۔ ارادہ یہی تھا کہ کچھ دیر کے لیے دفتر جاؤں گا پھر یا تو وکیل کی طرف جاؤں گا یا وکیل کو دفتر ہی میں بلوا لوں گا۔

میں دفتر پہنچا تو مجھ سے پہلے اختر ویٹنگ روم میں بیٹھا میرا انتظار کررہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا لیکن میں نے اپنے غصے پر قابو پالیا کہ شاید اس سے کچھ راز کی باتیں اُگلوا سکوں۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

''یار اختر! کہاں غائب ہوگئے تھے۔ میری شادی تک میں نہیں آئے۔ کس سے چھپتے پھر رہے تھے؟''

''جی ہاں پولیس سے۔ کسی کیس میں پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی اور ہاں، ایک بات بتاؤں، میرے والدین سے میرا جھگڑا تھا۔ ان سے صلح ہوگئی ہے بلکہ تمہاری وجہ سے صلح کرنی پڑی۔''

''میری وجہ سے کیوں؟''

''تاکہ تمہارے گھر میں آزادانہ آجاسکوں۔''

''وہ تو تم آتے رہے ہو۔''

''عدیلہ کے آجانے کے بعد ذرا مشکل تھا کیونکہ بہنوئی صاحب، میں عدیلہ کا بھائی ہوں۔ سید انور علی کا بیٹا۔''

میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ کس خوبصورتی سے عدیلہ کی کہی ہوئی باتوں کو دُہرا رہا ہے۔

''جناب کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟ ذرا ولدیت تو چیک کروں۔''

اس نے شناختی کارڈ دکھایا۔ ولدیت میں سید انور علی کا نام لکھا ہوا تھا۔

''اب آپ میرے گھر چلیں اور سید انور علی صاحب سے مزید تصدیق فرمائیں۔''

''نہیں، اس سے پہلے تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گے اور اپنی بہن سے ملو گے۔ اسے کتنی خوشی ہوگی میرے ساتھ دیکھ کر۔''

میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا میرے حکم کے مطابق وہ اپنے میکے جا چکی ہے۔ اب مجھے اختر کو تمام بات بتانی پڑی کہ کس طرح میں نے اس پر شک کیا اور اسے طلاق کی دھمکی دی اور وہ کیوں اپنے گھر چلی گئی۔

وہ گھبرا گیا مگر خیریت گزری کہ میں نے عدیلہ کو طلاق نہیں دی تھی۔

میں اسی وقت اختر کو لے کر عدیلہ کے گھر پہنچا۔ ابھی اس کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے، مجھے اختر کے ساتھ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔

اختر نے میرا گھر آباد کیا تھا، اسی نے بروقت آ کر اسے ٹوٹنے سے بچالیا۔

اس دن کے بعد سے میں نے عدیلہ پر کبھی شک نہیں کیا۔ میری صحت یابی کے لیے ایک بڑی ٹھوکر کی ضرورت تھی۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی میری اصلاح ہوگئی۔

اب اختر بے کار نہیں ہے۔ میں اس کی ذہانت سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں۔ وہ میرے بزنس میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔

مہمان

جناب عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں نے کراچی میں آنکھیں کھولیں۔ یہیں پلی بڑھی مگر اب بلوچستان کے ایک دور افتادہ گاؤں کی عزت ہوں۔ میری شادی کن حالات میں اور کیسے ہوئی، یہ میں آج سرگزشت کے توسط سے ہر قاری کو بتانا چاہتی ہوں۔ عام کہانی کی نظر سے نہیں بلکہ اس نظر سے آپ اس آپ بیتی کو پڑھیں کہ بلوچستان کے مہمان نواز لوگ، سیدھے سادے لوگ، کیوں ہم سے دوری اختیار کررہے ہیں؟
راحیلہ منصور
(کوئٹہ)

مجھے بلوچستان بہت متاثر کرتا تھا۔

نہ جانے کیوں، شروع سے یہ خواہش رہی تھی کہ میں بلوچستان جا کر وہاں کے چپے چپے کو دیکھوں، لوگوں سے ملوں، بلوچستان کے وسیع و عریض صحرا، اونچے اونچے پہاڑوں میں میرے لیے ہمیشہ ایک کشش سی رہی ہے۔

میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ نہ جانے وہاں کتنی اور کیسی کہانیاں ہوں گی، لوگ کیسے ہوں گے؟ ان کی روایات کیسی ہوں گی حالانکہ وہ بھی ہمارے ہی ملک کا ایک صوبہ ہے اور رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ...... اور کوئٹہ بھی کراچی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

کراچی سے لوگوں کا..... آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ وہاں بھی وہ سب کچھ ہے جو ہمارے اپنے شہر میں ہے۔ کراچی سے دن بھر میں نہ جانے کتنی گاڑیاں صبح و شام وہاں کے لیے چلا کرتی ہیں۔ یعنی وہاں جانے میں کوئی رکاوٹ یا دشواری نہیں تھی، اس کے باوجود مجھے موقع نہیں مل سکا تھا۔

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت ہوا کرتا ہے تو ایک دن وہ وقت آ ہی گیا۔

میں اس زمانے میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں لکھے جانے والے اردو ادب اور شاعری پر ریسرچ کر رہی تھی کہ ایک غزل نگاہوں سے گزری۔

بہت خوبصورت غزل تھی ''اے خالقِ اکبر، مجھے توفیق عطا کر۔ ہم گرفتار بلائے آسمان کب تلک رہیں۔'' اس پوری غزل میں ایک شاعرانہ بانکپن کے ساتھ ایک سلیقے کا احتجاج بھی تھا۔ شکوہ تو تھا لیکن بہت خودداری کے ساتھ۔

چونکہ یہ پوری غزل مجھے اچھی لگی تھی اسی لیے میں نے اپنے استاد سے دریافت کیا ''سر، یہ غزل کس شاعر کی ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ غزل کس کی ہو سکتی ہے؟'' سر نے اُلٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

''ظاہر ہے کہ اردو ادب کے کسی شاعر کی ہوگی۔''

''جی نہیں، یہ غزل ایک ایسے شخص کی ہے جس کی مادری زبان بلوچی تھی۔'' سر نے بتایا۔

''کیا!'' میں چونک اُٹھی تھی ''یہ کیسے ہو سکتا ہے سر! اس میں زبان کی صحت کا کتنا خیال رکھا گیا ہے۔''

''یہی تو کمال ہے۔ یہ غزل ہے میر گل خان نصیر کی۔'' سر نے بتایا۔

اب یہی موقع تھا جو قدرت نے مجھے فراہم کیا تھا۔ مجھے گل خان نصیر کی شاعری پر ریسرچ کرنا تھی اور یہی بہانہ مجھے کوئٹہ لے گیا۔

جب میں نے کوئٹہ جانے کا فیصلہ کیا تو میرے گھر والوں اور دوستوں نے سمجھانے کی کوشش کی ''کیا حماقت کر رہی ہو، وہاں دوسری روایت کے لوگ ہیں۔ تم اس طرح آزادانہ نقل و حرکت نہیں کر سکتیں۔''

''ارے بابا! میں وہاں کسی فیشن شو کے لیے تو نہیں جا رہی۔'' میں نے کہا ''میں تو ایک علمی اور ادبی کام کرنے جا رہی ہوں۔''

''کون تمہیں آزادی سے کام کرنے دے گا؟''

''خود وہاں کے لوگ۔'' میں نے کہا ''خود دیکھ لینا، وہاں مجھے کتنا پروٹیکشن ملے گا۔''

تو اس طرح میں کوئٹہ آ گئی۔

میں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں کہ میں ایک ریسرچر ہوں۔ ادب میرا شعبہ ہے، نام راحیلہ ہے۔ والد صاحب ایک سرکاری آفیسر تھے۔

میرے بابا ایک مختلف مزاج کے انسان تھے۔ انہوں نے مجھے شیشے کا برتن بنا کر نہیں رکھا بلکہ حوصلہ مند بنا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ لڑکی کو گل دان بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے فولاد بن جانا چاہیے۔ اسی لیے میں زمانے بھر کی سیر کرتی پھرتی تھی۔

انہوں نے ایک بات اور بھی کہی تھی کہ دیکھو، تمہیں اچھے بُرے کا خود خیال رکھنا ہے۔ معاشرے، مذہب اور والدین کو جس حد تک سمجھانا اور سکھانا تھا، وہ فرض ہم نے ادا کر دیا ہے، اب تم اپنی اخلاقی قدروں کی خود ہی ذمّے دار ہو۔

تم اپنی مرضی سے فیصلے کر سکتی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کبھی اس لکیر کو عبور کرنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ جو لکیر قدرت اور معاشرے نے کھینچ دی ہے۔

بہر حال میں ہزار اندیشوں کے ساتھ کوئٹہ پہنچ گئی۔

میں قومی ائر لائن سے آئی تھی، میں نے حجاب لے لیا تھا۔ سبرینا ہوٹل میں میرے کمرے کی بکنگ ہو چکی تھی۔ میرے ایک جاننے والے تھے، انہوں نے کوئٹہ میں میرے لیے ایک گائڈ کا بندوبست کر دیا تھا۔

وہ ان کے کسی دوست کا بیٹا تھا۔ منصور نام تھا اس کا۔ منصور کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا ''وہ انتہائی ذہین اور مہذب نوجوان ہے۔ بلوچستان یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا طالب علم ہے۔ دنیا کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتِ حال پر اس کی بہت گہری نظر ہے۔''

وہ نوجوان منصور کوئٹہ ائر پورٹ پر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے اس لیے اچھا لگا تھا کہ اس کے تیور اور انداز بہت مہذب تھے۔

''مس راحیلہ، میں منصور ہوں۔'' اس نے میرے پاس آ کر اپنا تعارف کروایا ''چاچا نے مجھے رہبر بنایا ہے لیکن میں بھٹکتے رہنے کا عادی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، مجھے اپنی راہ پر چلنا آتا ہے۔'' میں

نے مسکرا کر کہا۔

''آئیں، باہر ٹیکسی آپ کے انتظار میں ہے۔''

میں نے اسے بتا دیا کہ میری بکنگ سبرینا پر ٹل کی ہو چکی ہے۔

''ہاں، وہ بہت غنیمت ہے۔'' اس نے کہا ''وہاں کسی حد تک بے حجابی چل جاتی ہے۔''

اس نے بڑی ذہانت کے ساتھ ذومعنی بات کہہ دی تھی۔

وہ مجھے راستوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ ''محترمہ! زرغون روڈ سے گزر رہے ہیں۔ یہ کوئٹہ کی بہت مشہور اور وی آئی پی قسم کا روڈ ہے کیونکہ اسی روڈ کے ساتھ افغان ایمبیسی بھی ہے اور آپ کا وہ ہوٹل بھی ہے جہاں آپ کا قیام ہوگا۔''

''منصور تم یہ بتاؤ، مجھے یہاں گھومنے پھرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے کہا ''ہم بلوچ، عورتوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ آپ کو جہاں جہاں چلنا ہو، میرے ساتھ رہیے گا۔''

سبرینا ہوٹل ایک خوبصورت اور بڑا ہوٹل ثابت ہوا تھا۔ ایسا ہی جیسا کہ دوسرے شہروں میں ہوا کرتا ہے۔ کام کرنے والے صاف ستھری یونیفارم میں ملبوس گھومتے پھر رہے تھے۔ کچھ غیر ملکی مرد اور عورتیں دکھائی دیے۔ اس کا لاؤنج بھی بہت شاندار اور پُر تکلف تھا۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کر اپنا نام بتایا، شناختی کارڈ پیش کیا۔ مجھے میرے کمرے کا نمبر بتا دیا گیا۔ منصور واپسی کی اجازت مانگ رہا تھا۔

''کیوں، کیا تم کمرے تک نہیں چلو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں محترمہ، یہ ہماری روایت کے خلاف ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا ''ہم کسی غیر خاتون کے کمرے میں نہیں جاتے۔''

میں خجل سی ہو کر رہ گئی تھی۔

منصور نے کہا ''میں شام کے وقت آپ کی پاس آؤں گا۔'' اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا ''اس پر میرا موبائل نمبر ہے، جب بھی ضرورت ہو فون کر دیجیے گا۔''

ویٹر نے مجھے کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ دوسری منزل کا ایک پُر آسائش کمرا تھا۔ میرے پاس سامان کے طور پر صرف ایک بیگ اور ایک سوٹ کیس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے شاور لینے کے بعد روم سروس سے کھانا کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔ سب کچھ تو بہت جانا پہچانا تھا۔ یہ اپنا ہی ملک تھا۔ اپنے ہی لوگ تھے۔ پھر لوگ ایسی باتیں کیوں کیا

کرتے تھے؟

کھانے کے بعد مجھے نیند آ گئی تھی۔

شام کی چائے میں نے لاؤنج میں پینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہاں پہنچی تو منصور میرے انتظار میں ہی تھا ”آیئے، میں نے چائے کے لیے کہہ رکھا ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں چائے کے لیے آنے والی ہوں؟“ میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس ایک اندازہ سا ہو گیا تھا۔“ اس نے کہا ”اسی لیے میں آپ کے انتظار میں یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔“

”ایک تو تمہیں اندازے بہت ہوا کرتے ہیں۔“

”اتفاق ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”تم تو شاید انگریزی ادب پڑھ رہے ہو نا؟“ میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”تو پھر تم تو ملٹن اور شیکسپیئر ہی کو جانتے ہو گے۔ تمہیں دوسروں سے کیا واسطہ ہو گا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ میں دوسروں کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔“ اس نے کہا ”آپ دوسروں کے بارے میں تو پوچھ کر دیکھیں۔“

”تم گل خان نصیر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت کچھ۔ کیونکہ میرا بھی وہی قبیلہ ہے جو گل خان نصیر کا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ۔ پھر تو تمہیں ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گا۔“ میں نے پوچھا۔

”بہت کچھ۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ پہلی بار ہی سب معلوم کر لیں۔“ اس نے کہا ”چلیں، آپ کو کوئٹہ کی سیر کرا کے لاتا ہوں۔ بس حجاب میں رہیے گا۔ اس کا ذرا خیال رکھنا ہے۔“

”وہ تو رکھوں گی ...... لیکن تمہارے اس کوئٹہ شہر میں دیکھنے لائق ہے کیا؟“

”بہت کچھ۔“ اس نے کہا ”اور دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے کے لیے ہے۔ اگر آپ اپنا ذہن اور اپنا دل کھول کر یہاں آئی ہیں تو اس شہر میں آپ کو ہر قدم پر تاریخ ملے گی۔ یہاں کی فضاؤں میں ایسی ہوائیں ہیں، جو صحراؤں کی معصومیت اپنے ساتھ لے کر آتی ہیں۔“

”واہ!“ میں نے اس کی تعریف کی ”تم باتیں تو بہت اچھی کر لیتے ہو۔ خالص ادبی مزاج کی، شاعرانہ۔“

”اس لیے کہ میں ایک شاعر بھی ہوں۔“ اس نے بتایا ”اور اپنی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کرتا ہوں۔“

”منصور، یہ تو تم نے بہت اچھی بات بتائی۔“ میں نے کہا۔

”محترمہ، یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس وقت بھی بے شمار بلوچی بہت اچھی اردو شاعری کر رہے ہیں۔ خود گل خان نصیر ہی کو لے لیں، کیسی کیسی غزلیں کہی ہیں انہوں نے۔“

”ان کی ایک غزل ہی سے تو متاثر ہو کر میں یہاں تک آئی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کون سی غزل؟“

”ہم گرفتار بلائے آسماں کب تک رہیں۔“ میں نے کہا ”اس مصرعے ہی میں زبان اپنا کمال دکھا رہی ہے۔“

”آپ ان کی وہ غزل پڑھیں۔ غیروں سے شکایت یہ میرا کام نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بلوچی لوگوں نے اردو میں شاعری کی، لیکن کیا کسی .... کو یہ توفیق ہوئی کہ وہ بلوچی ادب پڑھے؟“

”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔“

”یہی تو بات ہے جس کے لیے ہم آواز اُٹھاتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ بلوچی اپنی ثقافت کی بات کرتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔

”منصور، میں یہاں تمہاری تقریر سننے نہیں آئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بھی مسکرا دیا ”جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں، اس قسم کی تقریر آپ کو بونس کے طور پر ملتی رہے گی۔“

ہم چائے پی کر اس ہوٹل سے باہر آ گئے۔

اس نے پھر سواری کر لی تھی، وہ مجھے بتا رہا تھا ”یہ آرچر روڈ ہے۔ اسی روڈ پر آریا سماج والوں کا مندر ہے۔ اور یہ جو آپ دیکھ رہی ہیں، اسے طوبیٰ مسجد کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے آگے داؤد شاپنگ سینٹر ہے۔ یہاں آپ کو دنیا کی ہر چیز مل جائے گی۔“

”چلو۔ ہم بھی کم از کم دنیا کی چیزوں کو دیکھتے ہوئے چلیں۔“ میں نے کہا۔

”ضرور۔“ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت دے دی۔

وہ شاپنگ سینٹر باڑہ مارکیٹ ہی جیسا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں کراچی والے الیکٹرونک سامان کی

خریداری کے لیے کوئٹہ ہی کا رُخ کرتے تھے۔

یہاں غیر ملکی سامان کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ ہم بہت دیر تک شاپنگ سینٹر میں گھومتے رہے تھے۔ اب چونکہ رات ہونے والی تھی اس لیے ہم ہوٹل واپس آ گئے۔

منصور مجھے خدا حافظ اور شب بہ خیر کہہ کر واپس چلا گیا تھا۔ اسی رات ابو کا فون آ گیا۔ وہ میری خیریت معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ خبر بھی سنا رہے تھے کہ انہوں نے میرے لیے شاید کوئی لڑکا پسند کر لیا ہے۔

مجھے نہ جانے کیوں یہ خبر اچھی نہیں لگی۔ اس کے برعکس دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

☆☆☆

صبح ہوئی تو رات والے فون کا اثر ابھی تک باقی تھا۔

نہ جانے وہ صاحب زادے کون تھے؟ ہوں گے کوئی کھاتے پیتے گھرانے کے فرد۔ شاید باہر سے تعلیم وغیرہ حاصل کر کے آئے ہوں یا کوئی بڑا کاروبار ہو؟

میں اتنا تو ضرور جانتی تھی کہ ابو نے میری شادی کے لیے کوئی عام رشتہ تو نہیں تلاش کیا ہو گا۔ میں اس معاملے میں ان کے معیار کو اچھی طرح جانتی تھی۔

گیارہ بجے کے قریب منصور پھر آ گیا۔ وہ پہلے کی طرح لاؤنج میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گئی اور اسی وقت میری نگاہ اس کے جوتوں پر پڑی اور یہ دیکھ کر عجیب سا لگا کہ اس کے جوتے بوسیدہ اور پھٹے ہوئے تھے۔

اس نے نہ جانے کب کے پُرانے جوتے پہن رکھے تھے۔ اب میں نے اس کا غور سے جائزہ لیا۔ اس کا لباس بھی بہت معمولی سا تھا البتہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بہت تازہ تھی۔

میں نے اپنے پرس سے پانچ ہزار نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے ”منصور، یہ رکھ لو۔“

”یہ کیا؟“ وہ چونک اُٹھا تھا۔

”تمہارا معاوضہ۔“ میں نے کہا ”تم گائڈ ہو نا، تو اس کام کا معاوضہ تو ہونا چاہیے۔“

”نہیں محترمہ، ہرگز نہیں۔“ اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی ”آپ نے شاید میرے پُرانے جوتے دیکھ لیے ہیں یا آپ کو میرے لباس کی کم قیمت کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ سے معاوضہ لوں، آپ ہماری مہمان ہیں اور ہمارے یہاں مہمانوں سے کچھ لیا نہیں جاتا بلکہ انہیں دیا جاتا ہے۔“

”چلو، یوں ہی سہی۔“ میں نے کہا ”بتاؤ، اپنے مہمان کو کیا دے رہے ہو؟“

”میں......؟“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا ”میں ایک غریب اسٹوڈنٹ بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہوں؟“

”اچھا چلو، کچھ ایسے لوگوں سے ملواؤ جو گل خان نصیر کو جانتے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس کا میں نے بندوبست کر دیا ہے۔ آج میں آپ کو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ملوانے لے جا رہا ہوں۔“ اس نے بتایا ”ہمایوں نام ہے ان کا۔ بہت زبردست انسان ہیں۔“

پروفیسر ہمایوں واقعی ایک زبردست انسان ثابت ہوئے تھے۔

انہوں نے گل خان نصیر کے بارے میں بہت سی معلومات دے دیں۔ میر گل خان نصیر ایک انقلابی شاعر تھے۔ ان کی ساری زندگی آمروں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے گزری تھی۔

1914ء میں نوشکی میں پیدا ہوئے۔ 1937ء میں قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے سیکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے۔ ان کی کئی کتابیں بہت اہم ہیں جیسے گل بانگ، ہسٹری آف بلوچستان اردو میں لکھی۔ اردو میں تو باقاعدہ شاعری بھی کی۔

پروفیسر نے بتایا کہ میر صاحب کے چھوٹے بھائی سلطان بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ فیض صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ دوبار حکومت پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز مل چکا ہے۔ فیض صاحب کے ساتھ لینن پرائز بھی ملنے والا تھا لیکن ایوب خان سے اختلاف کی وجہ سے ماسکو نہیں جا سکے تھے۔

غرضیکہ پروفیسر صاحب سے ملنے کے بعد مجھے میر گل خان نصیر کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

ہم پروفیسر صاحب سے اجازت لے کر پیدل ہی ایک طرف چل دیے۔ جہاں تک میں دیکھ رہی تھی، کوئٹہ اچھا خاصا صاف ستھرا شہر تھا۔

ہم شادمان اور گل برگ سے ہوتے ہوئے محمد علی جناح روڈ پر آ گئے تھے۔ ہم نے بہت طویل فاصلہ پیدل طے کر لیا تھا۔ لیکن منصور کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے تھکن کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔

ایک موڑ مڑتے ہوئے منصور نے اچانک ایک سوال کیا ”محترمہ، آپ یہ بتائیں کیا شخصیت کے لیے محبت کرنا ضروری ہے؟“

”تم نے یہ سوال کیوں کیا؟“ میں نے اس کی طرف

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اسی موضوع پر سوچتا رہا ہوں۔" اس نے کہا "خود اندازہ کرلیں، میر گل خان جیسا انقلابی سوچ رکھنے والا آدمی بھی محبت کے سحر سے نکل نہیں سکا۔ ان کی شاعری میں محبت کی بھرپور چاشنی موجود ہے۔"

"تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" میں دھیرے سے بولی "منصور، محبت ایک لطیف جذبے کا نام ہے اور یہ لطیف جذبہ ایک حساس دل ہی میں پیدا ہوسکتا ہے اور کسی شاعر کے دل سے زیادہ حساس دل اور کس کا ہوگا؟"

"اور اب دوسرا سوال بھی سن لیں۔"

"چلو، وہ بھی سنادو۔"

"دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا محبت ہر ایک کے لیے ضروری ہے؟" منصور نے پوچھا۔

"بات کیا ہے......" میں نے تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "تمہیں اس وقت محبت کیوں یاد آرہی ہے؟"

"پتا نہیں کیوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

ہم ہوٹل تک پہنچ گئے تھے۔ منصور وہاں سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آگئی۔ اسی وقت روم سروس نے اطلاع دی کہ خرم نام کے کوئی صاحب لاؤنج میں میرا انتظار کررہے ہیں۔ وہ کراچی سے آئے ہوئے ہیں۔

میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بھی کوئٹہ میں۔ میں فوری طور پر لاؤنج میں آگئی جہاں ایک معقول صورت نوجوان میرا انتظار کررہا تھا۔ وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔

"جی فرمائیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا نام خرم ہے۔" اس نے بتایا "میں کراچی سے آیا ہوں۔ انکل نے شاید میرے بارے میں آپ کو بتادیا ہوگا۔"

"کون انکل!" میں اس وقت تک سمجھ نہیں سکی تھی۔

"آپ کے ڈیڈ نے۔ میں ان کے دوست کا بیٹا ہوں۔"

اور اس وقت پتا چلا کہ یہ وہی صاحب زادے ہیں جن سے رشتے کے لیے ابو نے بات کی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں کوئٹہ بھی چلے آئے تھے؟

☆☆☆

دوسری صبح بہت بوجھل سی محسوس ہورہی تھی۔

خرم کی آمد نے کچھ اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس کو ابو نے بتایا تھا کہ میں کوئٹہ ریسرچ کے لیے گئی ہوئی ہوں اور میرا قیام سرینا میں ہے اس لیے وہ سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔

لیکن کیوں...... اس سے میرا ابھی تعلق ہی کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ صرف رشتے کی بات چلی تھی اور وہ موصوف میری حفاظت کے لیے دوڑے چلے آئے تھے۔

میں نے رات ہی کو اس سے پوچھ لیا تھا "یہ بتائیں کہ آپ کوئٹہ کیوں آئے ہیں؟"

"دیکھیں، جب مجھے یہ پتا چلا کہ آپ کوئٹہ اکیلی ہی چلی گئی ہیں تو پھر مجھے پریشانی ہونے لگی۔"

"آخر کیوں؟ پریشانی کیسی؟"

"دیکھیں نا...... یہاں کے حالات ایسے نہیں کہ کراچی سے آئی ہوئی کوئی لڑکی اکیلی گھومتی پھرے۔" اس نے کہا "یہاں ذرا ذرا سی بات پر گولیاں چلنے لگتی ہیں اور عورت کو تو برداشت ہی نہیں کیا جاتا۔"

"لیکن میرے ساتھ تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی...." میں نے بتایا۔

"یہ اتفاق ہے۔ آپ مطمئن نہ ہوجائیں۔ میں اسی لیے یہاں آگیا ہوں تاکہ آپ کی حفاظت کرسکوں؟"

مجھے اس کی بات بُری لگی تھی۔ دل میں آیا کہ اس سے یہ کہہ دوں کہ میں اپنی حفاظت خود کرسکتی ہوں، لیکن کچھ سوچ کر خاموش رہ گئی۔

خرم نے بھی اسی ہوٹل میں کمرا لے لیا تھا۔

رات کے وقت میں نے فون کرکے ابو کو ساری صورتِ حال بتادی تھی۔ ابو یہ سب سن کر ہنسنے لگے تھے "ہاں بیٹا، وہ اسی مزاج کا نوجوان ہے، بہت خیال رکھنے والا۔"

"لیکن مجھے کسی کے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا "خوامخواہ وہ میرے سر پر مسلط رہیں گے۔ میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت ہوگا۔"

"اوہو، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ خود بھی سمجھ دار آدمی ہے۔" ابو نے کہا۔

میں نے ابو سے پھر کچھ نہیں کہا۔

دوسری صبح جب میں منصور کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی معمول کے مطابق چائے پی رہی تھی کہ اچانک خرم بھی وہاں آٹپکا۔ اس نے بڑی کڑی نگاہوں سے منصور کی طرف دیکھا تھا۔

"راحیلہ! یہ صاحب کون ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ اس شہر میں میرے رہبر ہیں۔" میں نے بتایا "منصور نام ہے ان کا۔"

"اب میں آگیا ہوں تو آپ کو رہبر کی کیا ضرورت؟" اس نے کہا۔

اس کی یہ بات مجھے بُری لگی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ مرد حضرات فوری طور پر لڑکی پر اپنا حق جتانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

"خرم صاحب، جس قسم کی رہبری یہ کرسکتے ہیں۔ وہ آپ نہیں کرسکتے۔" میں جلدی سے بولی "منصور، ادب کے طالب علم ہیں اور میں بھی ادبی سلسلے ہی میں کوئٹہ آئی ہوں اسی لیے یہ جتنے مفید ہوسکتے ہیں، وہ آپ نہیں ہوسکتے۔"

میری بات سن کر خرم جزبز ہوکر رہ گیا تھا جبکہ میں نے محسوس کیا کہ منصور کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ بکھر گئے تھے۔

"بہرحال، آپ ذرا جلدی واپس آجایئے گا۔" خرم نے پھر کہا "آج شام آپ کو لے کر کہیں جانا ہے۔"

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر منصور کو لے کر ہوٹل سے باہر آگئی۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" باہر آکر منصور نے دریافت کیا۔

"میرے ایک امیدوار!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کراچی سے میری محبت میں یہاں تک چلے آئے ہیں جبکہ ابھی میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہوا ہے لیکن ابو نے انہیں میرے سر پر سوار کرادیا ہے۔"

"شاید...... یہ شخص آپ کو پسند نہیں آیا؟" منصور نے پوچھا۔

"کون پسند کرے گا...... جو لوگ مردانہ شاؤازم کے ہوتے ہیں، میں ان کو پسند نہیں کرسکتی۔" پھر میں نے منصور کی طرف دیکھا "معاف کرنا، تمہاری سوسائٹی بھی تو ایسی ہی ہے۔ عورت کو اپنا محکوم سمجھنے والی۔ جسے Male Dominated Society کہا جاتا ہے۔"

"یہ بات درست بھی......اور غلط بھی۔" اس نے کہا "درست اس لیے ہے کہ ہم عورت کو ایک خاص حد سے آگے نہیں جانے دیتے......اور غلط اس لیے ہے کہ ہماری خواتین بھی زندگی کے ہر شعبے میں آگے آرہی ہیں۔ آپ کو ہر جگہ پڑھی لکھی بلوچ خواتین پوری آزادی کے ساتھ اپنا کام کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔"

"منصور، میں نے یہاں آکر ایک بات ضرور محسوس کی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟"

"عورت کو اپنے تحفظ کا احساس!" میں نے بتایا "یہاں نگاہوں کی بے باکی اتنی عام نہیں ہے جتنی کراچی یا دوسرے شہروں میں ہوچکی ہے۔"

"بس ہم اسی قدر کی حفاظت تو کررہے ہیں۔"

اس دن میر گل خان نصیر کی ہسٹری آف بلوچستان دیکھنے کا موقع ملا۔ بہت زبردست کتاب ہے اور بہت محنت اور ریسرچ سے لکھی گئی ہے۔

یہ بھی پتا چلا کہ میر گل خان نصیر نے ہمارے جوش ملیح آبادی کی طرح ایسی شاعری بھی کی ہے جس میں بلوچی نوجوانوں کو ان کا ماضی یاد دلاتے ہوئے انہیں نیند سے.... بے دار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جیسے "اٹھ کے ابھی دنیا میں پھر جینے کا ساماں کیجیے...... یا اے بلوچی نوجوانو، پھینک دو جامِ شراب۔" وغیرہ۔

اس موضوع پر بات کرتے ہوئے منصور نے کہا "محترمہ، میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی قوم، اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کررہا ہے۔"

"نہیں، اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے بھی تو یہی کیا تھا۔" میں نے کہا۔

اس دن میر گل خان نصیر کی زندگی کے اور بھی کئی پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئیں۔ اُن کا انتقال 1983ء میں کراچی میں ہوا تھا۔

اس شام ہم نے کوئٹہ کے اور بھی کئی مقامات دیکھے۔ منصور کے ساتھ سیر کرتے ہوئے ذرا سی دیر کے لیے بھی خرم کا خیال نہیں آیا تھا جو ہوٹل کی لابی میں میرے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔

ہم ہوٹل واپس آئے تو وہ گیٹ ہی پر کھڑا تھا۔ مجھے منصور کے ساتھ دیکھ کر اس کے ماتھے پر بَل پڑ گئے تھے۔

"راحیلہ! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ اس طرح اس شخص کے ساتھ سیر کرتی پھر رہی ہیں۔"

"کیا!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "خرم صاحب! آپ کو روک ٹوک کا یہ حق کس نے دیا ہے؟"

"آپ کے ابو نے۔" اس نے کہا "اور اس سوسائٹی نے...... جو میری اور آپ کی ہے۔"

"ایسا کوئی حق نہیں ہے۔" میں غصے سے بولی "اور جہاں تک ابو کا معاملہ ہے تو میں ان سے خود بات کرلوں گی۔"

منصور پریشان سا کھڑا تھا۔

میں نے خرم کو نظر انداز کرتے ہوئے منصور کی طرف دیکھا "منصور! تم کل ذرا جلدی آجانا۔ ہمیں میر صاحب کے خاندان کے کچھ لوگوں سے انٹرویو کرنا ہے۔"

گرچہ ہمارے پروگرام میں ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن یہ میں نے خرم کو سنانے کے لیے کہا تھا۔ منصور نے بھی میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے اس نے کہا ”ٹھیک ہے میڈم! میں کل جلدی آجاؤں گا۔“

خرم غصے میں پاؤں پٹختا ہوا ہوٹل کے اندر چلا گیا تھا۔ اس کی جانے کے بعد منصور نے کہا ”محترمہ، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، میں شاید کل سے نہ آسکوں۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ سمجھا کریں۔“ اس نے کہا ”آپ خود دیکھ لیں۔ ان صاحب کو آپ کا میرے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ سخت غصے میں ہیں۔“

”تو اس سے کیا ہوا۔ کسی کے غصے کی پروا کر کے ہم اپنی زندگی تو نہیں بدل سکتے۔ اپنی خوشیاں تو ختم نہیں کر سکتے۔“

”خوشیاں......“ اب منصور کے چونکنے کی باری تھی ”آپ کن خوشیوں کی بات کر رہی ہیں؟“

”منصور! اگر تم صاف طور پر سننا ہی چاہتے ہو تو سن لو کہ تمہارے ساتھ رہ کر مجھے اچھا لگتا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہوں گی۔“

میں یہ کہہ کر ہوٹل کے اندر چلی آئی تھی، جبکہ منصور وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح منصور شاید بہت پہلے آکر لابی میں بیٹھ گیا تھا۔ آج اس نے بہت عمدہ ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ بلوچی کڑھائی کا کرتہ اور جیکٹ۔ اس لباس میں وہ بہت شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

میں ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ ابھی ہم نے چائے پینی ہی شروع کی تھی کہ خرم بھی وہاں آ گیا۔ وہ بہت طیش میں تھا۔ اس نے براہ راست ہی مخاطب کیا تھا ”راحیلہ! آج آپ کو میرے ساتھ کراچی واپس چلنا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ انکل کا حکم ہے۔“ اس نے کہا۔ اس کا اشارہ میرے ابو کی طرف تھا۔

”تم انکل سے کہہ دو کہ ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا۔“

”کام کو چھوڑو، یہاں تم اپنی عزت......“

”چپ ہو جاؤ۔“ میں نے غصے سے اس کی بات کاٹ دی ”تمہیں ایسی بکواس کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں کہ یہ اختیار مجھے انکل کی طرف سے ملا ہے۔“ اس نے کہا ”کیونکہ بہت جلد ہم ایک ہونے والے ہیں۔“

”لیکن خرم صاحب! میں اس رشتے سے انکار کرتی ہوں۔“

میں غصے میں بھری ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے ابو کو فون کر کے جب یہ بتایا تو ابو برس پڑے ”مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم وہاں کسی شخص کے ساتھ تفریح کرتی پھر رہی ہو، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، تمہارا رشتہ خرم سے طے ہو چکا ہے۔ بس...... میں اس کے علاوہ کچھ نہیں سننا چاہتا۔“

”واہ...... کیا بات ہوئی۔“ میں نے جھلا کر کہا ”ابو۔ آپ تو قبائلی رسم و رواج کا مذاق اُڑایا کرتے تھے کہ یہ لوگ عورتوں کی شادیاں زبردستی کروا دیتے ہیں، لڑکیوں کی مرضی معلوم نہیں کی جاتی اور آپ خود بھی وہی حرکت کرنے جا رہے ہیں؟“

”خاموش رہو۔“ ابو دہاڑے ”تم صاف صاف بتاؤ، تمہارا کیا فیصلہ ہے، تم واپس آ رہی ہو یا نہیں؟“

”واپس تو آنا ہی ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس لیے نہیں کہ میں خرم سے شادی کر لوں۔ آپ نے جہاں مجھے اتنی آزادی دی ہے، وہاں یہ آزادی بھی دے دیں کہ میں اپنی پسند کے کسی نوجوان کا انتخاب کر سکوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیا تم نے کسی کو پسند کر لیا ہے؟“

”ہاں، وہی نوجوان...... جس کا نام منصور ہے۔“ میں نے بتایا ”میں یہ نہیں جانتی کہ وہ میرے اس فیصلے پر میرا ساتھ دے گا یا نہیں...... لیکن یہ میں گارنٹی کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر ایسا ہو گیا تو آپ بھی فخر محسوس کریں گے۔“

ابو نے دوسری طرف سے فون بند کر دیا تھا۔

دوسری صبح خرم نے مجھ سے کہا ”لڑکی، میں کراچی واپس جا رہا ہوں۔ مجھے یہ پتا چل گیا ہے کہ تمہاری قسمت میں ٹھوکریں ہی لکھی ہیں۔ تم تباہ ہونے والی ہو، تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی ہے۔ تم نے جس کا انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتیں، اس کا ماحول، اس کا کلچر...... وہ لوگ عورت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔“

”یہ میرا دردسر ہے خرم صاحب!“ میں نے کہا ”آپ میری فکر نہ کریں۔ اگر میں برباد ہو بھی گئی تو آپ کے پاس فریاد لے کر نہیں آؤں گی۔“

خرم نے اس کے بعد مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

اس دن جب منصور میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

”کیا......!“ وہ یہ سن کر حیران رہ گیا تھا ”یہ...... یہ

آپ نے کیا کر دیا۔“

”کیوں...... کیا تمہاری کہیں شادی ہو چکی ہے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کہیں رشتہ طے ہو گیا ہے؟“

”نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔“

”کیا ہم میں سے کوئی مسلمان نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اوہو، آپ نہیں سمجھ رہی ہیں۔“ اس نے کہا ”بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس طرح رشتے نہیں ہوتے۔“

”اب ایک بات بتاؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم دونوں ایک ساتھ زندگی گزار سکیں؟“

”ہاں، چاہتا تو ہوں لیکن ایسی خواہشوں کا کیا فائدہ......؟“

”تم فائدے اور نقصان کو چھوڑو۔“ میں نے کہا ”تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابو سے انکار کر کے میں اپنی کشتیاں جلا چکی ہوں۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، مجھے اپنے گھر والوں کے پاس لے چلو، میں ان سے بات کر کے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“

”آپ نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ اس نے کہا ”ہماری روایتیں بہت سخت ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے کسی اور کو قبول کرتے ہیں۔“

”تو پھر کیا، کیا جائے...... میں تو کہیں کی نہیں رہی۔ نہ جانے کیوں تم پر اتنا بھروسا ہو گیا تھا کہ میں نے ابو سے بھی جھگڑا کر لیا۔“

”تو پھر ایسا کریں، میں پہلے اپنے گھر والوں سے بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے کہا ”اس کے بعد دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔“

”تو جاؤ، جلدی سے بات کر لو۔“

منصور کے جانے کے بعد میں بہت بے قرار ہو گئی تھی۔ میں کیا کر بیٹھی تھی، کہیں یہ کوئی غلطی تو نہیں تھی۔ ایسی غلطی جس کا کوئی مداوا ہی نہ ہو سکے۔

میں تو منصور کو زیادہ جانتی بھی نہیں تھی۔ خود اس نے بھی کبھی محبت وغیرہ کا اظہار نہیں کیا تھا اور میں نے اتنا بڑا اقدم اُٹھا لیا تھا۔ یہ کیسا پاگل پن تھا۔

اگر منصور کے گھر والے راضی نہیں ہوئے تو پھر کیا ہوگا؟ ایسا شاید کم ہی ہوا ہو کہ کسی لڑکی نے کسی دوسرے شہر آکر بغیر کسی ٹھوس سہارے کے اس قسم کا قدم اُٹھا لیا ہو۔ لیکن پاگل پن کا کوئی علاج تو نہیں ہوا کرتا۔

1794ء میں قاچار خاندان کے بانی آغا محمد خان نے کرمان کو کئی ماہ تک محاصرے میں لیے رکھا اور جس کے دوران لطف علی خان نے حیران کن استقلال اور پامردی سے مقابلہ کیا۔ گو اس کے مصائب کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ دو تہائی فوجی اور باشندے بھوک اور پیاس کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ آخر کار 2 جولائی 1794ء کی رات کو دشمن نے ایک سردار نجف قلی خان کو جاں بخشی اور انعامات وافر کے بدلے اس پر تیار کر لیا کہ وہ آغا محمد خان کا ایک دستہ اس دروازے سے داخل ہونے دے جو اس کے زیر کمان حصہ میں تھا۔ چنانچہ یہ دستہ داخل ہوا اور اس نے ایک ادھورے دروازے کو توڑ دیا اور ساری فوج اندر آ گئی۔ لطف علی خان یہ حالت دیکھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چند جاں نثاروں کے ساتھ دشمنوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور بم نامی شہر چلا گیا جہاں کے گورنر نے اسے دھوکے سے پکڑ لیا اور آغا کے پاس بھیج دیا۔ آغا نے بدست خود اس کی آنکھیں نکال دیں اور بعد میں اسے تہران میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔ زند خاندان کے اس مکمل زوال کی یاد تازہ رکھنے کے لیے آغا محمد خان نے عین اس جگہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار بنانے کا فیصلہ کیا جہاں لطف علی خان پکڑا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے چھ سو قیدیوں کی گردن ماری اور ان کے سر تین سو قیدیوں کے ذریعے بم بھجوائے اور ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کی کھوپڑیاں پہنچائے۔ ان تین سو بدبختوں کا بھی وہاں پہنچنے پر یہی حشر کیا گیا اور یہ اہرام 1810ء میں میری موجودگی پر بھی قائم تھا اور خون آشام فاتح کا دہشت ناک مظاہرہ تھا۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ”سفرنامہ بلوچستان اور سندھ“ سے اقتباس
تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

خرم مایوس ہو کر واپس چلا گیا تھا۔

وہ رات بہت بے چینی میں گزری تھی۔ میرے پاس تو اب اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ہوٹل میں رہ سکتی۔ کراچی واپس جانا ہی پڑتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر منصور لوٹ کر نہیں آیا تو پھر کیا ہوگا؟
میں بہت بُری طرح پھنس چکی تھی۔ یہ عشق کم بخت ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ ہمیشہ امتحان میں ڈالتا آیا ہے۔ میرے لیے کتنا بڑا امتحان آ گیا تھا۔
فوری طور پر ایک مسئلہ ہوٹل کے پیسوں کا تھا۔ والد صاحب سے تو اب کوئی امید نہیں تھی۔ وہ نہ جانے کیوں اتنے ناراض ہو گئے تھے حالانکہ میں نے وہی کیا جس کی انہوں نے تربیت دی تھی۔ مجھے لیکچر دیتے رہے تھے۔
''دیکھو بیٹا! بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر مذہب میں گم ہو جا۔ نہ افغانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ طورانی۔''
ان کا کہنا تھا کہ ہم مسلمان اسی لیے پیچھے رہ گئے ہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو رنگ و نسل اور زبان کے خانوں میں تقسیم کرلیا ہے۔ جبکہ خدا کے یہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔
والد صاحب کی یہ باتیں کتنی خوبصورت تھیں لیکن ان باتوں کے برعکس ان کا کیا رویہ تھا، شاید نصیحت کرنا اور ایک نظریہ رکھنا آسان ہے لیکن جب معاملہ اپنا اور اپنے گھر کا ہو تو پھر منظر نامہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔
دوسری طرف منصور بھی نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟
ظاہر ہے، اس کا تعلق جس معاشرے سے تھا، اس معاشرے میں کسی کو اتنی آزادی نہیں دی جاتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے رشتے طے کرنے لگے۔
منصور کو اس کے گھر والوں نے دھمکی دی ہوگی اور وہ اپنے گھر بیٹھ گیا ہوگا لیکن اب میں کیا کرتی، کہاں جاتی؟
میں نے ہوٹل والوں کا بل معلوم کیا تو پتا چلا بیس ہزار بنتے ہیں۔ بیس ہزار ادا کیے بغیر میں چیک آؤٹ نہیں کر سکتی تھی۔
میرے پاس چار پانچ سونے کی چوڑیاں تھیں۔ سونے کی چوڑیاں ہمیشہ میرا شوق رہی ہیں اور اتفاق سے وہ چوڑیاں اس وقت بھی میرے پاس تھیں۔
چوڑیوں کا خیال آتے ہی مجھے ایک طرح سے اطمینان سا ہو گیا تھا۔ اب مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ کوئٹہ کی صرافہ مارکیٹ میں جاکر چوڑیاں فروخت کر دیتی۔
چالیس پچاس ہزار تو آ ہی جاتے۔ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بعد اتنی رقم بچ جاتی کہ میں کراچی پہنچ سکتی تھی۔
دوسری صبح میں چوڑیاں لے کر اپنے کمرے سے نکل تو آئی تھی لیکن وہی دشوار مرحلہ میرے سامنے تھا۔ آخر میں کہاں جاتی؟ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کی صرافہ مارکیٹ کہاں ہے؟ اس کے علاوہ کسی اکیلی لڑکی کا بازار تک جانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔
پھر میرے ذہن میں ایک بات آ گئی۔ کیوں نہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے بات کرلوں۔ وہ اسی شہر کی رہنے والی تھی، کوئی نہ کوئی مدد ضرور کر سکتی تھی۔ گل یاسمین نام تھا اس کا۔ بہت ہی پیاری سی لڑکی تھی۔
''یاسمین!'' میں نے اس کے پاس جاکر کہا ''میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔ کیا تم میرا یہ کام کر دوگی۔''
''جی فرمائیں، کیا کام ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''مجھے اپنی کچھ چوڑیاں بیچنی ہیں۔'' میں نے بتایا۔
''چوڑیاں بیچنی ہیں؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''وہ کس لیے؟''
''تمہارے ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لیے۔'' میں نے بے تکلف ہو کر بتا دیا۔
''بل ادا کرنے کے لیے...... لیکن آپ کا بل تو ادا ہو چکا ہے۔'' اس نے بتایا ''بلکہ دو دنوں کا ایڈوانس بھی آ گیا ہے۔''
''کیا؟'' میں حیرت زدہ رہ گئی تھی ''یہ کیا کہہ رہی ہو، کس نے بل ادا کر دیا؟''
''یہ تو کل شام ہی کو ہو چکا ہے۔'' وہ حیران کیے جا رہی تھی۔
پھر مجھے منصور کا خیال آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ادا کر دیا ہو۔ ''یاسمین! تم نے اس نوجوان کو دیکھا ہوگا میں جس کے ساتھ جایا کرتی تھی، کیا یہ بل اس نے ادا کیے ہیں؟''
''نہیں تو۔'' اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی ''اس کو تو میں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ بل ادا کرنے والا کوئی اور تھا۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی یہیں پر تھی۔''
میں حیران ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ کون ہو سکتا تھا۔ منصور بھی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ میں تو یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں تھی۔
پھر مجھے خرم کا خیال آ گیا۔ اب وہی ایک رہ گیا تھا۔ خرم کا نمبر میرے پاس موجود تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر اس کا نمبر ملایا۔ اس نے کچھ دیر بعد فون اُٹھا لیا تھا۔ اس نے فوری طور پر میری آواز پہچان لی تھی۔ ''ہاں کہو، اب کیا چاہیے مجھ سے؟''
''خرم! میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں،

تم نے کیا سمجھ کر میرے ہوٹل کا بل ادا کیا ہے؟"
"تمہارا کیا دماغ خراب ہوگیا ہے؟" وہ غرایا "اب میں اتنا پاگل بھی نہیں ہوں کہ تم جیسی لڑکی کے ہوٹل کا بل ادا کرتا پھروں۔"

میں نے اس کا نمبر کاٹ دیا۔ اب صرف ایک ہی رہ گیا تھا اور وہ سوائے ڈیڈ کے اور کون ہوسکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ میرے باپ تھے۔ میں نے شاید فون پر ان سے کہہ بھی دیا ہوگا کہ میرے پاس پیسے ختم ہوگئے ہیں۔

چونکہ کوئی بھی باپ اپنی اولاد کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے انہوں نے کسی کی معرفت ہوٹل کے پیسے بھجوادیے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہوسکتی تھی۔

میں نے ڈیڈی کو فون کیا تو انہوں نے بھی فون اُٹھالیا تھا۔ ان کی آواز اور لہجے میں ابھی تک ناراضی تھی۔
"تم یہ بتاؤ تم کو واپس آنا ہے، یا وہیں رہ جانا ہے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔
"بابا۔ میں واپس آرہی ہوں۔" میں نے کہا "لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اتنی خاموشی سے پیسے کیوں بھجوائے؟ وہ آدمی تو مجھ سے مل کر بھی نہیں گیا۔"
"کون مل کر نہیں گیا، کیسے پیسے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"کیا آپ نے کسی کی معرفت ہوٹل کا بل تو نہیں ادا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں تو۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔" بابا نے کہا "اور تم جیسی نالائق اولاد کے لیے اب کچھ کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔"

میں نے بابا کا یہ جواب سن کر فون بند کردیا۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ باپ کا یہ رویّہ تھا میرے ساتھ۔ اور دوسری طرف خدا جانے وہ کون تھا جس نے ہوٹل کی پریشانی دور کردی تھی؟

اور وہ بھی اس طرح کہ احسان جتانے کو سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس بھلے آدمی نے تو مجھے آزاد کروادیا تھا۔ میں جہاں چاہے جاسکتی تھی۔

کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جلدی سے ریسیور اُٹھالیا۔ دوسری طرف کاؤنٹر سے یاسمین بول رہی تھی "بی بی! جلدی سے نیچے آجائیں۔" اس نے کہا۔
"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت لابی میں وہی آدمی موجود ہے جس نے آپ کا بل ادا کیا تھا۔" اس نے بتایا۔
"بس...... بس میں ابھی آرہی ہوں۔"

میں تقریباً دوڑتی ہوئی لابی تک آئی تھی۔ یاسمین کاؤنٹر پر ہی تھی۔ میں جب اس کے پاس پہنچی تو اس نے لابی میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف اشارہ کردیا۔

وہ ایک معقول صورت مقامی آدمی تھا۔ بہت ڈھنگ کے لباس میں ملبوس۔ لیکن میں اسے نہیں جانتی تھی۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔

اس نے شاید یہ اندازہ لگالیا تھا کہ یاسمین نے مجھے کچھ بتادیا ہے۔ اسی لیے وہ تیزی سے اُٹھا اور ہوٹل سے باہر چلا گیا۔ میں اسے آوازیں دیتی رہ گئی تھی۔

یہ ایک اور پُراسراری بات تھی۔ کون تھا وہ؟ اس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیوں کیا تھا؟ اس کا مجھ سے کیا تعلق تھا؟

میں سوچتے سوچتے پاگل ہونے لگی تھی۔ میں نے یاسمین سے کہا "دیکھو۔ یہ آدمی جب دوبارہ دکھائی دے تو فوراً فون کردینا۔ اس بار میں اسے نکلنے نہیں دوں گی۔"

یاسمین نے گردن ہلادی۔

وہ رات اسی طرح سوچتے ہوئے گزر گئی تھی۔ خدا جانے وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا؟ دوسری صبح پھر کاؤنٹر سے فون آیا تھا۔ اس بار یاسمین کی جگہ کسی اور نے فون کیا تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا "کوئی منصور صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"او خدا...... منصور!" میں دھک سی رہ گئی، منصور واپس آگیا تھا۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی لابی میں داخل ہوئی۔

منصور اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ لابی میں بیٹھا ہوا تھا "خدا کے بندے، تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟ کہاں چلے گئے تھے؟" میں نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔
"کچھ ایسے معاملات ہوگئے تھے کہ میں نہیں آسکا۔" اس نے اپنے مخصوص شرمیلے لہجے میں بتایا۔
"اور اگر میں واپس چلی جاتی تو......؟"
"میں جانتا تھا کہ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔" اس نے کہا "مجھے اتنا بھروسا تو ہے۔"
"بے وقوف انسان۔ میں یہاں بُری طرح پھنس گئی تھی۔" میں نے بتایا "میرے لیے ایک ایک لمحہ عذاب ہو رہا تھا۔ میرے گھر والوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کردیا۔

ہوٹل کا بل بیس ہزار ہوگیا تھا۔ پھر کسی خدا کے بندے نے پورا بل ادا کردیا۔ میں نہیں جانتی وہ کون ہے؟ لیکن اس نے میری جو مدد کی ہے، وہ میں نہیں بھلاسکتی۔"
"ہوتے ہیں، ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تم بتاؤ، تم نے میرے لیے کیا، کیا؟" میں نے پوچھا "میرے پاس صرف آج کا دن ہے۔ کل سے پھر ہوٹل کا کرایہ چڑھنا شروع ہوجائے گا۔"

اسی وقت میری نگاہ شیشے کی دیوار کی دوسری طرف چلی گئی۔ وہاں مجھے وہی آدمی دکھائی دے گیا جس نے میرا بل ادا کیا تھا۔

"منصور!" میں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا "یہ وہی آدمی ہے جس نے میرے پیسے دیے تھے۔"

منصور نے اسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی ہوٹل کے گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔ پھر میں نے منصور کو تیزی سے اس کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا۔ ذرا سی دیر میں وہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تھے۔

میں بہت بے چینی سے منصور کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

منصور کچھ دیر بعد واپس آیا تھا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔
"کیا ہوا، کیا کہا اس آدمی نے، کون ہے وہ؟" میں نے کئی سوال ایک ساتھ کرڈالے۔
"وہ مجھے نہیں مل سکا۔" منصور نے بتایا "وہ تیزی سے چلتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔"
"خیر، یہ بتاؤ، تم نے اپنے گھر والوں سے کیا باتیں کیں، کیا کہا انہوں نے؟" میں نے پوچھا۔
"راحیلہ! آپ جانتی ہیں کہ ہمارے رسوم و رواج کیا ہیں۔" منصور نے کہا "اوّل تو ہم کسی کو اپنے میں شامل ہی نہیں کرتے۔ اگر شامل بھی کرتے ہیں تو بہت جانچ پڑتال کے بعد۔"
"اور اگر شامل کرلیں تو پھر......؟"
"اس کے بعد تو وہ ہمارے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔" اس نے بتایا "اس کے لیے پھر جان بھی حاضر ہوتی ہے۔"
"میرا سوال اپنی جگہ پر ہے۔" میں نے کہا "تم یہ بتاؤ میرے لیے کیا کہا انہوں نے؟"
"سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں بات ہی نہیں کرسکا ہوں۔" اس نے بتایا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"
"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی "اس کے باوجود میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ تم اس وقت میرے ساتھ چلوگی۔"
"اور اگر تمہارے گھر والوں نے مجھے گولی ماردی تو؟"
"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ چاہے تمہیں میرے لیے قبول کریں یا نہ کریں، تمہاری حیثیت ایک مہمان کی سی ہوگی اور ہمارے یہاں مہمان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ ہم اس کے لیے جان تک دے سکتے ہیں۔"
"ایک تو میں ان باتوں سے تنگ آچکی ہوں، جان لے سکتے ہیں، جان دے سکتے ہیں۔" میں چڑ کر بولی "اس کے علاوہ کیا آتا ہے تم لوگوں کو؟"
"پیار کرنا آتا ہے۔" وہ ہنس پڑا تھا "کوئی پیار سے ایک قدم بڑھائے تو ہم اس کی طرف دوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ بہرحال، اب دیر مت کرو، ہمیں وہاں جلدی پہنچنا ہے۔"
"دیکھو منصور۔ مجھے نہ جانے کیوں ڈر سا لگ رہا ہے۔" میں نے کہا "اگر مجھے قبول نہیں کیا گیا تو پھر میرے پاس سوائے موت کے اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا...... کیونکہ میں اپنی ساری کشتیاں جلاچکی ہوں۔"
"جانتا ہوں میں۔" وہ بھی سنجیدہ ہوگیا تھا "اگر انہوں نے تمہیں قبول نہیں کیا تو اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب تم محبت کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہو تو کیا میں ایسا نہیں کرسکتا؟"

خوشی سے میرا چہرہ دمک اُٹھا تھا۔

بہت دیر کے بعد، بہت دنوں کے بعد ایک امید بھری اور حوصلہ دلاتی ہوئی خبر میرے پاس آئی تھی۔
"ایک بات بتاؤ۔" منصور نے میری طرف دیکھا "ہوسکتا ہے کہ ہمارے یہاں پہنچ کر تمہیں حالات بہت خراب دکھائی دیں تو ایسی صورت میں تمہارا کیا رویّہ ہوگا۔ کیا تم خوف زدہ ہوکر مجھے چھوڑ جاؤگی ...... لیکن یاد رکھو کہ تمہاری طرح میں نے بھی اپنی کشتیاں جلادی ہیں۔"
"تو پھر اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا "جہاں تم، وہاں میں۔"
"تو پھر چلو۔ ہمیں جلدی واپس بھی آنا ہے۔"
میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ کیسی عجیب بات تھی۔ وہ

میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ کچھ دنوں پہلے تک میں اسے جانتی بھی نہیں تھی، اس سے میرا کوئی تہذیبی، کوئی لسانی رشتہ بھی نہیں تھا۔ ہم الگ الگ شہروں میں رہا کرتے، اس کے باوجود میں نے اس پر مکمل بھروسا کرلیا تھا۔

اس کا چہرہ بتا تا تھا کہ وہ بھروسے کے قابل ہے۔ اس کا لہجہ، اس کے سچّے ہونے کی گواہی دیا کرتا تھا۔ اس نے جو کہا تھا کہ اگر اس کے گھر والوں نے کوئی ہنگامہ کیا تو وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا، مجھے اس بات کا بھی یقین تھا اسی لیے میں اس کے ساتھ چلی جارہی تھی۔

اس نے ایک ٹیکسی کرلی تھی۔

ہم کوئٹہ شہر کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ نہ جانے کتنی دور کا سفر تھا لیکن وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس کی ہدایت پر اس طرح حجاب لے لیا تھا کہ میرا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک بستی میں آ گئے۔ یہاں اس نے ٹیکسی فارغ کردی تھی۔

اس بستی کے مرد، عورتیں اور بچے ہمیں بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

منصور تو خیر ان ہی کا تھا۔ لیکن میں اجنبی تھی۔ اس لیے نگاہیں میری طرف مرکوز تھیں۔ منصور مجھے ایک دومنزلہ مکان کے پاس لے آیا تھا۔

''کیا یہی تمہارا مکان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہ میرے ایک دوست زمان کا مکان ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں کچھ دیر رہوگی۔'' اس نے کہا ''اس دوران ..... اپنے گھر والوں سے بات کرلوں گا۔ پھر جو ہوگا وہ تمہارے سامنے ہوگا۔''

اس نے دروازے پر دستک دی، اس کا دوست زمان باہر آ گیا۔ شاید منصور نے اسے ساری بات سمجھا رکھی تھی۔ اسی لیے وہ بہت احترام کے ساتھ مجھے اندر لے گیا۔

اندر اس کے گھر کی خواتین تھیں۔ وہ مجھے ان کے درمیان چھوڑ گیا تھا۔

زمان کے گھر کی خواتین بہت مہمان نواز ثابت ہورہی تھیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے میرے سامنے کھانے پینے کی بے شمار چیزیں رکھ دیں۔

اس وقت مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں جارہا تھا۔ میرا دل منصور کی طرف تھا۔ نہ جانے وہ اپنے گھر والوں سے کیا کہہ رہا ہوگا اور وہ لوگ اس سے کیا کہہ رہے ہوں گے ؛ ہوسکتا تھا کہ مجھے قبول کرلیا جائے یا ہوسکتا تھا کہ مجھے یہیں سے واپس جانا پڑے۔

کچھ دیر بعد منصور واپس آ گیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے آیا تھا لیکن بہت خاموش تھا ''کیا بات ہے منصور!'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اس نے بتایا ''تم کو دیکھ کر ہی فیصلہ کیا جائے گا۔''

اس کا گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم وہاں پہنچے، منصور نے دروازے پر دستک دی۔ اچانک تین آدمی بندوقیں لے کر مکان سے باہر آ گئے۔

انہوں نے باہر آتے ہی گولیاں چلانی شروع کردی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے منصور!'' میں نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہ ہماری روایت ہے راحیلہ!'' اس نے مسکرا کر بتایا ''جب ہم کسی مہمان کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں تو اسی طرح بلاؤں کو دور کرنے کے لیے گولیاں چلاتے ہیں۔ وہ دیکھو، گولیاں چلانے والوں میں ایک میرا باپ ہے اور وہ دونوں میرے بڑے بھائی ہیں اور تم نے اس آدمی کو تو پہچان لیا ہوگا۔'' اس نے ایک بندوق بردار کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، ہاں ...... یہ شاید وہی ہے جس نے ہوٹل کا بل ادا کیا تھا۔''

''ہاں، یہ میرا بڑا بھائی ہے۔ تم کو تو ہمارے گھر والوں نے اسی وقت قبول کرلیا تھا جب میں نے آ کر بتایا تھا، پھر میرے بڑے بھائی نے ہوٹل جا کر تمہارا بل ادا کردیا اور دو دنوں تک تمہارے آس پاس تمہاری حفاظت کی غرض سے منڈلاتا رہا۔''

''میرے خدا! کیا تم یہ سب جانتے تھے؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ مسکرا دیا ''ہم بلوچ لوگ بھی چھوٹی موٹی شرارتیں کرسکتے ہیں ناں۔ وہ دیکھو، میری ماں اور بہن تمہارے لیے خاص دوپٹا لے کر آ رہی ہیں۔ وہ دوپٹا تمہارے سر پر ڈال کر تمہیں اندر لے جایا جائے گا۔''

اور اس وقت میں رو رہی تھی اور یہ آنسو خوشی کے تھے، تشکر کے تھے۔

سوال

جناب معراج رسول صاحب

مؤدبانہ سلام!

امیدقوی ہے ، بخیریت ہوں گے۔اس بار خود پر گزرا ایک واقعہ ارسال کررہا ہوں۔ امید ہے آپ اور آپ کے قارئین کو پسند آئے گا۔

منظر امام

(کراچی)

مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہو۔

اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا میں نے اس آدمی کو دیکھا تھا جو اس بے چارے کو ایک زوردار دھکا دیتا ہوا کسی طرف بھاگ نکلا تھا۔

گرنے والا ایک بوڑھا آدمی تھا اور دھکا دے کر بھاگنے والا ایک جوان آدمی تھا۔ بہت بُری حرکت کی تھی اس کم بخت نے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کردیا۔

اسے شاید چکر آرہے تھے۔ اس کی پلکیں اس طرح جھپک رہی تھیں جیسے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہو۔ چند لمحوں تک یہی صورتِ حال رہی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ ''بہت بہت شکریہ بیٹے۔''

''انتہائی بدتمیز اور وحشی انسان تھا جس نے آپ کو دھکا دیا۔''

''جانے دو بیٹا۔ ہوسکتا ہے غلط فہمی میں دھکا دے دیا ہو۔''

''غلط فہمی کیسی میں تو دیکھ رہا تھا اس نے جان بوجھ کر آپ کو زخمی کرنے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کہاں رہتے ہیں چلیں میں آپ کو لے جاؤں۔''

''ارے نہیں۔ میں خود چلا جاؤں گا۔''

''تکلف نہ کریں میں پہنچادوں گا۔ میرے پاس گاڑی

ہے۔"

"کچھ دیر کے تکلف کے بعد اس نے میری بات مان لی تھی۔ میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھا دیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر اسے لے کر پہنچ گیا تھا۔ اس کا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

یہ ایک بہت چھوٹا سا مکان تھا جس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میں نے سہارا دے کر اسے گاڑی سے اُتارا اور دروازے تک لے آیا جس پر ایک تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا تھا۔ "آؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔" اس نے دعوت دی۔ "کچھ دیر بیٹھ کر چلے جانا۔"

میں اس کے گھر میں آ گیا۔

دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر، ایک بیٹھک اور دوسرا کمرا شاید خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ "بیٹا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔"

"ارے نہیں آپ زحمت نہ کریں۔"

"اس میں زحمت کیسی مجھے خوشی ہو گی اگر تم میرے ساتھ چائے پیو گے۔"

"کیا آپ اکیلے رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! بالکل اکیلا۔" اس نے جواب دیا۔ "خیر تم بیٹھو میں ابھی آیا۔"

کچھ دیر بعد وہ چائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی کہ میری وجہ سے اس بے چارے کو زحمت اُٹھانی پڑی۔ بہر حال، چائے پینے کے دوران میں نے اس سے پوچھ لیا۔ "محترم کیا آپ کا کوئی بھی نہیں ہے؟"

"ایسا نہ کہو سب ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان خاموشی ہو گئی۔ میں چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے خود بتایا۔ "میرے دو بیٹے ہیں اور دونوں اسی شہر میں رہتے ہیں۔"

"اوہ۔ آپ تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔"

"ہاں، مجھے تنہا رہنے کی عادت ہے۔" اس نے کہا۔

"محترم۔ میرا آپ سے کوئی ایسا تعلق تو نہیں ہے کہ میں آپ کے حالات جاننے کے لیے زور دے سکوں۔ لیکن مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے کیونکہ اس عمر میں آپ کو تنہا نہیں رہنا چاہیے۔"

"کیا بتاؤں بیٹے۔" بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "تم نے جس کو دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ میرا بیٹا تھا۔"

"کیا......!" میں تقریباً اُچھل پڑا تھا۔ "آپ کا بیٹا۔ آپ کی اولاد۔"

"ہاں، وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ راستے میں جا رہا ہوں تو کبھی دھکا دے کر گرا دیا یا کبھی کچرا پھینک دیا یا کبھی کوئی اور حرکت کر دی۔"

"کیا اس بے غیرت کو شرم نہیں آتی جو اپنے باپ کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔"

"اس کا باپ بھی تو ایسا ہی ہے بیٹا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ تو مکافاتِ عمل ہے جو میں نے کیا ہے اس کا انجام تو یہی ہونا تھا۔"

"محترم کچھ بھی ہو اولاد تو پھر اولاد ہوتی ہے۔ وہ ایسا شرمناک سلوک نہیں کر سکتی۔"

"اسے کرنا چاہیے کیونکہ میں اسی قابل ہوں۔"

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ نہ جانے اس نے اپنی اولادوں کے ساتھ کیا کیا ہو گا؟ میں نے ایسا کیس پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا یہ ایک حیرت انگیز پچویشن تھی۔

ہر انسان کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی وابستہ ہوتی ہے۔ اس بوڑھے کے ساتھ بھی تھی۔ اب تو مجھے اس کے بارے میں جاننے کا شوق ہو گیا تھا۔ "محترم اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں کہ آپ نے ایسا کون سا جرم کر دیا تھا جس پر یہ سب ہو رہا ہے آپ کے ساتھ؟"

"بیٹا تم اتنی محبت سے پوچھ رہے ہو تو اپنی کہانی سنا دیتا ہوں۔" اس نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ "میں بہت پیسے والا آدمی تھا، بہت دولت تھی میرے پاس، ایک بہت بڑا بزنس تھا میرا لیکن میں نے خدا کی ان نعمتوں کا کبھی شکر ادا نہیں کیا بلکہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی محنت اور تدبیر سے حاصل کیا ہے۔"

اس زمانے میں کسی انسان کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سب کچھ میں اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دفتر میں جو لوگ کام کرتے تھے میں ان سے اس طرح سلوک کیا کرتا جو شاید جانوروں کے ساتھ بھی نہ کرتا ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر دھکے دے کر دفتر سے نکال دیا کرتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔"

"یہ تو بہت نامناسب بات تھی۔"

"وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں پاگل ہو رہا تھا میں، پیسے نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا ورنہ شاید ان کے ساتھ بھی میرا ایسی سلوک ہوتا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ والدین کے ساتھ بھی

آپ ایسا ہی کرتے؟"

"ہاں، کیونکہ میرے ماں باپ غریب طبقے کے افراد تھے اور مرتے دم تک غریب ہی رہے جب کہ خود مجھے غربت پسند نہیں تھی، غریب پسند نہیں تھے۔ میں انہیں حقارت سے دیکھا کرتا تھا۔ حالانکہ خود میں بھی غریب ہی تھا لیکن میرے خیالات کچھ اور تھے میں نے بچپن ہی سے ان لوگوں سے دوستیاں کیں جو پیسے والے تھے۔ شاید انہی کی صحبت میں میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

وہ بوڑھا بڑی روانی سے اپنے حالات بتائے جا رہا تھا جیسے برسوں کا غبار صاف کر رہا ہو۔

"جوان ہونے کے بعد میں نے پیسے کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ وہ سب کچھ کیا جس کا مقصد پیسے حاصل کرنا تھا۔ جائز ہو یا ناجائز مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی بس پیسا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک اور کوئی ویلیو نہیں تھی۔ خدا معاف کرے۔ میں نے امیر گھرانوں کی لڑکیوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر انہیں بلیک میل بھی کیا ہے۔ ان سے ہر مہینے ایک لگی بندھی رقم لے لیا کرتا تھا۔"

"یہ تو آپ بالکل کسی فلم کی کہانی سنا رہے ہیں۔"

"ہاں بیٹا، میں نے ایسی ہی زندگی گزاری ہے۔" اس نے کہا۔ "صرف ایک ہی جذبہ ایک ہی خناس۔ پیسا پیسا اور پیسا اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، کوئی ویلیو نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں۔ انتہائی بے رحمی کے ساتھ میں نے پیسے جمع کیے۔ قسمت بھی میرا ساتھ دیتی رہی۔"

"میں نے اسمگلنگ تک کی ہے کیونکہ اس میں بہت کم وقت میں بہت دولت جمع ہو جاتی ہے۔ کوئی اخلاقی پابندی میں نے کبھی قبول نہیں کی۔ یہ ایک بہت طویل داستان ہے کہ میرے پاس دولت کس طرح آئی۔ میں نے کتنوں کو دھوکے دیے۔ کتنوں کو برباد کیا ہے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ میں بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا چونکہ میرے پاس وہ سارے طریقے تھے جن سے دو کو آٹھ بنایا جا سکتا ہے، لہٰذا کاروبار ترقی کرتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا دفتر خرید لیا میں نے اور اس زمانے میں یہ سوچ کر شکر ادا کیا کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"کیا......!" میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ "یعنی آپ کو اس بات پر خوشی ہوئی تھی۔"

"ہاں۔ کیونکہ وہ دونوں میرے راستے کی رکاوٹ تھے۔" اس نے بتایا۔ "دونوں ہی مجھے اخلاقیات پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ میں جو کچھ بھی کرتا پھر رہا ہوں وہ بہت غلط ہے۔ انسان کو دولت کے لیے حیوان نہیں بن جانا چاہیے۔ اسی لیے مجھے ان دونوں کے مرنے پر زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا۔"

"میرا صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بے چارہ غریب آدمی، میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی بلکہ اس کو اپنے دفتر میں جاب تک نہیں دی تھی۔ اس سے کہا تھا کہ جس طرح میں نے اپنے لیے راستے بنائے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی بنائے۔ میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔"

"آپ تو واقعی بے رحم انسان تھے۔" میں نے کہا۔

"نفرت محسوس ہو رہی ہے نا مجھ سے۔ یہی تو میرا کردار رہا ہے۔ اسی لیے تو میرے دونوں بیٹوں کا یہی برتاؤ ہے میرے ساتھ، مجھ جیسے آدمی سے کون نفرت نہیں کرے گا؟"

"آگے بتائیں۔ آگے کیا ہوا؟"

"بہر حال، جب میرے پاس بہت سا پیسا آ گیا تو میں نے ایک امیر گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی۔" اس نے بتایا۔ "حالانکہ ایک لڑکی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن اس کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ اسی لیے میں نے اسے ٹھکرا دیا اور ایک امیر لڑکی سے شادی کر لی جس میں صرف یہی خوبی تھی کہ اس کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ بس، اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں تھی اس میں، اس سے میرے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ وقت گزرتا گیا۔ دونوں بڑے ہو گئے۔ تعلیم حاصل کی اور دونوں ہی میری توقع کے خلاف نکلے۔ ان دونوں نے ایسی حرکت کی جو میرے مزاج اور اصول کے خلاف تھی۔

"کیا مطلب؟"

"ان دونوں نے غریب لڑکیوں سے شادیاں... کر لیں۔" اس نے بتایا۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ لڑکیاں شریف اور نیک ہیں اصل خرابی یہ تھی کہ دونوں کا تعلق غریب گھرانوں سے تھا۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی زندگی کا سارا فلسفہ دھرا رہ گیا۔"

"ہاں۔ سارا فلسفہ۔" بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "ان دونوں نے جو کچھ کیا میں کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ان کے فیصلوں اور ان کی اس حرکت نے میرے پورے وجود میں آگ سی لگا دی تھی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ فوری طور ان دونوں کو گولیوں سے

اُڑا دوں لیکن وقتی طور پر میں خاموش ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ دونوں بیٹوں نے اپنی بیویوں کے ساتھ آ کر مجھ سے بہت معافیاں مانگیں لیکن میں نے دل سے انہیں معاف نہیں کیا بلکہ ان چاروں کے خلاف اپنے دل میں غصے اور نفرت کی آگ کو پروان چڑھاتا رہا۔

میں انہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ خاص طور پر ان لڑکیوں کو جنہوں نے میرے بیٹوں سے شادیاں کی تھیں۔ اپنی حقیقت کو جانے بغیر انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ غریب گھرانوں کی ہیں پھر ان میں اتنی جرأت کہاں سے آئی کہ وہ میرے بیٹوں کو پھانس کر ان سے شادیاں کرلیں۔ میرے نزدیک یہ اتنی بڑی گستاخی تھی کہ جس کو کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ان دونوں کو قتل کروادیا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا......!'' میں اُچھل پڑا تھا۔ ''قتل کروادیا۔''

''ہاں۔'' بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔'' اس زمانے میں میرے لیے یہ سب بہت آسان تھا کیونکہ میرے پاس دولت تھی اور میں کرائے کے قاتلوں کو خرید سکتا تھا اور میں نے خرید لیا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان دونوں کی موت چھپی نہیں رہ سکی۔ پتا چل گیا تھا کہ ان دونوں کے قتل میں کس کا ہاتھ ہے۔''

میرے دونوں بیٹوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کیونکہ اب ہمارے درمیان رشتوں کی ویلیوز ختم ہو چکی تھیں۔ اب میں ایک مجرم تھا۔ بہرحال، اس کے بعد میں گرفتار ہوا۔ اور یہیں سے میری بربادی کی کہانی شروع ہوگئی۔ میرا کاروبار ختم ہوگیا۔ مجھے دس سال کی سزا ہوئی تھی کیونکہ یہ جرم میں نے براہِ راست نہیں کیا تھا۔ پھر طبیعت کی خرابی اور دوسرے مسائل۔ مجھے کچھ دنوں کی رعایت دے دی گئی تھی اور جب میں جیل سے باہر آیا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کاروبار دونوں بیٹوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ میں ہر لحاظ سے ایک خالی انسان تھا۔

بوڑھا اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ میں حیران ہو کر اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا جو کسی طرح بھی قابلِ رحم نہیں تھا۔ جس نے دولت کے غرور میں آ کر بہت بڑے بڑے جرائم کیے تھے۔ جس نے انسان کو انسان نہیں سمجھا تھا۔

''تو آپ کے وہ دونوں بیٹے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ ''کیونکہ میں اسی قابل ہوں کہ مجھے راہ چلتے ہوئے ذلیل کیا جائے۔ تم خود بتاؤ کیا میں ایسا نہیں ہوں؟''

''ہاں، آپ ایسے ہی ہیں۔'' میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ''بس اب آپ کے حال پر خدا رحم کرے۔ شاید خدا آپ کو معاف کردے۔''

میں بہت بوجھل ہو کر اس بوڑھے کے مکان سے باہر آ گیا۔ مجھے اس کی داستان سننے کے بعد اس سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ واقعی اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اس کے گناہوں کی سزا تھی۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ ''کیوں برخوردار کیا اس کی کہانی سن کر آ رہے ہو؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن اس نے یہ تو نہیں بتایا ہوگا کہ اس نے اپنی بہوؤں کے ساتھ ساتھ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی مروادیا تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کے بیٹے تو زندہ ہیں۔''

''یہی تو بات ہے۔'' اس بوڑھے نے کہا۔ ''اس کم بخت کی ہر بات سچی ہے اس نے جو کچھ بتایا ہوگا اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے صرف یہ کہ اس کے دونوں بیٹے زندہ ہیں کیونکہ ان کا بھی قاتل یہی ہے۔''

''خدا کی پناہ۔'' ''تو پھر وہ لوگ جو اسے دھکے دیتے ہیں مارتے ہیں۔''

''وہ کرائے کے لوگ ہوتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ کم بخت خود انہیں پیسے دیتا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیا جائے شاید اس طرح وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا اس کے بھیانک گناہوں کو معاف کردے لیکن ایسا نہیں ہوگا اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہوتا رہے گا بہت کچھ۔''

وہ بوڑھا آگے بڑھ گیا اور میں سوچتا رہ گیا۔

کیسے کیسے کردار راہ چلتے ہوئے سامنے آ جاتے ہیں۔ کیسی کیسی کہانیاں ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ انسان کتنا بے رحم اور کتنا بھیانک ہوتا ہے۔

ایک چہرے پر کتنے چہرے ہوتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی تلافیوں سے کیا جرائم اور گناہوں کے عذاب کم ہو جاتے ہیں۔

اب یہ معاملہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم تو صرف قیاس آرائیاں ہی کر سکتے ہیں۔

پرائز بانڈ

عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

میں نے ایک معمولی سی جھونپڑی میں جنم لیا۔ وہیں پلی بڑھی لیکن آج ڈیفنس جیسے علاقے میں رہتی ہوں۔ کروڑوں کی مالک ہوں۔ یہ تبدیلی کیسے آئی، یہی آپ کو بتانا چاہ رہی ہوں۔ پڑھیں، پسند آجائے تو نزدیکی شمارے میں شائع کردیں۔

عالیہ ریاض

(کراچی)

میں ایک غریب لڑکی تھی۔ میں ہی کیا۔ میرے آس پاس جتنے بھی لوگ تھے۔ وہ سب غربت زدہ تھے۔ دوست۔ رشتے دار، ملنے جلنے والے سب کے سب غریب۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا کہ میرا فلاں رشتے دار امیر تھا۔ یا فلاں رشتے دار کوئی بڑا آفیسر تھا۔ ایسا کوئی بھی نہیں تھا ہمارے خاندان میں۔

سب کے سب یوں ہی سے تھے۔ مزدور۔ فیکٹری میں کام کرنے والے۔ درزی، دھوبی وغیرہ۔ اور نہ ہی

ہمارے خاندان میں کوئی زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ اور ہم جہاں رہتے تھے۔ ظاہر ہے۔ وہاں بھی سب ہم جیسے تھے۔ ہماری کیٹگری کے جنہوں نے کبھی خواب میں بھی اچھے دن نہیں دیکھے ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق ہی ہوتا ہے کہ کسی غریب خاندان کا کوئی بندہ ترقی کرتا چلا جائے۔ عام طور پر نسل در نسل غربت ہی چلتی رہتی ہے۔

اور جو غریب نہیں رہتا کسی طرح اس کی ترقی ہو جاتی ہے۔ اس کے پاس پیسے آجاتے ہیں تو پھر وہ خاندان والوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ ظاہر ہی نہیں کرتا کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے۔

تو میں ایسے گھر میں پیدا ہوئی۔ ایسے ماحول میں پرورش پائی۔ میٹرک تک کسی نہ کسی طرح تعلیم بھی حاصل کرلی۔ ویسے مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ درسی کتابوں سے ہٹ کر بھی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھتی رہتی تھی۔ یہ ڈائجسٹ ٹھیلوں پر بہت سستے مل جایا کرتے۔

میری صورت شکل بھی مناسب تھی۔ میں خود کو خوبصورت تو نہیں کہوں گی لیکن میں بہت سی لڑکیوں سے بہتر تھی۔ اسی لئے سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ میری اماں میرے لئے خواب دیکھا کرتیں کہ کوئی شہزادہ مجھے اپنانے کے لئے آیا ہے جبکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ان پرانی اور گندی جگہوں میں شہزادے نہیں آیا کرتے۔

میرا ارادہ کالج میں بھی پڑھنے کا تھا لیکن ماں باپ کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں تھے کہ وہ مجھے اچھی تعلیم دلواسکتے۔ ان ہی دنوں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔

مجھے راستے میں ایک پرائز بانڈ گرا ہوا مل گیا تھا۔ میں یہ جانتی تو تھی کہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو پرائز بانڈ کہتے ہیں لیکن کبھی لینے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ وہ بانڈ 750 روپے کا تھا۔

میں اسے اپنے گھر لے آئی۔

اب ایک کشمکش میں مبتلا ہوگئی تھی کیا کروں اس بانڈ کا۔ نہ جانے کس کا ہوگا؟ کسی نے کتنی چاہت اور امیدوں کے ساتھ خریدا ہوگا؟ اس نے خواب دیکھے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوسکتا ہے کہ وہ محلّے ہی کے کسی آدمی کا ہو لیکن محلّے میں کس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ 750 روپے والا بانڈ خرید سکتا۔ کیا میں گھر والوں کو بتادوں؟

بہت سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ابھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ خاموشی سے یہ دیکھوں گی کہ محلّے میں کس گھر سے شور اُٹھتا ہے۔ کون اپنے گمشدہ بانڈ کی تلاش میں ہے؟

اگر کوئی سامنے آگیا تو ٹھیک ہے۔ میں یہ بانڈ اسے واپس کردوں گی۔ ورنہ خاموش رہوں گی۔ کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں۔ اگر کوئی انعام نہ بھی نکلے تب بھی بانڈ کی شکل میں۔ 750 روپے میرے پاس آگئے تھے۔

کئی دن گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اُٹھی اور نہ یہ سننے میں آیا کہ کسی کا بانڈ گم ہوگیا ہے۔ ورنہ وہ شخص تو پورا محلّہ سر پر اُٹھالیتا۔

دس دنوں کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ بانڈ میں اپنے پاس ہی رکھوں گی۔ میں نے ایک پرچی پر اس کا نمبر نوٹ کرلیا تھا اور وہ پرچی ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی۔

خدا جانے کس طرح مجھے یہ سارے طریقے آتے جارہے تھے حالانکہ ایسی باتوں سے کبھی ہمارا واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اب میں پرائز بانڈ کے نمبر بھی دیکھنے لگی تھی۔

اس کے لئے میں بک اسٹال پر چلی جاتی۔ جہاں پانچ روپوں میں نمبروں کی لسٹ مل جاتی۔ وہیں کھڑے کھڑے نمبر دیکھتی کیونکہ وہ نمبر تو میرے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ پھر لسٹ اسی اسٹال والے کے حوالے کرکے واپس آجاتی۔

اور ایک دن اچانک وہ نمبر آہی گیا۔ پانچ لاکھ روپے۔ اس نمبر پر پانچ لاکھ کا انعام ملا تھا۔ پورے پانچ لاکھ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درجنوں بار اس نمبر کو دیکھا۔ اپنے ذہن میں دُہراتی رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے نمبر غلط یاد رہا ہو۔

میں وہ لسٹ گھر لے آئی اور خاموشی کے ساتھ پرائز بانڈ سے ملا کر دیکھا۔ بالکل وہی نمبر اور پانچ لاکھ روپے۔ میرے پورے خاندان میں سے کسی نے اتنی رقم ایک ساتھ نہیں دیکھی ہوگی۔ میں اپنی برادری، اپنے خاندان بلکہ اپنے محلّے کی سب سے امیر لڑکی تھی۔

میرے خدا۔ کیا کروں میں۔ کیا سب کو بتادوں۔ لیکن میں نے پھر بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے کس طرح خوشی کی یہ خبر چھپائے رکھی ہوگی۔

اب اور بھی کئی طرح کے مرحلے تھے۔ میں یہ سب کچھ بہت ہوشیاری اور رازداری سے کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی عقل کہاں سے آگئی تھی؟

اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میں نے پیدا ہوتے ہی صرف غربت دیکھی تھی اور اب اس حال سے نکلنا چاہتی تھی۔ اسی لئے مجھ میں اتنا شعور بھی آگیا تھا۔

میرے محلّے میں ریاض نام کا ایک لڑکا تھا۔ ٹیوشن پڑھایا کرتا اور بے انتہا شریف۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی تھی۔ میں نے اسی کو ساتھ ملانے کا ارادہ کرلیا۔

ایک شام وہ راستے میں مل گیا۔ ”ریاض صاحب۔ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ حیران ہوکر دیکھنے لگا تھا۔ ”جی فرمائیں۔“

اکثر راہ چلتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو سلام تو کرلیتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی لئے حیران ہو رہا تھا۔

”کل آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن کسی کو بتایئے گا نہیں اور ہم محلّے سے باہر ملیں گے۔ یہ بہت رازداری کا کام ہے۔ پورے محلّے میں آپ ہی ایسے آدمی نظر آئے ہیں جس پر میں بھروسا کرسکتی ہوں۔“

”ویسے خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں۔ ہاں بالکل خیریت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ آپ کل صبح نو بجے بس اسٹاپ پر آجایئے گا۔ میں بھی آجاؤں گی۔“

مختصر یہ کہ ریاض نے اس معاملے میں میرا بہت ساتھ دیا۔

میں نے اسے ساتھ لے جاکر پانچ لاکھ روپے نکلوائے۔ پھر اس کی مدد سے بینک اکاؤنٹ کھلوایا اور چار لاکھ اس میں جمع کرکے ایک لاکھ کے اور بانڈز خرید لئے۔

میں اب اپنی قسمت کو بار بار آزمانا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہوگیا تھا کہ خدا میرا ساتھ دے گا اور میرے حالات بدلتے جائیں گے۔

بے چارہ ریاض حیران ہی ہو رہا تھا لیکن وہ اتنا شریف انسان تھا کہ خاموش ہی رہا۔ میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا۔

اتفاق دیکھیں کہ میرے کئی نمبرز اگلی قرعہ اندازی میں لگ گئے اور میرے پاس پورے پچیس لاکھ ہوگئے۔ پانچ لاکھ پہلے کے اور بیس لاکھ کے نئے انعامات۔

میں تو پاگل ہوکر رہ گئی تھی۔ پچیس لاکھ۔ کتنی بڑی رقم تھی ہم جیسے لوگ اس سے اپنا مستقبل بنا سکتے تھے۔ اتنی بڑی رقم تو پورے خاندان میں کسی کے پاس نہیں ہوگی۔ قسمت مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوگئی تھی۔

یہ بیس لاکھ بھی میں نے ریاض کے ساتھ ہی جاکر نکلوائے تھے اور اسی کے ساتھ جاکر اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیئے تھے۔ میں اب پچیس لاکھ کی مالک تھی۔

گھر کا یہ حال تھا کہ دس دس روپوں کے لئے سب پریشان رہتے۔ کبھی گھر میں آٹا نہیں ہے۔ کبھی چینی نہیں ہے۔ کبھی دواؤں کے پیسے نہیں ہیں لیکن میں اس وقت بھی خاموش رہی تھی۔

میں ابھی کچھ اور بھی حاصل کرلینا چاہتی تھی۔ یہ سب میری ابتدا تھی۔

میں نے اس سلسلے میں ریاض ہی سے مشورہ کیا۔ ”ریاض صاحب۔ میں کوئی کاروبار کرنا چاہتی ہوں۔ خاموشی کے ساتھ۔ کیا آپ مجھے کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔“

”میں کیا مشورہ دوں۔“

”کچھ بھی۔ کیونکہ میں آپ پر بہت بھروسا کرنے لگی ہوں۔“

”دیکھئے دو چار دنوں کے بعد سوچ کر بتاؤں گا۔“

اس دوران گھر میں میرا ایک رشتہ آیا تھا۔ لڑکے کی درزی کی دکان تھی۔ ظاہر ہے۔ میں نے اس رشتے سے انکار کردیا ہوگا کیونکہ اب تو میں کچھ اور ہو چکی تھی۔

ابا اور امی نے بہت شور کیا۔ بھائی نے بھی آنکھیں دکھائیں لیکن میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ میں یہی کہتی رہی کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔

چار دنوں کے بعد ریاض سے ملی تو اس نے بتایا۔ ”ایک اچھا موقع ہے لیکن اس کے لئے بعد میں بہت محنت کرنی ہوگی۔“

”بتائیں۔ کیا موقع ہے۔“

”ایک اسکول بک رہا ہے۔ اسکول اگرچہ چھوٹا سا ہے۔ لیکن بہت موقعے کی جگہ پر ہے۔ اگر اس پر محنت کی جائے۔ سلیقے سے چلایا جائے تو بہت کامیاب ہوسکتا ہے۔“

یہ تو بہت بڑا موقع تھا۔ میں نے کبھی خواب بھی اس قسم کے نہیں دیکھے تھے کہ میں کسی اسکول... میں پڑھا رہی

ہوں لیکن اب تو اسکول کی مالک بننے کی بات ہو رہی تھی۔
’’کیا مانگ رہے ہیں۔‘‘ میں نے پوچھا۔
’’بیس لاکھ روپے۔‘‘ ریاض نے بتایا۔ ’’وہ لوگ باہر جا رہے ہیں۔ اسی لئے چلتا ہوا اسکول بیچ رہے ہیں۔‘‘
’’کیا میں اس اسکول کو دیکھ سکتی ہوں۔‘‘
’’کیوں نہیں۔ ابھی چلیں۔‘‘
اسکول مجھے پسند آیا حالانکہ بچے زیادہ نہیں تھے۔ لیکن جگہ بہت موقعے کی تھی۔ چاروں طرف فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ اسکول کی عمارت چار کمروں کی تھی۔ پرائمری تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے مکان اور فرنیچر سمیت بیس لاکھ میں سستا ہی مل رہا تھا۔
’’ریاض صاحب سودا کرلیں اس کا۔‘‘ میں نے کہا۔
اور دس بارہ دنوں کے بعد وہ اسکول میرا ہو چکا تھا۔ کورٹ جانا پڑا تھا۔ میرے نام رجسٹری ہوئی تھی۔ جب اسکول میرے نام ہو گیا تو میں نے ریاض سے کہا۔ ’’ریاض صاحب۔ آپ نے مجھ پر اتنی مہربانیاں کی ہیں۔ بس ایک مہربانی اور کردیں۔‘‘
’’جی فرمائیں۔‘‘
’’اب یہ اسکول آپ کے حوالے ہے۔ آپ ہی چلائیں گے اسے۔‘‘
’’میں۔‘‘ ریاض پریشان ہو گیا تھا۔ ’’میں یہ ذمے داری کیسے قبول کر سکتا ہوں؟‘‘
’’کیوں نہیں کر سکتے، یہ آپ ہی کی ذمّے داری ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کیونکہ میں نے تو صرف میٹرک تک پڑھا ہے میں اسکول کیسے چلا سکتی ہوں۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے۔‘‘
’’اب میں اسکول والی تھی۔ ریاض نے اسکول سنبھال لیا۔ خود اس کے لیے بھی مصروفیت نکل آئی تھی۔ کبھی کبھی میں بھی اسکول چلی جایا کرتی تھی جو بہت خوبی سے چل رہا تھا۔ نئے داخلے بھی ہو رہے تھے۔
پہلے مہینے میں پندرہ ہزار کی بچت ہوئی تھی۔ میں نے ریاض کی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ شریک بن جائے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا پھر تنخواہ پر راضی ہو گیا تھا۔
گھر والے میرے مستقبل کی باتیں کرتے رہتے۔ کیا بنے گا میرا۔ ان کو بھائی کی نوکری کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ وہ اسے کسی فیکٹری میں کام دلوانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔
ایک دن میں نے ابو سے کہا۔ ’’ابو۔ اگر آپ کہیں تو میں جعفر کو نوکری دلوا دوں۔‘‘
’’تو کہاں سے نوکری دلوائے گی۔‘‘
’’ایک اسکول ہے، اس محلے میں ایک لڑکا رہتا ہے نا ریاض۔‘‘
’’ہاں ہاں جو ٹیوشنز پڑھاتا ہے، اچھا لڑکا ہے۔‘‘
’’ابا وہ اب ایک اسکول میں کام کر رہا ہے۔‘‘ میں نے بتایا۔ ’’ایک بار اس نے مجھ سے نوکری کے لیے کہا تھا۔ میں تو نہیں کر سکتی جعفر کی نوکری ہو جائے گی۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔ تو لے جا جعفر کو اپنے ساتھ۔‘‘
میں نے ریاض کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں جعفر کو لے کر آ رہی ہوں لیکن اس کے سامنے یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ اسکول سے میرا کیا تعلق ہے۔‘‘
بہر حال، میں جعفر کو لے کر اسکول پہنچ گئی اور جعفر کو اسکول میں کلرک کی نوکری مل گئی۔
اس کو یہ پتا ہی نہیں چل سکا تھا کہ وہ اسکول اس کی اپنی بہن کا ہے۔
بہت زبردست پراگریس تھی اسکول کی۔ تیسرے یا چوتھے مہینے پچاس ہزار کی بچت ہوئی تھی۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ ایک دن ریاض نے کہا۔ ’’یہ برابر والا مکان لینے کی سوچ رہا ہوں کیونکہ اب اسکول میں گنجائش کم ہوتی جا رہی ہے۔‘‘
’’اور وہ کیا مانگ رہے ہیں۔‘‘
’’چالیس لاکھ۔‘‘ ریاض نے بتایا۔
’’ریاض صاحب۔ یہ چالیس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟‘‘
’’اسکول کے بی ہاف پر بینک سے مل جائیں گے۔‘‘ ریاض نے بتایا۔ ’’میں نے بات کر لی ہے اگر اسکول کی یہی پراگریس رہی تو خدا نے چاہا تو ہم صرف ایک سال میں قرض اُتار دیں گے۔‘‘
’’چلیں تو پھر بسم اللہ کریں۔‘‘
اور چالیس لاکھ بھی مل گئے۔ اسکول اب وسیع ہو گیا تھا۔ آٹھویں تک تعلیم دی جا رہی تھی۔ ایک سال کے اندر اندر چار پانچ سو اسٹوڈنٹ آ گئے تھے۔ بیس بائیس لوگوں کا اسٹاف۔ چپراسی، چوکیدار، کلرک۔ کہاں سوچا تھا میں نے کہ میرے پاس یہ سب بھی ہوگا۔

اب میرے پاس بینک کے پندرہ بیس لاکھ کے علاوہ ایک کروڑ کی پراپرٹی تھی۔ ایک چلتا ہوا کاروبار تھا۔ خدا نے توقع سے بڑھ کر دے دیا تھا۔
ایک دن میرے بھائی کو بخار تھا۔ وہ اسکول نہیں گیا جبکہ میں اسکول کے بعض معاملات پر بات کرنے اسکول چلی گئی تھی۔ ریاض دوسری بلڈنگ میں معائنے کے لیے گیا ہوا تھا۔
میں اس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ میز پر اس کی ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں وہ ڈائری اُٹھا لی۔ اس دن پتا چلا کہ ریاض کو ڈائری لکھنے کا شوق بھی تھا۔
اس نے تاریخ وار اپنی یادداشتیں مرتب کر رکھی تھی۔ فلاں دن میرے ساتھ یہ ہوا، فلاں دن یہ آج فلاں دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ڈائری میں خوبصورت اشعار بھی لکھے ہوئے تھے اور ایک تاریخ پر میری نگاہ جم کر رہ گئی۔ اس نے لکھا تھا۔ ’’آج میرا بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ میں نے ٹیوشنز کے پیسوں سے بچا کر 750 روپے کا ایک پرائز بانڈ خریدا تھا۔ وہ محلّے ہی میں کہیں گر گیا لیکن میں نے کسی کو بتایا نہیں کیونکہ میری یہ عادت ہی نہیں ہے جو خدا کو منظور۔
میں سکتے میں رہ گئی۔
تو وہ پرائز بانڈ ریاض کا تھا۔ وہ بانڈ جس کی وجہ سے مجھے کامیابیاں ملی تھی جس کی وجہ سے میں نے اتنی ترقی کی تھی۔ یہ اسکول، یہ پراپرٹی، یہ بینک بیلنس یہ سب ریاض کا تھا۔ کیونکہ یہ سب اسی کے بانڈ کا کرشمہ تھا۔ میرے خدا کیا کروں میں؟
خاموش رہوں یا ریاض کو بتا دوں لیکن کیا بتاؤں۔
میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے پاس جو کچھ ہے اس کا حقدار کوئی اور ہے۔ اگر میں ریاض کو سب کچھ بتا دیتی ہوں تو پھر میرے پاس کیا بچتا ہے کیونکہ ان پر اصولاً صرف اس کا حق تھا اور اگر خاموش رہتی ہوں تو کیا چین سے رہ سکوں گی؟
کچھ دیر بعد ریاض واپس آ گیا۔ مجھے دیکھ کر حیران اور خوش ہوا تھا۔ ’’ارے کب آئیں آپ؟‘‘
’’بس کچھ دیر ہوئی۔‘‘
’’مجھے بلا لیا ہوتا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں دوسری بلڈنگ کی طرف گیا ہوا تھا۔‘‘

کیوپڈ

محبت کے اس دیوتا کو یونانی ایروز (Eros) اور رومن کیوپڈ (copid) کہتے ہیں لیکن اس کا رومن نام زیادہ معروف ہوا۔ یہ ایفروڈائٹ کی آوارگیوں کا نتیجہ تھا اور اس کے مارس سے تعلقات کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے محبت کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دیوتا اندھا تھا۔ اس کی تصویر ایک معصوم بچے کی ننگی تصویر ہوتی ہے جس کے ساتھ ایک ترکش اور ہاتھ میں کمان بنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں یہ کہ اس کے ترکش میں دو طرح کے تیر ہوتے تھے سنہرے اور آہنی۔ ان تیروں سے کیوپڈ، دیویوں، دیوتاؤں اور انسانوں کے سینوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کیوپڈ کے سنہرے تیروں کا نشانہ بننے والے اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن لوہے کے تیروں کا نشانہ بننے والے ناکام رہتے ہیں۔
کیوپڈ، سائیکی (psyche) سے محبت کرتا تھا لیکن اس کے پاس صرف رات کے وقت جایا کرتا تھا کیونکہ دن بھر ماں اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔
اسے پندرہ اولمپینز دیوتاؤں کا سب سے آخری دیوتا قرار دیا جاتا ہے تاہم بعض کے مطابق اولمپینز کی تعداد صرف بارہ تھی جبکہ باقی ان کے ماتحت دیوتا تھے اور ان کی طاقت و حیثیت اولمپینز کی نسبت بے حد کم تھی۔
مرسلہ: طاہر محمود، منڈی بہاالدین

’’ریاض مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔‘‘ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
’’ہاں بتائیں۔‘‘
’’کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ مجھے اتنی ترقی کہاں سے ملی ہے؟‘‘
’’ظاہر ہے آپ کی محنت اور آپ کی نیت کی وجہ سے۔‘‘ اس نے کہا۔
’’اس کے علاوہ سب سے بنیادی کردار اس پرائز بانڈ کا ہے جس پر مجھے انعام ملا تھا۔‘‘ میں دھیرے سے بولی۔ ’’اصل ترقی تو وہیں سے شروع ہوئی ہے۔ ورنہ میرے پاس کیا تھا کچھ بھی نہیں۔‘‘
’’یہ تو ہے۔‘‘ اس نے اتفاق کیا۔ ’’کوئی نہ کوئی بہانہ تو ہوتا ہے نا آپ کے لیے وہ بانڈ بہانہ مل گیا۔‘‘
’’کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ بانڈ کس کا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ظاہر ہے کہ آپ ہی کا ہوگا۔‘‘

''جی نہیں وہ بانڈ آپ کا تھا۔'' میں نے کہا۔
''کیا؟''
''جی ہاں۔ معاف کیجیے گا میں نے اتفاق سے آپ کی ڈائری پڑھ لی ہے'' میں نے بتایا۔ ''آپ کا جو بانڈ گم ہوا تھا وہ مجھے مل گیا تھا اسی سے یہ سارا کھیل رچایا گیا ہے۔''
''ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ بانڈ میرا ہے۔''
''کیا۔'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔
''آپ جانتے تھے۔''
''جی ہاں، آپ جس وقت مجھے لے کر بینک پہنچی تھیں۔ وہ نمبر میرے سامنے آ گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ نمبر مجھے زبانی یاد تھا کیونکہ میں نے اس سے بہت توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔''
''تو پھر۔ پھر آپ نے بتایا کیوں نہیں؟''
''میں نے یہ سوچا کہ انعام آپ کی قسمت سے نکلا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''قدرت نے آپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہوسکتا تھا کہ بانڈ میرے پاس ہوتا تو مجھے کوئی انعام نہیں ملتا۔ یہ سب آپ کی قسمت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ اسکول، یہ ترقی یہ سب آپ کی تقدیر کے کرشمے ہیں۔ میرا اس میں کوئی کنٹری بیوشن نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ میرا نقصان پورا ہی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے وہی 750 روپے دے دیجیے گا۔''
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ ریاض کتنا بڑا آدمی تھا۔ کتنے بڑے دل کا مالک تھا اور وہ چاہتا تو ہنگامہ تو کر ہی سکتا تھا لیکن اس نے مسکرا کر بات ہی ٹال دی تھی۔
''ریاض صاحب، آپ 750 روپے کی بات کر رہے ہیں یہ سب کچھ ہی آپ کا ہے۔'' میں نے کہا۔
''نہیں میرا اس میں کچھ نہیں ہے۔''
''اچھا چلیں آپ کا اس میں کچھ نہیں ہے لیکن آپ ایک کام تو کر سکتے ہیں نا۔''
''چلیں بتائیں۔''
''آپ میرے پارٹنر بن جائیں۔''
''ہاں، اس پر سوچا جا سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔
''میں بزنس پارٹنر کی بات نہیں کر رہی۔''
''تو پھر۔''
''میں لائف پارٹنر کی بات کر رہی ہوں۔'' میں نے بالآخر اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔
ریاض کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ آ گیا تھا۔
''عالیہ۔ اس نے پہلی بار اتنی بے تکلفی سے میرا نام لیا تھا۔ ''کیا تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو۔''
''ریاض صاحب، آپ تو اس قابل ہیں کہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بس آپ کے جواب کا انتظار ہے۔''
''کیا جواب میرے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہے؟'' وہ مسکرا کر بولا۔
پھر میری شادی ہوگئی۔ بہت دھوم دھام کے ساتھ۔ سب کے لیے یہ انکشاف تھا کہ اتنا بڑا اسکول میرا تھا۔ اب ہم دونوں میاں بیوی بہت کامیابی سے اپنا اسکول چلا رہے ہیں اس کی کئی شاخیں ہو چکی ہیں۔
میں نے بھی بی ایڈ کرلیا ہے۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ دونوں ہمارے اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ایک دن میری بچی کو ایک پرائز بانڈ گرا ہوا مل گیا۔ وہ اسے لے کر میرے پاس آ گئی۔ ''مما۔ یہ دیکھیں یہ پرائز باند گرا ہوا ملا ہے۔''
''بیٹا یہ جہاں سے ملا ہے وہیں جا کر رکھ آؤ۔''
''لیکن مما آپ نے اپنی جو کہانی سنائی ہے اس لحاظ سے تو یہ پرائز بانڈ میری قسمت بنا سکتا ہے۔''
''نہیں بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔''
''وہ کیوں مما۔''
''وہ اس لیے کہ اب اس دور میں تمہارے پاپا جیسا دوسرا ریاض نہیں مل سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ میری قسمت تھی کہ مجھے تمہارے پاپا مل گئے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کوئی تمہارا بھی اسی طرح ساتھ دینے والا ہو۔''
میری یہ بات بچی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
اس نے وہ پرائز بانڈ جہاں سے اُٹھایا تھا وہیں جا کر رکھ دیا تھا۔
میں نے غربت زدہ ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں لیکن ایک پرائز بانڈ نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ آپ کو اگر اتفاق سے کوئی ایسا پرائز بانڈ مل جائے تو اسے اُٹھانے میں جلدی نہ کریں۔ ہر پرائز بانڈ کے پیچھے ریاض جیسا آدمی نہیں ہوتا۔
آئی لو یو ریاض۔

وعدہ

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
میں ..... اپنی آپ بیتی لے کر سرگزشت کے قارئین کی محفل میں آئی ہوں لیکن یہ بتادوں کہ میں نے پردہ رکھنے کی خاطر تمام نام اور مقام بدل دیے ہیں لیکن تحریر میں بیان کردہ حقائق صحیح ہیں۔ کچھ بھی بدلنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

شکیلہ فرقان علی
(لاہور)

بڑی بڑی مونچھیں، گول مٹول گوشت سے بھرا چہرہ، باہر کو نکلی ہوئی توند، بات بات پر گالیاں۔ یہ تھی کسی پولیس والے کی شناخت جو میرے ذہن میں آباد تھی۔ اب جو شرجیل کو پولیس کی وردی میں، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے دیکھا تو یہ معلوم ہوا جیسے کوئی فلمی ہیرو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔
سامنے والے گھر کے سامنے پولیس موبائل آ کر رکی اور تڑا تڑ پولیس والے کود کر باہر نکلے تو میں یہ خبر اماں کو سنانے کے لیے فوراً چھت سے نیچے اُتر آئی۔
''اماں، شگفتہ خالہ کے گھر پولیس آئی ہے۔''

"اللہ خیر کرے۔ آج کل جگہ جگہ چھاپے پڑ رہے ہیں۔ پڑ گیا ہوگا اس کے گھر بھی۔"

"لیکن اماں، ان کے گھر میں تو کوئی لڑکا بھی نہیں، پھر وہ کسے پکڑنے آئے ہوں گے؟"

"اس کے گھر میں دو دو جوان لڑکیاں بھی تو ہیں۔ کر آئی ہوں گی کوئی ایسا ویسا کام۔"

"اماں، کسی کی بیٹیوں کے لیے تو ایسے الفاظ منہ سے مت نکالیں۔"

"اچھا نہیں نکالتی۔ تھوڑی دیر میں خود ہی محلّے میں شور مچ جائے گا۔ سب پتا چل جائے گا۔ تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

اماں سے باتیں کرنے کے بعد مجھے پھر موبائل کی فکر ہوئی۔ اب چھت پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں دروازے پر گئی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ موبائل کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ میں نے واپس آ کر اماں کو بتانا ضروری سمجھا۔

"اماں، پولیس موبائل تو اب وہاں نہیں ہے۔"

"کالج میں پڑھتی ہو لیکن اتنا نہیں معلوم۔ یہ لوگ کوئی گھنٹوں لگاتے ہیں، منٹوں میں کام کرتے ہیں۔ جسے پکڑنا ہوگا پکڑ کر لے گئے ہوں گے۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ شام تک کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی تو اماں کو فکر ہوئی۔

"اے شکیلہ! کسی بہانے سے شگفتہ کے گھر جا تو سہی۔ ذرا معلوم تو ہو کیوں آئی تھی پولیس؟"

"اماں، آئی ہوگی چھوڑو بھی۔"

"اوئی بچی! محلے داری کا کیا اتنا حق بھی نہیں۔ کسی کے دکھ درد میں کام نہیں آؤ گی تو کل تمہارے کام کون آئے گا؟"

"آپ چلی جائیں، میں کیا اچھی لگوں گی پوچھتے ہوئے۔"

"ارے پوچھنے کو کون کہہ رہا ہے۔ چکر لگا کر آ جا۔ ایسی ویسی بات ہوگی تو خود پتا چل جائے گا۔"

مجھے معلوم تھا یہ ان کی ہمدردی نہیں فطرت بول رہی ہے۔ انہیں ٹوہ لگانے کی عادت تھی اور شگفتہ باجی سے تو ان کی ویسے بھی نہیں بنتی تھی۔

ان کی ضد دیکھ کر مجھے بھی تجسس ہوا۔ شگفتہ باجی کے گھر ہمارا زیادہ آنا جانا نہیں تھا لیکن لڑائی بھی نہیں تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں ارم اور رفعت۔ دونوں جہاں مل جاتی تھیں، ہم اچھی طرح بات کرتے تھے۔ میں اس وقت تیار ہوئی اور شگفتہ باجی کے گھر پہنچ گئی۔ ارم اور رفعت سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں سلامت ہیں۔ شگفتہ باجی بھی مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ گھر کے ماحول سے ذرا ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی افتاد پڑی ہے۔

"شکیلہ! آج تم کیسے نکل آئیں؟" مجھے دیکھتے ہی شگفتہ باجی نے کہا۔

"شگفتہ باجی، میرے امتحان ختم ہوگئے نا۔ پرچے دے دے کر بور ہوگئی تھی سوچا ارم اور رفعت سے مل آؤں۔"

"بہت اچھا کیا۔ نکل آیا کرو کبھی کبھی۔ تمہاری ماں کیسی ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہیں۔"

"تم لوگ باتیں کرو، میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

میں ارم اور رفعت سے باتوں میں مشغول ہوگئی۔ بار بار سوچتی تھی کہ پوچھوں تمہارے گھر پولیس کیوں آئی تھی؟ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ اگر کوئی بات ہوگی تو وہ خود بتائیں گی یا اُٹھتے وقت پوچھ لوں گی۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے کی بیل بجی۔

"شاید شرجیل بھائی ہوں گے۔" ارم بولی وہ ابھی اُٹھ کر جانے ہی والی تھی کہ پولیس کی وردی پہنے ایک نوجوان اندر آیا۔ چھریرا بدن، کلین شیو۔ وردی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن سچی بات ہے، میں اسے آتا دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا، لو پھر چھاپا پڑ گیا۔ میں بھی پکڑی گئی۔

"دیکھا، میں کہہ رہی تھی نا کہ شرجیل بھائی ہوں گے۔"

اتنی دیر میں وہ ہمارے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔

"ارم، میری آنکھوں کو کچھ ہوگیا ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوگیا شرجیل بھائی؟"

"تم لوگ دو ہو اور مجھے تین نظر آ رہی ہو۔"

"اپنی آنکھوں کا نہیں عقل کا علاج کرائیے۔ ہم دو نہیں تین ہیں۔ یہ شکیلہ ہے، پڑوس میں رہتی ہے۔"

"کیوں جی، یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا پھر خود ہی کہنے لگا "ارے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہ گونگی ہیں۔"

"گونگی کیوں ہونے لگیں؟"

"کل تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ ہمارے پڑوس میں ایک گونگی رہتی ہے۔"

"وہ دوسری ہے۔"

"یہی تو میں کہوں، اتنی خوبصورت لڑکی گونگی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"آپ جا کر وردی اُتاریے۔ ہماری دوست کو ڈرائیے مت۔"

"ان سے کہیے گا جائیں نہیں۔ مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" اس نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔

"کون ہیں، یہ ذات شریف۔"

"یہ ہمارے ماموں زاد بھائی ہیں۔ نئے نئے ایس آئی بھرتی ہوئے ہیں۔ ان کے والدین سکھر میں رہتے ہیں۔ ان کی پوسٹنگ کراچی میں ہے لہٰذا یہ ہمارے حصے میں آ گئے۔"

"بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"ایک آدھ دفعہ اور آؤ گی تو سننا ان کے لطیفے۔"

"اب تو ضرور آؤں گی۔"

یہ تھا میری اور شرجیل کی پہلی ملاقات کا پس منظر۔

اس کے بعد کئی دن تک میرا ان کے گھر جانا نہیں ہوا۔ شرجیل مجھے اچھا لگا تھا۔ کئی مرتبہ جی بھی چاہا کہ ارم کے گھر جاؤں۔ شاید اس سے ملاقات ہو جائے لیکن دل میں شاید چور آ گیا تھا۔ ڈر لگتا تھا کہ چوری پکڑی نہ جائے۔

چوری پر مجھے یاد آیا کہ ملاقاتوں کا سلسلہ کیوں چل نکلا تھا۔ ایک چور ہی اس کا سبب بنا تھا۔ اس رات ہم سب سو چکے تھے کہ ایک چور ہمارے گھر میں کودا۔ اتفاق یہ ہوا تھا کہ میرا بڑا بھائی پانی پینے کے لیے اُٹھا تھا۔ اس نے چور کو پکڑ لیا اور شور مچا دیا۔ آواز سن کر ابا بھی اُٹھ گئے۔ دونوں نے مل کر اسے رسّی سے باندھ دیا۔ اتنا شور مچا تھا کہ محلے والے بھی جمع ہوگئے تھے۔ ابا نے دروازہ کھول دیا تا کہ محلّے والے اندر آ کر خود اس چور کو دیکھ لیں۔ ان آنے والوں میں شرجیل بھی تھا۔ وہ اس وقت وردی میں نہیں تھا اس لیے کوئی بھی نہیں جان سکا تھا کہ وہ کون ہے؟

میں نے اماں کے کان میں کہا "یہی تو وہ پولیس والے ہیں، جو شگفتہ باجی کے گھر میں آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"یہ پولیس میں ہیں تو ان سے کہو پکڑیں اسے۔"

اتنی دیر میں شرجیل کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی لیکن اتنے لوگوں کے سامنے وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ میرے کہنے پر ابا آگے بڑھے۔

"شرجیل صاحب! آپ تو پولیس میں ہیں۔ آپ بتایئے، اب کیا کرنا ہے اس چور کا؟"

"انکل! میں نے تھانے فون کر دیا ہے۔ پولیس موبائل آتی ہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

گلی میں پولیس موبائل کے سائرن نے شور مچایا اور پھر پولیس اندر آ گئی۔ شرجیل نے ابا کو ساتھ لیا اور چور کے ساتھ موبائل میں بیٹھ کر چلا گیا۔

ابا واپس آئے تو صبح ہو چکی تھی۔ شرجیل بھی ان کے ساتھ تھا۔

"اچھا انکل، اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بیٹا، اجازت کیسی، صبح ہوگئی ہے ناشتا کر کے جانا۔"

اماں نے ہاں میں ہاں ملائی "اور نہیں تو کیا۔ اتنا بڑا احسان ہے ہم پر تمہارا۔ تم نہ ہوتے تو ہم کہاں تھانے کے چکر لگاتے۔ تمہارے انکل تو کہہ رہے تھے کہ اس چور کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ تو تم آ گئے۔"

مجھے غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ شگفتہ باجی کے گھر مجھے دیکھ چکا ہے لیکن اس کی آنکھوں کی شرارت بتا رہی تھی کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے۔

میں چائے بنا کر لائی تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا "آپ کو تو میں شگفتہ باجی کے گھر دیکھ چکا ہوں، شاید وہی ہیں آپ؟"

"جی ہاں، ایک روز میں شگفتہ باجی کے گھر گئی تھی۔ وہاں دیکھا ہوگا۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اس نے چائے ختم کر کے کہا۔

"بیٹا، کبھی کبھی آ جایا کرنا۔ میں بھی تمہاری شگفتہ باجی ہی کی طرح ہوں۔"

"جی کیوں نہیں۔ محلّے والوں پر تو بڑا حق ہوتا ہے۔"

اس نے پھر میری طرف دیکھا تھا جیسے مجھ پر اپنا حق جتا رہا ہو۔

یہ تھی میری اس سے دوسری ملاقات۔

اس کے کہنے کے مطابق اسے مجھ سے پہلی ملاقات ہی میں محبت ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے چھت پر ٹہلتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ پھر چور والا واقعہ نکل آیا اور ملنے جلنے کا بہانہ ہاتھ

آ گیا۔

گھر میں سب ہوتے تھے لیکن ہمیشہ تو سب نہیں ہوتے تھے۔ ہمیں اکثر تنہائی مل جاتی تھی اور ہم آمنے سامنے بیٹھ کر محبت کی باتیں کرلیا کرتے تھے۔

یہ باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ میں پھر سے کالج جانے لگی۔ اب میں باہر نکل سکتی تھی اس لیے شرجیل نے خواہش ظاہر کی کہ ہم باہر ملا کریں۔

''گھر سے اچھی جگہ کون سی ہوگی شرجیل!''

''بات تمہاری بھی غلط نہیں ہے لیکن تمہارے گھر والوں کو کسی وقت بھی شک ہوسکتا ہے۔ میرا روز آنا اور تم سے باتیں کرتے رہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''تم کیا گھر آنا بالکل ہی چھوڑ دو گے؟''

''نہیں، کمی تو کرسکتا ہوں۔ جس دن تم سے باہر ملاقات ہوجایا کرے گی اس دن گھر نہیں آیا کروں گا۔''

طے یہ ہوا کہ ہم ہر تیسرے دن باہر ملا کریں گے۔

گھر کے قریب ہی بس اسٹاپ تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ کل دس بجے اسٹاپ کے قریب پہنچ جاؤں، وہ مجھے وہیں مل جائے گا۔

میں نے اس دن بہانہ کیا کہ کالج دیر سے جانا ہے۔ دس بجے تیار ہوئی اور اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ شرجیل میرا انتظار کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اس کے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت وردی میں نہیں تھا۔ کلف لگے سفید شلوار قمیص میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے خود پر فخر ہورہا تھا کہ پولیس والوں سے لوگ دوستی کرکے اُتراتے ہیں۔ میں شرجیل کے اتنے قریب بیٹھی ہوں۔ وہ میرا دوست ہی نہیں مجھ سے محبت کرتا ہے۔

ہم ایک کافی شاپ میں جاکر بیٹھے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب تک کافی ختم ہوتی ہم یہ طے کرچکے تھے کہ آیندہ کہاں ملنا ہے۔

جب ہم باہر ملنے لگے تو اس نے گھر آنا کم کردیا۔ اماں نے ایک روز خود ہی ذکر چھیڑا۔

''شرجیل بہت دن سے نہیں آیا۔''

''ہوگیا ہوگا کوئی کام۔''

''تو جاکے ارم سے تو پوچھتی۔''

''اماں، یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ نہیں آتے تو نہ آئیں۔''

''بیٹا، آج کل پولیس والوں سے تعلقات رکھنا بہت ضروری ہے۔ شہر کے حالات دیکھ رہی ہو، تمہارا بھائی اکیلا آتا جاتا ہے۔ کوئی بات ہوجائے تو شرجیل کا سہارا تو ہوگا۔''

''آپ ابا سے کہیں۔ وہ جاکر مل لیا کریں گے۔ ویسے بھی کسی غیر مرد کا روز روز گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا۔ محلے والوں کو بھی اعتراض ہوسکتا ہے۔''

میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے اماں سے کہا جیسے شرجیل کے آنے یا نہ ملنے سے مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

میرے انکار پر اماں خود شگفتہ باجی کے گھر گئیں۔ وہ شرجیل کے لیے شگفتہ باجی سے تعلق مستحکم رکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے پانی سے پہلے پل باندھنے کے لیے ابا کے کانوں میں بھی بات ڈال دی۔

''ابا، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ شرجیل یہاں آئے۔ غیر ہی تو ہے لیکن اماں کو بڑی فکر لگی ہوئی ہے کہ شرجیل نے آنا کیوں بند کردیا ہے؟''

''ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ آج کل پولیس والے بہت کام آتے ہیں۔ وہ اگر یہاں آجاتا ہے تو کیا ہے۔ پولیس میں ہے لیکن بہت شریف لڑکا ہے۔''

میں نے اپنی پوزیشن صاف کرلی تھی۔ میں نے شرجیل سے کہہ دیا کہ وہ اسی طرح آتا رہے جس طرح آتا تھا۔ میرے کہنے پر وہ دوسرے ہی دن آگیا۔ اماں نے اس سے بڑے گلے شکوے کیے۔ اس نے بے کھٹک ہوکر دوبارہ آنا شروع کردیا۔ اب میرا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ اب میرے لیے نہیں آرہا تھا، اماں کے کہنے پر آرہا تھا۔

اب مجھے اماں کی طرف سے کوئی ڈر نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں خوب ہنسی مذاق کرتے تھے۔ میں محسوس کررہی تھی کہ اماں خود مجھے موقع دے رہی ہیں۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہتے اور وہ کسی کام میں مصروف ہوجاتیں۔

یہ باتیں چھپنے والی نہیں تھیں۔ محلے میں باتیں بننے لگیں۔ شگفتہ باجی کو خود بھی اعتراض ہونے لگا تھا۔ یہ بات مجھے ارم نے بتائی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس نے اپنی طرف سے کہی تھی یا واقعی شگفتہ باجی کو اعتراض تھا۔ میں نے اماں کو بتادیا کہ اس اس طرح کی باتیں بن رہی ہیں۔ آپ شرجیل سے کہہ دیں کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ اماں تو اپنی ضد پر آگئیں۔

''کوئی کون ہوتا ہے ہمیں روکنے والا۔ ہمارا گھر ہے

ہم کچھ بھی کریں۔ ہمارے گھر کوئی بھی آئے، اب تو میں اس سے کہوں گی، صبح شام آیا کرے۔''

اماں نے تو اپنا فیصلہ سنادیا تھا لیکن شرجیل نے مجھے بتایا کہ شگفتہ باجی بہت بُرا مان رہی ہیں۔ اب میں تمہارے گھر نہیں آیا کروں گا۔

اماں نے پھر شور مچایا لیکن ابا نے انہیں یاد دلایا۔

''شکیلہ کی ماں، کیوں ضد کررہی ہو۔ یہ باتیں اگر فرقان تک یا اس کے گھر والوں تک پہنچیں تو اچھا نہیں ہوگا۔ فرقان آخر منگیتر ہے شکیلہ کا۔''

مجھے اچانک یاد آگیا کہ میرا کوئی منگیتر بھی ہے۔ میں نے شرجیل اور فرقان کا موازنہ کیا تو شرجیل اس سے بدرجہا بہتر نظر آیا۔ فرقان بینک میں کلرک تھا۔ چار بہنوں کا ساتھ بھی تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ فرقان میرا منگیتر تھا اور شرجیل میری محبت۔ منگنی ٹوٹ سکتی ہے محبت ختم نہیں ہوسکتی۔ اب مجھے یہ بھی امید تھی کہ اگر میں نے کوئی قدم اُٹھایا تو اماں میرا ساتھ دیں گی۔

میں اس دن شرجیل سے ملی تو میں نے بات کا آغاز ہی یہاں سے کیا۔

''شرجیل، میں تمہاری محبت میں گم ہوکر یہ بتانا ہی بھول گئی تھی کہ میری منگنی ہوچکی ہے۔''

''منگنی ہوئی ہے شادی تو نہیں ہوگئی۔ منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ وہ لوگ میرے فائنل امتحان کا انتظار کررہے ہیں۔ اس کے بعد شادی کا تقاضا کریں گے۔ تم جلد سے جلد میرے گھر رشتہ لے کر آؤ۔''

''تم نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ہے شکیلہ! تمہاری منگنی نہ ہوئی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اب تمہارے گھر والے منگنی توڑنے پر رضامند نہیں ہوں گے اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ اگر میری تم سے شادی نہ ہوسکی تو یہ میرا وعدہ ہے کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔''

''جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ ہر ماں باپ اپنی بیٹی کے لیے بہتر سے بہتر رشتے کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ آپ میرے منگیتر سے کہیں بہتر ہیں اور پھر میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اماں آپ کے حق میں ہیں، آپ رشتہ لے کر تو آئیں۔''

''میرے والدین سکھر میں ہیں۔ آج کل ایمرجنسی ڈیوٹیاں لگ رہی ہیں۔ جیسے ہی چھٹی ملتی ہے، میں سکھر جاکر اپنی والدہ کو لے آؤں گا۔''

اس کی دلداری نے مجھے مغرور بنادیا تھا۔ کوئی یہ کہے کہ اگر تم سے شادی نہ ہوئی تو میں شادی نہیں کروں گا، غرور کرنے کے لیے یہ بات ہی کافی تھی۔

شہر کے حالات کشیدہ تھے۔ خاص طور پر اس کا تھانہ بہت متاثر تھا۔ اسے ایک گھنٹے کی بھی چھٹی نہیں مل رہی تھی کہ وہ سکھر جاتا اور اپنی والدہ کو لے کر آتا۔ میری بھی اس سے ملاقات نہیں ہورہی تھی۔ صرف فون ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے مجھے اس کی خیریت مل جاتی تھی۔ وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ فون کرکے اپنی والدہ کو بلالے مگر اس کا کہنا تھا کہ فون پر ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ اسے سکھر جاکر اپنے والدین کو بتانا ہوگا کیونکہ وہ ارم یا طلعت میں سے کسی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں، وہ اگر یہاں آئیں تو شگفتہ باجی انہیں بھڑکا دیں گی۔

میں پھر کچھ دن کے لیے انتظار کرنے پر مجبور ہوگئی۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ سکھر جارہا ہے۔ میں خوش ہوگئی۔

دوسرے دن وہ آبھی گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ ایک ہفتے بعد کراچی آئیں گی۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ بات ہوگئی ہے۔

اس دوران میری دو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پہلی ملاقات میں وہ بالکل نارمل نظر آرہا تھا لیکن دوسری ملاقات میں مجھے اس کا رویہ بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ میری حوصلہ افزائی کے بجائے مجھے سمجھانے پر اُتر آیا تھا۔

''شکیلہ، میری بات مانو تو جہاں تمہاری منگنی ہوئی ہے، وہیں شادی کرلو۔''

''شرجیل!'' میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو۔ وہ بھی ایک سال کی ملاقاتوں کے بعد۔''

''مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تمہاری منگنی ہوچکی ہے تو میں کبھی تمہارے قریب نہ آتا۔''

''اب تو بتادیا اور یہ بھی بتادیا کہ مجھے اپنے منگیتر سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''ذرا سوچو۔ اگر منگنی ٹوٹی تو تمہارے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔''

''آپ کو میرے گھر والوں کی پروا ہے، میری نہیں؟ اب میں آپ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔''

''میرا بھی یہی حال ہے لیکن اس شریف آدمی پر بھی غور کرو جس نے تم سے منگنی کی ہے۔ اس دوران ممکن ہے

کوئی اور لڑکی بھی اس کی زندگی میں آئی ہو لیکن اس نے یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا ہو کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف تم اس سے منگنی توڑ کر کسی اور کو اپنا لو اور وہ بھی کئی سال پُرانی منگنی۔"

"کیا میں اس شخص سے شادی کرلوں جسے میں پسند ہی نہیں کرتی؟"

"تم ابھی غصے میں ہو۔ اچھی طرح غور کرلو۔ تم خود کہو گی کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔"

اس کے رویے پر مجھے تعجب بھی ہوا تھا اور دکھ بھی۔ جو شخص ہمیشہ مجھے حاصل کرنے کی بات کیا کرتا تھا مجھے کسی اور شخص کے سپرد کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ ایک امید کی کرن پھر بھی تھی جو مجھے سنبھالا دیے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے غور کرنے کے لیے کہا ہے۔ خود بھی غور کر رہا ہوگا۔ ممکن ہے وہ خود اپنی غلطی تسلیم کرلے۔

میں نے غصے میں اسے فون نہیں کیا لیکن تیسرے دن اچانک مجھے خیال آیا، ان تین دنوں میں شرجیل نے ایک مرتبہ بھی مجھے فون نہیں کیا۔ میں نے اسی وقت اپنے موبائل سے اس کے موبائل پر نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی لیکن اس نے نہیں اُٹھایا۔ میں نے پھر ملایا پھر یہی ہوا۔ میں غصے کے عالم میں بار بار نمبر ملاتی رہی۔ پھر سوچا ہو سکتا ہے وہ کسی میٹنگ میں ہو۔ دو چار گھنٹے بعد پھر ٹرائی کی۔ اس نے فون بند کیا ہوا تھا۔ میں رات بھر کھولتی رہی۔ اس کے فون پر خاموشی تھی۔ شاید اس نے سم ہی بدل لی ہے۔ مگر کیوں؟ وہ مجھ سے کیوں بھاگ رہا ہے؟

میں صبح ہوتے ہی شگفتہ باجی کے گھر گئی کہ شاید وہاں ملاقات ہو جائے۔ میرے چہرے سے وحشت تو برس ہی رہی تھی، میں نے جو بات انہیں بتائی اس کا بھی انہیں یقین آ گیا ہوگا۔

"میرے بھائی کی موٹر سائیکل چھن گئی ہے۔ میں شرجیل صاحب کے پاس آئی تھی کہ شاید وہ کچھ مدد کردیں۔"

"شرجیل تو دو دن ہوئے ہمارا گھر چھوڑ گیا۔ کہہ رہا تھا اپنے کسی دوست کے گھر جا کر رہے گا۔"

"آپ مجھے اس دوست ہی کا پتا دے دیں۔"

"اب تمہیں گھر کی بات کیا بتاؤں۔ مجھ سے لڑ کر گیا ہے اس لیے پتا بھی دے کر نہیں گیا۔ ویسے اس کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔ آ جائے گا کسی دن۔"

"اب میں کیا کروں۔ کیسے ہو ان سے ملاقات۔"

"تم اپنے بھائی کو لے کر تھانے چلی جاؤ یا صرف بھائی کو بھیج دو۔ وہ وہاں مل جائے گا۔"

"جی شگفتہ باجی، یہی کرتی ہوں۔"

میں ان کے گھر سے نکلی تو مجھے یقین آ گیا تھا کہ شرجیل کسی وجہ سے مجھ سے ملنا نہیں چاہتا اور بھاگتا پھر رہا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں محبت اپنے گرد فریب کا حصار کھینچے رہتی ہے۔ مجھے بھی میری محبت نے فریب دیا۔ کیا خبر وہ بے چارہ اپنی کسی مشکل میں گرفتار ہو۔ شگفتہ باجی کہہ رہی ہیں، ان سے بھی لڑ بھڑ کر گیا ہے۔ اس سے ایک ملاقات ضروری ہے، چاہے کسی طرح بھی ہو۔

میں گھر آ کر کچھ دیر اپنی تقدیر پر ماتم کرتی رہی۔ پھر یہ سوچ کر اُٹھ گئی کہ رونا ہی ہے تو جی بھر کے رولوں گی پہلے معلوم تو ہو کس بات پر رونا ہے؟

میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور اماں سے سہیلی کے گھر کا بہانہ کر کے تھانے پہنچ گئی۔ اس نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا کہ میں تھانے نہیں آ سکتی۔ شاید سوچا بھی ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ کب آؤں گی۔ وہ اس وقت تھانے ہی میں تھا کہ میں پہنچ گئی۔

"تم یہاں کیوں آ گئیں؟"

"جس کا کچھ لٹ جاتا ہے وہ تھانے ہی تو آتا ہے۔"

"عجیب بے وقوفی ہے۔" اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا "اچھا ابھی چلی جاؤ میں بعد میں تم سے ملاقات کروں گا۔"

"شرجیل، اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے تمہیں ابھی میری بات سننی ہوگی۔"

"اچھا ٹھہرو، میں ابھی ایس ایچ او صاحب سے کہہ کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

اس نے اپنے افسر سے اجازت لی اور مجھے لے کر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ اس کے پاس کہنے کو غالباً کچھ بھی نہیں تھا، آخر مجھے بولنا پڑا۔

"شرجیل، میری شادی کی تاریخ طے ہونے والی ہے۔" اس سے آگے الفاظ نے میرا ساتھ ہی نہیں دیا۔

"میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ شادی کرلو۔"

"میں یہی جاننا چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرنا کیوں نہیں چاہتے؟ بزدلوں کی طرح کیوں بھاگتے پھر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ دو بچے بھی ہیں میرے۔"

یہ سن کر میں اب سوچتی ہوں کہ بے ہوش کیوں نہیں ہو گئی تھی؟

"تم جھوٹ بول رہے ہو شرجیل!"

"میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟"

"اگر یہ سچ ہے تو تم میرے قریب کیوں آئے تھے؟ میرے جذبات سے کیوں کھیلتے رہے ہو۔ مجھے امیدیں کیوں دلا رہے تھے۔ کیوں کہہ رہے تھے کہ اپنی والدہ کو لے کر آؤ گے؟"

"میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔"

"تمہاری غلطی نے میری زندگی تو برباد کردی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اپنی زندگی برباد ہونے سے بچا لو۔ تمہارے ماں باپ جہاں کہتے ہیں وہاں شادی کرلو۔"

"میں کہہ چکی ہوں، کسی اور سے شادی نہیں کرسکتی۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" اس نے کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "کیا خیال ہے، اب چلا جائے؟"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر بٹھا لیا "شرجیل، مرد دوسری شادی بھی تو کر لیتے ہیں۔"

"کر لیتے ہوں گے لیکن میں ایسا نہیں چاہتا اور پھر میری بیوی اجازت بھی نہیں دے گی۔" اس نے ایسی بے رُخی سے کہا کہ میں ششدر رہ گئی۔ پھر اچانک میرے اندر کی عورت بیدار ہو گئی۔

"جھوٹے انسان، محبت کا ڈراما رچانے سے پہلے بیوی یاد نہیں آئی تھی۔ اس وقت نہیں سوچا تھا کہ اجازت نہیں ملے گی۔ اب اگر تو چاہے بھی تو میں تجھ سے شادی نہیں کروں گی۔ جا تو ہمیشہ میری بددعا میں رہے گا۔"

اس نے میری بات بھی پوری نہیں ہونے دی اور اُٹھ کر چل دیا۔ میری بلند آواز پر کئی لوگوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ میں وہاں اکیلی بیٹھ کر تماشا بننا نہیں چاہتی تھی۔ میں بھی اُٹھ کر باہر آ گئی۔

وہ باہر میرا منتظر تھا۔

"کہو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں؟"

"چھوڑ تو دیا اور کیسے چھوڑو گے؟"

اسے اس جواب کی توقع تھی۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تھانے کی طرف چل دیا۔

میں نہیں جانتی کہ گھر کس طرح پہنچی تھی۔ احساسِ شکست تھا کہ رخساروں پر طمانچے مار رہا تھا۔ گھر پہنچی تو اماں نے دیکھتے ہی کہا، اپنا چہرہ تو دیکھ، کیسا لال بھبوکا ہو رہا ہے۔

اب انہیں کیا بتاتی کہ ناکامی کی چوٹ کوئی معمولی چوٹ نہیں ہوتی۔ جو چوٹ میں کھا کر آئی ہوں اس کے نشان برسوں رہیں گے۔

میں بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی اور اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ کچھ دیر بعد اماں میرے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے مجھے اُٹھانے کے لیے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"اللہ خیر! تجھے تو بڑا تیز بخار ہے۔ دُھوپ میں جانے کہاں تک پیدل چلی ہے۔ ٹھہر، ابھی تیری نظر اُتارے دیتی ہوں۔"

وہ بھاگی بھاگی گئیں اور مرچیں لے کر آ گئیں۔ میری نظر اُتاری اور آرام کرنے کی تلقین کر کے کمرے سے چلی گئیں۔ ماں کی ممتا یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کی بیٹی کو نظر لگ گئی ہے۔

شام تک تو میری حالت ہی غیر ہو گئی۔ ابا آئے تو مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا، وہ فوراً ٹیکسی لے آئے۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ لڑکی کسی ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ بخار کسی بیماری کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ صدمہ کیا تھا یہ صرف مجھے معلوم تھا۔ میرے علاوہ کون جان سکتا تھا؟ ڈاکٹر نے مجھے نیند کی دوا دے دی۔ میں پورے ایک دن اور ایک رات سوتی رہی، بخار اُتر گیا تھا لیکن آنکھ کھلتے ہی بخار کی پھر وہی کیفیت تھی۔ مختصر یہ کہ کامل پندرہ دن بستر پر پڑی رہی۔ بستر سے اُٹھی تو اتنی نحیف ہو گئی تھی کہ دو قدم چلنا دشوار تھا۔ اماں کو یہ فکر تھی کہ بچی کی کمزوری نہ جانے کب تک دور ہو۔ شادی سر پر کھڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے اب میرا علاج میری غذا کو قرار دیا تھا اور غذا تھی کہ حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔ شرجیل کی بے وفائی تھی کہ بھولنے میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن ارم اور طلعت مجھے دیکھنے آئیں۔ میں نے باتوں باتوں میں شرجیل کے بارے میں پوچھ لیا۔

"وہ اب کراچی میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنا ٹرانسفر سکھر کرا لیا۔ سکھر جانے کو کوئی تیار نہیں ہوتا اس لیے تبادلہ بہت جلد ہو بھی گیا اور وہ چلے گئے۔"

"بیوی بچوں والے آدمی کے لیے فیملی سے دور رہنا مشکل بھی تو ہو جاتا ہے۔ اچھا ہوا انہوں نے ٹرانسفر کرا لیا۔"

''بیوی بچوں والا آدمی! یہ تم کس کے لیے کہہ رہی ہو؟'' وہ دونوں ہنسنے لگیں ''شرجیل بھائی کی شادی کہاں ہوئی ہے۔''

''ان کی شادی تو ہوگئی ہے۔''

''ہم تو ان کے رشتہ دار ہیں۔ ہم سے زیادہ انہیں کون جانتا ہوگا؟ امی ابھی پرسوں ہی تو سکھر سے ہوکر آئی ہیں۔''

ارم اور طلعت کے جانے کے بعد اس خبر نے کچھ ایسا اثر کیا کہ میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگئی۔ طبیعت جیسے ایک دم سے سنبھل گئی۔ وہ شادی شدہ نہیں ہے تو پھر اس نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟ صاف ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ جو شخص خود بھاگنا چاہے اس کا پیچھا کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اسے بھول جاؤں گی جیسے وہ کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ میں اسی وقت اُٹھی اور اماں کے پاس چلی آئی۔

''اماں، فرقان کی طرف سے کوئی خیر خبر آئی؟''

اماں نے میری طرف چونک کر دیکھا۔ فرقان کا نام لے کر میں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ کتنے دنوں بعد یہ نام وہ میری زبان سے سن رہی ہوں گی۔

''ابھی پرسوں تو فرقان کی ماں کا خط آیا ہے۔ تجھے بتانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ وہ لوگ کراچی آرہے ہیں۔ شادی کی تاریخ بھی طے کریں گے اور شاید شادی کے لیے شاپنگ وغیرہ بھی کریں۔ تو اب بیماری کا ڈھکوسلا چھوڑ اور اُٹھ کر کھڑی ہوجا۔''

''میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں اماں!''

''اللہ تجھے ٹھیک رکھے۔''

وہ کراچی آیا اور اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھہر گیا۔ اس کے والدین اور بہنیں آئیں اور شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ اس سے اگلے دن فرقان بھی آیا۔ اسے ابا اور بھائی کے ساتھ بری کے سامان کی خریداری کے لیے جانا تھا۔ میں اس کے سامنے تو نہیں آسکتی تھی لیکن پردے سے لگ کر اسے دیکھا۔ کئی مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی کیونکہ فرقان سے ہماری دور کی رشتے داری بھی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں شرجیل اور اس کا موازنہ کیا۔ اگر بے وفائی کا داغ نہ لگا ہوتا تو وہ مجھے کبھی اچھا نہ لگتا لیکن اس وقت دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ جو شخص مجھے چھوڑ کر چلا گیا اس سے بہتر کیسے ہوسکتا ہے جو مجھے مانگنے آیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کلرک ہے لیکن ترقی بھی تو ہوسکتی ہے۔

میں جو شرجیل سے ملنے کے بعد منگنی توڑنے پر آمادہ ہوگئی تھی، انکار نہ کرسکی۔ مجھے شرجیل کی بے وفائی سے زیادہ اس کی بزدلی پر غصہ آرہا تھا۔

ایک مہینے بعد کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ یہ ایک مہینا تیاریوں ہی میں گزر گیا۔ میں اکلوتی بیٹی تھی، ابا اور بھائی نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ مجھے شرجیل کا خیال تک نہیں آرہا تھا۔ میں آج سوچتی ہوں تو مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔

میری شادی کراچی ہی میں ہوئی۔ فرقان جس گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں بیاہ کر اسی گھر میں گئی اور پھر ایک ہفتہ گزارنے کے بعد فرقان مجھے لے کر لاہور چلے گئے۔

فرقان کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے بعد مجھے اپنے والدین کے انتخاب پر فخر ہونے لگا۔ فرقان نہایت اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ نہایت خیال رکھنے والے بھی تھے اور فراخ دل بھی تھے۔ ان کی تنخواہ کم تھی لیکن گھر کے مالی حالات اچھے تھے اس لیے مجھے کبھی تنگی کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نہایت شوخ اور فقرہ باز تھے۔ مجھے ان کی اس خوبی کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ وہ جب بھی ہمارے گھر آتے تھے، خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ شاید وہ سسرال کا پاس کرکے خاموش رہتے ہوں گے۔ گھر میں بھی وہ چپ ہی رہتے تھے لیکن تنہائی میں خوب کھلتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے، میرے لیے ہے۔

اگر فرقان موزوں شوہر نہ ہوتے تو شاید شرجیل کی یاد مجھے پریشان کرتی۔ اب معاملہ دوسرا تھا۔ شرجیل بالکل ہی میرے ذہن سے اُتر گیا بلکہ میں شکر بھیجتی تھی کہ میں بال بال بچ گئی۔ کیا خبر شرجیل کب مجھے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اب اگر شرجیل کبھی یاد بھی آتا تھا تو ایک دھوکے باز کی حیثیت سے۔

قدرت نے ایک اور انتظام بھی کردیا۔ ایک سال بعد میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کے ایک سال بعد خدا نے ایک بیٹی بھی دے دی۔

دونوں بچوں کا رزق بھی اللہ نے ساتھ ہی اُتارا۔ ان کی ترقی ہوگئی۔ مالی حالات پہلے بھی کون سے خراب تھے لیکن ترقی کی اپنی خوشی ہوتی ہے اور اس وقت تو مجھے مزید خوشی ہوئی جب انہوں نے اس ترقی کا سبب مجھے قرار دیا۔

''کہتے ہیں رزق عورت کی قسمت سے ملتا ہے۔ تم نہ آئی ہوتیں تو ابھی تک کلرک ہی پڑا ہوتا۔''

''اس خوشی کے موقعے پر ایک بات کہوں؟'' میں نے

کہا۔

''حکم کیجیے۔''

''میں جب سے بیاہ کر آئی ہوں، اپنے میکے نہیں گئی۔''

''کل کی بکنگ کرادوں، پرسوں کی؟''

''کیا آپ نہیں جائیں گے؟''

''بھئی، نئی نئی پروموشن ہوئی ہے۔ چھٹی کرنا مناسب نہ ہوگا۔ تم خود ہی جاؤ گی خود ہی آنا ہوگا۔ یہ میری مجبوری ہے اور کوئی بات نہیں۔''

میں ان کی مجبوری کو سمجھتی تھی۔ میں بچوں کو لے کر کراچی آگئی۔

تین سال بعد آئی تھی۔ پورا محلّہ مجھے دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ ارم اور طلعت بھی آئیں۔ باتوں باتوں میں نہ جانے کیسے شرجیل کا تذکرہ آیا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھ لیا۔

''کیا حال ہے ان کا؟''

''ان ہی کے بارے میں تو بتانے والی تھی۔ انہوں نے تو پورے خاندان کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔ سنا ہے کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگئے تھے۔ اس کی شادی کہیں اور ہوگئی اور وہ مجنوں بن گئے۔ شادی کرنے کا نام نہیں لیتے۔ نوکری اب بھی کررہے ہیں لیکن اس طرح کہ ترقی تو کیا خاک کرتے اور تنزلی ہوگئی۔ ایس آئی سے اے ایس آئی بنادیے گئے۔''

''انہوں نے تو اپنا ٹرانسفر سکھر کرالیا تھا۔''

''اب پھر کراچی آگئے ہیں۔ سنا ہے پولیس لائن میں رہتے ہیں۔ ہم سے تو میل جول ختم ہی ہوگیا ہے۔ کیسا آدمی تھا اور کس حال کو پہنچ گیا۔''

ارم اور طلعت مجھے اُلجھن میں چھوڑ گئی تھیں۔ جس لڑکی کا وہ ذکر کررہی تھیں وہ یقیناً میں تھی۔ جب انہیں اپنا یہی حال بنانا تھا اور مجھ سے واقعی محبت تھی تو شادی سے انکار کیوں کردیا تھا؟ انہوں نے جھوٹ کیوں بولا کہ وہ شادی شدہ ہیں؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے وہ لڑکی میں نہیں کوئی اور ہو۔ اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو۔ پھر میں نے اس موضوع پر زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

چند روز کراچی میں گزارنے کے بعد میں لاہور آگئی۔

بچوں میں اور گھرداری میں ایسی مصروف ہوئی کہ پچھلے خیالوں کی طرح یہ یاد بھی ذہن سے نکل گئی۔ سال پر سال گزرتے گئے۔ مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ میں کراچی میں کسی مجنوں کا تذکرہ سن کر آئی تھی۔

ہماری شادی کو دس سال گزر گئے تھے کہ فرقان کو منیجر شپ کی آفر ہوئی لیکن شرط یہ تھی کہ انہیں کراچی جانا ہوگا۔ وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن مجھے یہ خوشی تھی کہ میکا قریب ہوجائے گا۔ یہ خوشی بھی تھی کہ فرقان منیجر بنائے جارہے ہیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس پیش کش کو نہ ٹھکرائیں۔ کراچی چلے جائیں۔ ایک مرتبہ منیجر تو بن جائیں بعد میں لاہور ٹرانسفر کرالیجیے گا۔ یہ بات فرقان کی سمجھ میں آگئی۔ وہ مجھے اور بچوں کو لے کر کراچی آگئے۔ ہم نے ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

اس مکان میں آئے ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے کہ وہ بینک سے آئے تو ایک شادی کارڈ ان کے ہاتھ میں تھا۔

''میرے بینک کے ایک اہم کسٹمر کے بیٹے کی شادی ہے، تمہیں بھی چلنا ہے۔''

''ظاہر ہے، آپ کی بیگم کی حیثیت سے میں ہی جاؤں گی، کوئی اور تو نہیں جائے گی۔''

''اس خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔ آپ کا نام زبردستی لکھوایا ہے۔ کوئی بلا نہیں رہا تھا آپ کو۔ جب میں نے ان سے وعدہ کیا کہ ہالیڈے اِن میں تقریب ہے، ٹیپ ٹاپ سے آئیں گی تب جاکر وہ تیار ہوئے۔''

یہ کراچی آنے کے بعد پہلی تقریب تھی جس میں، میں اور فرقان ایک ساتھ شریک ہورہے تھے۔

میں اس محفل میں اجنبی تھی لیکن ایک خاتون جان پہچان کی نکل آئی تھیں۔ میں ان کے ساتھ گپ شپ میں مشغول ہوگئی۔ فرقان مجھے ان کے پاس چھوڑ کر اپنے دوستوں میں شامل ہوگئے۔ کچھ دیر بعد اچانک میری نظر پڑی وہ ایک شخص سے بغل گیر ہورہے تھے۔ یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے دو بچھڑے ہوئے دوست بڑے عرصے بعد مل رہے ہوں۔ ذرا جو غور کیا تو میں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ دوسرا شخص کوئی اور نہیں شرجیل تھا۔ وہ بہت بدل گیا تھا لیکن میں اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ اب میں یہ ڈر رہی تھی کہ فرقان ضرور میرے پاس لے کر آئیں گے۔ میرا جی چاہا کہ بھیڑ میں کسی طرف گم ہوجاؤں۔ میں اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے ہی والی تھی کہ فرقان اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے

میرے پاس لے آئے۔ شرجیل غالباً آنا نہیں چاہتا تھا۔

''ان سے ملو یہ ہیں میری مسز!'' پھر اس نے کہا ''شرجیل انہیں تم جانتے تو ہوگے۔ تم بھی تو اسی محلّے میں رہ چکے ہو جہاں میری سسرال ہے۔''

''یار، ہم پولیس والوں کو گھر میں رہنا نصیب کہاں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے انہیں دیکھا بھی ہو لیکن اب عرصہ گزر گیا، کچھ یاد نہیں آتا کہ کہیں دیکھا ہے۔''

میں نے اسے شرمندہ کرنے کے لیے کہا ''میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ ارم اور طلعت کے مکان میں رہتے تھے۔''

''آپ کو شادی مبارک ہو۔'' اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

شرجیل بیٹھتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ میں کوئی اور بات نکال دوں۔ وہ کسی بہانے سے اُٹھ کر چلا گیا۔

ہم گھر واپس آئے تو فرقان بڑی دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے۔

''یہ لاہور میں میرا کلاس فیلو تھا۔ پھر اس کے گھر والے سکھر شفٹ ہوگئے۔ برسوں بعد مجھے کراچی میں مل گیا۔ معلوم ہوا موصوف کسی سے محبت کرنے لگے ہیں اور عنقریب شادی بھی کرلیں گے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی اپنی منگنی کا حال بتادیا۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا کہ میری منگیتر یعنی تم اسی محلّے میں رہتی ہے جہاں وہ ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے تمہارے والد کا نام بتایا تو پہچان بھی گیا۔ پھر میں لاہور واپس آ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی شادی ہوگئی اور اس لڑکی کے سوگ میں اس نے آج تک شادی نہیں کی۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ محبت کسی اور سے کرتی ہیں اور شادی کہیں اور کرلیتی ہیں۔''

''یہ معلوم ہوا کہ وہ لڑکی کون تھی؟''

''مجھے معلوم ہے، بہت خوددار ہے۔ اس لڑکی کا نام کبھی نہیں بتائے گا۔''

مجھے اطمینان ہوگیا کہ شرجیل نے کسی کو میرا نام نہیں بتایا ہے۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ فرقان کی منگیتر میں ہوں تو اس نے اپنے دوست (فرقان) کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور طے کرلیا کہ میری شادی فرقان ہی سے ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے بدظن کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے خود کو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ظاہر کیا۔ اس کا مقصد پورا ہوگیا اور میری شادی فرقان سے ہوگئی۔

اس کا یہ عمل ایک بڑا رسک تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ میں دلبرداشتہ ہوکر خودکشی کرلیتی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ فرقان اچھا شوہر ثابت نہ ہوتا اور میری زندگی تباہ ہوجاتی۔

اس نے اپنے دوست کی خاطر اپنی محبت کو قربان کردیا۔ اپنی شادی کے بعد پہلی مرتبہ مجھے افسوس ہوا تھا۔ اس افسوس کے جواب میں مجھے صرف ایک بات اس سے معلوم کرنی تھی۔ اس کے لیے میں چاہتی تھی کہ وہ یہاں آجائے یا میں اس کے گھر جاؤں۔ فرقان سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ مجھے شرجیل کے گھر لے چلو لیکن میں اسے یاد دلانے کے لیے کبھی کبھی شرجیل کے بارے میں پوچھ ہی لیا کرتی تھی۔

''کیا حال ہے تمہارے اس مجنوں دوست کا؟''

فرقان کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا ''اس دن کے بعد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

میں کہتی تھی تم لوگ عجیب دوست ہو۔ میرے یہ تقاضے آخر کام آئے۔ ایک دن فرقان نے مجھ سے کہا ''تیار ہوجاؤ، آج شرجیل کی طرف چلتے ہیں۔''

ہم وہاں پہنچے تو اس کا گھر اکیلے پن کا دلخراش منظر پیش کررہا تھا۔

میں نے موقع دیکھ کر شرجیل سے کہا ''تمہاری بیوی نظر نہیں آرہی اور نہ دو بچے۔''

''مجھے اور شرمندہ مت کرو۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔''

پھر اس نے مجھے وہ کہانی سنائی جو فرقان پہلے ہی سنا چکے تھے۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ شادی کرلے لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تم سے شادی نہیں ہوئی تو عمر بھر شادی نہیں کروں گا۔ میں نے تم سے کیا ہوا ہر وعدہ توڑ دیا۔ کیا اس وعدے سے بھی مکر جاؤں۔ یہ وعدہ ہی تو ہے جو تمہاری یاد کو میرے دل میں آباد رکھے ہوئے ہے، کیا تمہیں بالکل ہی فراموش کردوں؟''

فرقان اب بھی اس سے ملتے رہتے ہیں۔ اس نے اب بھی شادی نہیں کی ہے۔ کیا آج کے دور میں بھی ایسی محبت کرنے والے ہوتے ہیں؟

سفید پوش

قابلِ صد احترام، معراج رسول صاحب

سلامِ تہنیت!

عرصے بعد میں ایک تحریر کے ساتھ حاضر ہوا ہوں گو کہ یہ تحریر بہت مختصر ہے مگر اپنے اندر ایک جہان رکھتی ہے۔ جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اسے لکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے اگر طویل کرتا یا دیگر واقعات کو بھی شامل کرتا تو تحریر کا حسن مجروح ہوجاتا۔

اخترشہاب

(کراچی)

حادثات اور انسان لازم و ملزوم ہیں۔ گر حادثات نہ ہوں تو زندگی کا لطف بھی جاتا رہے مگر کچھ حادثات و واقعات انسانی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جنہیں بھلانا بھی چاہو تو بھلا نہ سکو۔ ایسی اثر پذیری کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعہ بڑا ہو۔ بعض چھوٹے واقعات و حادثات بھی تادیر اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ دل میں خلش بن کر تاعمر بے چین رکھتے ہیں۔ اب اسی واقعے کو لے لیں، گو کہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر مجھے اب بھی ستاتا ہے، رلاتا ہے، بے چین کیے

رکھتا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ میں بے خبر سو رہا تھا۔ دن بھر کی تھکن، دفتر کی چخ چخ ذہن کو بوجھل کر دیتی ہے اور اس سے نجات کے لیے نیند ضروری ہے سو میں وقت سے کچھ پہلے ہی سو گیا تھا۔ بیگم اس بات سے بہ خوبی واقف تھیں کہ نیند سے جگانا قیامت لانے کے مترادف ہے۔ اسے دو چار طعنوں کے نشتر سے گھائل ضرور ہونا پڑے گا اس لیے کبھی بھی ایسی جسارت نہیں کرتی تھی مگر اس روز حد ہو گئی، ابھی سویا ہی تھا کہ اس نے جگا دیا۔ وہ بھی جھنجوڑ کر۔ میں گھبرا کر اُٹھا تھا۔ ابھی دو چار صلواتیں سناتا کہ اس کے چہرے کی گھبراہٹ نے لگام لگا دی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور زبان میں بھی لغزش تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں صرف اتنا کہا ''وہ......وہ......ابو......''

''کیا ہوا ابو کو؟'' نیند میری کافور ہو گئی اور میں گھبراہٹ میں تقریباً چھلانگ مار کر بستر سے اُترا اور سلیپر میں پیر ڈالتے ہوئے ابو کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہاں گھر کے تمام افراد جمع تھے۔ چھوٹا بھائی،، اس کی بیوی، باجی اور ان کے بچے۔ تقریباً سبھی جمع ہو چکے تھے اور سب ابو کے بستر کو گھیرے کھڑے تھے۔

''کیا......کیا ہوا......؟'' کمرے میں پہنچتے ہی میں نے سوال کیا۔

''ابو بے ہوش ہو گئے ہیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے انجائنا پین ہے۔ میں نے ایمبولینس کے لیے فون کر دیا ہے۔'' چھوٹے بھائی نے بتایا۔ ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے ایمبولینس کی آواز سنائی دی۔ میں اسٹریچر لینے باہر لپکا۔ ایمبولینس والا اسٹریچر نکال ہی رہا تھا کہ میں نے اسٹریچر تھام لیا اور جلدی جلدی اندر بھاگا۔ ابو کو اسٹریچر پر لٹایا پھر اُٹھا کر باہر لے آیا۔ ایمبولینس میں چھوٹا بھائی بھی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ پریشانی کے عالم میں ہم اسپتال کی طرف بھاگے۔ ایمبولینس اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہوٹر بجاتی ایمبولینس کو لوگ راستہ بھی دے رہے تھے پھر بھی اس کی رفتار مجھے سست لگ رہی تھی، یہی سڑکیں جن پر رواں دواں ٹریفک ہمیشہ مجھے اٹریکٹ کرتا تھا۔ میں فخریہ کہا کرتا تھا کہ ہمارا شہر ہمہ وقت جاگتا رہتا ہے۔ ٹریفک رواں رہتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر بھی سڑکوں پر گاڑیاں ٹل جائیں گی، مگر آج یہی ٹریفک مجھے عذاب لگ رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔ خدا خدا کر کے درمیانی فاصلے سمٹے اور ہم اسپتال پہنچے۔ ایمرجنسی میں گیٹ سے وارڈ تک، پیرامیڈیکل اسٹاف، عیادت کرنے والے اور مریضوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، پورا شہر بیماری کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ ہر کوئی پریشان، ہراساں، بھاگتا ہوا۔ اس دوڑ میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ اسٹریچر کھینچ کر لایا، ابو کو لٹایا، بھائی نے اسٹریچر تھام لیا اور دھکیلتے ہوئے آگے بڑھا۔ میں ایمبولینس فیس دینے کو رک گیا تھا۔ روپے دے کر پلٹا ہی تھا کہ ایک بڑے میاں کو تیورا کر گرتے دیکھا۔ انہوں نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں گرتے دیکھ کر کئی آدمی دوڑے۔ میں خود بھی اُٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔ جلدی سے ایک بندہ اسٹریچر لے آیا۔ اس پر انہیں لٹایا گیا اور پیرامیڈیکل اسٹاف اسٹریچر دھکیلتا ہوا ایمرجنسی کی جانب لپکا۔ میں بھی ان کے ساتھ بڑھا۔ ابو کو اُدھر ہی لے جایا گیا اسی لیے مجھے بھی اُدھر ہی جانا تھا۔

ایمرجنسی میں پہنچ کر دیکھا، ابو کو ڈاکٹرز گھیرے کھڑے تھے۔ طبی امداد دی جا رہی تھی۔ ایک جانب میں کھڑا ہو گیا۔ نظریں شیشے کے پار ابو کی جانب ٹکی ہوئی تھیں۔ تبھی ایک اسٹاف ممبر ہاتھ میں پرچی لیے ہوئے نکلا۔ اس نے ابو کا نام پکارا تھا۔ پکار سنتے ہی میں آگے بڑھا۔

''یہ دوائیں لا دیں۔'' اس نے پرچی تھما کر کہا۔

میں پرچی لے کر میڈیکل اسٹور کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر اُن بڑے صاحب کی طرف اُٹھ گئی جو کچھ دیر پہلے بے ہوش ہو کر گرے تھے۔ میں نے ایک میل نرس سے پوچھا ''انہیں ہوا کیا ہے؟''

''شوگر اور بی پی چیک کیا ہے، دونوں ڈاؤن ہیں۔ ایڈ دے رہے ہیں۔''

وقت کم تھا، مجھے دوا بھی لینی تھی اس لیے میں اسے چھوڑ کر میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ دوائیں لیں اور واپس ہوا۔ بڑے صاحب کا سی پی، بی پی ٹیسٹ ہو چکا تھا اور وہ لمبے لمبے لیٹے تھے مگر ہوش میں اب تک نہیں آئے تھے۔ ان کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ تنفس کی رفتار کا اندازہ سینے کے اوپر نیچے ہونے سے بہ خوبی ہو رہا تھا۔ ان پر نظریں ڈالتا ہوا میں ابو والے کمرے کی طرف آ گیا۔ اسٹاف رکن کے ہاتھ میں دوائیں دیں۔ فی زمانہ ادویات کی قیمت تو آسمان کو چھو ہی رہی ہے، اسپتال کے دیگر اخراجات بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے اونچی اُڑانیں بھر رہے تھے۔ کل ملا کر یہ بات سچ ثابت ہو رہی ہے کہ آج موت آسان اور علاج مشکل ہے۔ مریض صحت یاب ہو کر بل دیکھتا ہے تو پھر سے بیمار پڑ جاتا

جلیبی کو عربی میں زلابیہ کہتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلابیہ ہی سے بگڑ کے جلیبی لفظ بنا ہے۔ اس لیے یہ بھی انہیں عربی وفارسی مٹھائیوں میں شامل کرنے کے قابل ہے۔ پیڑا خالص ہندی مٹھائی ہے اور امرتی بھی ہندی ہے مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ میں ایجاد ہوئی۔
اقتباس: دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

مشہور ادیب احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ماچس چُرانے والوں کی ایک انجمن قائم کی تھی جس کے وہ صدر بھی تھے۔
اقتباس: پطرس نامہ
مرسلہ: علی شاہ، گلگت

ہے اور یہ بیماری ہارٹ اٹیک ہوتی ہے۔ گویا گئے نماز بخشوانے، گلے پڑگئے روزے پھر ڈاکٹرز کے شگوفے الگ، جس کا ذکر اخبارات میں بھی نظر آتا ہے۔ کبھی ڈاکٹرز آپریشن کے بعد پیٹ میں قینچی بھول جاتے ہیں تو کبھی گلوز اور کبھی معدے کے درد والے کی کڈنی کا علاج شروع کر دیتے ہیں۔ سال چھ مہینے بعد انکشاف ہوتا ہے کہ مرض تو کچھ اور تھا تب تک غلط تشخیص کے باعث ایک تیسرا مرض ظاہر ہو چکا ہوتا ہے۔ ہمارے اسپتالوں میں ایسے کھیل زور وشور سے جاری ہیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ علاج کے لیے انہی پر انحصار کرتے ہیں۔ انہی ڈاکٹرز سے رجوع کرتے ہیں۔

میں آئی سی یو کے باہر کھڑا ایسی کچھ سوچ رہا تھا۔ اندر ابو کی ٹریٹمنٹ جاری تھی۔ کسی بھی وقت کوئی نئی پرچی اندر سے آ سکتی تھی اس لیے میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ بس وقت گزاری کے لیے کبھی سامنے بچھی کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ جاتا اور کبھی کھڑا ہو جاتا۔ بیٹھتے وقت میری نظر اس جانب اُٹھ گئی جہاں بڑے صاحب کو میڈیکل ایڈ دی جا رہی تھی۔ بستر کے گرد کھنچے پردے آدھے سے زیادہ ہٹے ہوئے تھے گویا وہ آدھے چھپے آدھے نظر آ رہے تھے۔ یہاں چھوٹا بھائی تھا، ضرورت پڑنے پر آواز دے سکتا ہے، یہ سوچ کر میں بڑے صاحب کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا۔ بڑے میاں اسی طرح بے ہوشی کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے قریب کھڑے میل نرس سے پوچھا۔

”بھائی میاں، تشخیص ہوا...... انہیں مرض کیا ہے؟“

”اجی جناب، یہی تو پتا نہیں چل رہا ہے۔ شوگر اور بی پی ڈاؤن تھا۔ انجکشن لگا، انہیں ہوش آیا۔ ڈاکٹر کو آنے میں دیر ہوئی تو پھر سے غنودگی چھا گئی۔ دیگر ٹیسٹ کے لیے تیاری ہو رہی ہے، لگتا ہے کوئی گمبھیر مسئلہ ہے۔“

”کوئی اٹینڈنٹ بھی نظر نہیں آ رہا؟“ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس جناب! کچھ لوگ انہیں لے کر آئے تھے۔ عوامی مسئلہ ہے اس لیے ہم توجہ دینے پر مجبور ہیں۔“ میل نرس نے کہا اور اسے ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں اس کی دوائیں وغیرہ کہاں سے آئیں گی۔ یہ اسپتال والے سستی دوائیں تو دے دیں گے مگر مہنگی دوائیں کب دینے والے ہیں...... بے چارہ دوائی نہ ملنے کی وجہ سے مر جائے گا۔“

میری جیب میں اچھی خاصی رقم تھی۔ جو میں اس لیے ساتھ لے آیا تھا کہ ابا کے لیے ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ابو کو دعاؤں کی اشد ضرورت تھی۔ انسان زبان سے دعا نہ بھی دے، پھر بھی ہر مسام دعا دیتا ہے۔ اسی لیے تو حکم ہے کہ غریبوں، محتاجوں کی دعائیں لو۔ کب کس کی دعا کام آ جائے۔

میں نے میل نرس سے پوچھا ”ان کی دوائیں وغیرہ آ گئیں؟“

”پہلے ہوش تو آ جائے۔“ اس نے جواب دے کر ڈرپ میں ایک اور انجکشن منتقل کیا۔ ”اس کے بعد ہی دیگر ٹیسٹ ہوں گے۔“

تبھی میری نظر اس پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ بڑے صاحب نے آنکھیں کھولی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا ”انکل، اب کیسی طبیعت ہے؟“

”اب بھوک نہیں لگ رہی ہے۔“ انہوں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

میں ان کے اور قریب ہو گیا۔ ان کے مہمل جملے کی تشریح چاہی۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

ان کا جواب سن کر میں ہل گیا ”بیٹا، تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔“

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں آپ کے اس پرچے کا گرویدہ ہوں، اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر پڑھتا ہوں۔ علم ودانش اور سچائی ایک ساتھ شاید اردو میں سرگزشت ہی پیش کرتا ہے اسی لیے مجھے پسند ہے۔ کافی عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اپنی آپ بیتی بھیجوں، بالآخر لکھ ہی لی اور بھیج بھی رہا ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ کیا یہ شائع ہوسکتی ہے؟
ڈاکٹر احمر صدیقی
(کراچی)

میں ایم بی بی ایس کا امتحان دے کر فارغ ہی ہوا تھا کہ چچا جان کے یہاں سے شادی کا تقاضا شروع ہو گیا۔ زینی میری چچازاد تھی اور چند ماہ پہلے ہی اس سے میری منگنی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ شادی اسی وقت ہوتی جب میں ہاؤس جاب مکمل کر کے کوئی ملازمت شروع کر دیتا۔ ویسے تو گھر میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ ابا جان کا اچھا خاصا وسیع کاروبار تھا۔ ذاتی گھر، گاڑی، نوکر چاکر، انہوں نے ہمیں زندگی کی ہر آسائش مہیا کر رکھی تھی۔ وہ خود تو صبح سے شام تک اپنے کام

میں مصروف رہتے اور گھر آنے کے بعد بھی اپنا حساب کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ اس لیے گھر چلانے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کی ساری ذمے داری والدہ نے اُٹھا رکھی تھی اور وہ اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی سے نبھاہ رہی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن شاز یہ تھی جو اُن دنوں انٹر میں پڑھ رہی تھی۔ ابا جان گھر کے معاملات میں بہت کم دخل دیا کرتے تھے اور انہوں نے امی کو تمام سیاہ وسفید کا مالک بنا رکھا تھا لیکن وہ بالکل بھی لاتعلق نہیں تھے۔ کم از کم بچوں کی پڑھائی کے سلسلے میں ان کا رویہ بے حد جارحانہ تھا اور وہ اس بارے میں کوئی سمجھوتا کرنے پر تیار نہ تھے۔ امتحان سے دو مہینے پہلے ہمارے گھر میں کرفیو لگ جاتا اور ہمیں اسکول کالج کے علاوہ کہیں آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ امتحان کے دنوں میں ہماری خالہ کی شادی طے پا گئی۔ ابا جان چاہ رہے تھے کہ یہ شادی چند دنوں کے لیے ملتوی کر دی جائے کیونکہ صرف ہم دونوں بہن بھائی ہی نہیں بلکہ خاندان کے اور بھی کئی بچے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے لیکن لڑکے والوں کی کسی مجبوری کے سبب ایسا ممکن نہ ہو سکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنی سگی خالہ کی مہندی، مایوں، ڈھولکی اور دیگر تقریبات میں شرکت نہ کر سکا۔ صرف رخصتی اور ولیمہ میں ابا جان مجھے دو گھنٹے کے لیے لے گئے تھے۔ اس پر انہیں خاندان والوں کی باتیں بھی سننا پڑیں۔ خاص طور پر میری نانی اور ماموں تو بہت برہم تھے لیکن ابا نے ان کی کسی بات کی پروا نہیں کی اور مجھے پیار سے سمجھا دیا کہ مہندی، مایوں تو میرے بغیر بھی ہو جائے گا لیکن یہ وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے بھلے ہی کے لیے یہ سب کہہ رہے تھے۔ اس لیے مجھے ان تقریبات میں شرکت نہ کرنے پر کوئی ملال نہ ہوا۔

ابا جان کی اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ ہم دونوں بہن بھائی شروع سے ہی ہر امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے رہے اور مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے پانچ سال دل لگا کر محنت کی اور اب میرا ارادہ تھا کہ امریکا جا کر اسپیشلائزیشن کروں کیونکہ صرف ایم بی بی ایس کرنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ ابا جان بھی اس خیال سے متفق تھے اور انہوں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر میں نے امریکا جانے کے لیے مطلوبہ امتحان پاس کر لیا تو وہ میری تعلیم کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ امتحان کا نتیجہ آنے اور ہاؤس جاب شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس لیے میں نے امریکا جانے کے لیے مطلوبہ امتحان دینے کی تیاری شروع کر دی۔ میں صبح ناشتا کرنے کے بعد کالج کی لائبریری میں چلا جاتا اور وہاں بیٹھ کر اپنے نوٹس تیار کرتا۔ کچھ کتابیں میں نے اپنے طور پر جمع کر لی تھیں۔ ان کی مدد سے رات کو بھی میں گھر میں بیٹھ کر اسٹڈی کرتا رہتا۔ میری تربیت کچھ اس انداز میں ہوئی تھی کہ مجھے گھر سے باہر جانے، دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے یا تفریح کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ کوئی کھیل بھی نہیں کھیلتا تھا۔ اس لیے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد بھی سارا وقت گھر یا لائبریری میں ہی گزر جاتا۔ البتہ چچا جان کے یہاں دوسرے تیسرے روز ضرور جایا کرتا تھا اور اس کی وجہ زینی تھی جسے بچپن سے ہی مجھ سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

دراصل چچا جان پہلے ہمارے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ ان کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی تھی۔ جب تک دادی زندہ رہیں، سب کچھ ٹھیک چلتا رہا لیکن ان کے انتقال کے چند روز بعد ہی چچا جان اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے گھر میں منتقل ہو گئے۔ امی بتاتی ہیں کہ چچی جان کو شروع سے ہی الگ گھر میں رہنے کی خواہش تھی اور اس کا اظہار وہ کئی مرتبہ امی کے سامنے دبے الفاظ میں کر چکی تھیں لیکن دادی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ دادی اپنے بیٹوں کو اکٹھا دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس رشتے کو مستحکم بنانے کے لیے زینی کی پیدائش پر ہی اسے مجھ سے منسوب کر دیا اور جیسے ہی چچی، زینی کو لے کر اسپتال سے گھر آئیں تو دادی نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ یہ گڑیا میری ہے اور اسے میں اپنے احمر کو دوں گی۔ امی بتاتی ہیں کہ چچی جان نے اس فیصلہ پر بھی ناک بھوں چڑھائی۔ دادی کے سامنے تو کچھ نہ بولیں لیکن امی سے اُلجھ گئیں اور بولیں کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں بچوں کے رشتے کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ زمانہ بہت آگے چلا گیا ہے۔ ان کی بیٹی کوئی بھیڑ بکری نہیں کہ اسے جس کھونٹے سے چاہے باندھ دیا جائے۔ زینی کی شادی وہیں ہوگی، جہاں وہ چاہے گی۔ امی ہمیشہ سے ہی صلح جو واقع ہوئی تھیں، لڑنا جھگڑنا اور بحث وتکرار کرنا ان کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ انہوں نے چچی کو یقین دلایا کہ بچوں کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔

زینی کی پیدائش کے وقت میری عمر پانچ برس ہوگی۔ اس وقت کی بہت سی باتیں مجھے یاد نہیں لیکن دادی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ”یہ گڑیا میں احمر کو دوں گی“ میرے

ذہن سے چپک کر رہ گئے اور میں اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگا جس طرح کوئی بچہ اپنے کھلونوں سے پیار کرتا ہے اسی طرح میں بھی زینی پر فریفتہ ہونے لگا۔ میرا زیادہ وقت چچی جان کے کمرے میں گزرتا۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا، سو جاتی تو اس کے سرہانے بیٹھ کر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ اس نے بھی بچپن سے مجھے ہی اپنی نظروں کے سامنے دیکھا لہٰذا اس کے ذہن میں میری تصویر نقش ہو کر رہ گئی۔

چچی کو یہ سب پسند نہیں تھا اور وہ زینی کو مجھ سے دور رکھنا چاہتی تھیں لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر ایک دن میرا والہانہ پن دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا اور وہ امی سے کہنے لگیں ”اگر زینی اور احمر کی شادی ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ یہ بہت اچھا شوہر ثابت ہوگا۔“ خدا جانے انہوں نے یہ بات طنزاً کہی تھی یا واقعی وہ سنجیدہ تھیں لیکن میں نے ان کے الفاظ پر یقین کر لیا اور میرا سینہ خوشی وفخر سے چوڑا ہو گیا۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زینی میری ہے اور ہمیشہ میری ہی رہے گی اور اس کے بعد سے میں زینی پر اپنا زیادہ حق سمجھنے لگا۔

چچا جان نے جب الگ ہونے کا فیصلہ کیا تو میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ مجھے چچی جان اور چچا جان کے جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اب زینی مجھ سے دور ہو جائے گی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے تو وہ چوبیس گھنٹے میری نظروں کے سامنے ہوتی تھی، دوسرے گھر میں جانے کے بعد تو اسے دیکھنے کے لیے بھی آنکھیں ترس جائیں گی۔ اگر میں روزانہ زینی سے ملنے جاتا تو یہ مناسب بات نہ ہوتی۔ اس کے باوجود میرے لیے وہاں گھنٹا دو گھنٹا سے زیادہ بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ جی چاہا کہ چچا جان کے قدموں میں سر رکھ کر ان سے التجا کروں کہ وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا جب انہوں نے ابا جان کی نہیں سنی تو میرے کہنے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

چچا جان مع اہل وعیال اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے اور میرے لیے خزاں کا موسم شروع ہو گیا۔ گو کہ ہمارے گھر سے ان کا مکان کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا اور میں دن میں وہاں کے دس چکر لگا سکتا تھا لیکن یہ بڑی معیوب بات ہوتی۔ میں شاید اپنے دل کے چور کی وجہ سے ایسا سمجھ رہا تھا۔ میری حد سے بڑھی ہوئی آمد ورفت کو کسی اور رنگ میں دیکھا جاتا اور وہ لوگ یہی سمجھتے کہ میں زینی کی وجہ سے وہاں پڑا رہتا ہوں۔

اس کے باوجود میرے لیے زینی سے دور... رہنا ممکن نہیں تھا۔ شروع کے تین چار دن تو گھر کی تزئین وآرائش میں لگ گئے اور میں نے اس کام میں ان کی بھرپور مدد کی۔ اس کے بعد میں نے یہ وتیرہ اختیار کیا کہ اسکول سے واپسی پر تھوڑی دیر کے لیے چچا جان کے یہاں چلا جاتا۔ چچی کا موڈ ٹھیک ہوتا تو وہ کھانے کے لیے روک لیتیں ورنہ پندرہ بیس منٹ زینی سے باتیں کر کے اپنے گھر چلا آتا۔

یہ معمول یونہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اسکول سے نکل کر کالج میں آ گیا۔ اب میری مصروفیات اور دلچسپیاں مختلف تھیں۔ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے لیے انٹر میں اچھا گریڈ لانا ضروری تھا اور اس کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے زینی کے یہاں جانا کم کر دیا۔ کالج سے واپسی پر سیدھا گھر آتا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا پھر جرنل وغیرہ بنانے بیٹھ جاتا۔ یہ میری عادت تھی کہ جو کچھ کالج میں پڑھایا جاتا، اس کے نوٹس گھر آ کر تیار کر لیتا اور رات کو پڑھائی کے دوران انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح میرے پاس چچا جان یا کسی اور کے گھر جانے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ زینی شروع میں تو بہت جز بز ہوئی اور اس نے مجھ سے اچھا خاصا جھگڑا کیا لیکن جب میں نے اسے اپنا شیڈول بتایا تو اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ تاہم اس نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ ایک یا دو دن چھوڑ کر اس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی اور میں نے انٹر کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس طرح مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ابا جان میری اس کامیابی پر بے حد خوش تھے اور ہر ایک سے فخریہ کہا کرتے کہ بیٹے نے میری لاج رکھ لی ورنہ مجھ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ اسے پرائیویٹ میڈیکل کالج میں پڑھاتا۔ چچا جان، چچی اور زینی بھی میری اس کامیابی پر خوش تھے۔ زینی کے تو قدم ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ لگتا تھا کہ جیسے میں نہیں بلکہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس کی خوشی بھی اپنی جگہ بجا تھی۔ میں خاندان کا پہلا لڑکا تھا جو ڈاکٹر بننے جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا جاؤں گا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مجھ سے منسوب ہو چکی ہے لہٰذا اسے اپنا مستقبل خاصا محفوظ نظر آ رہا تھا

سچ پوچھیں تو اس نے ابھی سے اپنے آپ کو میری

شریکِ سفر سمجھنا شروع کر دیا تھا اور پوری طرح مجھ پر قابض ہو چکی تھی۔ اسے میری ایک ایک عادت، طرزِ زندگی، پسند ناپسند اور مزاج کا پتا تھا۔ وہ میرے کالج اور محلّے کے دوستوں کے بارے میں ایک ایک بات جانتی تھی۔ میڈیکل کالج میں مخلوط تعلیم تھی اور میرے کلاس فیلوز میں کئی لڑکیاں شامل تھیں جن سے میرا پڑھائی کے دوران واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے ان کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کرتی۔ اس طرح اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ان میں سے کس لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے، کس کا افیئر چل رہا ہے اور ان میں سے کون میری جانب ملتفت ہے۔ میں خود بھی اس سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس سے جھوٹ بولنے یا اسے دھوکا دینے کے بارے میں نہیں سوچا۔ میری پوری زندگی اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند تھی جس کا وہ کوئی بھی ورق جب چاہے پڑھ سکتی تھی۔

یہ ساری تمہید بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین، میرے اور زینی کے تعلق کو بہ آسانی سمجھ سکیں۔ دادی نے یہ گڑیا میرے احمر کی ہے، کہہ کر میرے دل میں اس کی محبت کا جو بیج بویا تھا۔ وہ میرے میڈیکل کے آخری سال تک پہنچتے پہنچتے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہم دونوں کی محبت دیوانگی کی حدوں کو چھو رہی تھی اور ہمارے لیے ایک دوسرے سے دور رہنے کا تصور بھی سوہانِ روح تھا۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس والہانہ محبت کی تپش کو محسوس کر لیا تھا اور کسی جانب سے اس رشتے کی مخالفت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر چچی جان سے تھا لیکن وہ بھی حیرت انگیز طور پر میرے حق میں ہو چکی تھیں۔ شاید انہیں اپنی بیٹی کے والہانہ پن نے سب کچھ سمجھا دیا تھا اور وہ دل و جان سے اس رشتے کے لیے رضامند ہو چکی تھیں۔

اب میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ زینی کو چھوڑ کر ایک لمبے عرصے کے لیے بیرونِ ملک کس طرح چلا جاؤں۔ میں تو اس کے بغیر چوبیس گھنٹے نہیں گزار سکتا تھا۔ فائنل امتحان ختم ہونے کے بعد میں نے یہی مسئلہ زینی کے سامنے رکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی ''اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ دو چار سال میں تمہارا کورس ختم ہو جائے گا۔ پھر تو تمہیں یہیں واپس لوٹ کر آنا ہے۔''

''کتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا، دو چار سال......'' میں چڑتے ہوئے بولا ''یہاں تو یہ عالم ہے کہ ایک دن تمہیں نہ دیکھوں تو دل اُلٹنے لگتا ہے۔''

''اپنے دل کو قابو میں رکھو اور کیریئر کی جانب توجہ دو۔'' وہ ناصحانہ انداز میں بولی ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔''

''تم غلط کہہ رہی ہو، فی الحال مجھے صرف یہی ایک غم ہے۔''

''دیکھو، آدمی کو تھوڑا سا عملی ہونا چاہیے۔'' وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی ''اس وقت تمہاری عمر تیئس سال ہے۔ زیادہ سے زیادہ بتیس سال کی عمر تک تم تعلیم سے فارغ ہو کر شادی کر سکتے ہو۔ پاکستان میں مردوں کی اوسط عمر ساٹھ سال ہے اس طرح تمہارے پاس محبت کرنے کے لیے تیس سال ہوں گے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

''یہ حساب کتاب اپنے پاس رکھو اور اس مسئلے کا کوئی حل سوچو۔''

''اس کے علاوہ تو ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔ جانے سے پہلے مجھ سے نکاح کر لو اور جب وہاں سیٹ ہو جاؤ تو مجھے اپنے پاس بلا لینا۔ میں تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی بلکہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کسی ہوٹل میں برتن دھونا شروع کر دوں گی۔''

اس وقت مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ کتنی عظیم تھی وہ جس نے اپنے گھر میں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا وہ میری قربت کی خاطر دیارِ غیر کے ہوٹلوں میں برتن دھونے پر تیار تھی۔ ویسے مجھے اس کی تجویز قابلِ عمل نظر آئی۔ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا ''کیا ہم دونوں کے گھر والے اس پر رضامند ہو جائیں گے؟''

''انہیں تیار کرنا تمہارا کام ہے۔ میں، امی سے بات کرتی ہوں اور ہو سکا تو انہیں اس پر بھی راضی کر لوں گی کہ وہ تمہارے گھر والوں پر شادی کے لیے دباؤ ڈالیں اور انہیں سمجھائیں کہ اگر لڑکے کو تنہا بھیج دیا گیا تو وہ وہاں جا کر کسی گوری کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔''

''ہاں، یہ خطرہ تو ہے۔'' میں نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا ''اب وہاں صرف گوری ہی نہیں بلکہ سانولی یعنی پاکستانی اور انڈین لڑکیاں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی عمریں اچھے رشتوں کے انتظار میں نکلی جا رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی مجھے پھانس لے۔''

''وہ تم دونوں کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں کسی بھی طرح وہاں پہنچ کر تم دونوں کو جہنم واصل کر دوں گی۔''

''اتنا زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں

نے اسے ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا ''یہ سوچو کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''وہی جو میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں۔ یعنی میں اپنی امی کو تیار کرتی ہوں اور تم تائی جان سے بات کرو۔''

اس نے تو بڑی آسانی سے یہ بات کہہ دی لیکن جانتا تھا کہ امی کے سامنے میرے لیے زبان کھولنا بہت مشکل ہوگا۔ ویسے تو میں ان کا بہت چہیتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک میری ہر خواہش بغیر کہے پوری ہوتی رہی تھی۔ لیکن یہ خواہش ایسی نہ تھی جسے آنکھ بند کر کے پورا کر دیا جاتا۔ میری عمر صرف تیئس سال تھی۔ پڑھائی مکمل نہیں ہوئی تھی اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں شادی کر کے بیوی کو اپنے ساتھ دیارِ غیر لے جانے کی بات کرنا محض دیوانے کا خواب ہی تھی جبکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہاں جا کر گزر اوقات کیسے ہوگی؟ ابا جان میرے تعلیمی اخراجات کس حد تک برداشت کر پائیں گے اور مجھے اپنے طور پر کیا کرنا ہوگا؟ اس حوالے سے یہ نقشہ بالکل غیر واضح تھا اور مجھے اس میں رنگ بھرنے تھے۔ اس لیے میں نے فی الحال شادی کی بات چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی۔

میری خاموشی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ اگلے ہی ہفتے چچی جان نے دھماکا کر دیا۔ وہ ہانپتی کانپتی ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے امی سے مطالبہ کیا کہ باہر جانے سے پہلے میری اور زینی کی شادی کر دی جائے۔ امی یہ مطالبہ سن کر حیران رہ گئیں اور انہوں نے چچی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''شمسہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ ابھی تو احمر نے امتحان دیا ہے۔ نتیجہ بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد ایک سال کا ہاؤس جاب ہوگا۔ اس دوران.... امریکا جانے کے لیے امتحان کی تیاری کرتا رہے گا۔ سنا ہے کہ وہ امتحان بہت مشکل ہوتا ہے اگر اس میں پاس ہو گیا تبھی باہر جانے کی بات ہوگی۔ اس وقت تو وہ اپنا خرچ نہیں اُٹھا سکتا۔ بیوی کو کہاں سے کھلائے گا؟''

''بھابی! میں آج شادی کی بات نہیں کر رہی۔'' چچی تڑخ کر بولیں ''اتنی عقل میرے پاس بھی ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ احمر کے باہر جانے سے پہلے اس کی اور زینی کی شادی ہو جانی چاہیے۔ ورنہ ہماری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔''

چچی کا جارحانہ انداز دیکھ کر امی نے خاموشی اختیار کر لی اور انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا لیکن چچی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس سلسلے کو منطقی انجام تک پہنچا کر رہیں گی۔

امی نے جب یہ خبر ابا جان کو سنائی تو وہ بالکل ہی ہتھے سے اُکھڑ گئے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ احمر کی شادی امریکا سے واپس آنے کے بعد ہوگی۔ اگر انہیں بہت جلدی ہے تو وہ اپنی بیٹی کو کہیں اور بیاہ دیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

بہت ہی عجیب و غریب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ میں اور زینی دونوں ہی پریشان تھے کہ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ دراصل ہمیں چچی جان سے اس جلد بازی کی توقع نہ تھی۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ اسی لیے انہوں نے یہ پتّا پھینکا تھا۔ اصل قصّہ کچھ یوں تھا کہ ان دنوں ان کا ایک بھانجا شکیل دبئی سے آیا ہوا تھا۔ وہ وہاں کسی کمپنی میں سپروائزر تھا لیکن پندرہ بیس سال دبئی میں رہ کر اس نے اچھے خاصے پیسے کما لیے تھے اور چچی کے خاندان والے اس کی امارت سے بے حد مرعوب تھے۔ اسے دیکھ کر چچی کی بھی رال ٹپک پڑی اور انہوں نے سوچا کہ مجھے تو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک طویل سفر طے کرنا ہے جبکہ شکیل کے پاس سب کچھ پہلے سے موجود تھا اور وہ زینی کو تمام آسائشیں فوری طور پر مہیا کر سکتا تھا جو میں شاید دس سال بعد کر پاتا چنانچہ جب زینی نے ان سے نکاح کی بات چھیڑی تو انہیں موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ جانتی تھیں کہ ابا جان کبھی بھی یہ مطالبہ تسلیم نہیں کریں گے اور اس طرح انہیں میرے اور زینی کے رشتے کو ختم کرنے کا ایک معقول بہانہ مل جائے گا۔

میں اور زینی اس چال کو سمجھ گئے تھے اور زینی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور کے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اور اگر یہ رشتہ ختم ہوا تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اُٹھا سکتی ہے مثلاً یہ کہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ سکتی ہے، کورٹ میرج کر سکتی ہے۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہوا تو خودکشی کر لے گی۔ میں اس کی انتہا پسند اور جذباتی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا۔ چچی جان نے بے وقت کی راگنی چھیڑ کر اچھا نہیں کیا تھا لیکن اس میں بھی ان کی غرض پنہاں تھی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنے منصوبہ کو آگے بڑھا رہی تھیں اور ہر دس پندرہ دن بعد اپنا مطالبہ دُہرانے آ جاتیں۔ ایک دن تنگ آ کر امی نے ان سے کہہ دیا کہ اگر انہیں احمر پر بھروسا نہیں تو وہ باہر نہیں جائے گا اور یہیں رہ کر کسی اسپتال میں

ملازمت کر لے گا۔
چچی کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ انہوں نے کہا ''میں نہیں چاہتی کہ زینی کی وجہ سے احمر کا مستقبل تاریک ہو۔ یہاں رہ کر وہ کیا کر لے گا۔ سبھی والدین چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد ان کی بیٹی اچھی زندگی گزارے اور میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں۔''
گویا بلی پوری طرح تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ میں نے زینی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس معاملے میں ہم لوگ بالکل بے بس ہو گئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ چچی جان ہر قیمت پر یہ رشتہ ختم کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس پر زینی نے مجھے یقین دلایا کہ مجھے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ان سے نمٹ لے گی اور اگر کچھ بھی نہیں ہوا تو اس کے پاس خودکشی کا آپشن تو موجود ہے۔
انہی اُلجھنوں میں گرفتار تھا کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ میری محبت، کیریئر اور رشتے ناتے، سب کچھ اس آگ کی نذر ہو گیا اور اب میں ایک زندہ لاش کی مانند اپنی زندگی کے بقیہ دن پورے کر رہا ہوں۔ کاش اس روز مجھ سے وہ لغزش سرزد نہ ہوئی ہوتی۔
وہ موسم برسات کا ایک خوشگوار دن تھا۔ آسمان صبح سے ہی بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں صبح سویرے ورزش اور ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی دیر بعد زینی کی طرف جاؤں گا اور اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے گرم گرم پکوڑوں کے ساتھ موسم کی رنگینی سے بھی لطف اندوز ہوتا رہوں گا۔ میں اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ابا جان کام پر جانے کے لیے اپنے کمرے سے باہر آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خاکی رنگ کا لفافہ تھا۔ انہوں نے وہ لفافہ مجھے دیا اور تاکید کی کہ اسے فوری طور پر وکیل احمد علی کو پہنچا دوں۔ ان کا دفتر ہمارے گھر سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ بائیک سے آنے جانے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگتا۔ میں نے سوچا کہ پہلے وکیل صاحب کو لفافہ پہنچا دوں۔ اس کے بعد زینی کی طرف چلا جاؤں گا۔ میں نے موٹر سائیکل کی چابی اُٹھائی اور امی کو بتا کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔
وکیل احمد علی دفتر میں ہی موجود تھے۔ میں نے لفافہ انہیں تھما دیا اور واپسی کی اجازت چاہی وہ مصر تھے کہ چائے پی کر جاؤں لیکن مجھے زینی کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے معذرت کر کے چلا آیا۔ دفتر سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے سڑکوں پر اچھی خاصی پھسلن تھی۔ میں احتیاط سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچا تو بارش تیز ہو گئی۔ وہاں گلی میں کچھ بچے بارش میں کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک بچہ اچانک میری بائیک کے سامنے آ گیا۔ اگر میں فوراً بریک نہ لگاتا تو وہ بائیک کے نیچے آ جاتا۔ اس طرح بریک لگانے سے توازن برقرار نہ رہ سکا اور میں خود موٹر سائیکل سے نیچے گر پڑا۔ وہ بچے خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی اور فرد موجود نہیں تھا۔ اچانک ہی میرے کانوں میں کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ ثمینہ تھی جو گلی کے کونے والے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کا باپ بچپن میں ہی ماں بیٹی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ ماں، محلّے والوں کے کپڑے سی کر گزر اوقات کرتی۔ ثمینہ نے بہ مشکل تمام میٹرک کیا تھا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ محلّے والے ان ماں بیٹی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ان کے بارے میں کئی طرح کی باتیں مشہور تھیں لیکن ابھی تک کسی نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ثمینہ خود بھی بہت شوخ و طرار قسم کی لڑکی تھی اور ہر ایک سے بہت جلدی بے تکلف ہو جاتی تھی۔ محلّے کے کئی لڑکے اس کے گھر کے گرد چکر لگاتے رہتے لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ اس سے دو ہی مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ وہ کیریکٹر کی مضبوط تھی یا پھر اسے کسی تگڑی آسامی کی تلاش تھی۔
میں نے ہنسی کی آواز سن کر اس کی جانب گردن اُٹھا کر دیکھا۔ وہ مجھے اشارے سے بلا رہی تھی۔ میں نے زمین .... سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ نہ جانے جسم کے کس حصے پر چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اُٹھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے میری کیفیت بھانپ لی۔ دائیں بائیں دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر میری بغل میں ڈالا اور پوری قوت لگا کر مجھے اوپر اُٹھا لیا۔ میں نے زمین پر قدم جما کر چلنے کی کوشش کی تو اس ٹخنے میں درد کی ٹیس سی اٹھی۔ میں لڑکھڑایا تو اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے مجھے لے کر اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگی۔ میں نے مڑ کر اپنی موٹر سائیکل کی جانب دیکھا تو وہ بولی۔
''اس کی فکر نہ کرو۔ کسی بچے سے اُٹھوا لوں گی..... فی الحال تمہیں دیکھنا ہے کہ کہاں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔''

اتنی دیر میں ہم اس کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ مجھے گھر کے اندر لے گئی اور کمرے میں رکھی ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولی ''تم دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھو۔ پہلے میں موٹر سائیکل کا بندوبست کر لوں پھر تمہیں دیکھتی ہوں۔''
میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ گھر میں کسی اور فرد کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ گویا اس کی ماں گھر پر نہیں تھی۔ میں اس سے ماں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن اتنی دیر میں وہ صحن کا دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ وہ جیسے ہی موٹر سائیکل لے کر آئے گی، میں فوراً ہی یہاں سے رفوچکر ہو جاؤں گا۔
اس کی واپسی پندرہ منٹ بعد ہوئی لیکن وہ کسی طرح موٹر سائیکل صحن کے اندر لانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے دس گیارہ سال کے دو لڑکے بھی آ گئے۔ جنہیں اس نے جھڑک کر بھگا دیا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ گیلا لباس اس کے جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ جس سے اس کے بدن کے خدوخال پوری طرح واضح ہو گئے تھے۔ اس نے میری موجودگی کا خیال کیے بغیر دوپٹا اُتارا اور اسے نچوڑنے لگی۔ پھر اس نے وہ دوپٹا برآمدے میں لگی الگنی پر پھیلا دیا اور میرے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولی۔
''لگتا ہے ٹخنے پر چوٹ آئی ہے۔ ذرا دیکھوں تو سہی۔''
یہ کہہ کر اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے میرا دایاں پاؤں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے فوراً ہی اپنی نظریں دوسری جانب کر لیں۔ مجھ میں اس کے جسم کی حشر سامانیوں کا نظارہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ اسے اتنے قریب پا کر خود میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
''پہلے تم اپنا لباس تبدیل کر لو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔ میں بھی اب چلتا ہوں۔ یہ بارش تو رکنے والی نہیں۔''
''لباس بھی تبدیل کر لوں گی۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائی ''مرہم پٹی کے بغیر تو میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہارے کپڑے بھی تو بھیگ گئے ہیں۔ ایسا کرو تم شرٹ اُتار کر الگنی پر پھیلا دو۔ میں ہلدی چونا گرم کر کے لگاتی ہوں۔ ہر قسم کی چوٹ کے لیے اکسیر ہے۔ تب تک قمیص بھی سوکھ جائے گی اور ہم گرم گرم چائے بھی پئیں گے پھر تم بے شک چلے جانا۔''
اس کی قربت اور باتوں نے مجھ پر ایسا سحر طاری کیا کہ میں نے سوچے سمجھے بغیر قمیص اُتار کر اس کے حوالے کر دی۔ وہ میرے جسم کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی ''واہ! باڈی تو خوب بنائی ہے۔ لگتا ہے کہ باقاعدگی سے کسرت کرتے ہو؟''
مجھے اس کے چھچھورے پن پر سخت غصہ آیا لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا ''خالہ کہاں ہیں؟''
''وہ کسی کسٹمر کو کپڑے دینے گئی ہیں۔ بارش کی وجہ سے رک گئی ہوں گی۔''
''اچھا، تم جلدی سے پٹی باندھ دو۔ پھر میں چلوں گا۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔''
''بس پانچ منٹ میں لے کر آتی ہوں، لیکن پہلے تمہارے لیے چائے بنا دوں۔''
یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اب میں نے اس کے سراپے کو غور سے دیکھا۔ وہ واقعی قدرت کا تخلیق کردہ حسین شاہکار تھی۔ پتلی کمر، اس پر لہراتی ہوئی لمبی سیاہ چوٹی، پشت پر سے قمیص کا گلا کافی نیچے تک کھلا ہوا تھا جس سے اس کی گوری چمک دار جلد صاف نظر آ رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، موتیوں جیسے دانت اور بھرے بھرے ہونٹ۔ وہ واقعی کیچڑ میں کھلا ہوا کنول کا پھول تھی۔ میرے لیے وہاں ایک پل کے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ جلدی سے مجھے چائے پلائے، پٹی باندھے اور میں وہاں سے دوڑ لگا دوں۔ سب سے زیادہ فکر مجھے اس بات کی تھی کہ اگر اس کی ماں آ گئی تو وہ مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر کیا سوچے گی؟
ثمینہ پانچ منٹ میں چائے لے کر آ گئی۔ اس نے پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بولی ''تم چائے پیو تب تک میں تمہارے لیے ہلدی چونا گرم کر کے لاتی ہوں۔ تم دیکھنا اس کے باندھتے ہی آرام آ جائے گا۔''
یہ کہہ کر وہ لہراتی بل کھاتی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے ابھی تک دوسرا دوپٹا لینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اور اس طرح اپنے حسن کی بجلیاں گراتی بار بار میرے سامنے آ رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھ جیسا زاہد بھی بے ایمان ہو سکتا تھا۔ باورچی خانہ صحن کی دوسری جانب تھا اور وہ بار بار صحن عبور کرتے ہوئے بُری طرح بھیگ گئی تھی۔ لیکن وہ اپنے

حسن کی فتنہ سامانیوں سے بے نیاز میری دل جوئی اور تیمارداری میں مصروف تھی۔ اس بار وہ ہلدی چونا گرم کر کے لائی۔ اس کے ہاتھ میں پٹی بھی تھی۔ وہ میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور جھک کر میرے ٹخنے پر پٹی باندھنے لگی۔ میں ایک بار پھر منہ دوسری طرف پھیرنے پر مجبور ہو گیا۔

خدا خدا کر کے یہ مرحلہ ختم ہوا تو میں ایک دم ہی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا اور میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

''دیکھو تو کتنے زور کا مینہ برس رہا ہے۔ اب تو سڑک پر بھی پانی جمع ہو گیا ہوگا۔ ایسے میں کس طرح موٹر سائیکل چلاؤ گے۔ میں تو کہہ رہی تھی، تھوڑی دیر اور رک جاتے۔''

''نہیں ثمینہ، بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب میں جاؤں گا۔ یہ بارش رکنے والی نہیں۔''

ابھی میں نے اپنا جملہ ختم کیا ہی تھا کہ بادل بہت زور سے گرجے۔ بجلی چمکی اور اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ثمینہ ایک زوردار چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ میں نے اسے اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی گو کہ اس کا لباس گیلا تھا لیکن اس کے جسم کی تپش میرے وجود کو پگھلائے دے رہی تھی۔ اس نے خوف زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ان میں ایک واضح پیغام تھا۔ اس کے لب پھڑ پھڑائے اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو ہم دونوں کمرے میں ایک ہی بستر پر دراز تھے اور خالہ رضیہ کمرے کے دروازے پر کھڑی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ ان کی نگاہوں سے شعلے برس رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ ایک طوفان آ کر گزر گیا تھا اور اب میری زندگی ایک نئے امتحان سے دوچار ہونے والی تھی۔ اس نے ثمینہ کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چادر میں اپنا جسم چھپاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں بھی بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ رضیہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے آگے بڑھی اور میرے مد مقابل آ کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے وہ مجھے گھورتی رہی پھر کسی ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی ''اس شہر میں تمہارے باپ کا بڑا نام ہے۔ ابھی محلّے کے لوگوں کو آواز دے کر بلا لوں تو تمہارے خاندان کی عزت، گلیوں میں تار تار ہو کر بکھر جائے گی۔''

میں کچھ نہ بولا۔ کہنے کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا۔ بس خاموش کھڑا سر جھکائے اس کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسی لہجے میں بولی ''ہم بھی کوئی چوڑے چمار نہیں ہیں۔ عزت کی کھاتے ہیں اور سر اُٹھا کر چلتے ہیں۔ اس کا باپ سید تھا۔ اگر وہ ہمیں چھوڑ کر نہ چلا جاتا تو یہ بھی سید زادی کہلاتی پھر دیکھتی کہ کوئی رئیس زادہ اس کی عزت کو کیسے پامال کرتا ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی جب اسے اندازہ ہو گیا کہ میں پوری طرح اس کے ٹرانس میں آ چکا ہوں تو وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولی ''خیر جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر اور گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ جوانی میں ایسی لغزشیں ہو جاتی ہیں لیکن ان کا مداوا ابھی ممکن ہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

مجھے لگا کہ ماسی رضیہ کے گھر نہیں بلکہ کسی تھانے میں بیٹھا ہوا ہوں اور پولیس والے مجھ سے مک مکا کر رہے ہیں۔ بہر حال، مجھے امید کی کرن نظر آئی تو جلدی سے بولا ''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

اس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ اُبھری۔ اس نے اپنے لہجے میں مزید نرمی پیدا کی اور بولی ''دیکھو میاں، بات ابھی اس کمرے تک محدود ہے۔ ہم تینوں کے علاوہ کسی اور کو نہیں معلوم کہ تم کیا گل کھلا چکے ہو۔ اگر تم چاہو تو ساری عمر کسی کو معلوم نہیں ہو پائے گا کہ آج کی تاریخ میں یہاں کتنا بڑا طوفان گزر چکا ہے۔

اب وہ خوامخواہ کا سسپنس پیدا کر رہی تھی۔ جی میں آیا کہ اسے دھکا دے کر گھر سے باہر چلا جاؤں بعد میں جو ہو، دیکھا جائے گا لیکن اس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ وہ عورت منٹ بھر میں شور مچا کر پورے محلّے کو اکٹھا کر سکتی تھی اور میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ میری قمیص ابھی تک الگنی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

میں بے بسی کے عالم میں اپنے بازوؤں کی اُبھری ہوئی مچھلیاں دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس موقع پر کوئی جذباتی قدم اُٹھانا سراسر حماقت ہوگی، لہٰذا اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا ''جی، میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا۔''

''دیکھو میاں! میں صاف اور کھری بات کرنے کی عادی ہوں۔ میری بیٹی کی زندگی تو تم نے برباد کر دی، تم جانتے ہو کہ عورت کی عزت ایک نازک آبگینے کی طرح ہوتی ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر کوئی

بچہ وچہ ہو گیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی دہلیز پر بیٹھی رہے گی۔ اس لیے اب تم ہی وہ واحد فرد ہو جو اسے سہارا دے سکتے ہو۔''

''جی...... میں...... میں، یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' میں ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، تم......!'' وہ مکاری سے بولی ''وہ گانا نہیں سنا، تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر تم کسی لڑکی کی تنہائی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کی عزت سے کھیل سکتے ہو تو اسے مزید ذلت اور رسوائی سے بچانے کے لیے اس کا ہاتھ بھی تھام سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں اپنے گھر والوں سے بات کروں گا۔'' میں نے گویا اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

وہ عورت بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے تھی۔ میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ''ان سے بعد میں بات کرتے رہنا۔ تمہارا نکاح ابھی اور اسی وقت ثمینہ سے ہوگا۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میرے پاس دوسرا اختیار موجود ہے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے، نیک نامی چاہتے ہو یا بدنامی!''

مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت میرے سر پر آن گری ہو۔ اس عورت نے مجھے بڑی ہوشیاری سے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ میری تو وہی کیفیت تھی کہ آگے کنواں اور پیچھے کھائی۔ اگر اپنی عزت بچانے کی خاطر ثمینہ سے نکاح کر لیتا تو گھر والوں، چچا، چچی اور سب سے بڑھ کر زینی کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا۔ ان کے سامنے ثمینہ سے نکاح کا کیا جواز پیش کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی صورت میں میری بچپن کی محبت زینی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جاتی جو مجھے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ میں نے زینی سے محبت نہیں بلکہ عشق کیا تھا۔ جان تو دے سکتا تھا لیکن زینی سے بچھڑنے کا تصور بھی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔

دوسری صورت اس سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ ثمینہ سے نکاح نہ کرنے پر وہ عورت مجھے بُری طرح بدنام کر دیتی۔ سارے شواہد میرے خلاف تھے۔ میڈیکل ٹیسٹ اور ڈی این اے کے بعد تو میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ بچتا پھر پولیس، تھانہ، کچہری اگر وہاں سے پیسوں کے عوض گلو خلاصی ہو جاتی تب بھی میرے ماں باپ کی عزت دو کوڑی کی رہ جاتی۔ میرا عزت دار باپ جو شان سے سر اُٹھا کر اور فخر سے سینہ پھلا کر پھرتا تھا، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ خاندان اور محلّے کی عورتیں طعنے دے دے کر میری ماں کا کلیجا چھلنی کر دیتیں۔ بہن کے لیے رشتے آنا بند ہو جاتے اور سب سے بڑھ کر زینی، کیا وہ مجھے ایک بدکردار شخص کے طور پر قبول کر سکتی تھی؟ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں ثمینہ کے ساتھ منہ کالا کر چکا ہوں تو وہ زندگی بھر میری شکل نہ دیکھتی۔ گویا ثمینہ سے نکاح کروں یا نہ کروں، زینی میرے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال نکاح کے لیے رضامندی ظاہر کر دوں اور یہ شرط لگا دوں کہ جب تک میں اپنے گھر والوں کو راضی نہیں کر لیتا، اس نکاح کو خفیہ رکھا جائے گا۔ بعد میں کچھ دے دلا کر ثمینہ سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ میں نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا اور آہستہ سے بولا ''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہی کہ جب تک میں اپنے گھر والوں کو راضی نہ کر لوں، اس وقت تک اس نکاح کو خفیہ رکھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ثمینہ باعزت طریقے سے اس گھر سے رخصت ہو کر جائے۔''

وہ عورت یہ سن کر نہال ہو گئی اور بولی ''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ تم غسل کر لو، میں قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرتی ہوں۔''

ایسا لگتا تھا کہ قاضی اور گواہ بھی تیار بیٹھے تھے۔ آدھے گھنٹے میں ہی وہ انہیں لے کر آ گئی۔ پھر سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ اب ثمینہ قانوناً اور شرعاً میری بیوی بن چکی تھی۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے زینی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی ہے اور ناکام عشق کی داستانوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پھر میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں کسی نہ کسی طرح ثمینہ سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے پڑ گیا ہے۔

میں ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر واپس آ گیا اور کمرا بند کر کے لیٹ گیا۔ دل پر ایک بوجھ تھا۔ ضمیر کی خلش بے کل کیے دے رہی تھی کہ اب زینی کا سامنا کس طرح کر سکوں گا لیکن اس سے معمول کے مطابق ملنا بھی ضروری تھا، ورنہ وہ ضرور پوچھتی کہ میں نے اس کے یہاں آنا کیوں کم

کر دیا ہے؟ اب مجھے منافق بن کر یہ دُہرا کھیل کھیلنا تھا۔ میں زینی کا محبوب ہونے کے ساتھ ساتھ ثمینہ کا شوہر بھی بن چکا تھا اور مجھے یہ دونوں کردار نبھانا تھے۔

میں تین چار دن تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس دوران میں نے کتابوں کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ چوتھے روز ایک بچہ ہمارے دروازے کے باہر آیا اور مجھے ایک رقعہ دے کر چلا گیا۔ یہ ثمینہ نے بھیجا تھا اور اس میں لکھا تھا ''میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں ورنہ......''

اس ورنہ میں جو دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس کا تصور کرتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ثمینہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی البتہ اس کی ماں نے میری بڑی آؤ بھگت کی لیکن اس کا انداز ساس نہیں بلکہ نائیکہ جیسا تھا جو گاہک کو قابو میں رکھنے کے لیے ہر جتن کرتی ہے۔ میں اس کی وارفتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''ثمینہ کو کیا ہوگیا۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے؟''

''تم سے ناراض ہے۔'' وہ بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی ''نکاح کے بعد غائب جو ہو گئے تھے۔ اب وہ تمہاری بیوی ہے، اس کا بھی تم پر کوئی حق ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے خالہ لیکن رخصتی سے پہلے میرا یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں۔''

''اور یہ رخصتی کب ہوگی؟''

''جب میں اپنے والدین کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''اور اگر وہ نہ مانے تو......''

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ وہ میری بات مان لیں گے۔''

''دیکھو میاں! میں ان چکروں میں نہیں پڑتی۔ میرے نزدیک رخصتی سے زیادہ نکاح کی اہمیت ہے۔ اب ثمینہ قانوناً اور شرعاً تمہاری بیوی ہے اور میں اسے بخوشی تمہارے ساتھ رہنے کی اجازت دے رہی ہوں۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ اسے یہاں رکھو یا اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب تک تمہارے گھر والے راضی نہیں ہو جاتے، تم شوق سے یہاں آ سکتے ہو۔ جتنا وقت چاہے ثمینہ کے ساتھ گزارو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا البتہ میری ایک شرط ہے کہ تمہیں ہر روز یہاں آنا ہوگا۔ چاہے گھنٹا بھر کے لیے ہی آؤ لیکن اس طرح منہ چھپا کر گھر بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

وہ عورت بڑی ہوشیاری سے میرے گرد جال بُنتی جا رہی تھی اور مجھے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ میں کس دلدل میں اُترتا جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا گھنٹا بھر کی تو بات ہے، وقت نکال کر آ جایا کروں گا۔ اگر اس طرح راز کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آیندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''یہ ہوئی نا بات!'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی ''تمہیں تھوڑی سی بہادری دکھانا ہوگی ورنہ خاک چاٹتے رہ جاؤ گے۔ اب تم ثمینہ کو مناؤ، میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''

میں بجھے دل کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو ثمینہ منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے پشت سے جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''ثمینہ، مجھ سے غلطی ہو گئی، معاف کر دو۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''معافی کس بات کی؟'' وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی ''مجھے آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے، جو کچھ ہوا، اس میں آپ کا کوئی قصور ہے اور نہ میری کوئی غلطی۔ ہماری قسمت میں یہی لکھ دیا گیا تھا سو وہ ہو گیا لیکن اب میں آپ کی امانت ہوں۔ اس لیے تھوڑا بہت شکوہ کرنے کا حق تو مجھے بھی ہے۔''

''کہہ جو دیا کہ آیندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ بس اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔''

اس نے اپنا موڈ ایسا ٹھیک کیا کہ میں دو گھنٹے تک اس کی قید سے رہائی نہ پا سکا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کی منہ زور جوانی نے زینی کے پیار کو شکست دے دی تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ زینی کے پیار کی عمارت پانی کے ایک عارضی ریلے میں بہہ جاتی۔ ثمینہ جیسی دس لڑکیاں بھی زینی کو مجھ سے جدا نہیں کر سکتی تھیں لیکن یہ میری اس وقت کی سوچ تھی، حقیقت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

رزلٹ آنے کے فوراً بعد ہی میرا ہاؤس جاب شروع ہو گیا۔ اس طرح مجھے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور میں نے امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہاؤس جاب پورا ہونے سے پہلے میری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں بھی شاید مجھ سے اسی جواب کی توقع تھی چنانچہ انہوں نے یہی پیغام چچی جان کو بھی بھجوا دیا۔ وہ تھوڑی بہت تلملائیں لیکن چچا جان کے سمجھانے پر خاموش ہو گئیں۔ میرے پاس اب وقت کی بہت کمی ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک اسپتال میں ڈیوٹی دیتا۔ شام کو گھر آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا پھر دوسری ڈیوٹی یعنی ثمینہ کے پاس جانے کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اس طرح میری واپسی رات گئے ہوتی۔ گھر والوں سے یہ بہانہ بنا رکھا تھا کہ ایک دوست کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈی کر رہا ہوں۔ ایسی صورت میں زینی کے پاس جانے کے لیے کس طرح وقت نکالتا لیکن مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

چھٹی والے دن میں ہمت کر کے اس کے پاس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ثمینہ کی طرح وہ بھی میرے نہ آنے پر ناراض ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے بڑی خوش دلی سے پیش آئی۔ اس نے مجھے امتحان میں پاس ہونے پر مبارک باد دی۔ اپنے ہاتھ سے گرما گرم پکوڑے اور چائے بنائی اور میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی ''گو کہ یہ برسات کا موسم نہیں ہے لیکن جانتی ہوں کہ تمہیں میرے ہاتھ کے بنے ہوئے پکوڑے اچھے لگتے ہیں حالانکہ اصولاً تو تمہیں مٹھائی لے کر آنا چاہیے تھا۔''

''مٹھائی کیسے لے کر آتا؟'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا ''سچ پوچھو تو مجھے یہاں آتے ہوئے ہی ڈر لگ رہا تھا کہ نہ جانے میری طویل غیر حاضری پر تمہارا کیا ردِعمل ہو؟''

''ہم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہونے والے نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی مصروفیت رہی ہوگی۔ اسی لیے نہیں آ سکے۔ خیر چھوڑو، ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ اسپتال کی ڈیوٹی کیسی چل رہی ہے؟''

''اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دو گھنٹے بعد واپسی ہوئی تو میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں زینی اور ثمینہ کا موازنہ کرنے لگا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ زینی کتنے بڑے ظرف کی مالک تھی۔ اس نے میری طویل غیر حاضری پر بھی کوئی شکوہ نہیں کیا جبکہ ثمینہ سے تین چار دن بھی برداشت نہ ہو سکا اور اس نے مجھے دھمکی آمیز رقعہ بھیج دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ثمینہ سے جلد از جلد گلو خلاصی کی کوشش کروں گا اور اگر وہ نہ مانی تو اسے زبردستی طلاق دے دوں گا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

امام حنبل بن احمد

اور مشہور ڈاکو ابو الہیثم

امام موصوف کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ کہتے تھے کہ ''رحم اللہ بالہثم، غفر اللہ لابی الہثم'' ایک دن پوچھا کہ ابوالہثم کون ہے؟

کہا جس دن سپاہی مجھے دربار میں لے گئے اور کوڑے مارے گئے تو جب ہم راہ سے گزر رہے تھے، ایک آدمی مجھ سے ملا۔ اور کہا کہ مجھ کو جانتے ہو؟ میں مشہور چور اور عیّار ابوالہثم حداد ہوں۔ میرا نام شاہی دفتر میں ثبت ہے۔ بارہا چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا اور بڑی بڑی سزائیں جھیلیں۔ صرف کوڑوں کی مار ہی گنوں تو اٹھارہ ہزار ضربیں تو میری پیٹھ پر ضرور پڑی ہوں گی۔ بااین ہمہ میری استقامت کا یہ حال ہے کہ اب تک چوری سے باز نہ آیا۔ جب کوڑے کھا کر جیل سے نکلا، سیدھا چوری کی تاک میں چلا گیا۔ میری استقامت کا یہ حال شیطان کی طاعت میں رہا دنیا کی خاطر۔ افسوس ہے تم پر اگر اللہ کی محبت میں اتنی بھی استقامت نہ دکھلاؤ۔ اور دینِ حق کی خاطر چند کوڑوں کی ضرب برداشت نہ کر سکو۔'' میں نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہا اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکے جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پر ہزار حیف اور ہماری خدا پرستی سے بت پرستی لاکھ درجہ بہتر!

اقتباس: تذکرہ از مولانا ابوالکلام آزاد

مرسلہ: تاجور سلیم دانش، ترنگڑی بالا مانسہرہ

انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔ میں اپنی پلاننگ کررہا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نکاح کو ایک مہینا بھی نہیں ہوا تھا کہ ثمینہ نے بیویوں والا انداز اختیار کرتے ہوئے فرمائشیں کرنا شروع کردیں۔ اس زمانے میں ہاؤس جاب کرنے والوں کو ماہانہ وظیفہ نہیں ملتا تھا اور میں خود اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے گھر والوں کا محتاج تھا۔ ایسی صورت میں ثمینہ کی فرمائشیں کیسے پوری کرتا؟ اسے اپنے ساتھ باہر لے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ اس کی خواہش تھی کہ میں اسے کھانا کھلانے کسی ہوٹل میں لے جاؤں یا شاپنگ کراؤں۔ ایک دو مرتبہ تو اس نے دبے لفظوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہر لڑکی کی طرح اس کی بھی خواہش ہے کہ وہ بھی شادی کے بعد ہنی مون منانے جائے لیکن اس کا یہ ارمان پورا نہ ہوسکا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن اس نے اپنی ماں سے میری شکایت کرڈالی۔ اس پر وہ مکار بڑھیا بڑی ادا سے بولی۔

''بیٹا! میں تمہاری مجبوریاں سمجھتی ہوں۔ تم اسے اپنے ساتھ باہر نہیں لے جاسکتے تو کیا ہوا، کچھ پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دو۔ یہ خود ہی اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے گی۔''

میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا مجھے لوٹنے کے منصوبے کا آغاز ہوچکا تھا۔ میں اس وقت تو انہیں ٹال کر آگیا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے ثمینہ سے جان چھڑانے کی منصوبہ بندی کرنا شروع کردی۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی حل سامنے آیا کہ ثمینہ اور اس کی ماں سے صاف صاف کہہ دوں کہ میرے گھر والے اس شادی پر رضامند نہیں ہورہے۔ وہ پہلے ہی چچازاد سے میرا رشتہ طے کرچکے ہیں اور ان کے لیے زبان دے کر پھر جانا ممکن نہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں نے اس شادی پر اصرار کیا تو وہ مجھے عاق کردیں گے اور مجھے ان کی دولت اور جائداد میں سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔

میں یہ فیصلہ کرکے مطمئن ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لالچی لوگ ہیں جب انہیں معلوم ہوگا کہ ثمینہ سے شادی کرنے کی صورت میں مجھے دولت اور جائداد سے محروم ہونا پڑے گا تو وہ خود ہی مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے گی۔ اس طرح میں مہر کے علاوہ لاکھ دو لاکھ روپے اضافی دے کر اپنی جان چھڑالوں گا۔ یہی سوچ کر میں ثمینہ کے گھر پہنچا تو وہاں ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر اس مکار بڑھیا کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب اس نے ہمیں تنہائی کا موقع فراہم کیا تو ثمینہ نے شرماتے ہوئے مجھے اپنی دانست میں یہ خوش خبری سنائی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔

یہ خبر سنتے ہی میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا لیکن یہاں اُلٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ اب بچے کی پیدائش تک ثمینہ کو طلاق دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ثمینہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی اور بولی ''کیا بات ہے، آپ کو یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی؟''

''یہ بات نہیں ہے ثمینہ! میرا مطلب ہے کہ رخصتی سے پہلے اتنی جلدی...... یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''آپ نے میرے بارے میں بھی کچھ سوچا کہ میں لوگوں کو کیا بتاؤں گی کہ اس بچے کا باپ کون ہے؟ یہ شادی کب تک خفیہ رہے گی؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ثمینہ! اب ہمیں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہی پڑے گا۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ مجھے جلد از جلد یہاں سے لے جائیں۔ اگر اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے تو میرے لیے عارضی طور پر کوئی علیحدہ مکان لے لیں۔ میں چھوٹے سے گھر میں گزارہ کرلوں گی۔ اگر آپ نے مزید تاخیر کی تو میں خود ہی اپنا مقدمہ لے کر آپ کے ابا کی عدالت میں پہنچ جاؤں گی۔''

اس کی یہ دھمکی سن کر میں پریشان ہوگیا۔ جانتا تھا کہ وہ ایسا بھی کرسکتی ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی نظروں میں اپنی یا دوسروں کی عزت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔

''تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں جلد ہی کوئی نہ کوئی انتظام کرلوں گا۔''

''آپ کے پاس صرف ایک ہفتہ ہے۔ اس سے زیادہ میں انتظار نہیں کرسکتی۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس نے چائے کو پوچھا اور نہ ہی میری کوئی خاطر کی۔ اس کی بے رُخی پر مجھے سخت غصہ آیا۔ انتہائی درجے کی خود غرض عورت تھی۔ اسے صرف اپنی عزت کی فکر تھی۔ میری پریشانیوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔

پانی سر سے اونچا ہوتا جارہا تھا اور میرے پاس اس مسئلے سے نمٹنے کی کوئی ترکیب نہیں تھی۔ مجبور ہوکر اپنے ایک دوست عارف کے پاس گیا۔ اس کا باپ بہت بڑا پراپرٹی ڈیلر تھا۔ میں نے اسے اپنا رازدار بنانے کا فیصلہ کیا اور اسے تمام صورتِ حال بتادی۔ وہ بھی یہ ماجرا سن کر پریشان ہوگیا

اور بولا۔

''یار، تم تو بُری طرح پھنس گئے۔ وہ لڑکی اور اس کی ماں بہت بڑی حرافہ معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے تمہیں پوری طرح اپنے جال میں جکڑ لیا ہے۔''

''اب ان باتوں کو دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مسئلے کا کوئی حل بتاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ عورت میرے گھر تک پہنچ جائے۔''

''دیکھو یار! میں تمہارے لیے فلیٹ کا بندوبست تو کرسکتا ہوں۔ دو چار مہینے تک کرایہ بھی نہیں مانگوں گا لیکن تم جانتے ہو کہ میرا باپ کاروباری آدمی ہے۔ زیادہ عرصہ برداشت نہیں کرسکے گا۔ اس دوران اگر تم کچھ بندوبست کرسکتے ہو تو میں تمہاری مدد کے لیے حاضر ہوں۔''

''تم فی الحال فلیٹ کی چابی مجھے دو۔ میں تمہاری دی ہوئی مہلت سے پہلے ہی کوئی انتظام کرلوں گا۔''

عارف نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اس نے صرف فلیٹ ہی میرے حوالے نہیں کیا بلکہ قرض حسنہ کے طور پر پچاس ہزار روپے بھی دیے تاکہ میں نئے گھر میں ضروری سازوسامان ڈال سکوں۔ کچھ پیسے میرے پاس بھی تھے۔ ان سے میں نے بیڈروم سیٹ، تھوڑا سا فرنیچر اور کراکری وغیرہ خریدی اور ایک دن خاموشی سے ثمینہ کو لے کر اس فلیٹ میں شفٹ ہوگیا۔ ثمینہ کی ماں بھی اس کی تنہائی دور کرنے کی غرض سے ساتھ ہی چلی آئی اور بہانہ یہ بنایا کہ بچے کی پیدائش تک اس کا ثمینہ کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

اب یہ میرا گھر تھا اور اسے چلانے کی ذمے داری بھی مجھ پر تھی۔ ہاؤس جاب ختم ہونے میں ابھی چھ مہینے باقی تھے۔ اس کے بعد ہی مجھے کوئی ملازمت مل سکتی تھی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ حکومت نے ٹرینی ڈاکٹروں کو معمولی وظیفہ دینا شروع کردیا لیکن اس سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوسکتے تھے چنانچہ میں نے ایک کلینک میں پارٹ ٹائم ملازمت کرلی۔ اب میں گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ صبح سے شام تک اسپتال، پھر کلینک، واپسی میں ایک چکر ثمینہ کی طرف۔ اس طرح میں رات بارہ ایک بجے کے قریب گھر پہنچتا۔ شروع شروع میں تو پڑھائی کا بہانہ بنا کر گھر والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی دودھ پیتے بچے نہ تھے۔ انہیں میری سرگرمیوں پر کچھ شک ہونے لگا۔ ابا جان نے اپنے طور پر کچھ انکوائری کی لیکن وہ بھی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔

ان حالات میں زینی میرے لیے ایک بھولا بسرا

خواب بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اس کا خیال آتا تو دل میں ایک ٹیس سی اُٹھنے لگتی۔ ہر ہفتے سوچتا کہ چھٹی والے دن اس سے ملنے ضرور جاؤں گا لیکن ثمینہ پہلے سے ہی کوئی نہ کوئی پروگرام بنا کر بیٹھی ہوتی۔ جیسے جیسے ڈلیوری کے دن نزدیک آرہے تھے، اس کے نخروں اور فرمائشوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اپنے گھر بالکل نہ جاؤں اور سارا وقت اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہوں۔ ایک دن مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں وقت نکال کر زینی سے ملنے چلا گیا۔

وہ مجھے کافی کمزور لگ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ کافی دنوں سے بیمار ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی لیکن اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی پوچھا کہ میں اتنے دنوں تک کیوں نہیں آیا؟ وہ بالکل نارمل انداز میں مجھ سے باتیں کرتی رہی لیکن میں اس کے چہرے پر لکھی پریشانی پڑھ چکا تھا جسے وہ مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ میرے لیے اس کا یہ رویّہ بھی پریشان کن تھا۔ اگر وہ یونہی دل ہی دل میں گھٹتی رہی تو یہ اس کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب باقاعدگی سے زینی کے پاس جایا کروں گا تاکہ وہ میرے بارے میں کسی بدگمانی کا شکار نہ ہو۔ میں اسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ میری محبت تھی اور اسے ایک نہ ایک دن میری زندگی میں آنا ہی تھا لیکن ثمینہ نے مجھے کچھ اس طرح اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا کہ میں کوشش کے باوجود زینی کی طرف نہ جاسکا۔ اسی اثنا میں ثمینہ کی ڈلیوری کا وقت قریب آگیا اور مجھے اس کی نازبرداری کرنے کے لیے بیک وقت اسپتال اور کلینک دونوں جگہ سے چھٹی کرنا پڑگئی۔

ثمینہ نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا گو مجھے یوں لگا جیسے میرے پاؤں میں زنجیر پڑگئی ہے۔ اب اگر میں اسے طلاق دیتا تو وہ مجھ سے نان ونفقہ کا مطالبہ کرسکتی تھی اور اس طرح مجھے ایک مخصوص مدت تک بچی کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم اسے دینا پڑتی چنانچہ مجھے ایک بار پھر اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا اور ثمینہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مزید سوچ بچار میں مصروف ہوگیا۔ اب ثمینہ اور اس کی ماں کا اصرار بڑھتا جارہا تھا کہ میں گھر والوں سے بات کرکے ثمینہ کو اپنے گھر لے جاؤں۔ شاید وہ مالی تنگی برداشت نہیں کرپارہی تھیں اور میرے باپ کی دولت پر عیش کرنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا تھا لیکن میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا جان یہ سنتے ہی مجھے سچ مچ عاق کردیں گے اور اس کے بعد میں گھر کا رہوں گا نہ گھاٹ کا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ زینی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوجائے گی جو مجھے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ میں ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح ٹالتا رہا۔

ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی مجھے ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی اور میں نے کوشش کرکے اپنا ٹرانسفر حیدرآباد کروالیا کیونکہ کراچی میں رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا، آخر میں کب تک چوروں کی طرح زندگی گزارتا رہتا۔ ابا جان اس ملازمت کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے مجھ سے باہر جانے کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتادیا کہ تیاری نہ ہونے کی وجہ سے امتحان نہ دے سکا۔ اب اگلے سال کوشش کروں گا چنانچہ وہ مطمئن ہوگئے اور میں حیدرآباد چلا آیا۔

جانے سے پہلے میں زینی سے ملنے گیا تو وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ نہ جانے اسے کون سا روگ لگ گیا تھا جو وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ میں نے اس سے بہت پوچھا لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی کمزوری ہے جبکہ چچی جان کا کہنا تھا کہ اس کی بھوک پیاس سب ختم ہوچکی تھی۔ کھانے کی طرف وہ دیکھتی بھی نہیں۔ بہت اصرار کرنے پر دو چار لقمے منہ میں ڈال لیتی ہے بس ہر وقت اس کی نظریں دروازے پر جمی رہتی ہیں۔ جیسے اسے کسی کا انتظار ہو، کئی ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس کوئی سوچ ہے جو اسے اندر ہی اندر گھلا رہی ہے۔

"تمہارے آجانے سے اس کا دل بہل جاتا تھا لیکن تم نے بھی مصروفیت کی وجہ سے آنا جانا کم کردیا اور اب تو تم بھی دوسرے شہر جارہے ہو۔ نہ جانے کتنے مہینوں بعد شکل دکھایا کروگے۔"

میں زینی کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا اور میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ اپنا تبادلہ منسوخ کروادوں لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا لہٰذا مجبوراً زینی کو الوداع کہہ کر اور ہر ہفتے آنے کا وعدہ کرکے واپس چلا آیا۔ ایک مہینے بعد رہائش کا بندوبست ہوگیا تو میں نے ثمینہ کو بھی اپنے پاس ہی بلالیا۔ اس کی ماں بھی کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی، وہ بھی ساتھ ہی چلی آئی۔ ثمینہ بہت خوش تھی کہ اب اس کو آزادی سے میرے ساتھ گھومنے کا موقع ملے گا۔ میں بھی مطمئن ہوگیا کہ وقتی طور پر اس نے میرے گھر جانے کی ضد چھوڑ دی تھی۔

اس واقعے کے ایک مہینے بعد مجھے ابا جان نے فون پر بتایا کہ زینی کی حالت بہت خراب ہے اور وہ مجھے یاد کررہی ہے لہٰذا میں فوراً کراچی پہنچوں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ثمینہ سے ایک ضروری کام کا بہانہ بنایا اور فوراً ہی کراچی کے لیے روانہ ہوگیا۔ زینی کے گھر پہنچا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چراغ روشن ہوگئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کمرے میں موجود سب لوگوں کو باہر جانے کے لیے کہا جیسے تنہائی میں مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ جب سب لوگ باہر چلے گئے تو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے نحیف آواز میں بولی۔

"تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں تمہیں کوئی الزام نہیں دوں گی البتہ اتنی شکایت ضرور ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی اہم بات چھپائی حالانکہ بچپن سے لے کر آج تک تم مجھ سے ہر بات شیئر کرتے آئے ہو۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ تم کبھی نہ کبھی مجھے اس راز میں شریک کرلوگے پھر ہم مل کر اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرلیں گے مگر شاید تم نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ یقین جانو، اگر تم مجھے اپنا ہم راز بنالیتے تو میں خود تایا جان کو راضی کرکے ثمینہ کو دلہن بنا کر لاتی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جو کچھ ہوا، تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہیں اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے یہ قدم اُٹھانا پڑا۔ اس کے لیے میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ ہوسکے تو مجھے بھی معاف کردینا کہ میں تمہارے کسی کام نہ آسکی۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ زینی کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ ثمینہ، اس کی ماں، قاضی اور دو گواہوں کے علاوہ کسی کو اس نکاح کے بارے میں علم نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ثمینہ یا اس کی ماں نے کسی ذریعے سے زینی تک یہ کہانی پہنچادی ہو تاکہ وہ مجھ سے بدظن ہوجائے کیونکہ انہیں بھی میرے اور زینی کے تعلق کے بارے میں تھوڑا بہت علم تھا۔

میں نے بدحواسی کے عالم میں زینی سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو زرینہ! میں نے ایسا کیا کردیا؟"

"جان! میرا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے۔ اب تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یقین کرو میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ اگر شکایت کرنا ہوتی تو بہت پہلے کرچکی ہوتی لیکن میں تمہاری پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ البتہ یہی حسرت لے کر اس دنیا سے جارہی ہوں کہ کاش، تم مجھے اپنا سمجھ کر اس راز میں شریک کرلیتے۔"

میں اس کی بات سن کر تڑپ اُٹھا اور بولا "زینی۔ میں تمہیں سب کچھ بتادیتا لیکن ڈر رہا تھا کہ کہیں تم مجھ سے دور نہ ہوجاؤ۔ اسی لیے اپنے طور پر اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔"

"اب وہ مصیبت نہیں بلکہ تمہاری بیوی ہے۔ اس کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے ہاتھ پر

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین ونازک قدریں چُور چُور ہوگئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑادیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے مخمسے میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہوگیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹادیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پُرانے بچھڑ گئے اور پھر "وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔"

انجمن کے پرخچے اُڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اُٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہوگیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہوسکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیاکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو چھپّر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

اقتباس: عصمت چغتائی

مرسلہ: راحیلہ امجد، گجرات

اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور وہ خاموشی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی زوردار بارش شروع ہوگئی۔ مجھے یاد آیا کہ جس روز میری محبت کی موت واقع ہوئی تھی، تب بھی بارش ہوئی تھی اور آج جب میری زندگی مجھ سے روٹھ کر جارہی تھی تو آسمان کو بھی رونا آگیا‘ لیکن میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ بہا۔ میں پتھر کے بت کی طرح گم صم اپنی محبت کی لاش کو دیکھتا رہا۔

زینی کے چالیسویں کے بعد زندگی معمول پر لوٹ آئی۔ ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ البتہ ثمینہ بہت خوش تھی جیسے اس کے راستے کی رکاوٹ ہٹ گئی ہو۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ انہی ماں بیٹی میں سے کسی نے زینی کو یہ خبر پہنچائی ہوگی۔ مجھے ان کی شکل سے نفرت ہوگئی تھی، اگر زینی کی وصیت کا پاس نہ ہوتا تو میں انہیں جوتے مار کر گھر سے نکال دیتا۔

ثمینہ نے ایک بار پھر ابا جان کے گھر چلنے کی ضد شروع کردی تھی۔ تنگ آکر میں نے بھی جوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔ دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ ثمینہ کو بہو کے طور پر قبول کرلیتے یا مجھے بھی گھر سے نکال دیتے۔

چنانچہ ایک ویک اینڈ پر میں گھر گیا اور جی کڑا کرکے انہیں پوری بات بتادی اور ان حالات سے بھی آگاہ کردیا جن سے مجبور ہوکر مجھے یہ قدم اُٹھانا پڑ گیا تھا۔ وہ دم سادھے میری داستان سنتے رہے پھر بولے ”جو ہوا، اچھا ہوا۔ تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے خاندان کی عزت بچانے کے لیے اپنی محبت کی قربانی دی۔ اگر تم ہمیں پہلے بتادیتے تو شاید اس مسئلے کا کوئی حل نکل سکتا تھا۔ مجھے زینی کی موت کا بہت افسوس ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنی بہو کے روپ میں دیکھا تھا۔“

ابا جان نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ثمینہ کو اپنی بہو کے طور پر قبول تو کرلیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کردی کہ وہ ان کی زندگی میں اس گھر میں نہیں آئے گی۔ البتہ اگر میں چاہوں تو وہ میرے لیے اسی شہر کے کسی پوش علاقے میں علیحدہ مکان کا انتظام کرسکتے ہیں۔ شاید وہ ثمینہ کی ماں کی ساکھ کے حوالے سے ڈرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ محلے میں کسی کو ان کے رشتے کے بارے میں علم ہو۔

پھر وہی ہوا جو ثمینہ نے چاہا۔ ابا جان نے ڈیفنس میں مجھے مکان خرید کردے دیا۔ اس کی تزئین و آرائش بھی میرے ذوق کے مطابق ہوگئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ذاتی کلینک کھولنے میں بھی مدد کی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اسپتال کی ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ پریکٹس بھی کروں تاکہ ثمینہ کی جائز و ناجائز خواہشات پوری کرنے کے لیے میرے پاس معقول رقم ہو۔

وقت کا پہیہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ میری بہن کی شادی ہوگئی۔ ایک ایک کرکے امی اور ابا جان بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ میں نے اپنا آبائی گھر فروخت کرکے بہن کو اس کا حصہ دے دیا اور کلینک کو وسعت دے کر اسپتال کی شکل دے دی۔ کچھ عرصہ بعد ثمینہ کی ماں بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور اپنی بیٹی کو میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے چھوڑ گئی۔

ثمینہ انتہائی چھچھوری عورت ثابت ہوئی۔ اس میں نودولتیوں والی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ گھر میں دنیا بھر کی آسائشیں موجود ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتی ہے لیکن اس کی ہوس کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ روپیا پانی کی طرح بہاتی ہے لیکن فرمائشوں کا انبار ختم نہیں ہوتا۔ بیٹی کو بھی اس نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ وہ بھی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ روک ٹوک کرتا ہوں تو گھر میں جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں۔ تنگ آکر قبرستان کا رُخ کرتا ہوں اور زینی کی قبر کے سرہانے گھنٹوں بیٹھا رہتا ہوں۔ زندگی میں تو اس سے ملنے کی فرصت نہیں تھی لیکن اب میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ میں نے اس کی قبر کے برابر والی جگہ اپنے لیے مخصوص کروالی ہے اور اپنے وکیل کو وصیت کردی ہے کہ مجھے اس کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ وہ مجھے زندگی میں نہ مل سکی تو کم از کم موت کے بعد ہی اس کا ساتھ نصیب ہوجائے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک لغزش کا اتنا بھیانک انجام ہوگا۔

□

شمارہ اگست 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: عشق ناتمام............صبح یار خان

☆ دوم: تقدیس عشق............شاہین اطہر

☆ سوم: عشق نامکمل............خرم وجاہت

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے